جنوری 2017
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
سالِ نو نمبر
JANUARY 2017
KHAWATEEN DIGEST Regd. No. SC-51
سمیرا حمید اور سائرہ رضا کے ناول
قیمت 60/- روپے

خواتین ڈائجسٹ

بانی و مدیرِ اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — نادرہ خاتون

مدیر — آذر ریاض

نائب مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیرہ خصوصی — امت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات — عدنان

اشتہارات — خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

جنوری 2017

جلد 44 شمارہ 9

قیمت 60 روپے

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملئے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	7000 روپے

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

نفسیات

پکوان

بیوٹی بکس

MEMBER APNS CPNE

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری کا پرچا لیے حاضر ہیں۔

دُنیا اپنے معلوم اختتام کی جانب ایک قدم اور آگے بڑھی۔ زمین نے اپنی محوری گردش کا ایک اور چکر پورا کیا۔ ہندسوں کی تبدیلی کا عمل ایک بار پھر دُہرایا گیا اور دُنیا نے نئے سال کا جشن اسی جوش و خروش سے منایا جو اس کا خاصا رہا ہے۔

اگرچہ نئے سال میں ہندسوں کی تبدیلی کے سوا کچھ نہیں بدلتا مگر کہیں نہ کہیں امید کی کرن جگمگاتی رہتی ہے کہ شاید نیا سال کرۂ ارض پر امن کا، خوش حالی کا، محبتوں کا، روشنیوں کا پیغام لے کر آئے۔ شاید ان لوگوں کے دن بدل جائیں جو ظلم و بربریت کا شکار ہیں، محکوم ہیں، مظلوم ہیں۔ جبری غلامی کے حصار میں جکڑے ہوئے ہیں۔

انسان کی خوش گمانیاں، اس کی آرزوئیں، اس کے خواب کبھی ختم نہیں ہوتے۔ شاید یہی جذبے ہیں جن سے زندگی آگے بڑھتی ہے۔ انسان اپنی بقا قائم رکھتا ہے، زندگی کا ساتھ نبھاتا ہے اور زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ ازل سے انسان دُنیا کو بدلنا چاہتا ہے مگر خود کو بھی بدل نہیں پایا ہے۔

کیلنڈر پر تاریخ بدل گئی ہے۔ سو حسب روایت ہم قارئین کو نئے سال کی مبارک باد دیتے ہیں اس امید اور دعا کے ساتھ کہ نیا سال کرۂ ارض پر محبت و آشتی کا پیغام لے کر آئے۔ مظلوموں کی داد رسی اور ظلم کا خاتمہ ہو۔ آمین

انشاجی،

چاند کے شیدائی، چاند نگر کے انشاجی، سب کے پیارے، سب کو عزیز، دوستوں کے دوست کتنے من موہنے، کتنے مقبول، دُنیا سے رخصت ہوئے سالوں بیت گئے مگر دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔ ان کے کالم پڑھیں تو یوں لگتا ہے، آج ہی لکھے گئے ہوں۔ ان کی شاعری کا گداز آج بھی دلوں کو چھوتا ہے۔ ان کے خطوط پڑھیں تو لگتا ہے انشاجی سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اور ان پر لکھے گئے خاکے جن میں انشاجی سامنے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ بہت کم شاعر، ادیب ہوں گے جن کے بارے میں اتنا لکھا گیا ہو اور اتنا اچھا لکھا گیا ہو۔

گیارہ جنوری کو انشاجی کی برسی کے موقع پر ان کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول نمل اختتام کو پہنچا۔ اس ماہ اس کی آخری قسط شائع کی جا رہی ہے۔ یہ ناول انتیس ماہ تک مسلسل شائع ہوتا رہا اور کسی بھی مرحلے پر اس کی دلچسپی اور پسندیدگی میں کمی نہیں آئی۔
- سمیرا حمید کا مکمل ناول "محبت آمد و من" سمیرا حمید ہمیشہ انوکھے اور مختلف موضوعات لے کر آتی ہیں۔ اس بار انہوں نے ماضی میں جا کر محبت کی ایک دلکش داستان تحریر کی ہے۔
- سائرہ رضا کا ناول "حسن المآب اور..." سائرہ رضا کے موضوعات زندگی سے قریب ہوتے ہیں۔ ان کا سادہ اور رواں اندازِ تحریر قاری کو باندھ لیتا ہے۔ اس بار انہوں نے قدرے مختلف موضوع پر لکھا ہے جو خاص توجہ کا متقاضی ہے۔
- میمونہ صدف کا ناولٹ "راہِ جنوں میں"، آمنہ ریاض کا ناول "دشتِ جنوں"،
- عطیہ خالد، شازیہ الطاف ہاشمی، حافظہ خوشنود حنیف، نفیسہ سعید اور عائشہ اختر بٹ کے افسانے،
- خواب ناک کی میزبان عائشہ جہاں زیب سے باتیں، عدیل رزاق سے ملاقات،
- کرن کرن روشنی۔ احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

جنوری کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

استقامت کابیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"تو ثابت قدم رہ جیسا کہ تجھے حکم ہوا۔" (ہود۔ 112)

اور فرمایا:

"تحقیق جنہوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے' ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) نازل ہوتے ہیں: تم مت ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور خوش خبری سنو' اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم تمہارے دوست ہیں' دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں۔ اور تمہارے لیے وہاں وہ ہے جو تمہارا جی چاہے۔ اور تمہارے لیے وہاں وہ ہے جو تم مانگو۔ مہمانی ہے اس بخشنے والے مہربان کی طرف سے۔" (فصلت۔ 30۔ 32)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بے شک جنہوں نے کہا: "ہمارا رب اللہ ہے' پھر ثابت قدم رہے' ان پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے' وہ لوگ ہیں بہشت والے' اس میں ہمیشہ رہیں گے' بدلہ ہے ان کاموں کا جو وہ کرتے تھے۔" (الاحقاف۔ 13۔ 14)

فائدہ آیات: ان آیات میں استقامت کا دینی و اخروی نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر استقامت عطا فرمائے' تاکہ ہم ان خوش خبریوں کا مصداق بن سکیں جو ان آیات میں بیان کی گئی ہیں۔

ثابت قدم

حضرت ابو عمرو' بعض کے نزدیک ابو عمرہ' سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں' میں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے اسلام کے بارے میں ایسی بات بتا دیں کہ اس کے بارے میں آپ کے علاوہ میں کسی سے سوال نہ کروں۔" آپ نے فرمایا:

"تم کہو: میں اللہ پر ایمان لایا' پھر اس پر ثابت قدم رہو۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ استقامت کا مطلب ہے: اسلام کے اوامر و نواہی پر نہایت ثابت قدمی سے عمل کرنا' نیز احکام فرائض و سنن اور مستحبات کو بجالانا اور محرمات سے اجتناب

کرنا۔

2۔ ایمان محض زبان سے ظاہر کردینے کا نام نہیں بلکہ اصل ایمان وہی ہے جس کے ساتھ عمل ہو اس لیے کہ عمل ایمان کا ثمر اور نتیجہ ہے۔ جس طرح بے ثمر درخت کی کوئی اہمیت نہیں اسی طرح عمل کے بغیر ایمان کی حیثیت نہیں۔ اور استقامت کمال ایمان کی علامت ہے۔

3۔ ایمان لاکر اس پر استقامت اختیار کرنا واقعی بڑا مشکل امر ہے اس لیے اس پر انعام بھی بہت بڑا رکھا گیا ہے۔ سورۃ حم السجدہ میں ملائکہ کی دوستی ان کی مودت اور حزن ملال سے آزادی جیسے انعامات کا تذکرہ موجود ہے۔

4۔ مسند احمد میں ہے کہ اس نے مزید یہ سوال کیا کہ اللہ کے رسول آپ میرے بارے میں کس چیز کے متعلق خطرہ محسوس کرتے ہیں تو آپ نے اپنی زبان کو پکڑ کر ارشاد فرمایا کہ "اس کی حفاظت کرنا۔" (مسند احمد:3/413)

اعتدال کی راہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اعتدال کی راہ اختیار کرو اور سیدھے سیدھے رہو اور یہ بات جان لو کہ تم میں سے کوئی شخص صرف اپنے عمل سے نجات نہیں پائے گا۔"

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ بھی نہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہاں! میں بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنے فضل اور رحمت میں ڈھانپ لے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ اگرچہ عمل کی اہمیت اپنی جگہ مسلم (تسلیم شدہ) ہے کیونکہ اللہ کی رحمت اور اس کا فضل حاصل کرنے کا یہی واحد طریقہ ہے تاہم تمام اعتماد صرف عمل ہی پر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ عمل کسی کوتاہی کی وجہ سے (جس کا ہمیں علم بھی نہ ہو) برباد بھی ہو سکتا ہے اس لیے عمل کے ساتھ یہ دعا بھی کی جائے کہ ہمارا عمل بارگاہ الٰہی میں قبول ہو جائے اور وہ ہمیں اپنے دامان رحمت میں ڈھانپ لے اور ہر عمل میں اخلاص نصیب ہو کہ اخلاص کے بغیر بڑے سے بڑا عمل بھی مردود ہے۔

2۔ میانہ روی اور اعتدال امور خیر میں بھی مطلوب ہے۔ بے جا تشدد اور طاقت سے بڑھ کر نیکی کرنا انسان کو تھکا دیتا ہے۔ اور یوں بھی ہوتا ہے کہ تہجد و اشراق تک ادا کرنے والا اکتا کر فرائض بھی ترک کر بیٹھتا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر استقامت اور مداومت اختیار کی جائے خواہ وہ تھوڑا ہی ہو۔

3۔ بعض لوگ میانہ روی کی آڑ میں فرائض کو بھی ترک کر دیتے ہیں اور حرام تک کے مرتکب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام میں تشدد نہیں ہے۔ لیکن اعتدال کا یہ مفہوم سراسر غلط ہے۔ اس کے معنی فرائض کو ترک کرنے اور حرام کا ارتکاب کرنے کے ہرگز نہیں ہیں۔ خواہش پرستی میں حدود اللہ کو پامال کرنا اور فرائض کو ترک کر کے کہنا کہ اسلام میں تنگ نظری نہیں ہے یقیناً "مغرب زدگی کی علامت ہے۔

غور و فکر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"(اے نبی!) کہہ دیجیے: بس میں تو تمہیں ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کے لیے دو دو اور ایک ایک کھڑے ہو جاؤ پھر غور و فکر کرو۔" (سبا۔46)

اور فرمایا:

"بے شک آسمان و زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے۔ اور وہ غور و فکر کرتے ہیں آسمان و زمین

کی پیدائش میں) کہتے ہیں: اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے فائدہ پیدا نہیں کیا' تو پاک ہے۔ چنانچہ تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔" (آل عمران۔ 190-191)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیے گئے۔ اور آسمان کی طرف کہ کیسے وہ بلند کیا گیا۔ اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے وہ بلند کیا گیا۔ اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے وہ گاڑے گئے۔ اور زمین کی طرف کہ کیسے وہ بچھائی گئی۔ چنانچہ تو نصیحت کر تو صرف نصیحت کرنے والا ہے۔" (الغاشیہ 17-21)

اور فرمایا:

"کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھیں...." (محمد۔10)

اس مفہوم کی اور بھی بہت سے آیات ہیں۔

نیکی کی طرف

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "نیکیوں کی طرف جلدی کرو!" (البقرہ۔148)

اور فرمایا:

"اور جلدی کرو اپنے رب کی مغفرت اور جنت کی طرف' جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے' جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔" (آل عمران۔133)

اس موضوع سے متعلقہ احادیث درج ذیل ہیں۔

نیک اعمال میں جلدی کرو

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"(نیک) اعمال کرنے میں جلدی کر لو' ایسے فتنوں کے آنے سے پہلے جو شب تاریک کے مختلف ٹکڑوں کی طرح (یکے بعد دیگرے) رونما ہوں گے۔ صبح کو آدمی مومن ہوگا اور شام کو کافر۔ شام کو مومن ہوگا تو صبح کو کافر۔ وہ (اس طرح کہ) اپنے دین کو دنیا کے معمولی سامان کے عوض بیچ دے گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں خبر دی گئی ہے کہ قیامت کے قریب پے در پے فتنوں کا ظہور ہوگا۔ فتنوں کی کثرت کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں دین و ایمان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی' دنیا حاصل کرنے کی دوڑ لگی ہوگی حتیٰ کہ دنیوی مفادات کے لیے اپنے دین و ایمان کا سودا کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہوگا' بلکہ صبح و شام ان کے روپ بدلیں گے۔ چنانچہ ان بہروپیوں کی آج کثرت ہے جو صبح کچھ ہوتے ہیں' شام کو کچھ۔ کسی کو دین و ایمان پر استقامت نصیب نہیں الا ماشاء اللہ۔ ایسے حالات میں اہل ایمان کو استقامت کی اور بلا تاخیر اعمال صالحہ بجالانے کی تلقین کی گئی ہے۔

2۔ نیکی کا موقع میسر آتے ہی اسے کر گزرنا چاہیے' تامل کی صورت میں شیطان طرح طرح کے خیالات پیدا کر کے اس سے دور کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

3۔ اللہ کی معصیت اور گناہ بہت برا فتنہ ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پناہ مانگی ہے کیونکہ معصیتوں کا دلدادہ انسان دار آخرت سے غافل ہو جاتا ہے' امور خیر میں لیت و لعل سے کام لیتا رہتا ہے تا آنکہ موت اسے دبوچ لیتی ہے اور اسے ندامت اور توبہ کی بھی توفیق نہیں ملتی۔

جلدی

حضرت ابو سروعہ (سین کی زیر اور زبر کے ساتھ) عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مدینے میں عصر کی نماز پڑھی۔ آپ نے سلام پھیرا اور نہایت تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے اپنی بیویوں میں سے کسی کے حجرے کی طرف تشریف لے گئے۔ لوگ آپ کی اس تیز رفتاری سے گھبرا گئے۔

(تھوڑی دیر کے بعد) آپؐ واپس تشریف لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ لوگ آپؐ کی اس تیز رفتاری پر تعجب کر رہے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مجھے یاد آیا کہ ہمارے پاس (گھر میں سونے یا چاندی کی) ڈلی کا کچھ حصہ ہے مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ یہ (ڈلی) مجھے (اللہ کی یاد سے) روک دے' اس لیے میں نے (جلدی جلدی جاکر) اس کو تقسیم کرنے کا حکم دیا۔" (بخاری)

اور بخاری ہی کی ایک اور روایت میں ہے "میں پیچھے گھر میں صدقے کی ایک ڈلی چھوڑ آیا تھا تو میں نے اسے رات کو اپنے گھر رکھنا پسند نہیں کیا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ انسان کو اپنے پاس ایسی چیز نہیں رکھنی چاہیے جس کی وجہ سے اس کی توجہ اللہ سے ہٹ کر اس کی طرف ہو جائے۔

2۔ عام حالات میں لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آنا جانا اگرچہ ناپسندیدہ ہے لیکن خاص حالات میں' جب کہ کوئی ضرورت اس کی داعی ہو' ایسا کرنا جائز ہے۔

3۔ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیا سے بے رغبتی اور جلد از جلد نیکی کرنے کے جذبے کا بھی اندازہ ہوتا ہے' نیز یہ معلوم ہوا کہ زکوٰۃ اور صدقات کی رقم فوراً" مستحقین تک پہنچانا ضروری ہے۔

4۔ کسی ضروری کام کے لیے فرض نماز کے بعد کے اذکار کو موخر کیا جا سکتا ہے۔

5۔ امام یا خطیب کے خلاف معمول کام سے لوگ متعجب ہوں تو اس کا سبب بیان کر دینا چاہیے تاکہ شبہات پیدا نہ ہوں۔

6۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ فرض نماز کے سلام کے فوراً" بعد سنتیں وغیرہ نہیں پڑھتے تھے بلکہ اپنی جگہ پر تشریف رکھتے ہوئے اذکار کرتے تھے۔

بڑا صدقہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور سوال کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کون سا صدقہ اجر کے اعتبار سے بڑا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تیرا اس وقت صدقہ کرنا جب کہ تو صحیح (تندرست و توانا) ہو' مال کی حرص دل میں ہو' (خرچ کرنے سے) تجھے فقر کا اندیشہ اور (اپنے پاس جمع رکھنے سے) تونگری کی امید ہو۔ اور تو صدقہ کرنے میں تاخیر نہ کر' یہاں تک کہ جب روح گلے تک پہنچ جائے تو تو کہے: فلاں کے لیے اتنا' فلاں کے لیے اتنا' جب کہ وہ فلاں (وارث) کا ہو چکا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ صحیح صدقہ وہی ہے جو انسان صحت کی حالت میں کرے۔ موت کے آثار شروع ہونے کے بعد کے صدقے کی اللہ کے ہاں خاص اہمیت نہیں' علاوہ ازیں اس وقت انسان ایک تہائی مال سے زیادہ صدقہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ اس وقت مال وارثوں کا حق بن جاتا ہے' جسے اللہ کی راہ میں بھی خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اللہ نے حد مقرر فرما دی ہے کہ مرض الموت میں کوئی اپنا مال وقف یا صدقہ کرنا چاہے تو وہ ایک تہائی (3/1) مال سے زیادہ نہیں کر سکتا۔

2۔ اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ انسان کو نیکی کے کاموں بالخصوص صدقہ و خیرات میں تاخیر نہیں بلکہ عجلت سے کام لینا چاہیے۔

3۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذکورہ بالا صورت کے علاوہ کوئی صورت باعث فضیلت نہیں۔ فقر' حرص اور صحت کی قید لگانے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے حالات میں عموماً" صدقہ کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے اور صرف نیکی کا جذبہ رکھنے والے ہی صدقہ کر سکتے ہیں ورنہ خوشحال کا صدقہ جسے فقر کا ڈر نہ ہو' بھی بسا اوقات بہت بڑے

اجر کا باعث ہوتا ہے۔ بسا اوقات سائل کی محتاجی کی نوعیت بھی صدقے کی فضیلت کو بڑھا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایمان والوں کی ایک خوبی یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ تنگی اور آسائش ہر دو صورتوں میں خرچ کرتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ احد والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تلوار پکڑی اور فرمایا:

"یہ تلوار مجھ سے کون لے گا؟" صحابہ نے اپنے ہاتھ دراز کیے' ان میں سے ہر ایک کی زبان پر تھا۔ "میں' میں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کون ہے جو اسے اس کے حق کے ساتھ لے گا؟"

(یہ سن کر) سب لوگ پیچھے ہٹ گئے اور توقف کیا۔

ابو دجانہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور کہا: "میں اسے اس کے حق کے ساتھ لوں گا۔" چنانچہ انہوں نے تلوار آپ سے لی اور اس سے مشرکوں کی کھوپڑیاں پھاڑیں۔ (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کی بہادری اور فضیلت کا بیان ہے' تاہم اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس وقت بزدلی دکھائی بلکہ ان کا توقف اس اندیشے کی وجہ سے تھا کہ کہیں اس کے حق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو جائے ورنہ اس سے قبل جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مشروط طور پر تلوار لینے کا اعلان فرمایا تو ہر صحابی اسے لینے کے لیے لپکا۔ ظاہر بات ہے تلوار لینے کا مقصد اس سے جہاد کرنا ہی تھا نہ کہ کچھ اور۔ اس جذبے میں کوئی صحابی بھی پیچھے نہیں رہا۔

2۔ مسابقت الی الخیرات اچھا جذبہ ہے' تاہم انسان کو وہی ذمہ داری اٹھانی چاہیے جسے نبھانے کا وہ اہل ہو۔

مسلمان کی تکلیف پر خوشی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مومن تو بھائی بھائی ہیں۔" (الحجرات۔10)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "بے شک وہ لوگ جو اہل ایمان کے اندر بے حیائی کے پھیلانے کو پسند کرتے ہیں' ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔" (النور۔9)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اپنے (مسلمان) بھائی کی تکلیف پر خوشی کا اظہار نہ کرو (کہیں ایسا نہ ہو) کہ اللہ تعالیٰ اس پر تو رحم فرما دے اور تمہیں آزمائش میں ڈال دے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

طعن کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر قصور کے تکلیف دیتے ہیں' یقیناً انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔58)

متنفر کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص کسی کی بیوی یا اس کے غلام کو دھوکا دے تو وہ ہم میں سے نہیں۔" (ابوداؤد)

فائدہ: کسی کی بیوی یا غلام کو ورغلا کر خاوند اور مالک کے خلاف کر دینا اور ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے سے متنفر کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ مومن کی شان تو اصلاح بین الناس ہے نہ کہ فساد بین الناس (لوگوں کے درمیان فساد ڈالنا)

دوستوں کے نام بے تکلف خط جن کے بارے میں انسان کو یقین ہوتا ہے کہ یہ کبھی شائع ہوں گے۔ ان خطوط میں لکھنے والے کی شخصیت پوری سچائی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔
انشاء جی کے خط ان کے کالموں کی طرح سدا بہار ہیں۔ ان کی ذات میں دوستوں کے لیے جو محبت' خلوص اور فکر مندی تھی' وہ ان خطوط میں نظر آتی ہے۔ برجستگی' بے ساختگی اور ظرافت تو ان کے قلم کا خاصا تھی۔ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ اردو ادب میں غالب کے بعد انشاء جی واحد قلم کار ہیں جو اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مزاح نگار بھی ہیں۔
ریاض احمد ریاض نے انشاء جی کے خطوط کا مجموعہ ترتیب دیا ہے۔ اس مجموعے کے کچھ خط آپ کے ذوق کی نذر کر رہے ہیں۔

خطوط انشاجی کے

انشاجی

4 فروری 1949ء لاہور

مائی ڈیر اے حمید!

تم مری کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر ایسے چڑھ کے بیٹھ گئے ہو کہ ہم خاک نشینوں کی خبر ہی نہیں لیتے۔ بس بہت سیر ہو چکی۔ اب آجاؤ۔

قرار خاطر بے تاب تھک گیا ہوں میں!

ہاں ٹھیک ہے' تمہارا خط ملا لیکن خط سے کیا ہوتا ہے' تمہیں اب تک بنفس نفیس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مثلاً" آج میری نظم ہے بغداد والی' جسے پڑھنے کا تم نے وعدہ کیا تھا اور کل انجمن ترقی پسند مصنفین یوم چین منا رہی ہے۔

کیا یہ دن بہار کے تمہارے بغیر ہی گزریں گے۔

اور پھر افسانہ 'اب تو سویرا' سچ مچ آخری مراحل میں ہے یعنی لکھائی چھپائی کے افسانے کے لیے طوالت کے لحاظ سے جگہ بھی تو موزوں...... (لیکن محبوب صاحب کہتے ہیں تمہارا خط آگیا ہے اور تم نے افسانہ بھی پوسٹ کر دیا ہے اور تم بنفس نفیس آرہے ہو پس بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی اس سارے لکھے پر خاک ڈالوں اور کہوں...... اور ایک قصہ سنو!

لیکن قصہ سنانے سے پہلے مجھے یہ خط ضرور پوسٹ کرنے دو۔

ابن انشاء

16 مارچ 1949ء لاہور

پیارے حمید

تم کہو گے۔ پھر دیر کر دی۔ ہاں بھئی پھر دیر ہو گئی۔ موقع اور موڈ کی تلاش کرتے دیر ہو گئی اور بغیر موڈ کے خط لکھ رہا ہوں۔ لیکن لکھ تو رہا ہوں۔ اتنا تھوڑا ہے۔

لاہور کوئی مری تو نہیں ہے کہ ہفتہ بھر سے آسمان ابر آلود ہو۔ مینہ لگاتار برس رہا ہو اور سردی کافی تکلیف دہ ہو۔ یہاں تو عجیب و غریب قسم کا موسم ہے' موسم کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ تم جو یہاں نہیں ہو۔ دن اور رات اداس سے گزرتے ہیں۔ آج کل لارنس میں اور مال پر گھومنے کا مزا ہے۔ کل رات دس بجے حمید اختر' جلیس اور صفدر آگئے۔ ان کے ساتھ باہر جا کر نان کباب کھائے۔ کافی پی اور اس کے بعد گھومتے رہے۔ بارہ بجے تک گپیں ہانکتے رہے اور ہنستے اور کھیلتے کودتے رہے۔ پھر صفدر کو معاً" کوئی کام یاد آگیا اور چلا گیا۔ میں نے حمید اختر اور جلیس کو تھوڑی دیر روکا۔ لیکن پھر وہ بھی چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا اور دل اداس ہو گیا۔

پھر تم پتھر پر بیٹھ کر ناول پڑھنے لگے۔ دھوپ جسم کو پرسکون گرمی بخش رہی تھی۔ نیچے پھیلی ہوئی وادیوں میں سفید ابر پارے تیر رہے تھے اور چیڑ کے گنجان جنگلوں کی طرف سے آنے والی ہوا میں خنکی تازگی اور

ہلکی خوشبو تھی۔ لیکن وہ تازگی اور خوشبو یہاں تک نہیں پہنچتی۔ تم اس خوشبو اور تازگی کے مزے لوٹ رہے ہو۔ خیر اچھا ہے۔ لیکن تم آؤ تو یہ تازگی اور یہ خوشبو جو بہار اور امید کی نشانیاں ہیں' اپنے ساتھ لے کر آنا۔

20 تاریخ کو کراچی میں یوم غالب ہے اور یہ لوگ وہاں جا رہے ہیں۔ کون لوگ' صفدر' قاسمی' جلیس۔ قتیل اور ظہیر وغیرہ۔ اس ہفتے ہمارے اجلاس کی صدارت مولانا چراغ حسن حسرت کر رہے ہیں۔ ایوب کرمانی ایک طنزیہ مضمون پڑھیں گے۔ میں ایک نظم پڑھوں گا۔ شنگھائی والی نظم ابھی پوری نہیں ہوئی۔ میں جو نظم پڑھ رہا ہوں وہ آج سے کوئی چار سال پہلے لکھی گئی تھی۔ لیکن آج کے حالات میں اس کا اطلاق زیادہ اچھی طرح ہوتا ہے۔ پین اب چلنے لگا ہے۔ یہ پین بھی میں نے خاص طور پر یہ خط لکھنے کے لیے کسی سے مستعار لیا ہے۔ پرسوں سے مستعار لے رکھا ہے۔

دو تین دن ہوئے۔ مغربی پنجاب کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا انتخاب ہوا ہے۔ احمد ندیم قاسمی جنرل سیکریٹری چنے گئے ہیں۔ عبداللہ ملک آرگنائزنگ سیکریٹری اور عارف خزانچی۔ بہت اچھا انتخاب ہوا ہے۔ بھٹی اور عبدالسلام خورشید وغیرہ نکل گئے ہیں اور ان کی جگہ ظہیر وغیرہ کو لیا گیا ہے۔ چند دن تک لاہور کی انجمن کا بھی انتخاب ہونے والا ہے۔ تاریخ کا ابھی تعین نہیں ہوا۔ ملک وغیرہ کا خیال ہے کہ سیکریٹری صفدر کو اور تمہیں بنا دیا جائے۔ اس میں میری کنویسنگ کو کوئی دخل نہیں۔ صاف بات ہے۔ اب یہ ہے کہ تم آؤ تو پتا چلے کہ تم کہاں رہو گے اور ذمہ داری کے کام کرو گے کہ نہیں۔ میرے لیے سب سے بڑی بدخبری یہ ہے کہ ہمارا دفتر شاید جون تک کراچی منتقل ہو جائے۔ میری کوشش اب بھی یہی ہے کہ یہاں میرے لیے کوئی روزگار کی سبیل نکل آئے تو نوکری چھوڑ کر یہیں رہ جاؤں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے

روزگار کی کوئی سبیل یہاں نکلے گی نہیں اور مجھے "طوعاً و کرہاً" جانا پڑے گا۔ اور سب دوستوں سے ایک مستقل جدائی ہو جائے گی۔

ہاں جان من۔ میں مارچ کی 26 تاریخ کے لیے چشم براہ ہوں۔ آج 16 ہے۔ اور تمہارے آنے میں سات آٹھ دن کا وقفہ ہے بشرطیکہ تم اپنے پروگرام اور وعدے کے پابند رہو۔ میرے دوست ضرور آجاؤ۔ شالا مار باغ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اسی روز دیکھیں گے۔ تم تو پہلے بھی دیکھ چکے ہو۔

اب کے پھر شورش نے چٹان میں جھک ماری ہے۔ لیکن چھوڑو جی۔ کون پروا کرتا ہے۔ میرا شنگھائی والا مضمون اس ہفتے کے نظام میں آ رہا ہے اور نظام نے ترقی پسند روش پر چلنا منظور کر لیا ہے۔ اس میں ہفتے کے ہفتے ہماری رپورٹ بھی چھپا کرے گی اور باقی بھی کئی تبدیلیاں ہوں گی (ان میں انتظار کی تبدیلی شامل نہیں ہے)

ماہر نے تمہاری جو تصویر کھینچی تھی۔ وہ میں بھیج رہا ہوں۔ بس معمولی قسم کی تصویر ہے۔ حفیظ نے جو تصویریں کھینچی ہیں' وہ بہت اچھی ہیں۔

اچھا تو پیارے دوست۔ اب رخصت! میرا یہ خط بے رنگ و بو ہے لیکن رنگ و بو کہاں سے لاؤں۔ تمہارا انتظار ہے۔ شاید تمہارے ساتھ رنگ و بو بھی آجائے۔

ابن انشاء

30 مئی 1952ء کراچی

پیارے حمید

تم بہت دنوں سے میری آنکھوں کے سامنے ہو۔ میرے دل میں بس رہے ہو۔ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں' اس کی کئی وجھیں ہیں۔ ایک تو یہ امروز میں ہفتے کے ہفتے "کتابوں کی دنیا" کا کالم لکھتا ہوں اور اب تک تمہارے ناول' جمیل اور کنول' کے علاوہ تمہارے ان افسانوں پر جو نقوش اور ادب لطیف میں چھپے ہیں تبصرے کر چکا ہوں۔ امید ہے اس ہفتے تمہارے "ڈربے" پر تبصرہ کروں گا۔ تمہارا نیا ناول بڑا اچھا ہے لیکن کئی پہلوؤں سے "ڈربے" مجھے زیادہ پسند ہے اور ان ہی پہلوؤں سے سماوار بھی۔ جزئیات نگاری اور ظرافت کے تم بادشاہ ہو۔ میلوڈراما بھی اچھا لکھتے ہو۔

لیکن میرے ایسے آدمی کو جس کی زندگی میں محبت کو کبھی دخل نہیں رہا۔ سہیلی کے نام قسم کی چیزیں کیسے پسند آسکتی ہیں؟ ہاں وہ تمہارا قبرستان سے خط جو ادب میں چھپا تھا' یہاں بہت پسند کیا ہے' اور تم سے کیا پردہ میں نے اس کا پروپیگنڈا بھی کافی کیا ہے۔ پھر عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت تمہارا یہ احمقانہ اور بیرنگ خط ملا ہے اس وقت میں گورکی کی آپ بیتی کا دوسرا حصہ پڑھ رہا تھا اور وہ جہاں چرکا اور سنکا کا نام آتا ہے (تم نے غلط ملط کر دیا ہے۔ چرکا میرا نام ہے سنکا تمہارا' نوٹ کرلو) اور جہاں کالی بلی کبوتر کھا گئی رے والا گیت ہے اور اس سے پہلے میں نے تمہارا یور تاژ وادیاں' ابھی ختم ہی کیا تھا۔ مجھے وہ بہت پسند آیا لیکن اپنی محرومی' قید اور دوری پر آہ بھر کر اور کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ تم الو کے پٹھے ہو۔ لیکن تم سے میرا مزاج (اور قارورہ) کچھ ایسا ملا ہوا ہے کہ تمہیں دیکھ کر دل کا کنول فوراً کھل جاتا ہے۔ اگر تم لڑکی ہوتے اور میرے خطے میں رہتے تو میں تمہارے ساتھ شادی کرنے کے لیے ہزاروں جتن کرتا اور تم شادی نہ کرتے (یا نہ کرتیں) تو خودکشی کرلیتا..... اور یہ شادی میں (اگر کرتا) تو یہ جانتے ہوئے کرتا کہ تم مجھ سے نکاح کے باوجود محلے کے بانکے چھبیلے نوجوانوں سے..... لیکن اب بات بڑھانے سے حاصل۔ تم چرکاتی زبان میں کہو گے۔ بچو' یہ تو تیری گپ ہے۔ یہ تو بے پر کی اڑا رہا ہے..... لیکن اتنا کہوں کہ تم پر برقع بجتا بہت خوب اور میکلوڈ روڈ پر تم گزرتے (یا گزرتیں) تو احمد راہی کھنکارتا ضرور اور وہ شخص بھی جو حجلہ نور میں مستور ہے طوبیٰ سے بلند (ظہیر) تانگے میں تمہارا پیچھا ضرور کرتا اور شام کو تم پکانے کے لیے گوبھی چیرتے "سونے کے بندوں کے لیے تقاضے کرتے' پکی روٹی اور جنگ نامہ کلاں پڑھتے اور اپنی تین سالہ بچی کنیز فاطمہ اور چھ ماہ کے لڑکے نذیر (چوہدری نذیر احمد کی طرف اشارہ نہیں) کو لے کر فلم دیدار کا مستورات کا ساڑھے تین بجے والا شو دیکھنے جاتے۔

اس سے تم پر واضح ہو جائے گا کہ جس قسم کے بعض میلوڈراما کا خط اور مضمون تم لکھتے ہو ویسے میں بھی لکھ سکتا ہوں۔

جمیل اور کنول کا ریویو امروز میں چھپا تو یہ غضب ہوا کہ کاتب نے سب جگہ 'جمیل اور کنول' لکھ دیا اور مجھے غصے میں آکر امروز میں ایک خط لکھنا پڑا۔ اس کاتب نے مندر کو معذور بھی لکھا تھا' جس پر میں نے بہت غدر مچایا اور امروز کے کاتب مجھ سے ناراض ہوگئے۔ کل میں نے تمہارا یوتاژ وادیاں پڑھنے کے بعد مولوی عبدالغنی نیازی ایم۔ اے (اردو) ایم اے (فارسی) سابق پروفیسر ناگپور کالج اور سابق پرنسپل اردو کالج کو پڑھنے کو دیا۔ وہ میرے کولیگ ہیں۔ میرے داہنے ہاتھ بیٹھتے ہیں اور میں نے تمہارا بیرنگ خط ان ہی سے تین آنے قرض لے کر چھڑایا تھا۔ وادیاں پڑھ

گروہ ناک بھوں چڑھا کر بولے (ان کی عمر 53 سال ہے اور داڑھی شرعی ہے) اس میں مستقل ویلیو کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کوئی تعمیری بات نہیں کیا فائدہ ایسی باتیں لکھنے سے۔ خود وہ نعتیں اور ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار کے مرثیے لکھتے ہیں' اقبال کے کلام میں تصوف کے موضوع پر ایک مقالہ تصنیف فرما رہے ہیں۔ کراچی آؤ تو ملاقات کراؤں۔

تم ادب کے میدان میں چوکڑیاں بھرتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے ہو اور میں اتنا پیچھے رہ گیا ہوں کہ اس سال کچھ نہ لکھا تو فخریہ لوگوں سے کہا کروں گا۔" یہ شخص اے حمید بھی جو مشہور افسانہ نگار ہے میرا بہت اچھا دوست ہے۔ بس میرے سامنے اس نے لکھنا شروع کیا بلکہ شروع شروع میں تو مجھ سے اصلاح بھی لیتا رہا ہے۔ اچھا لڑکا ہے اور ترقی کرے گا۔ اس کا اکثر وقت میرے مکان پر گزرتا تھا۔ فلاں افسانے کا پلاٹ میں نے اسے بتایا تھا اور اس میں جس باغ کا تذکرہ ہے یہ وہ باغ ہے جو ہمارے گھر کے پیچھے ہے۔ وغیرہ" مجھے انتظار حسین بھی پسند ہے جو سر پر تو ا باندھ کر ٹھیک دوپہری میں افسانے لکھتا ہے اور املی کے پتے پر ڈسٹر پیل کر شفیا اور رفیا قسم کے غیر فانی کردار تخلیق کرتا رہتا ہے۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہو گا کہ ایک نقاد جلال الدین احمد نے پاکستان کوارٹرلی (انگریزی) میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں میرا نام تمہارے اور ابن سعید کے ساتھ لیا۔ اشفاق احمد کی تصویر بھی چھاپی ہے۔ شوکت صدیقی' انور اور جلیس کا بالکل ذکر نہیں کیا حیرت ہے۔

میرا حال تم نے دیکھ ہی لیا۔ میرا بارود قریب قریب ختم ہو گیا۔ اب کے ایک بہت گھٹیا قسم کی نظم مکمل تھی۔ وہ مرزا صاحب نے ادب لطیف میں سب سے پہلے چھاپ کر میری رسوائی کا سامان مہیا کر دیا۔ جو نظمیں اچھی ہیں۔ یعنی میری پسند کی ہیں ان میں سے کوئی پوری نہیں ہوئی۔ مزاحیہ اور طنزیہ مضمون لکھنے میں' میں پھسڈی رہ گیا۔ میری کتاب خمار گندم یہاں سے چھپنے والی تھی لیکن میرے پاس مضمون ہی پورے

نہیں۔ سوچتا ہوں تم لوگوں سے اور لاہور سے دوری تو اس کی وجہ نہیں ہے....؟ اگر میں نے آئندہ چھ مہینے میں کئی مضمون اور نظمیں لکھ دیں تو فبہا ورنہ میری فاتحہ پڑھ لینا۔

اچھا تم تو مصری شاہ میں رہتے ہو۔

تمہیں سب سے بڑا ADVANTAGE یہ ہے کہ تم نے دنیا دیکھی ہے۔ میں گورکی کی کتاب پڑھتے وقت تمہارا اور تمہاری کتاب پڑھتے وقت گورکی کا تصور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج کل کیسی گزرتی ہے۔ اب میں بہت اداس ہوں۔ تم مجھ سے دور ہو' میں تنہا ہوں مجھے آہنی میخوں سے دفتر کی میز کے ساتھ ٹھونک دیا گیا ہے۔ میری گھریلو ذمہ داریوں اور پریشانیوں نے میرا امن و سکون چھین لیا ہے۔ میری 26 سال ہو چکی ہے۔ دس سال کے اندر اندر میں پوری طرح بوڑھا ہو جاؤں گا۔ میرے بال ابھی سے سفید ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

مجھے گورکی کی نانی پر حیرت ہوتی ہے جو ایسے ماحول میں رہتے ہوئے بھی جب کہ نانا صاحب نے انہیں الگ کر دیا تھا' کہتی ہے۔ "میرے اللہ یہ دنیا کتنی حسین ہے۔ میرا بس چلے تو میں قیامت تک یہیں رہوں اور جو آٹھ دس آنے کما لیتی ہے تو اسے خیرات کے طور پر غریبوں کی کھڑکیوں کے چھجوں پر رکھ آتی ہے۔ خفیہ خیرات کے طور پر....."

حمید اختر جیل سے رہا ہو گیا۔ آخر اسے جیل میں کیا تکلیف تھی؟ ایک صاحب لاہور سے آئے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے سر کے بال جھڑ گئے ہیں۔ یہ سب نظر بندی کا کھیل ہے۔ مجھے عبدالمتین عارف کا خیال آتا ہے۔ مجھے وہ شخص بہت پسند ہے۔ بہت مخلص دوست ہے لیکن معلوم نہیں اس کا نام سن کر مجھے بے اختیار ہنسی کیوں آ جاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی شکل کے ساتھ کمیونزم کا جوڑ کچھ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ اب تو سنا ہے' وہ کہیں پڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد کسی اسلامیہ ہائی اسکول میں ٹیچر ہو جائے گا اور لڑکوں کو چوبڑ کی سڑکوں کا رقبہ نکالنا سکھایا کرے گا لیکن اگر حوضوں اور نالیوں کا سوال سمجھاتے وقت اس نے "جدلیاتی مادیت" کے سوال سمجھانے شروع کر دیے تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔ ہماری آئندہ نسل بالکل ہی ان پڑھ رہ جائے گی۔

احمد راہی کو لو' مجھے تعجب ہوتا ہے اس نے کڑھائیاں مانجھنے..... قالین کی پشم رنگنے اور شام کو اکھاڑے میں دو دو ہاتھ کرنے کے بجائے یہ دس بارہ جماعتیں کیسے پڑھ لیں اور پڑھ لیں تو آٹا پیسنے کی چکی کا منشی ہونے کے بجائے شاعر اور ادیب اور ایڈیٹر کیسے ہو گیا۔ دراصل ان ہی چھوٹی چھوٹی محیر العقول باتوں ہی سے تو خدا کا وجود ثابت ہے۔ قاسمی صاحب کا نام آتے ہی غائبانہ آنکھیں جھکا لینے کو جی چاہتا ہے اور ملک کو دیکھتے ہی اسے چمٹ جانے۔ اس سے گالیاں سننے اور لاہور کے ادبی اور سیاسی حلقوں کے انتہائی اندرونی حالات دریافت کرنے کا جنون پاؤں کے تلوؤں سے گھس کر کھوپڑی کو چٹخا کر نکل جاتا ہے

اے پیارے لوگو تم دور کیوں ہو

میں نے لاہور چھوڑنے کے بعد جتنی نظمیں اور میر کے رنگ میں جتنی غزلیں لکھی ہیں' سب میں دوستوں سے جدائی اور ISOLATION (تنہائی) کا بہت شدید احساس پایا جاتا ہے۔ ایک غزل کا مقطع تھا:

انشا اب ان ہی اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

اب تو تمناؤں کا باغ مرجھا رہا ہے اور حسرتوں کا دامن پھیل رہا ہے اب زندگی "فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے" تک محدود ہو گئی ہے۔ زیادہ نہ لکھنے کی وجہ بھی یہی ہے جب میں آسانی سے اچھے سے اچھے ادیبوں کی کتابیں خرید کر نہایت اطمینان سے پڑھ سکتا ہوں تو مجھے خود کچھ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں تم کراچی آؤ تو کافی ہاؤس میں بیٹھیں۔ کلفٹن پر گھومیں۔ کیماڑی میں تیل آلود سمندر میں کشتی کی سیر کریں۔ طویل شام اس "کالے پل" پر گزاریں جس پر سنکا نے مضافات نظم لکھی تھی۔ اور ان چند دنوں میں میں اتنے قہقہے لگاؤں کہ باقی عمر کے لیے بے نیاز ہو جاؤں۔

ابن انشاء

1۔ "اصلی نام؟"
"عائشہ جہاں زیب۔"
2۔ "پیار کا نام؟"
"(momce) موسی۔"
3۔ "تاریخ پیدائش؟"
"22 جنوری۔"
4۔ "قد/ستارہ؟"
"5 فٹ 3 انچ/Aquarius۔"
5۔ "مادری زبان؟"
"اردو۔"
6۔ "بہن بھائی' آپ کا نمبر؟"
"میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں.... جب چھوٹی تھی تو والدین میں علیحدگی ہو گئی' اس لیے اکلوتی ہوں۔"
7۔ "شادی/بچے؟"

خبرناک کی میزبان

عائشہ جہاں زیب سے باتیں

شاہین رشید

"شادی ہو چکی ہے اور ماشاء اللہ سے تین بچے ہیں۔"
8۔ "تعلیمی قابلیت؟"
"ایم فل انگلش لٹریچر۔"
9۔ "شوبز میں آمد؟"
"حادثاتی طور پر آئی ہوں۔"
10۔ "آپ کے علاوہ کوئی اس فیلڈ میں؟"
"نہیں جی' کوئی نہیں ہے۔"
11۔ "گھر والوں نے اعتراض کیا؟"
"اماں' نہیں مانتی تھیں مگر پھر مان گئیں۔"
12۔ "پہلا پروگرام/کمرشل/وجہ شہرت؟"
"خبرناک/کوئی نہیں/یہی خبرناک ہے' جس نے بہت شہرت دی ہے۔"
13۔ "ٹی وی کے علاوہ مصروفیات؟"
"پہلے میں ٹیچر تھی اور گھر داری کرتی ہوں اب۔"
14۔ "بڑے ہو کر کیا بننا چاہتی تھیں؟"
"رائٹر۔"
15۔ "آپ صبح اٹھ جاتی ہیں آسانی سے؟"
"میں آرام سے اٹھ جاتی ہوں۔ بچوں کو اسکول بھیجتی ہوں اور صبح اٹھنے کی عادت اس لیے بھی ہے کہ میں نے چھ سال ٹیچنگ بھی کی ہے۔"
16۔ "اٹھتے ہی دل چاہتا ہے کہ؟"
"دوبارہ سو جاؤں۔"
17۔ "کوئی ڈراما کیا؟"
"نہیں جی.... فی الحال تو نہیں۔"
18۔ "گھر کے کاموں سے دلچسپی؟"
"اب کھانا پکانا اچھا لگتا ہے۔ پہلے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور صفائی ستھرائی کا تو کریز ہے۔"

19۔ "کیا اچھا پکا لیتی ہوں؟"
"سرسوں کا ساگ"، "حلیم" اور "بثیر"۔
20۔ "پسندیدہ تہوار؟"
"بسنت ہوا کرتا تھا کبھی.... اب کوئی تہوار جی کو نہیں بھاتا۔"
21۔ "بھوک کس طرح کم کرتی ہیں؟"
"مجھے پھل بہت پسند ہیں۔ بھوک کم کرنے کے لیے وہی کھاتی ہوں۔"
22۔ "تھکن میں بھی کہاں جانے کو دل چاہتا ہے؟"
"تھکن میں بھی لانگ ڈرائیو پہ جانے کو دل چاہتا ہے۔"
23۔ "آپ اداس ہو جاتی ہیں؟"
"جی اکثر اداس ہو جاتی ہوں۔"
24۔ "رونا آتا ہے؟"
"بہت سی باتوں پہ رونا آتا ہے۔"
25۔ "طبیعت میں ضد ہے؟"
"بچپن میں ضدی تھی.... اب اتنی نہیں ہوں۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی اڑ جاتی ہوں۔"
26۔ "بچپن کی کوئی بری عادت جو ابھی بھی موجود ہے؟"
"کینڈیز کا شوق ابھی بھی ہے۔"
27۔ "غصہ کب آتا ہے؟"
"جب کوئی میری بات نہ سمجھے.... تب غصہ آتا ہے۔"
28۔ "غصے میں رد عمل؟"
"کمرہ بند، تنہائی۔ یہی اظہار ہے۔"
29۔ "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"بجلی۔"
30۔ "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"اپنے ہی غصے سے ڈر لگتا ہے۔"
31۔ "لڑکوں میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
"کچھ نہیں.... سوائے اس کے وہ ایمان دار ہوں۔"
32۔ "فضول خرچ ہیں؟"
"کافی حد تک بچت کی عادت ہے۔ مگر ہاتھ کافی کھلا ہے، شاپنگ پہ جاتی ہوں تو خرچ ہو ہی جاتا ہے۔"
33۔ "کن چیزوں پہ زیادہ خرچ کرتی ہیں پیسہ؟"
"کراکری پہ اور بچوں پہ زیادہ خرچ کرتی ہوں۔"
34۔ "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"
"کوشش کرتی ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں کبھی بھی.... مگر کسی کو بری سچویشن سے بچانے کے لیے بولتی ہوں۔"
35۔ "آپ پریشان ہو جاتی ہیں یہ سوچ کر کے؟"
"کہ آنے والی جنریشن کا کیا بنے گا۔"
36۔ "آپ کی کوئی ایکسٹرا خوبی؟"
"خوبی اس خدا کی جس نے ہمیں بنایا۔"
37۔ "ایک خواب، جو بار بار دیکھتی ہیں؟"
"کوئی نہیں۔"
38۔ "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"بالکل.... میرے لیے اندھی ہوتی ہے مگر دنیا میں لوگ دیکھ کر محبت کرتے ہیں۔"
39۔ "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"
"کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو اسے برے وقت میں پکارو۔"
40۔ "آپ کا بیگ کھولیں تو کیا کیا ملے گا؟"
"میرے بیگ میں ایک پینسل، کچھ کاغذ، لپ اسٹک، چیونگم اور بکھرے ہوئے پیسے ملیں گے۔"
41۔ "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"جوتا چھپائی۔"
42۔ "بدلہ لیتی ہوں؟"
"نہیں.... میں بدلہ پر یقین نہیں رکھتی میں اپنا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں۔"
43۔ "گھر آ کر پہلی خواہش؟"
"مجھے اپنے کمرے میں تنہائی چاہیے ہوتی ہے۔"
44۔ "اپنے ڈراموں میں پسندیدہ کردار؟"
"ایک بہت ہی چیلنجنگ قسط کی تھی کسی ڈرامے میں، وہ بہت پسند ہے۔"
45۔ "شادی میں کیش دیتی ہیں یا گفٹ؟"
"کیش۔"
46۔ "کھانے کی ٹیبل پہ کیا ہونا ضروری ہے؟"
"کیچپ۔"

47۔ "کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ 'چٹائی 'اپنا بیڈ یا ڈائننگ ٹیبل؟"

"بیڈ وہ بھی صرف اپنا۔"

48۔ "لوگ مل کر کیا فرمائش کرتے ہیں؟"

"سیلفی پلیز۔"

49۔ "ایک کردار جو کرنا چاہتی ہیں؟"

"کوئی ایسا کردار جو میری زندگی کے قریب ترین ہو۔"

50۔ "کیا کیا چیزیں لے کر گھر سے نکلتی ہیں؟"

"پانی کی بوتل 'فروٹ اور پیسے لازمی لے کر نکلتی ہوں گھر سے۔"

51۔ "گھر میں کوئی ناراض ہو جائے تو؟"

"کوشش کر کے منا لیتی ہوں۔"

52۔ "بستر پر جاتے ہی نیند آجاتی ہے یا وقت لگتا ہے؟"

"بستر پر جاتے ہی نیند آجاتی ہے۔"

53۔ "آپ کی فیوچر پلاننگ؟"

"کہ میری کتاب شائع ہو جائے۔ باقی اللہ مالک ہے۔"

54۔ "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"

"آدھا دن سو کر اور آدھا دن شاپنگ کر کے۔"

55۔ "گھر کا کون سا کمرہ پسند ہے؟"

"سن روم۔"

56۔ "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتی ہیں؟"

"سب کے۔"

57۔ "موبائل نمبر جلدی جلدی بدلتی ہیں؟"

"نہیں بدلتی.... میرا ایک ہی نمبر ہے کئی سالوں سے۔"

58۔ "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"

"کوشش کرتی ہوں کہ پابندی کر سکوں۔"

59۔ "لڑکوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"

"ان کا جھوٹ بولنا۔"

60۔ "اپنی کمائی سے کیا قیمتی چیز اپنے لیے خریدی؟"

"بہت کچھ.... فہرست لمبی ہے۔"

61۔ "بچت کس صورت میں کرتی ہیں۔ کیش یا گولڈ؟"

"کیش کی شکل میں اگر بچ جائیں تو۔"

62۔ "دعوت میں ملکی کھانے پسند ہیں یا غیر ملکی؟"

"دونوں۔"

63۔ "انٹرنیٹ اور فیس بک سے لگاؤ؟"

"ہے 'مگر اندھے پن یا نشے کی حد تک نہیں ہے۔"

64۔ "وہ نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"جو مجھے زبردستی گھسیٹ کر نصیحت کرے اور وہ مجھ سے ریلیونٹ بھی نہ ہو تو مجھے برا لگتا ہے۔"

65۔ "گھر میں کون سا لباس پسند ہے؟"

"جینز۔"

66۔ "آپ کی اچھی اور بری عادت؟"

"بھروسا کرنا اور بری طرح بھروسا کرنا۔"

67۔ "اچھی یا بری نیوز سب سے پہلے کس کو سناتی ہیں؟"

"دوست کو اور اپنے میاں صاحب کو (شوہر کو)۔"

68۔ "اپنے آپ میں کیا چینج لانا چاہتی ہیں؟"

"مجھے اور زیادہ فوکس کرنا ہے اپنے کام پر۔"

69۔ "آپ کی چھٹی حس — کیسی ہے؟"

"بہت اسٹرانگ ہے۔"

70۔ "زندگی کا ایک ہی دن باقی ہو تو کیا دعا مانگیں؟"

"معافی اور مغفرت کی۔"

71۔ "کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"

"مجھے تو اپنا ملک بہت پسند ہے 'لیکن اگر سیاست دان کوئی اور ہوتے تو اچھا تھا۔"

72۔ "کوئی گہری نیند سے جگا دے تو؟"

"غصہ آتا ہے بہت۔"

73۔ "گھر آتے ہی بیڈ پر ہوتی ہیں کیا؟"

"نہیں واش روم میں اپنے پاؤں واش کر کے بیڈ پر جاتی ہوں۔"

74۔ "لڑکی حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"

"لڑکی کا خوب صورت اور ذہین ہونا ضروری ہے۔"

75۔ "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا رکھتی ہیں؟"

"ویسلین اور پانی۔"

76۔ "دل کی سنتی ہیں یا دماغ کی؟"

"دل کی سنتی ہوں۔"

77۔ "بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی آپ کے پاس ہے؟"

"میرے بچپن کے سارے کھلونے میرے پاس ہیں۔ کیونکہ میں اپنے کھلونے توڑتی نہیں تھی۔"

78۔ "ادھار دینے اور لینے والوں کے لیے آپ کے تاثرات؟"

"ہر انسان کی مجبوریاں ہوتی ہیں مگر کوشش کرتی ہوں ایسا نہ کیا جائے۔"

79۔ "اپنی شخصیت میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟"

"کچھ نہیں.... اللہ نے جیسا بنایا ہے۔ بہت اچھا بنایا ہے۔"

80۔ "کوئی سین جو مشکل ہوا ہو؟"

"ہاں.... کچھ لائنیں مشکل میں ڈال دیتی ہیں۔ پر پھر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

81۔ "رومانٹک سین کے لیے بہترین اداکار؟"

"کوئی نہیں۔"

82۔ "اپنے تجربے سے سیکھتی ہیں یا دوسروں کے؟"

"اپنے تجربے سے سیکھتی ہوں۔"

83۔ "شاپنگ کے لیے بہترین جگہ؟"

"کوئی مخصوص جگہ نہیں ہے۔"

84۔ "فلم + ماڈلنگ + ڈراما کیا کرنا ہے؟"

"سب کی آفرز ہیں مگر ابھی کچھ نہیں کرنا۔"

85۔ "آپ اکثر سوچتی ہیں؟"

"ایک island (جزیرہ) ہو اور میں ہوں۔"

86۔ "بات دل میں رکھتی ہیں یا کہہ دیتی ہیں؟"

"کہہ دیتی ہوں ورنہ تکلیف ہوتی ہے۔"

87۔ "آئینہ دیکھ کر سوچتی ہیں؟"

"کبھی دیکھا کرتے تھے آئینہ اب تو بس تیاری کے لیے ہی ہوتا ہے۔"

88۔ "شوبز میں جگہ بنانے کے لیے کیا ضروری ہے؟"

"انسان محتاط ہی رہے۔"

89۔ "شاپنگ کے لیے کتنی رقم لے کر نکلتی ہیں؟"

"کبھی پلان کر کے نہیں چلتی۔"

90۔ "بلینک چیک میں کم سے کم کتنا اماؤنٹ لکھیں گی؟"

"منحصر ہے کہ چیک کس کا ہے۔"

91۔ "اگر آپ سے سیل فون کی سہولت لے لی جائے تو؟"

"مشکل اور تکلیف تو ہوگی۔ مگر زیادہ دیر نہیں۔"

92۔ "کبھی فخر محسوس کیا؟"

خود تو خیر نہیں.... ہاں اگر کوئی دوسرا میری خوبیاں بیان کر رہا ہو یا میری تعریف کر رہا ہو تو ضرور "اٹھلاتی" ہوں۔"

93۔ "پاور میں آجائیں تو؟"

"طاقت اس ذات کی جس نے سب کچھ بنایا ہے۔"

94۔ "اگر کسی ایئر لائن کا اوپن ٹکٹ ملے تو کہاں جائیں گی؟"

"ورلڈ ٹور پہ۔"

95۔ "تعلیمی دور کا سب سے اچھا پریڈ؟"

"جب میں "ایم فل" کر رہی تھی۔"

96۔ "کسی ڈرامے کے لیے گنجا ہونا پڑے تو؟"

"منحصر ہے اس بات پہ کہ کردار کیسا ہے۔"

97۔ "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"

"اماں کے ہاتھ کا بہت پسند تھا۔"

98۔ "غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟"

"مشکل سے۔"

99۔ "کس دن کا انتظار رہتا ہے؟"

"دوستوں سے ملنے کا۔"

100۔ "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"آنا تو ہے، کوئی بات نہیں، رب نے میرے لیے کوئی اور راستہ رکھا ہوگا۔"

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

نعیمہ ناز

1۔ لکھنے کی صلاحیت اور شوق شاید وراثت میں ہی ملا ہو‘ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کیوں کہ میرے ابا‘ اماں گو کہ لکھاری نہیں تھے‘ مگر غضب کے داستان گو تھے۔ ابا انڈیا میں بیتا اپنا بچپن‘ لڑکپن بیان کرتے تو لوگوں اور گاؤں سمیت سب کا ایک نقشہ سا کھینچ دیتے تھے۔ الفاظ کا چناؤ‘ ایک ایک تفصیل اور انداز بیاں‘ ایسا لگتا تھا کہ کہانی سن رہے ہیں۔ یہی انداز اماں کا تھا۔ وہ بھی کہانی کے انداز میں گزرا وقت اور حالات بیان کرتیں پھر اس پر محاوروں اور ضرب الامثال کا تڑکا‘ دونوں ہی لگاتے تھے۔ ہو سکتا ہے وسائل اور مواقع ملتے تو یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک‘ بہت بڑا نہ سہی چھوٹا موٹا لکھاری ہوتا‘ تو مجھے یہ لگتا ہے کہ مجھ میں یہ صلاحیت ان ہی سے آئی ہے۔

اور رہی بات دوسرے‘ بہن بھائیوں کی تو میری بڑی بہن جب اسکول میں پڑھتی تھیں تو ان کی ایک نظم اخبار جہاں میں شائع ہوئی تھی‘ اس کے بعد ان کی تخلیقی صلاحیت کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور چھوٹی بہن کو لکھنے کا شوق ہے‘ مگر بقول ایڈیٹر ابھی ناپختگی ہے۔ بھائیوں کو لکھنے کا شوق نہیں صرف پڑھنے کا شوق ہے‘ وہ بھی اخبارات۔

2۔ میرے گھر والوں میں میری بڑی بہن اور چھوٹی بہن میری کہانیاں پڑھتی ہیں۔ بھائی لوگ دلچسپی اور خوشی کا اظہار تو کرتے ہیں کہانی چھپنے پر‘ مگر پڑھتے وہ صرف اخبارات ہی ہیں۔ دونوں بھابھیاں ڈائجسٹ نہیں پڑھتیں‘ مگر اپنے ملنے جلنے والوں کو بتاتی ہیں کہ ہماری نند رائٹر ہے۔ سسرال میں میری نند کی بیٹی ڈائجسٹ پڑھتی ہے‘ مگر کبھی میری کہانی پر تبصرہ نہیں کیا‘ باقی کسی کا رجحان اس طرف نہیں‘ رشتے داروں میں یا خاندان میں ڈائجسٹ پڑھنے کا زیادہ رجحان نہیں ہے‘ البتہ میری کزنز جب بھی ملتی ہیں تو میری لکھنے کی مصروفیت کے بارے میں پوچھتی ضرور ہیں۔ شادی سے پہلے اسکول میں میری جو کولیگز میری کہانیاں پڑھتی تھیں وہ اچھی خاصی تعریف کر دیا کرتی تھیں۔

میری دونوں بہنوں کو جو کہانی جتنی پسند آتی ہے اسی حساب سے تبصرہ کر دیتی ہیں۔ ابھی اکتوبر میں شائع ہونے والا ناول انہیں بہت پسند آیا تھا۔ ملنے جلنے والوں اور محلے داروں میں سے جو لوگ میری کہانیاں پڑھتے ہیں‘ سراہتے ہیں۔

میری شادی کے بعد میرے اکثر احباب‘ ملاقات ہونے پر یہ سوال ضرور کرتے تھے۔ "اب بھی لکھ رہی ہو؟ سسرال والے اعتراض تو نہیں کرتے؟"

اور اب تین بچوں کے بعد یہ سوال ہوتا ہے۔

"کیسے لکھ لیتی ہو‘ اتنے چھوٹے چھوٹے بچوں اور ذمہ داریوں کے ساتھ؟"

(چھوٹے بچے اور گھر کی ذمہ داریاں‘ تب ہی تو اتنا کم کم لکھ پاتی ہوں) پھر بھی اکثر خیر خواہ حیرت کے ساتھ شاباشی بھی دے دیتے ہیں۔

خاندان کی کچھ خواتین سمیت کچھ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب ملتی ہیں تو کچھ اس طرح کا سوال ہوتا ہے۔

"ڈائجسٹ میں لکھ رہی ہو آج کل؟"

"میں ڈائجسٹ نہیں کہانی لکھتی ہوں‘ وہ ڈائجسٹ میں چھپتی ہے۔" میری وضاحت سن کر بڑے اطمینان سے جواب دیا جاتا ہے۔

"ہاں ہاں‘ ایک ہی بات ہے۔"

3۔ جب بھی کوئی تحریر مکمل کر لیتی ہوں تو سکون کا سانس لیتی ہوں۔ شکر ہے مکمل ہو گئی‘ چھپنے کے بعد یہ اطمینان ہوتا ہے کہ شکر ہے چھپ گئی‘ مگر اپنی تخلیق کے معیار پر کوئی خاص اطمینان نہیں ہوتا۔ ہمیشہ یہی سوچتی ہوں کہ اس سے بہتر لکھوں‘ اپنے ابا اور اماں

کے گزرے وقتوں کے بارے میں دو ناول لکھنے تھے۔ "اک خواب جو دیکھا تھا کبھی" اور "ماں کہانی" گو کہ یہ زندگی کے رنگوں میں سے فقط دو چار رنگ ہی ہیں مگر انہیں لکھ کر اطمینان ہوا۔ اپنی تحریروں میں سے جو تحریر پسند ہے وہ ایک ناولٹ لکھا تھا۔ "جنت دوزخ" وہ اچھا لگا تھا۔ "رابعہ کی کہانی" "تخلیق" اور ایک دو افسانے اچھے لگے تھے۔ ویسے ایک بات ہے کہ ایک ماں کو اپنے سارے ہی بچے پیارے ہوتے ہیں' چاہے وہ کتنے ہی نالائق کیوں نہ ہوں۔

4۔ ہر اچھی تحریر بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ مشتاق احمد یوسفی بہت زیادہ پسند ہیں اور مختار مسعود بھی' قیوم محمد بشیر بہت بھائے مجھے' عبداللہ حسین' قرۃ العین حیدر' اشفاق احمد' مستنصر حسین تارڑ کو سارا تو نہیں پڑھا' مگر جتنا پڑھا ہے اس نے مجھے ان کا مداح بنا دیا۔ جاسوسی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ سب رنگ ڈائجسٹ میں نے بہت پڑھے ہیں اس دور کے جب طویل انتظار کے بعد اس کا ایک شمارہ آتا تھا' اس میں منتخب ادب شائع ہوتا تھا۔ وہ سارے لکھاری مجھے بہت پسند ہیں' چاہے وہ موپاساں ہو' او ہنری' لوئس اسٹیونسن' پرل ایس بک' راجندر سنگھ بیدی' کرشن چندر' قاضی عبدالستار قاضی' ابوالفضل صدیقی' میں کیا کیا نام لکھوں' لسٹ بہت طویل ہے نیل کے ساحل سے..... خواتین اور شعاع میں لکھنے والیاں..... رفعت ناہید سجاد' رفعت سراج' ہما کوکب' راحت جبیں' عالیہ بخاری' ہاما ملک' عنیزہ سید' عمیرہ احمد' نمرہ احمد' فرحت اشتیاق' سمیرا حمید' سائرہ رضا' امل رضا ان سب کو بہت شوق سے پڑھا ہے اور پڑھتی ہوں۔ مجھے جاوید چوہدری کے کالم بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی یاسر پیرزادہ کا بھی' سرگزشت میں ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریروں نے کتنی ہی شخصیات سے روشناس کرایا ہے۔

5۔ اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس لکھنا ایسے ہی ہے کہ کسی سمندر میں سے چند قطرے چن کر نکالوں' اشعار کا معاملہ یہ ہے عمر کے مختلف ادوار اور مختلف حالات میں مختلف اشعار پسند رہے ہیں ایک سہیلی کا سنایا ہوا ایک شعر آج تک بہت پسند ہے کچھ یوں ہے کہ

زنداں سے پرے دیکھ رنگ چمن' جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

سمیرا حمید اور نمرہ احمد کے بہت سے جملے بہت کمال کے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں سے کچھ بھی چن لیں سب مجھے پسند ہیں۔

سوال نمبر 2 کا جواب ادھورا رہ گیا تھا بقیہ یہاں لکھ رہی ہوں' میری چھوٹی بہن کو میری یہ کہانی بہت پسند آئی کوئی کوئی خوش نصیب تحریر ہوتی ہے جسے یہ شرف حاصل ہوتا ہے۔ اچھی اچھی رائٹرز کو پڑھ کر دماغ بہت اعلا ہو گیا ہے اور گھر والوں میں' اپنے مجازی خدا کا ذکر کرنا تو بھول ہی گئی۔ لغوی معنوں میں "گھر والے" تو وہی ہیں۔ شادی کے ابتدائی عرصے میں یہ حال تھا کہ اب بھی ہے کہ جب میں خوشی خوشی بتاتی' میری تحریر شائع ہوئی ہے' جلدی سے جواب ملتا۔

"ہاں میں نے دیکھ لی ہے۔ صفحہ نمبر.... پر ہے۔"

"صفحہ نمبر یاد کر لیا۔ پڑھی بھی یا نہیں؟"

"میں کہاں پڑھتا ہوں کہانیاں۔"

"تو اب پڑھ لیں۔ آپ کی بیگم نے لکھا ہے۔ کوئی تو رائے دیں۔ تحریر اچھی ہے' بری ہے؟"

"اچھی ہی ہو گی تب ہی تو شائع ہوئی ہے۔ بری ہوتی تو کیوں چھاپتے۔"

اب کر لو آگے بات۔ پھر بھی موصوف کا شکریہ کہ لکھنے کے معاملے میں میرے ساتھ بہت تعاون کرتے ہیں۔ کاغذ قلم لانے سے لے کر بچے سنبھالنے تک۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔

www.paksociety.com

سراپا حقیقت مجسم فسانہ

ادارہ

اے وقت کی حیرت میں کھو جانے والی آنکھ ٹھہر
آج کے پل پر رک کر آگے پیچھے دیکھ
روشنی اور تاریکی شاید ایک ہی ڈال کے پتے ہیں
لمحوں کا یہ فرق نظر کا دھوکا ہے
وقت کی اس ناوقتی کے سیلاب میں شاید
"آج" ہی واحد لمحہ ہے

ایک اور سال کی مسافت تمام ہوئی' خواب اور امیدیں انسان کی زندگی کے ساتھ چلتی ہیں۔ ہر نیا سال نئی امیدوں اور خوابوں کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔ پہلا سوال ہم نے اسی حوالے سے کیا ہے۔ ہزاروں سال قدیم دنیا ہر روز ایک نئے رنگ' نئی رعنائی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ زندگی اور وقت ایک ہی شے کے نام ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی رواں رہتی ہے۔ مگر عمر اس لمحے میں قید ہو کر رہ جاتی ہے۔ جو حاصل عمر رواں ہوتا ہے۔ سروے کا دوسرا سوال اسی لمحہ کے متعلق کیا ہے۔

ناکامی اور کامیابی زندگی کا حصہ' جس کا سامنا زندگی میں ہر شخص کو کرنا پڑتا ہے۔ تیسرا سوال ناکامی اور کامیابی کے بعد احساسات کے بارے میں تھا۔

اس کائنات کا وجود محبت پر قائم ہے۔ خلوص زندگی کی اساس ہے۔ محبت ہماری زندگیوں کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ چوتھا سوال اسی حوالے سے کیا ہے۔

اور پانچواں اور آخری سوال آپ کے ذوق مطالعہ سے آگاہی کے لیے تھا۔

سوالات یہ ہیں:

1 ۔ نئے سال کے آغاز پر آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟

2 ۔

کوئی ٹھہرا ہوا سا ایک لمحہ
ساری عمر رواں سے اچھا ہے

کیا آپ کی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ آیا جب آپ کو روحانی سکون اور خوشی ملی؟

3 ۔ 2016ء میں کون سی کامیابی ملی اور کہاں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

4 ۔ کوئی خوش کن احساس' میٹھا سا جملہ' محبت بھری نظر' تحسین آمیز بات جس سے دل کو بے اختیار خوشی حاصل ہوئی۔

5 ۔ کوئی کتاب جو آپ کو اچھی لگی؟ کیوں اچھی لگی۔ پسندیدہ اقتباس یا شعر لکھیں۔

آئیے دیکھتے ہیں کہ ہماری پیاری اور ذہین قارئین نے کیسے اس سروے کو اپنے دلکش جوابات سے سجایا ہے۔

سیما ممتاز عباسی ..... لاڑکانہ

ہر نئے سال کے آنے سے سب کے احساس الگ ہونے کے باوجود ایک سے ہوتے ہیں کہ: مولا! یہ سال ہماری امیدوں' خواہشوں' خوشیوں اور سکھوں سے مالا مال

ہوں۔

پھر نیا سال نئی صبح نئی امیدیں
اے اللہ! خیر کی خبروں کے اجالے رکھنا

2۔ ہم نے اپنے طور پر نادار اور غریب لڑکیوں کو کورس کی کتابیں فراہم کیں اور ایک آدھ کو تو یونیفارم بھی دلوائے اپنی سیلری سے، جس سے مجھے سکون اور بے حد روحانی خوشی محسوس ہوئی۔

3۔ سن 2016ء میرے لیے نہایت خاص رہا کہ میں نے عمرہ کی سعادت حاصل کی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چوکھٹ پر حاضری کا موقع مل گیا اور ناکامی کوئی نہیں ملی۔

4۔ خوش کن احساس یہ رہا کہ میرے ابا نے خوش ہو کر کہا تھا: "سلیمی عمرہ مبارک ہو" ان کی آواز میں محبت، شفقت، دعا اور بہت کچھ تھا، میں یہ چھوٹا سا جملہ باقی عمر میں بھول نہ پاؤں گی۔ بابا تھینک یو!

5۔ گبریل گارسیا مارکز کے ناول سے مجھے یہ اقتباس بہت بہت پسند ہے۔

"تمہیں پیار ہو گیا ہے؟ ایسا ہے نا!" بوڑھی ماں نے جوان ہوتے بیٹے سے پوچھا۔

"ہاں! مگر آپ کو کیسے پتا چلا؟" وہ حیران ہو کر پوچھا۔

"تم نے جب پانی میں انگلی ڈالی تو اس میں رنگ بھرنے لگے اور صرف پیار میں ہی ایسا ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کو چھوتا ہے تو اس میں سے قوس قزح جیسے رنگ پھوٹنے لگتے ہیں۔"

حرا قریشی.... ملتان

1۔ جیسے گلشن میں باد صبا چہار سو غنچے کھلا دے، جیسے محبوب من کی یاد چٹکیاں یعنی من کے آنگن میں محبت کی شمع جلا دے، جیسے یک دم ابھرنے والی کہکشاں سے گرد و پیش روشن ہو جائے، جیسے بوقت طلوع آفتاب ہر شے نور کا لباس زیب تن کرے، جیسے حسن فطرت عالمتاب کا عکس جابجا جلوہ گر ہو جائے۔ ایسے کیف آفریں احساسات ہوتے ہیں سال نو کی آمد پر! ہر آنے والے نئے سال پر لبوں پر بس یہی "دعا" ہوتی ہے۔

اے نئے سال کے ابھرتے ہوئے سورج
تمہیں اپنی کرنوں کی قسم.... مری ایک بات مان لو
کہ اس نئے سال میں، دل کی راہوں پر چلنے والوں کے
راستوں کو روشنیوں سے بھر دینا! آمین!

2۔ کام؟ شب کی خاموش فضاؤں میں یادداشت کے کواڑوں پر کئی بار دستک دینے کے باوجود بھی کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں آ رہا جیسے قرطاس کی زینت بنا سکوں، ہاں ایسا ضرور ہے کہ جب بھی کسی اسکول کولیگ، احباب من میں سے کسی کو اسٹڈی میٹر کے حوالے سے کوئی مسئلہ درپیش ہو تو حرا کو یاد کرتے ہیں اور یقین جانیے اس وقت بالکل تھکن، کوئی زحمت یا مصیبت محسوس نہیں ہوتی بلکہ یہ سوچ کر اپنی ذات مزید معتبر لگنے لگتی ہے کہ کچھ تو ہے اپنے اندر کہ رب سوہنا ہمیں ان کے لیے وسیلہ بنا کر پیش کر دیتا ہے۔

کوئی اچھی بات؟۔ اچھی باتیں تو اکثر بلکہ باقاعدگی سے پہلے پیریڈ میں اپنی کلاس کے وائٹ بورڈ پر تحریر کرتی ہوں، بات میری اپنی بھی ہو سکتی ہے اور جلال الدین رومی، اشفاق احمد، شیخ سعدی، عمیرہ احمد، نمرہ احمد یا خواتین شعاع اور کرن میں شائع کردہ بھی کوئی بات ہو سکتی ہے۔

جمعۃ المبارک کو بالخصوص حدیث اور اسی کے حوالے سے بات چیت کو طالب علموں کے ساتھ موضوع بحث بنایا جاتا ہے جب سینئر اسٹوڈنٹس کے علاوہ جونیئر بھی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تو بے حد روحانی سکون ملتا ہے اور خوشی کا بھرپور احساس بھی ہوتا ہے۔

3۔ اس سال کے حوالے سے خاص بات سوشل میڈیا پر جیتے جانے والے ڈھیروں انعامات اور ناکامی بھی اسی حوالے سے ہے مگر ——— کامیابیوں کا پلڑا بھاری رہا ہے بفضل خدا! ایک مزے دار بات یہ بھی ہوئی کہ میرے سیل فون کے اسپیکر کا حلق کسی ناگہانی آفت کی طرح بند ہوگیا۔ بے چارہ بالکل خاموش 'اداس' اداس! اسے صحیح کروانے میں دن' ہفتے' مہینے بھی لگ سکتے تھے سو جناب من نے اسے اسی کے حال پر چھوڑ دیا اور پھر معجزاتی طور پر اس کی ہچکیاں سنائی دینے لگیں اور پھر مکمل آواز آگئی۔ مسئلہ حل ہوگیا! اس قادر مطلق کا جس قدر شکر بجالاؤں کم ہے۔ یا اللہ! تیرا بہت بہت شکر! رفتہ رفتہ سلسلہ کلام کرتی ہوں.... میں اپنے رب سے جب بھی بات کرتی ہوں....!

بقول شاعر عرفان صادق

بڑی یہ خواہش ہے!
غبار وہم وگماں سے نکال دے مولا....
میرے خیال کی راہیں اُجال دے مولا!
سخن وری میں رہے نام معتبر صدیوں....
میرے حروف کو امرت میں ڈھال دے مولا!

4۔ خوش کن احساس؟ میں نے پھول چٹکنے سے .... وہ صورت پہچانی ہے! ہائے کیا فرط طرب تھی جب عیدیہ

امتل پیاری کا پیغام موصول ہوا۔ خود کو کھلی فضاؤں میں کئی گنا اڑتا محسوس کیا۔ میٹھا سا لمحہ؟ جب جب پیاری حیا اور ام طیفور اپنی رائے کا اظہار کرتی ہے۔ تحسین آمیز بات؟

وہ دن بھی آئے کہ خوشبو سے میری آنکھ کھلی اور ایک رنگ حقیقت میں چھو رہا تھا مجھے! تحسین آمیز کلمات بہت سے ہیں۔ "خط آپ کے" حرا قریشی کا خط بہت ہی یونیک تھا ہم تو ان کی فصاحت و بلاغت پر حیران ہوتے تھے۔ اس بار تو ان کا انداز ہی خوب تھا۔" (عائشہ رباب)

حرا جی! آپ کا خط پڑھ کر ہمیں ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ آپ کے خوب صورت الفاظ من موہ لیتے ہیں۔ ہمارا مشورہ ہے کہ آپ کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ دیں۔" (مدیرہ کرن ڈائجسٹ) سوشل میڈیا پر تو پذیرائی ملتی رہتی ہے۔

(5) اس برس "نمل" "آب حیات" اور "اندھیرے میں جگنو" زیر مطالعہ رہیں۔ جن کے گراں قدر بطن میں بصورت اقتباس کئی گہر نہاں تھے چند ملاحظہ کیجئے۔

"نماز "نماز "نماز.... اور یہ کیفیت.... یہ وہی چکھ سکتا ہے جو فجر اور تہجد پہ اٹھتا ہے۔" (نمل از نمرہ احمد)

"کوئی کتنی بھی بڑی اچیومنٹ والا دن ہو چوبیس گھنٹے کے بعد ماضی بن جاتا ہے اور ماضی کے ڈھنڈورے پیٹنے والے لوگ کبھی مستقبل کے بارے میں نہیں سوچتے۔" (آب حیات از عمیرہ احمد)

"اہل علم کو کئی چیزیں ضخیم کتابوں اور بحث سے سمجھ میں نہیں آتیں وہ ایک بچے کی کلکاری یا ان کے سر پہ

کرے ایک سیب کی ضرب سے فورا" سمجھ میں آجاتی ہیں۔" (اندھیرے میں جگنواز محمود ظفراقبال ہاشمی)

اپنی تحریر "مجاحرہ" سے بھی ایک اقتباس لکھ رہی ہوں' اگر طبیعت پر گراں نہ گزرے' پڑھنے میں بھلا لگے تو ضرور شامل کیجئے گا۔

"جب میں نے تنکوں کی مدد سے چھوٹی سی جھونپڑی بنائی تب مری ذات پر امید کے مفہوم کا صحیح الہام ہوا۔"

آخر میں بس یہی بات کہوں گی کہ محبوب من خواتین کو آپ سب کی محنت اور کوشش نے خوب صورت سے خوب صورت ترین بنادیا ہے۔

کرن نعمان...... کراچی

1۔ خدا جانے یہ صرف میرے ساتھ ہوتا ہے یا اور کسی کے ساتھ بھی ہوتا ہوگا۔ 31 دسمبر کی رات 12 بجے سے پہلے تک میں اداس ہوتی ہوں سال کے رخصت ہونے پر مگر جیسے ہی آتش بازی اور فائرنگ کی آوازیں آتی ہیں دل میں جوش اور ولولہ بھرجاتا ہے نئے سال کی خوشی میں۔

2۔ اس سال کا سب سے اچھا کام رمضان میں دور قرآن میں شرکت کرنا تھا۔ اچھی بات یہ کی کہ سارا سال کوشش کی' دل سے گلے شکووں کو نکالنے کی۔ جس میں بہت حد تک کامیاب بھی رہی۔ ایک کینسر کی مریضہ خاتون کی کچھ مالی مدد کرنے کی کوشش کی۔ جس سے روحانی سکون اور خوشی ملی۔

3۔ بلاشبہ "وہ چاند چہرہ" خواتین میں شائع ہونا میری زندگی کی بڑی کامیابی ہے۔ یہ میری پہلی کہانی تھی اور اس کے بعد دسمبر میں "تیرے خیال کا پیکر" شائع ہوئی' اس کے علاوہ میرا ایک آرٹیکل "مقصد حیات" کے عنوان سے روزنامہ جسارت میں شائع ہوا۔ دنیا کے ساتھ ساتھ دین کے لیے لکھنے کا بھی موقع ملا۔ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی ہماری حج کی درخواست نا منظور ہوگئی' اس صورت ناکامی کا سامنا ہوا۔

4۔ جولائی کے مہینے میں ایک عید ملن پارٹی میں جب خاتون خانہ نے پارٹی کے تمام شرکا سے میرا تعارف "ہماری سوسائٹی کی رائٹر" کہہ کر کروایا تو وہ ایک خوش کن لمحہ تھا۔ پھر لکھنے کے حوالے سے ہی نشرو اشاعت کی ایک محفل میں بطور رائٹر بلوایا گیا تو وہاں ایک نہایت مہربان' شفیق اور مجھ سے کہیں زیادہ اچھا لکھنے والی خاتون نے جب یہ کہا جیسا آپ کے لیے سوچا تھا اس سے بڑھ کر پایا تو بے اختیار دل کو خوشی ملی۔

5۔ کتاب بہترین دوست ہوتی ہے۔ لوگوں کے لیے یہ ایک جملہ ہوگا' پر میری زندگی کی سچائی اور حقیقت ہے۔ اس سال Paul read کی لکھی کتاب Alive بہت زیادہ اچھی لگی۔ یہ انسانی زندگی کے Survival کی داستان ہے اسے پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ انسان جو بظاہر گوشت پوست کا نرم ونازک دکھائی دیتا ہے' عزم وحوصلے میں برفانی طوفانوں اور بلندوبالا چوٹیوں سے زیادہ مضبوط اور قوی ہے۔ اقتباس ول ڈیورائٹ کی کتاب خزاں زدہ پتے سے پیش کرتی ہوں۔

"اور لیجئے' جوان نے شادی کرلی اور جوانی ختم ہوگئی۔ ایک شادی شدہ مرد اگلے ہی روز پانچ سال بوڑھا ہوجاتا ہے

اور بعینہ شادی شدہ عورت بھی۔ حیاتیاتی اعتبار سے بھی شادی کے ساتھ ادھیڑ عمری شروع ہو جاتی ہے کیونکہ کام اور ذمہ داریاں بے فکری کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ جوشیلے جذبات سماجی ضابطوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور شاعری نثر بن جاتی ہے۔ اب ہمارے جدید شہروں میں

شادی دیر سے ہونے لگی ہے' جس کے نتیجے میں نوجوانی کا عرصہ طویل ہو گیا ہے۔"

ام ہالہ..... کراچی

1۔ نئے سال کے اعتبار سے تو کچھ بھی خاص احساسات نہیں ہوتے' جیسے دوسرے سب عام سے دن ہیں' ویسا ہی نئے سال کا پہلا دن بھی لگتا ہے..... ہاں لیکن گزری رات یہ بے حد افسوس ہوتا ہے جو صبح تک باقی ہوتا ہے' جی ہاں! 31 دسمبر کی رات! جب 11 بجے سے ہی پورا علاقہ فائرنگ اور پٹاخوں کی آوازوں سے گونجنا شروع ہو جاتا ہے اور 1 بجے تک وقفہ وقفہ سے یہ طوفان بد تمیزی برپا رہتا ہے' تب انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ یہ امت..... جو فلسطین سے لے کر کشمیر تک ذبح ہو رہی ہے' اس کے فرزند ذرا سی' سستی سی تفریح کے پیچھے کیسے اپنی شریعت' اپنی روایات اور اپنی تہذیب کو بھلا کر' اپنے مظلوم مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کر رہے ہیں اور کچھ خیال ہی نہیں۔

2۔ الحمد للہ کئی ہیں' لیکن میرے نزدیک جس طرح انسان کو اپنے گناہوں کو چھپانا چاہیے تاکہ قیامت کے دن لوگ آپ کے گناہوں پر گواہ نہ بن سکیں' اسی طرح اپنی نیکیوں کو بھی چھپانا چاہیے' ورنہ ریاکاری کا عنصر شامل ہو جاتا ہے جو کہ مردود ہے۔

3۔ یہ سال میرے لیے اس اعتبار سے خاص رہا کہ میں نے عرصہ آٹھ سال بعد دوبارہ لکھنا شروع کیا' وہ قلم جو شادی کے بعد کی گوناگوں مصروفیات میں زنگ کھا چکا تھا' وہ دوبارہ رواں ہو گیا' الحمد للہ..... شادی سے پہلے میں اچھا خاصا لکھ لیا کرتی تھی (دوسرے رسالوں کی بات کر رہی ہوں) لیکن اس کے بعد تو لمبے عرصے قلم سے ناتا ٹوٹا رہا' اب جنوری 2016ء سے لکھنا شروع کیا تو الحمد للہ پذیرائی ملی' بہت جگہوں پر کامیابی کے ساتھ اپنا نام جگمگاتا دیکھا' بہت خوشی ہوئی' یہ سال کی سب سے خاص بات رہی گو ایک دو جگہ ناکامی کا منہ بھی دیکھنا پڑا لیکن اس سے ہمارے ارادے متزلزل نہیں ہوئے۔

4۔ خوش کن احساس تو میری بیٹی کا حفظ قرآن کریم کا سلسلہ ہے' رب تعالیٰ خیر و عافیت کے ساتھ تکمیل کروائے جس کا مجھے بہت انتظار ہے اور خوشی تو ایسی پیاری نعمت ہے کہ رب تعالیٰ نے اسے اپنے بندوں کے لیے چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی رکھ چھوڑی ہے..... سو میرے لیے بھی

دن میں ہفتہ میں' مہینہ میں کئی کئی بار خوشی کا موقع ہوتا ہے الحمد للہ..... جب میرے بچے اپنی ذہانت اور محنت سے کوئی اعزاز حاصل کریں' جب ان کی تعریف ہو' جب میرے ہاتھ کے بنے کھانوں' میرے ہاتھ کے سلے کپڑوں کی واہ واہ ہو' جب بچے اپنی بے ساختہ محبت کا اظہار کرنے کو اپنی ماں کا منہ چوم لیں' جب شوہر اپنی

آمنہ ریاض

دشتِ جنوں

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی.... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔

معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔

فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔

کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں تین بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔

صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔

شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہجہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں عرف مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔

باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔۔۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تنگ مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور ٹیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

گیارہویں قسط

فلک بوس سے کافی دور جنگل سے ذرا ہٹ کر شام کا قبرستان تھا۔

پائن کے قد آور درختوں میں گھرا۔ خاموش چپ چاپ قبرستان۔

یہاں خاموشی تھی، وحشت تھی اور موت کا سایہ لیکن اسرار نہیں تھا۔ وہ اسرار جو فلک بوس کی میراث تھا اور لکڑی کا پھاٹک نما گیٹ عبور کرتے ہی پیچھے رہ گیا تھا۔

اونچی نیچی ڈھلوان پر مضبوطی سے قدم جماتے ہوئے معاویہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ قبرستان کی حد بندی کے لیے بنائی گئی باڑھ اس سے چند قدم دور رہ گئی تھی۔ اس نے لمبے ڈگ بھرے اور باڑھ عبور کر کے اندر داخل ہو گیا۔ چھوٹی بڑی کچی پکی قبروں پر اجل کا فرشتہ اپنا سایہ پھیلا کر جا چکا تھا۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو کہیں پیچھے دم توڑ چکی تھی اور قبرستان کی حدود میں ایک سرد سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

بشام کے پہاڑ سے کئی میل دریائے کنہار کے دوسرے کنارے۔ جو پہاڑ تھے اُن کے عقب سے بیدار ہوتے سورج کی کرنیں سر نکال رہی تھیں اور ایسا ملگجا اجالا پھیل رہا تھا کہ نظر بدقت دور تک دیکھ سکتی تھی۔

قریب ہی ایک درخت سے ٹیک لگا کر خاتون بی بی اونگھ رہی تھی۔ معاویہ کی موجودگی کا احساس کر کے اس نے آنکھیں کھولیں اور سٹپٹا کر اٹھ بیٹھی۔ معاویہ نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کا کہا۔

"آئے کت کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہ..." خاتون بی بی نے ایک طرف اشارہ کیا۔ تو اس ملگجے اجالے میں ______ معاویہ نے دیکھا۔ دور وسامہ کی قبر کے پاس اپنی کالی چادر میں لپٹی آئے کت سر جھکائے مٹی پر بیٹھی تھی اور ایسے بیٹھی وہ ایک گٹھڑی سی معلوم ہوتی تھی۔

معاویہ کے دل میں ایک جانا پہچانا سا دکھ سر اٹھانے لگا۔ اس نے ایک گہری سانس بھر کر اپنی متزلزل ہوتی ذہنی طاقت کو جمع کیا۔ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھ گیا۔

خاتون بی بی واپس درخت سے ٹیک لگا کر ستانے لگی۔

قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا یا رات میں بارش برسی تھی۔ کچی مٹی کی بھینی سی خوشبو ہر طرف اڑتی پھر رہی تھی۔ درختوں کے نم پتے، سوکھی ہوئی لیکن نم سی ٹہنیاں ارد گرد بکھری ہوئی تھیں۔

معاویہ کی موجودگی کا احساس تھا یا پیر کے نیچے آ کر کوئی پتا کسمسایا تھا۔ آئے کت نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ہاتھ اٹھائے آنکھیں بند کیے دعا مانگ رہا تھا۔ دعا پوری کر کے اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرے اور آنکھیں کھول دیں۔ آئے کت نے دیکھا اس کی آنکھوں کے کنارے نمی تیر رہی تھی۔

اس نے سر جھکایا اور تھوڑی اپنے گھٹنوں پر لپٹے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"میں ابھی کچھ دیر اور یہاں بیٹھنا چاہتی ہوں۔"

اس ایک جملے میں ہٹ دھرمی یا فیصلہ کن انداز نہیں تھا بس التجا تھی گزارش تھی۔

معاویہ نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا اور پلٹ کر مخالف سمت میں قدم بڑھا دیے۔

کچھ دور قبروں کی حدود سے کوئی ساٹھ قدم آگے پہاڑ کا سینہ بے آب و گیاہ پڑا تھا۔ یہ جگہ غالباً "مزید انسانوں کی آخری آرام گاہ کے طور پر چھوڑی گئی تھی۔ ذرا آگے پہاڑ کی آخری حد تھی۔ معاویہ اس کنارے آ کر بیٹھ گیا۔

نیچے بہت نیچے سندھ کا دریا صبح کے احترام میں قدرے پرسکون ہو کر بہتا تھا۔ سامنے جو پہاڑ تھا اور جن کے عقب سے سورج جلوہ گر ہونے کو تھا۔ اتنے دور تھے کہ ناقابل رسائی معلوم ہوتے تھے۔

معاویہ بہت دیر بیٹھا رہا پھر سر کے بل لیٹ کر اس نے بازو پھیلا دیے۔ اب صبح کا تر و تازہ آسمان اس کے عین سامنے تھا۔ جہاں سورج کی نو مولود کرنوں کی پاکیزگی اور پہاڑی پرندوں کی اونچی اونچی اڑانیں دکھائی دے رہی تھیں۔ بادلوں کے مہین گالے سے تھے جو مختلف شکلیں بناتے بگاڑتے رہے۔ ان بادلوں میں کبھی اسے وسامہ دکھائی دیتا کبھی وہ لکڑی کی الماری، جس میں دم گھٹنے سے وسامہ کی موت واقع ہوئی تھی۔ ایک بار یہ بادل تیز تیز گھومے اور انہوں نے اس گول پتھر کی شکل اختیار کر لی جس کے گرد بھاگتے اور کھیلتے ہوئے معاویہ اور وسامہ کا بچپن گزرا تھا۔ اگلی بار اسے ان بادلوں میں فلک بوس کی خوب صورت راہداریاں اندھیرے میں ڈوبی ہوئی نظر آئیں یہاں تک اس کا ذہن نیند میں ڈوب گیا۔

پتا نہیں پھر کتنی دیر گزری۔ سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر پھیل گئی تھیں، جب اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں اور دیکھا آئے کت اس سے کچھ فاصلے پر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے چپ چاپ بیٹھی تھی اور

سامنے دیکھ رہی تھی۔

معاویہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں پر دیر تک سونے کا بوجھل پن طاری تھا لیکن ذہن کہتا تھا بس آنکھیں کھول دے۔

سورج سامنے والے پہاڑ سے کافی اوپر آچکا تھا اور روشنی نے پوری طرح بشام کو گھیر لیا تھا۔ ہوا بھی تیز ہوچلی تھی اور دریا اب تیز تیز بہتا تھا۔ آئے کت تو اپنی کسی جھونک میں تھی' اس نے گردن موڑ کر معاویہ کو دیکھا۔

"امید کرتی ہوں تم اچھی نیند سوئے ہوگے۔" وہ آہستہ سے مسکرا رہی تھی۔

"پتا نہیں کیسے آنکھ لگ گئی.... یہ زمین کافی سخت ہے۔" معاویہ نے قدرے شرمندگی سے کہا۔ قبرستان کے پاس اسے سونا تو نہیں چاہیے تھا۔ یہ غلط کردیا اس نے۔

"اس سخت زمین پر بھی تم کافی دیر سے سو رہے ہو۔"

"ہاں۔ وہی ناں۔ پتا نہیں کیسے سویا میں۔"

"رات کو تمہیں بھی پرسکون نیند نہیں آئی ہوگی۔ میں بھی نہیں سو سکی۔" آئے کت نے ایک بار پھر گردن سامنے کی طرف موڑتے ہوئے کہا تھا۔ معاویہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلیں؟ سب لوگ ناشتے پر ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس نے اپنے کپڑے اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ لیٹنے کی وجہ سے اس کی کمر پر کافی مٹی اور گھاس پھونس لگ چکی تھی۔

آئے کت خاموشی سے اٹھی اور معاویہ سے چند قدم آگے چلنے لگی۔

غیر ہموار زمین پر وہ دونوں آگے پیچھے چلتے رہے یہاں تک کہ قبرستان کے پھاٹک تک پہنچ گئے۔ اچانک آئے کت رک گئی اور اس نے گردن موڑ کر حسرت سے کچھ دور روسامہ کی قبر کو دیکھا۔

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور چہرے پر ایک زبردست اضطراب دکھائی دینے لگا۔ آنکھوں میں عجب بے رونقی سی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر معاویہ کو دیکھا۔

"کیا ہم فلک بوس میں مزید کچھ دن رک سکتے ہیں؟"

معاویہ فوراً" کوئی جواب نہیں دے سکا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"ماموں راضی نہیں ہوں گے۔ وہ پہلے ہی اس جگہ نہیں آنا چاہتے تھے۔"

"میں جانتی ہوں' تم انہیں منالو گے۔" آئے کت نے یقین سے کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ گردن موڑی' سر جھکایا اور قدم آگے بڑھا دیے۔ معاویہ کے دل نے تہیہ کرلیا وہ ماموں کو کچھ دن مزید قیام کے لیے منالے گا۔

قبرستان کے سب سے اونچے درخت پر بیٹھے کسی پہاڑی پرندے نے اسی وقت اڑان بھری تھی کہ فضا میں ایک جلترنگ سا بج کر خاموش ہوگیا۔

☼ ☼ ☼

پتا نہیں کیوں لیکن کبھی کبھی یہ ساری ریاضت' وہ جو اپنی چھوٹی سی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کرتی تھی' رائیگاں سی لگنے لگتی تھی۔

فضل منزل کے پچھلے صحن میں آم کے گھنے سائے تلے بیٹھ کر اس نے بے زاری اور مایوسی سے سوچا تھا۔

ہوا کچھ یوں کہ اس روز صبح ہی صبح فضیلہ چچی سے ناشتہ بنانے کی بات پر اس کی بحث ہوگئی۔ روشن امی کی طبیعت ناساز تھی۔ کل سے زکام کی وجہ سے سر میں درد ہو رہا تھا' ساتھ میں ہلکا ہلکا سا بخار بھی تھا۔

ماہ نور نے چند روز پہلے ہی عرفات ماموں کے اصرار پر ایک قریبی آرٹ اینڈ کرافٹ انسٹیٹیوٹ جوائن کر لیا تھا۔ بمشکل ایک مہینے کا کورس تھا بارہ ہزار فیس۔ عرفات ماموں چپکے سے جا کر اس کا نام درج کروا آئے اور فیس بھی بھر دی۔ اب کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی کہ ماہ نور انسٹیٹیوٹ جا کر اپنے صلاحیت کو پالش نہ کرتی۔

باقی گھر والوں نے حسب توقع بھرپور مخالفت کی۔ گھر میں کاموں کا رونا رویا گیا لیکن اس بار عرفات ماموں کے ساتھ ساتھ صباحت تائی جان بھی ماہ نور کی ہمنوا ہو گئیں تو اپوزیشن کو خاموش ہی ہونا پڑا اور یوں ماہ نور خوشی خوشی انسٹیٹیوٹ جانے لگی۔ بس ایک مسئلہ ہوا اور وہ یہ کہ روشن امی پر گھرداری کا بوجھ بڑھ گیا پہلے وہ تمام کام جو ماہ نور بھاگ بھاگ کر کر لیا کرتی تھی اب روشن امی کے سر آ گئے۔ وہ بیچاری اپنی ہمت سے زیادہ کرتی رہیں اور بیمار پڑ گئیں۔

ایسے میں خوش نصیب کو ہوش آیا کہ گھر والوں اور خاندان والوں سے ہنگمے لینے سے زیادہ اہم یہ ہے کہ روشن امی کی گرتی ہوئی صحت کا خیال کیا جائے۔ لہٰذا اس صبح اس نے انہیں بستر سے اٹھنے نہیں دیا اور خود ناشتہ بنانے پہنچ گئی۔

"آپ بس آرام کریں' ایک دن اگر سب کو روٹین سے ہٹ کر ناشتہ کھانے کو مل جائے گا تو کون سی قیامت آجائے گی۔ سب کو شکر ادا کرنا چاہیے کم سے کم بنا بنایا کھانے کو تو مل رہا ہے۔" اس نے حسب عادت ہر پہلو کو جوتی کی نوک پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"تم نہیں سمجھتی ناں خوش نصیب!" روشن امی نے نقاہت سے کہا تھا۔

"مجھے ضرورت بھی نہیں ہے۔" اس نے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے کہا تھا۔

"گھر میں مہمان موجود ہے.... اور مہمان بھی وہ جو چند تک رخصت ہونے والا ہے۔ اگر ایک بھی دن ہماری طرف سے کوئی کوتاہی سرزد ہو گئی تو فضیلہ بہت برا منائیں گی۔"

"خدا کو مانیں روشن امی! آپ کتنا ڈریں گی ان لوگوں سے۔" خوش نصیب کا میٹر ہی گھوم گیا تھا۔ اس نے ان کے لاکھ اصرار کے باوجود ایک نہ مانی اور اس کی بات نہ ماننے کی صورت میں دوپہر کے کھانے میں چپکے سے جمال گھوٹا ملانے کی دھمکی دے کر انہیں لیٹے رہنے پر مجبور کیا اور کچن میں آ گئی۔

اب آ تو گئی تھی لیکن چونکہ کچن میں صرف کھانے پینے کے لیے ہی آتی تھی سو آج تو چکرا ہی گئی کہ شروع کہاں سے کرنا ہے۔ ماہ نور کی ہی طرح روشن امی نے اسے بھی سگھڑ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن چونکہ اس کے مزاج میں مستقل مزاجی نہیں تھی سو وہ ماہ نور کی طرح ہر کام میں طاق نہ ہو سکی تھی البتہ گزارے لائق کھانا بنا ہی لیتی تھی۔

ابھی بھی تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے مطلوبہ سامان مل گیا تو اس نے سب کے لیے بڑے بیل بیل کر لچھے دار پراٹھے بنائے۔ ساتھ میں ہری مرچ اور پیاز کا خوب پھولا ہوا اور سنہری سا آملیٹ۔ بازو تھک گئے پراٹھے بیل بیل کر اور آملیٹ کے لیے پیاز کاٹ کاٹ کر۔ ایسی اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں کہ اس کا اپنا ہی دل بے چین ہونے لگا کہ اب بیٹھ جائے اور ڈٹ کر ناشتہ کرے۔ لیکن پھر روشن امی کا خیال آ گیا کہیں ایسا نہ ہو اس کے پہلے ناشتہ کر لینے سے فضیلہ چچی خفا ہی ہو جائیں۔ سو محض روشن امی کو ذہنی اذیت سے بچانے کے لیے اس نے ناشتے میں پہل نہیں کی اور خود پہ ضبط کیے کاموں میں لگی رہی۔

چائے دم پر رکھی تھی جب فضیلہ چچی نے کچن میں جھانکا اور اسے دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟ اور تمہاری اماں کہاں ہیں؟ ناشتہ تیار ہوا یا نہیں؟"

"روشن امی کی طبیعت خراب ہے چچی! وہ آرام کر رہی ہیں۔" اس نے اپنی ناگواری کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"چلو اب صبح صبح طبیعت خراب ہو گئی۔" چچی نے ناک چڑھا کر کہا۔ "ایک تو تمہاری اماں کے نخرے ختم نہیں ہوتے.... بھئی ذرا ناشتہ ہی تو بنانا تھا۔ پتا بھی ہے گھر میں مہمان آیا ہوا ہے اس پر ایسی ڈرامے بازیاں...." خود کلامی کے انداز میں بولتی وہ خوش نصیب کو نظر انداز کرتی وہ چولہے کی طرف بڑھی تھیں۔

اور گو کہ ایسا رد عمل متوقع تھا لیکن پھر بھی خوش نصیب کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ابھی کچن میں آنے سے پہلے وہ تہیہ کر کے آئی تھی کہ چچی اور صیام کے تیکھے جملوں کا کوئی جواب نہیں دے گی۔ لیکن اس وقت سارے عہد خاک میں مل گئے کیونکہ چچی کا انداز بڑا تحقیر آمیز تھا۔ خوش نصیب اپنے لیے پھر بھی ان کے جیسے تیسے جملے برداشت کر لیتی تھی لیکن روشن امی کے لیے کوئی ایسا انداز اور بات کہے اس کے لیے سہ جانا آسان نہیں تھا۔

"آج تک روشن امی نے آپ لوگوں کی خدمت گزاری کے معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ پھر آپ نے کیسے سوچ لیا، وہ اب کوئی ڈرامے بازیاں کریں گی۔" اس نے ترخ کر کہا تھا۔

چچی نے اسے گھور کر دیکھا اور بولیں۔

"ارے جاؤ یہاں سے 'پہلے ہی ناشتے میں اتنی دیر ہو چکی ہے۔ شامیر آتا ہی ہو گا۔" انہیں اب کاموں کی فکر تھی جو روشن امی کی موجودگی میں خود بخود ہو جایا کرتے تھے۔

"ناشتہ میں نے بنا دیا ہے۔" خوش نصیب نے کہا۔

"ارے کیا واقعی؟" وہ ایک دم خوش ہوئیں پھر احساس ہوا' خوش نصیب کے سامنے اس طرح خوش ہو کر وہ اس کا دماغ ساتویں آسمان پر نہ پہنچا دیں۔ سو فوراً" سے پیشتر اپنی خوشی چھپا گئیں اور پکا سا منہ کر کے بولیں۔

"تم نے تو بنا دیا.... لیکن وہ اس قابل تو ہرگز نہیں ہو گا کہ مہمان کے سامنے رکھا جا سکے۔"

"پھر آپ صیام یا منہا کو بلا لیں اور ان سے کہیں کہ اپنے ہاتھوں پر بٹھائے ہوئے بٹیرا اڑا کر کسی کام میں آپ کا ہاتھ بٹا دیں۔" خوش نصیب نے سنجیدگی سے طنز کیا۔ فضیلہ چچی کمر پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف پلٹیں۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا....؟" انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے خوش نصیب کو گھورا تھا۔

"میں دیکھ رہی ہوں دن بدن تمہاری زبان کچھ زیادہ ہی چلنے لگی ہے۔"

"زبان ہی چلنے لگی ہے.... اس میں کوئی نقصان کی بات تو نہیں ہے چچی!" اس نے اطمینان سے چائے کے کھولتے ہوئے پانی میں پتی ڈالتے ہوئے چچی کو سلگایا تھا۔ "کاش کہ کچھ لوگوں کے ہاتھوں اور ذہنوں کا زنگ بھی اتر جائے اور وہ بھی کام کرنے کی پوزیشن میں آ جائیں۔"

"اے لڑکی! یہ کیا صبح صبح کاموں کے طعنے دینے شروع کر دیے ہیں' چار روٹیاں پکا کر تم اور تمہاری ماں بہن ہمارے سر پر احسان دھرتی ہو.... بات کرتی ہوں میں آج روشن سے۔" چچی کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا تھا۔

ان دونوں کو ہی پتا نہیں چلا کب پیچھے کچن کے دروازے سے صیام اور شامیر اندر داخل ہوئے اور ان دونوں کے مابین ہو رہی گرما گرمی نے وہیں ان دونوں کے پیر جکڑ لیے۔

"آپ کو جس سے بات کرنی ہے کر لیں۔ میں اپنی بات سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں' ماہ نور اور روشن امی آپ لوگوں کے ملازم نہیں ہیں کہ ہر وقت ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر آپ کے مہمانوں کی خدمتیں کرتے رہیں۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

لیکن چچی کا اطمینان وہ غارت کر چکی تھی' انہیں اتنا غصہ آیا کہ بڑھ کر چولہے پر رکھی چائے کی کیتلی ہی الٹ دی۔

کیتلی زوردار آواز کے ساتھ لڑھکتی ہوئی زمین پر گری۔ آن کی آن سارا گرم کھولتا ہوا چائے کا قہوہ چولہے' شلیف اور نیچے فرش پر پھیل گیا۔

چچی کے ارادوں سے بے خبر خوش نصیب اگر اچھل کر اپنا بچاؤ کرنے کے لیے پیچھے نہ ہٹی ہوتی تو یقیناً" اس کے پیر جل چکے ہوتے یا کیتلی لگنے سے ماس ضرور پھٹ گیا ہوتا۔

"ارے پھوہڑ لڑکی! یہ کیا کیا تم نے۔" چچی کی صدمے سے بھرپور آواز سنائی دی۔

خوش نصیب نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

دور کھڑی صیام دوڑی آئی۔

"ہائے امی! آپ پر تو نہیں گرا قہوہ۔۔۔ خوش نصیب کس قدر جاہل ہو تم۔" خوش نصیب اور روشن امی کو ڈرامہ بازیوں کے طعنے دینے والی دونوں ماں بیٹی ڈراما تیار کر چکی تھیں۔

"مم۔۔۔ میں نے کچھ نہیں' کیا چچی نے کیتلی گرائی ہے۔" وہ سٹپٹا ہی گئی تھی۔

"اللہ معافی۔۔۔ اب جھوٹ بھی بول رہی ہو۔" چچی اپنے گال پیٹنے لگیں۔ سٹپٹائی ہوئی خوش نصیب نے دیکھا' پیچھے شامیر بھی کھڑا تھا اور پریشانی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس پر منوں پانی آن گرا۔ ہر بار حق پر ہونے کے باوجود بے عزت ہونا اس کا مقدر ہی کیوں ٹھہرایا جاتا تھا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے ڈسٹر شیلف پر پھینکا اور بھاگتی ہوئی کچن سے نکل گئی۔ جاتے جاتے اس نے سنا۔ چچی کہہ رہی تھیں۔

"دیکھا تم نے شامیر! کس قدر جاہل اور بدتمیز لڑکی ہے یہ خوش نصیب! آج بات کرتی ہوں میں طوطے کے ابا سے۔ اس منحوس ماری کے تو کس بل نکالیں۔" تو منحوس ماری آکر پچھلے صحن میں بیٹھ گئی اور اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ کاش کہ کوئی جادو کی چھڑی گھومے اور وہ فضل منزل سے دور چلی جائے۔

☼ ☼ ☼

فلک بوس کا مرکزی پھاٹک کھول کر جوں ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ صاعقہ ممانی انہیں برآمدے میں بے چینی سے ٹہلتی نظر آگئیں لیکن درمیانی راستہ اتنا تھا کہ وہیں سے آواز دے کر ان کی بے قراری کی وجہ نہیں پوچھی جاسکتی تھی۔

صاعقہ ممانی نے انہیں دیکھا تو ٹھہر گئیں۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتی ان کی طرف آئیں تاکہ درمیانی راستہ جلدی ختم ہو۔

"تم دونوں کہاں چلے گئے تھے۔۔۔ میں کب سے تم دونوں کا انتظار کر رہی ہوں اور معاویہ! تم اپنا موبائل ساتھ لے کر کیوں نہیں جاتے؟" وہ بہت فکر مند اور جھنجلائی ہوئی لگ رہی تھیں۔

"آپ کو پتا ہے یہاں موبائل کے سنگلز کام نہیں کرتے پھر ساتھ ساتھ لے کر پھرنے کا کیا فائدہ؟" معاویہ نے نرمی سے کہا۔

"تم دونوں تھے کہاں؟ کچھ اندازہ بھی ہے میں کس قدر پریشان رہی ہوں۔" وہ رونکھی ہو رہی تھیں۔

"راستے میں کچھ مسئلہ ہو گیا تھا۔۔۔ وہیں دیر ہو گئی۔" معاویہ نے بات بنائی اور ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"کک کیا مسئلہ؟" صاعقہ ممانی مزید پریشان ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں ممانی! آپ بس چھوڑیں اس بات کو۔" معاویہ نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہیں؟ سب خیریت ہے ناں اور۔" اس نے ڈھلوانی لان پر دور تک نظر

دوڑائی۔

"ماموں کہاں ہیں؟"

"یہاں سے چلو معاویہ! مجھے بڑی وحشت ہو رہی ہے۔" انہوں نے بے چارگی سے کہا۔

ایک لحظہ کے لیے بالکل خاموش کھڑی آئے کت اور معاویہ کی نظریں ملیں تو آئے کت نے فوراً" ہی دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

"ابھی نہیں جا سکتے ممانی!" اس نے سرعت سے کہا۔

"کیوں؟" انہوں نے مایوس ہو کر پوچھا۔

"کچھ کام باقی ہے یہاں۔ جب تک ختم نہیں کر لیتا۔۔۔ واپس نہیں جا سکتا۔" اس نے مستحکم لہجے میں کہا تھا۔

"تم نے پہلے تو کسی کام کا ذکر نہیں کیا تھا۔" وہ الجھ کر بولیں۔

"ذہن میں نہیں رہا ہو گا۔" اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا تھا اور ان کے ساتھ روش پر قدم بڑھا دیے تھے۔ آئے کت بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

"اچھا بتائیں؟ پریشان کیوں ہیں؟ شام کو میں آپ کو نیچے وادی میں لے جاؤں گا؟ آپ کو یاد ہے آپ کو وادی میں جانا کتنا پسند ہوا کرتا تھا۔" وہ انہیں ماضی یاد دلا رہا تھا۔

"وہ کوئی اور وقت تھا معاویہ! جب مجھے وادی میں جا کر گھومنا پھرنا اچھا لگتا تھا۔ تب میرا وسامہ میرے ساتھ ہوتا تھا اور جب وہ ساتھ تھا تو فلک بوس بھی روشن لگتا تھا۔ اب تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے، نہ خوبصورتی نہ سکون یہ عمارت میرا بیٹا کھا گئی۔" آنسو بھری آنکھوں سے وہ سامنے دیکھنے لگیں۔

روش کے بالکل سامنے فلک بوس کی عمارت تھی۔ پرشکوہ لیکن پراسرار۔ جنگل میں بڑ گد کے گھنے پیڑوں سے ایسے چمگادڑیں نہ لٹکتی ہوں گی جیسے فلک بوس کے در و دیوار سے ہیبت اور وحشت لٹکتی محسوس ہوتی تھی۔

"وسامہ نہیں ہے ماما جان! ورنہ تو سب ویسے کا ویسا ہی ہے۔" آئے کت نے بوجھل لہجے میں کہا تھا۔ صاعقہ ممانی اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ دل دکھ سے بھر گیا تھا۔

"پاپا دکھائی نہیں دے رہے۔" اب آئے کت نے ادھر ادھر طالب حسن کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تمہارے کمرے سے مری ہوئی گلہری ملی ہے۔ وہ اسی کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہیں۔"

صاعقہ ممانی نے ذرا خفیف سے لہجے میں کہا تھا۔ معاویہ اور آئے کت نے بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان دونوں کے دماغوں نے ایک ہی نہج تک اڑان بھری تھی اور وہ دونوں ایک ساتھ اندر کی طرف بہت تیزی سے بڑھے تھے۔

☼ ☼ ☼

ان چند دنوں میں شامیر وہ تمام رویے دیکھ اور سن چکا تھا جو فضل منزل میں خوش نصیب کے ساتھ برتے جاتے تھے۔

کئی بار اسے افسوس بھی ہوا لیکن فطرتاً" وہ دوسروں کے معاملات میں دخل دینے والا انسان نہیں تھا سو خاموش ہی رہا۔ سب سے بڑی بات وہ یہاں چند دن کا مہمان تھا اور کسی بھی معاملے میں مداخلت کر کے اپنا امپریشن بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس روز کچن میں جو کچھ ہوا۔ اسے دیکھ اور سن کر بھی وہ خاموش ہی رہتا اگر جو فضیلہ آنٹی کو جان بوجھ کر چائے کی کیتلی گراتے ہوئے نہ دیکھ چکا ہوتا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہوا۔" ناشتے کی میز پر بیٹھے جب فضیلہ آنٹی اور صیام نے نان اسٹاپ خوش نصیب کو کوسنا شروع کیا تو بڑے تحمل اور خاموشی سے سب سنتے شامیر کے منہ سے بے ساختہ یہ لفظ پھسل گئے۔ وہ اس وقت پلیٹ پر رکھے سلائس کا کنارہ کتر رہا تھا اور سامنے بھاپ اڑاتی کافی کا بہترین مگ رکھا تھا جب اس کے کہے ہوئے لفظ پگھلے ہوئے سیسے کی مانند صیام اور فضیلہ آنٹی کی سماعت سے ٹکرائے۔
ان دونوں نے کچھ ایسے صدمے سے شامیر کی طرف دیکھا تھا کہ شامیر کو آن کی آن میں اپنے کہے لفظوں کے غلط ہونے کا احساس ہو گیا۔
"مم.... میرا مطلب ہے گرم قہوے کا اس طرح گرنا کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔" اس نے جلدی سے بات سنبھالنے کی ایک نالائق سی کوشش کی تھی۔
"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس خوش نصیب کو کون سمجھا سکتا ہے۔" فضیلہ آنٹی نے ترنت کہا۔
"ان کے باوا زندہ ہوتے تو شاید کچھ سمجھا لیتے۔ لیکن نہ بھیا! باپ کیا گیا دنیا سے۔ یہ لڑکی تو ہاتھوں سے ہی نکل گئی۔" وہ بڑا افسوس کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔
"اچھا... ہاتھوں سے نکل گئی ہے لڑکی؟" شامیر نے بس یوں ہی کہہ دیا۔
"اور نہیں تو کیا؟ جو لڑکیاں بزرگوں کے کنٹرول میں ہوتی ہیں وہ ایسی ہوتی ہیں کیا؟" صیام نے بھی خوب سر ہلا ہلا کر کہا تھا اسی وقت منہا کچن میں داخل ہوئی۔
"مجھے کیا پتا میں نے کبھی لڑکیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش نہیں کی۔" اس نے جلدی سے کہا۔
"ظاہر ہے شامیر کو کیسے پتا ہو سکتا ہے۔" فضیلہ چچی نے صیام کو آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا پھر شامیر کی طرف متوجہ ہوئیں۔
"ابھی جو تم نے خوش نصیب کی بدتمیزیوں کا مظاہرہ دیکھا ہے' وہ تو کچھ بھی نہیں ہے' کیا بتاؤں تمہیں' بچپن سے اس لڑکی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہم یتیم سمجھ کر لحاظ کرتے رہے اور یہ ہر گزرتے دن کے ساتھ سر چڑھتی چلی گئی۔" آگے خوش نصیب کی شرارتوں اور بدتمیزیوں کا نہ ختم ہونے والا ایسا بیان تھا جو بلاواسطہ کئی بار شامیر سن چکا تھا وہ تو شکر ہے منہا کچن میں آ گئی تو فضیلہ چچی کے قصوں کو بریک لگی۔ وہ دودھ والے کی آمد کا پیغام ساتھ لائی تھی۔
"امی! باہر دودھ والا آیا ہے.... کہہ رہا ہے مہینے کا حساب کر دیں۔" وہ بیزار سی لگ رہی تھی۔
"اے ہائے اس نگوڑمارے کو بھی ابھی آنا تھا۔" وہ سر پر ہاتھ مارتے ہوئے جھنجلا کر اٹھی تھیں۔
"آؤ منہا! ہمارے ساتھ ناشتہ کرو۔" شامیر نے اسے بھی دعوت دی۔
"نہیں شکریہ' ڈور بیل کی آواز نے نیند خراب کر دی' ورنہ میرا ابھی اور سونے کا ارادہ ہے' روشن چچی پتا نہیں کہاں ہیں آج۔ کم سے کم کوئی اٹھ کر دروازہ تو کھول ہی سکتا ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی تب شامیر نے صیام کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجائے شامیر کو دیکھ رہی تھی۔
شامیر نے اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتے پایا تو کندھے اچکا کر وجہ دریافت کی۔ گو کہ اس کے ذہنی ——— نالائق پن سے اچھی طرح واقف تھا وہ دیکھنے میں جتنی خوب صورت اور طرح دار لگتی تھی' ذہنی اعتبار سے اتنی ہی

چغد ثابت ہوئی تھی۔
"ایک بات پوچھوں آپ سے؟"
"اگر میں منع کروں گا تو کیا آپ نہیں پوچھیں گی؟ نہیں ناں؟ تو پوچھیے؟" اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

حسب توقع بات صیام کے سر سے گزر گئی یا اپنی ایکسائٹمنٹ میں اصل بات کو ہی اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔

"یہ خوش نصیب کیسی لگتی ہے آپ کو؟" معاً" رازداری سے لیکن معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس نے پوچھا۔

شامیر نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "یہ کیسا سوال ہے؟" اس کے انداز میں تھوڑی سی ناگواری بھی تھی۔

صیام اس کے انداز سے ٹھٹک گئی اور فوراً" ہی محتاط ہو کر بولی۔

"میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ آپ کو پہلے ہی محتاط کر دوں۔ دیکھیں کوئی نقصان اٹھانے سے بہتر ہے انسان احتیاط کر لے وہ" بڑی اپنائیت سے کہہ رہی تھی۔

"میں سمجھا نہیں؟ کیسی احتیاط؟ کیسا نقصان؟" وہ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"ابھی امی نے جتنا آپ کو بتایا ہے' دراصل خوش نصیب اس سے کہیں زیادہ بری ہے۔" اپنی کرسی سے شامیر کی طرف جھکتے ہوئے اس نے رازداری سے کہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے ادھر ادھر بھی دیکھا تھا کہ کسی اور کی غیر موجودگی کا اطمینان کر لے۔

"منحوس تو خیر وہ بچپن سے ہی ہے' جس بھی اچھے اور نیک کام کے وقت پہنچ جاتی ہے وہ خراب ہو جاتا ہے لیکن آج کل اس نے تعویذ بھی کرنے شروع کر دیے ہیں۔"

"کیا؟ تعویذ؟" اسے بری طرح جھٹکا لگا تھا۔

"اور نہیں تو کیا"' صیام آنکھیں گھما کر بولی۔ "اور مجھے تو یہ بھی پتا چلا ہے کہ وہ آپ پر تعویذ کروا رہی ہے۔"

شامیر کا قہقہہ اتنا بے ساختہ تھا کہ صیام سٹپٹا ہی گئی' اس بیچاری نے تو بڑی محبت اور اخلاص کے ساتھ اسے اس کی طرف آنے والے خطرے سے آگاہ کیا تھا لیکن شامیر کے قہقہوں نے اسے شرمندہ ہی کر کے رکھ دیا۔

"آپ کو شاید لگ رہا ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔"

شامیر کے قہقہے جب ذرا کنٹرول میں آئے تب تک نازک مزاج صیام اچھی خاصی سبکی محسوس کر کے ٹھیک ٹھاک برا منا چکی تھی۔

"ارے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" شامیر نے اپنی ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا تھا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ خوش نصیب مجھ پر تعویذ کیوں کروائے گی؟"

"کس کا دل نہیں چاہتا کہ دنیا کی ہر اچھی چیز اسے مل جائے۔" صیام نے بے ساختہ کہا' ساتھ ہی زبان دانتوں تلے دبالی کیوں کہ شامیر کی ہنسی معنی خیز مسکراہٹ میں بدل چکی تھی۔ اس نے جیسے بڑا انجوائے کیا تھا صیام کی بات کو۔

"وہ' میرا مطلب ہے' میں ابھی آتی ہوں۔" وہ سٹپٹا کر کہتی ہوئی جلدی سے اٹھی اور کچن سے باہر نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا' ایک مری ہوئی گلہری کے ملنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کسی بلی نے کھا کر پھینک دیا ہو گا اسے۔"

طالب حسن نے معاویہ اور آئے کت کے اس مرحوم گلہری کے متعلق پے در پے سوالوں پر حیران ہو کر کہا تھا۔

"آپ ہمیں وہ گلہری دیکھنے تو دیں۔" بالآخر معاویہ نے زچ ہو کر کہا تھا۔

"کبیر سے کہہ کر میں نے اسے باہر پھنکوا دیا ہے۔" انہوں نے سنجیدگی سے ان دونوں کو دیکھا۔

"اب کیا تم دونوں میں سے کوئی مجھے بتائے گا آخر ایک مری ہوئی گلہری کو تم لوگ کیوں دیکھنا چاہتے ہو؟"
معاویہ اور آئے کت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر آئے کت آہستہ سے بولی۔
"مری ہوئی اور سر کٹی گلہریاں وسامہ کو ملنی شروع ہوئی تھیں اس کے بعد اس نے کہنا شروع کر دیا کہ فلک بوس کا آسیب اسے دکھائی دیتا ہے۔"
"اور اب تم دونوں کو لگ رہا ہے کہ یہ مری ہوئی گلہری اسی آسیب یا بد روح کی واپسی کا انڈی کیشن ہے؟" انہوں نے سنجیدگی سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔
"اور وہ روح وسامہ کی جان لینے کے بعد ہم میں سے کسی کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے؟ کیوں اپنا وقت اس چیز کے پیچھے گنوا رہے ہو جس کا کوئی سر پیر ہی نہیں ہے۔" وہ جیسے تھک چکے تھے اور عاجز آکر بول رہے تھے۔
"وسامہ نے کچھ فیل کیا تھا تو اس میں کچھ نہ کچھ سچائی تو ضرور ہو گی ماموں!" معاویہ روانسا ہو کر بولا۔
"وہ آسیب اس کا وہم تھا معاویہ! اور کچھ نہیں۔" دکھی لہجے میں بولتے وہ کرسی پر ڈھے سے گئے۔ چند لمحے وہ اسی طرح سر جھکا کر بیٹھے رہے پھر نظر کا چشمہ اتار کر انگلیوں کی پوروں سے دونوں آنکھیں دیر تک مسلتے رہے۔
"بچپن سے وسامہ کو کہانیاں بننے کا شوق تھا، وہم پالنے کا عارضہ لاحق تھا جسمانی لحاظ سے وہ ہم سب کے ساتھ رہتا تھا لیکن بیشتر زندگی اس نے اپنے کرداروں کے ساتھ گزاری تھی ہم کیوں یہ سب باتیں بھول جاتے ہو؟ غلطی ہماری ہے۔ اس کے مسئلے کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اگر بہت پہلے اسے کسی ماہر نفسیات کے پاس لے گئے ہوتے تو شاید۔" وہ رک گئے۔ گم کر روحانی آنکھ سے اس شاید کے بعد کا منظر ذہن میں ترتیب دینے لگے۔ پھر ایک دم سے ہوش میں آئے اور بولے۔
"آئے کت بھی وسامہ کے ساتھ فلک بوس میں رہتی رہی ہے اگر وہ آسیب واقعی کوئی حقیقت تھا تو آئے کت کو کبھی دکھائی کیوں نہیں دیا، چلو دکھائی دینا تو دور کی بات ہے۔ کیا کبھی آئے کت نے اس آسیب کی موجودگی کو محسوس کیا؟ نہیں۔" انہوں نے خود سوال کر کے خود ہی جواب دیا تھا۔
"اس لیے کیونکہ وسامہ سائیکو تھا آئے کت نہیں۔" یہ کہتے ہوئے ان کے لہجے میں دکھ بولتا تھا۔
معاویہ نے ذرا توقف کے بعد کہا۔
"پچھلے دنوں میں نے ایک کتاب پڑھی ہے۔ سروائیول آف بلڈی ڈیتھ اس میں لکھا تھا روح تو ہوتی ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔ صدمے کا مارا ہوا انسان طویل بحث نہیں کر سکتا خصوصاً" اس شخص کے سامنے تو بالکل بھی نہیں جس سے محبت اور احترام دونوں کا رشتہ جڑا ہو۔
"تو روح کے وجود سے کس کو انکار ہے میرے بچے! جو چیز اللہ نے بنا دی اس کے وجود سے انکار کی ہزار دلیلیں لے آؤ تم میں تب بھی نہیں مانوں گا کہ وہ نہیں ہے، روح تو اصل ہے انسان کا۔ یہ خاکی جسم تو روح کی حفاظت کے لیے بنایا تھا خدا نے۔"
"وسامہ کی لائبریری میں جا کر دیکھو۔ تمہیں ایسی کئی کتابیں مل جائیں گی جن میں حیات بعد الموت پر بحث کی گئی ہے۔ ایسی ایسی تھیوریز پڑھنے کو ملیں گی کہ تم دنگ رہ جاؤ گے کہ اس خاکی جسم سے نکل کر بھی ایک ایسی دنیا آباد ہے جس تک ہم زندگی کی رمق کے ساتھ نہیں پہنچ سکتے۔ دنیا کی کوئی بھی زبان اٹھا کر دیکھ لو۔ اس موضوع پر اتنی ریسرچ ہو چکی ہے، اتنے بحث و مباحثے ہو چکے ہیں اتنی تائید اور انکار ہو چکے ہیں کہ اب کسی نئی بحث کو چھیڑنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے، لیکن چونکہ ہمارا دکھ نیا ہے تو ہم اس موضوع کو کھول کر اپنے ہی زخموں کو ہرا کرتے رہنا چاہتے ہیں۔" وہ دکھ سے ہنسے تھے۔

"یہ خوداذیتی پتا نہیں کب ہمارے اندر سے نکلے گی۔ جب اللہ نے کہہ دیا صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دو تو ہم صبر کر کیوں نہیں لیتے۔" وہ ان دونوں سے زیادہ جیسے وہ خود سے بات کر رہے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے ان کی ذہنی رو بار بار بھٹک رہی ہو۔

"کسی بے اعتقاد سے بات کرو وہ بھٹکی ہوئی روح کو دیوی دیوتا کا درجہ دے دے گا۔ ضعیف الاعتقاد کو یہ مجذوب کا نعرہ لگتی ہے اور لیٹسٹ ٹیکنالوجی اسے سائنٹفک فارمولوں کی ردوبدل سے ایسی خود کار مشین بنادینا چاہتی ہے جو بٹن دبا کر مطلوبہ روح کو بلائے اور اپنے مسائل کا حل نکلوا کر اسے چلتا کرے۔ ہم انسانوں نے ہر چیز کو کاروبار بنا لیا ہے۔ ہمیں ہر چیز سے پیسہ کمانے کی فکر لاحق ہے۔ تم دونوں تھک تو نہیں گئے؟ پتا نہیں آج میں اتنا کیوں بول رہا ہوں۔ دل چاہتا ہے میں بولتا ہی رہوں۔"

جوان اولاد کو کھو دینے کے بعد وہ مزید بوڑھے لگنے لگے تھے۔

"آپ بولتے رہیے۔" آئے کت نے سامنے کرسی پر نشست سنبھالتے ہوئے شوق سے کہا۔

"وسامہ سے آپ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔"

وہ چونکے۔ ایک ایسا خوش کن سا احساس۔ جس میں دکھ بھی شامل ہوتا ہے۔ "وہ میرے بارے میں بات کرتا تھا؟"

"آپ اس سے ناراض تھے پاپا! وہ نہیں۔" آئے کت نے بھی دکھ بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا۔

معاویہ کو اس پر غصہ آیا۔ کیا ضرورت تھی ابھی یہ بات جتانے کی۔

"آپ کیا کہہ رہے تھے۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کے پیروں میں بیٹھ گیا ایسے جیسے دیر تک اٹھنے کا ارادہ نہ ہو۔

"پھر کبھی معاویہ!" انہوں نے ٹالنا چاہا لیکن معاویہ ضد پر آمادہ ہو چکا تھا۔

"نہیں ابھی۔" پھر گردن موڑ کر آئے کت سے بولا۔ "بابا کبیر سے کہو ناشتہ یہیں لے آئیں۔"

آئے کت نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر باہر نکل گئی۔ اس کے گزرنے سے راہداری کا پردہ ذرا سا لرزا اور لرز کر ساکت ہو گیا۔

معاویہ نے گردن واپس موڑی اور ماموں کو دیکھنے لگا۔ وہ اسے بچپن سے جانتے تھے سو سمجھ گئے وہ اب پوری بات سن کر ہی ٹلے گا۔

"میں کہہ رہا تھا' روح کا وجود تو بلاشبہ ہوتا ہے لیکن کوئی روح بھٹک کر عالم ارواح تک پہنچنے کی بجائے دنیا میں جیتے جاگتے انسانوں کو تنگ کرنے لگے اس بارے میں واضح طور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بالفرض اگر دنیا میں ایسا ہونا ممکن ہے بھی تو۔" جوش خطابت سے ان کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ ذرا دیر کے لیے رکے پھر جلدی جلدی بولنے لگے۔

"تو ہم اتنے وثوق سے یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وسامہ کی موت کی ذمہ دار وہ بدروح ہی تھی۔ دیکھو' جنات اچھے یا برے ہو سکتے ہیں۔ اس چیز کا تو قرآن پاک میں بھی ذکر ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ شیطان کوئی فرشتہ نہیں بلکہ ایک جن تھا جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ وہ محض خاک کا ایک پتلا ہی تو ہے۔

لیکن روحیں تو اللہ پاک نے اچھی ہی پیدا کی تھیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کچھ اچھی اور کچھ بری روحیں پیدا کر دی گئی ہوں۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ سب روحیں اچھی اور نیک ہی ہوں گی۔ باقی انہیں صحیح راستے سے بھٹکانے والا شیطان ہوتا ہے' انسان کو اچھا یا برا بنانے میں اس کے ماحول' تربیت اور اس کی زندگی میں آنے والی آزمائشوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہم کچھ دیر کے لیے یہ ضرور مان سکتے ہیں کہ ایک اچھے انسان کو ورغلا کر شیطان نے غلط راستے ڈال دیا ہو۔ لیکن ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جب وہ انسان مرا تو اس کی روح چونکہ شیطان کے زیر اثر آ

چکی ہوتی ہے تو وہ دنیا میں بھٹکتی رہتی ہے اور پھر انسانوں کو تنگ کرنے لگتی ہے۔"

"وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کو اگر اسے مان بھی لیا جائے کہ کوئی تکلیف پہنچائی اور مرنے کے بعد اس انسان کی روح بھٹکتی رہتی ہے اور اپنا بدلہ لینے کے لیے اس انسان کو تنگ کرتی ہے تو جس عورت کا تقریباً" سو سال پہلے فلک بوس میں قتل کیا گیا اس کی وسامہ سے ایسی کیا دشمنی پیدا ہو گئی کہ اس نے وسامہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس کی جان ہی لے لی؟"

وہ بڑے مدلل انداز میں بول رہے تھے اور معاویہ ایسے ہمہ تن گوش۔ ان کے سامنے بیٹھا تھا جیسے چھوٹا سا بچہ کہانی سننے بیٹھتا ہے۔

"تو آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ وہ سب جو وسامہ نے محسوس کیا وہ اس کا وہم تھا؟" معاویہ نے الجھ کر پوچھا تھا۔

"بالکل۔" ترنت کہتے ہوئے انہوں نے اپنا بائی فوکل چشمہ اتار کر ایک طرف میز پر رکھ کر داہنی ٹانگ بائیں ٹانگ سے اتار کر پاؤں زمین پر رکھا اور دونوں گھٹنوں پر کہنیوں کے سہارے آگے ہو کر بولے۔

"اپنے بیٹے کے بارے میں یہ سب باتیں کرتے ہوئے مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے لیکن میرا خیال ہے معاویہ! تمہیں یہ مان لینا چاہیے کہ وسامہ ایک نارمل انسان نہیں تھا' تم جانتے ہو وہ بچپن سے بہت زیادہ امیجنیٹیو (تخلیاتی) تھا' جو سوچتا تھا اسے ویژیولائزڈ کر لیا کرتا تھا۔ تمہیں یاد ہے وہ کہا کرتا تھا مجھے اپنے کردار اپنے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں؟ تو وسامہ کی وہی ذہنی کیفیت یہاں اپلائی کر کے دیکھو' سارا معاملہ تم پر واضح ہوتا چلا جائے گا۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" اس نے بے چارگی سے کہا تھا۔

"وسامہ نے فلک بوس کے آسیب کی باتیں سن رکھی تھیں۔" وہ مزید سمجھانے والے انداز میں بولے۔

"ان ہی باتوں کو سنتے اس کے ذہن نے ایک کہانی بنی ہوگی اور کہانی کا مرکزی کردار اس عورت کی روح تھی' جس کا وسامہ ذکر کرنے لگا تھا اس نے اس روح یا آسیب کے بارے میں اتنا سوچا کہ وہ اس کے ذہن پر سوار ہو کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ اسے اپنے آس پاس چلتی پھرتی نظر آنے لگی اور راتوں کو آکر ڈرانا بھی شروع کر دیا۔ دیکھو معاویہ! مصنفین عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو میرے اور تمہارے جیسے انسانوں سے کئی گنا زیادہ گہرائی میں جا کر محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں' اسی طرح انہیں عام انسانوں سے کئی گناہ زیادہ ڈپریشن اور انزائٹی کا سامنا کرنا پڑتا ہے' یہ ڈپریشن اور انزائٹی کب انہیں خالی دنیا میں دھکیل کر شیزوفرینیا کا مریض بنا دے' کوئی کیا کہہ سکتا ہے' ہم سب جانتے ہیں وسامہ کس قدر ڈپریشن کا شکار رہتا تھا' پچھلے چند سالوں میں اس کے تین ناولز ناکام ہو چکے تھے۔ اسے اچھے ریویوز نہیں مل سکے' اس کی کتابوں کا تمام ایڈیشن دیمک کھا گئی یا ردی کی نذر ہو گئے اور پھر میں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا' تم یوں سمجھو' میری ناراضی اس کے نفسیاتی مرض کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوئی ہو گی۔" انہوں نے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن ہر مصنف نفسیاتی مریض تو نہیں ہوتا ماموں!"

"بے شک' میں نے یہ کہا بھی نہیں ہے۔ لیکن کئی نامور مصنف اس mental disorder (ذہنی انتشار) کا شکار رہے ہیں۔ اس حقیقت کو ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔" انہوں نے پھر ٹھوس مدلل انداز میں کہا۔

"اور اس نفسیاتی مرض میں مبتلا افراد میں خودکشی کا تناسب بھی عام انسانوں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔"

معاویہ الجھن آمیز انداز میں سر جھکا کر بیٹھ گیا اور ان تمام باتوں پر غور کرنے لگا جو طالب حسن اسے سمجھانا چاہ رہے تھے۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور بے چارگی سے انہیں دیکھ کر بولا۔

"ان تمام باتوں کے باوجود میں یہ نہیں مان سکتا کہ وسامہ نے خودکشی کی نیت سے تہ خانے میں جا کر خود کو اس

الماری میں بند کیا ہو گا۔" وہ ایسے الجھن آمیز انداز میں بولا تھا جیسے انسان اپنا معافی الضمیر سمجھا نہ پا رہا ہو۔

"وہ امیجنیٹو تھا' اپنے خیالات کو ویژولائز کر لیتا تھا۔ بچپن میں اس کا ایک خیالی دوست بھی تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ ہر بات مجھ سے شیئر کرتا تھا ماموں! وہ ناکام انسان ہرگز نہیں تھا۔ نہ اپنے کیریئر کی ناکامی کو اس نے ذہن پر اتنا سوار ہونے دیا تھا کہ خودکشی ہی کر لے۔"

"میں نے فلک بوس کا جائزہ لیا ہے۔" طالب حسن نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"ہم پہلے بھی کئی بار یہاں آ چکے ہیں۔ ہاں میں مانتا ہوں یہ عمارت بڑے عرصے سے خالی رہی ہے لیکن یہاں کسی آسیب کے کوئی اثرات نہیں ہیں کہا جاتا ہے' جو عمارتیں آسیب زدہ ہوتی ہیں وہاں ایک مخصوص قسم کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے' تم غور کرو فلک بوس میں تنہائی کی خوشبو ضرور ہے لیکن بدبو ہرگز نہیں ہے۔"

معاویہ نے سر جھکا۔ اس کے ماتھے پر الجھن کی سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔

طالب حسن نے بازو بڑھا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور شفقت سے بولے۔

"وسامہ جا چکا ہے معاویہ! اور جن بھی وجوہات کی بنا پر اس کی موت واقع ہوئی' نہیں تم چھوڑ کر اس حقیقت کو تسلیم کر لو کہ اب سب کچھ کا بے فائدہ ہے' کوئی آسیب ہے یا نہیں؟ اس کی کھوج سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا' میں اپنا ایک بیٹا کھو چکا ہوں' تمہیں اس ٹوٹی بکھری حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔" انہوں نے نرمی اور منت سے کہا تھا۔ معاویہ انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

اور وہ سمجھتا تھا اپنا دکھ چھپا کر وہ ان سب کو سہارا دے رہا ہے۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا دکھ تو اس کے چہرے پر لکھا ہوا ہے۔ دنیا سے وہ دکھ چھپا سکتا ہے' اپنوں سے نہیں۔

دروازہ دھیمی سی آہٹ کے ساتھ کھلا تھا۔ صاعقہ ممانی' آئے کت اندر داخل ہوئیں' ان کے پیچھے ٹرالی دھکیلتی خاتون بی بی اور ٹرے اٹھا کر آتے بابا کبیر تھے۔

معاویہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ لوگ ناشتہ کریں' میں کچھ دیر آرام کروں گا۔"

"ناشتہ تو کرو معاویہ!"

"بھوک نہیں ہے ممانی!" وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ سب خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

موسم بدل رہا تھا۔ آم کے درخت کے سارے پتے زرد ہو کر جھڑ رہے تھے۔ دن میں کئی بار جھاڑو لگانے کے باوجود ہر تھوڑی دیر کے بعد صحن میں پتوں کا ڈھیر لگ جاتا جو بدلتے موسم کی خنک ہوا کے ساتھ سارے صحن میں اڑتے پھرتے تھے۔

کچن میں طوفان اٹھا کر خوش نصیب' وہیں بیٹھی تھی اور بددل تھی۔ بیزار تھی اور ساری دنیا کو فنا کر دینا چاہتی تھی۔ پتا نہیں کتنی دیر گزری کہ اسے اپنے پیچھے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔

خوش نصیب نے گردن کو ذرا سی جنبش دی۔ پلٹ کر نہیں دیکھا۔

شامیر چند سیکنڈ کھڑا رہا پھر جینز کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ خوش نصیب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی' دونوں ہی چند لمحے خاموش رہے پھر شامیر نے کہا۔

"گرم قہوہ تمہارے پاؤں پر تو نہیں گرا؟"

خوش نصیب نے آہستہ سے نفی میں گردن ہلائی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"کیا میں کچھ دیر یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"
"اگر فضیلہ چچی اور صیام کو اعتراض نہ ہو تو۔" اس نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"میں پہلے بھی بتا چکا ہوں' اپنے معاملات میں' میں خود مختار ہوں' کسی کی پسند ناپسند سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔" وہ بیٹھ گیا۔
"بائے دا وے' ابھی جو کچن میں ہوا مجھے اس کا افسوس ہے' فضیلہ آنٹی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"
"آپ کے افسوس کرنے سے وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آجائیں گی' اس لیے آپ اپنی انرجی ویسٹ نہ کریں۔" اس نے روکھے پن سے زیادہ بیزاری سے کہا تھا۔
"مجھ سے کیوں خفا ہو؟"
"میں کسی سے خفا نہیں ہوں۔"
"روتی رہی ہو کیا؟"
"خوش نصیب کو رلانے والا ابھی دنیا میں کوئی پیدا نہیں ہوا' البتہ لوگوں کو رونے پر کیسے مجبور کرنا ہے' یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" اس نے اپنے ازلی اعتماد کے ساتھ کہا تھا۔
شامیر بے ساختہ ہنس دیا۔ "آئی لائیک یور کانفیڈنس۔" پھر اچانک اس نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور ایک چھوٹا سا ڈبا خوش نصیب کی طرف بڑھا دیا۔
"یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔"
خوش نصیب نے چونک کر پہلے شامیر کے ہاتھ میں پکڑے ڈبے کو دیکھا پھر اسے دیکھا۔
"یہ کیا ہے؟"
"اسٹابری فلاڈ چاکلیٹس ہیں' مجھے اچھی لگیں تو تمہارے لیے لے آیا۔"
"تھینک یو لیکن...." وہ تذبذب میں پڑ گئی۔
"لے لو خوش نصیب! کوئی اتنا بڑا خزانہ نہیں دے رہا تمہیں کہ تمہیں اتنا سوچنا پڑ رہا ہے۔" اس نے ہنس کر دوستانہ انداز میں کہا تھا۔ خوش نصیب نے جھجکتے ہوئے ڈبا لے لیا۔ "تھینک یو۔"
"ویلکم' ویسے میں تمہیں ایک اور بات بھی بتانا چاہ رہا تھا۔" وہ شرارت سے مسکرا کر بولا۔
خوش نصیب استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"اگر میں تمہیں اچھا لگتا ہوں تو تم مجھے ویسے بھی بتا سکتی ہو' مجھ پر تعویذ کروانے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا تھا لیکن خوش نصیب کے سر پر جیسے آسمان ہی آگرا۔
"تت تعویذ؟ کک کون سے تعویذ؟"
شامیر نے مسکرا کر جتاتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔
"صیام مجھے غلط خبر نہیں دے سکتی۔"
"صیام' وہ تو ایک نمبر کی جھوٹی لڑکی ہے۔"
"اچھا؟ تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔"
"ماننا ہی پڑے گا' میں کیوں کسی پر تعویذ کراؤں گی۔ میں ایسی لڑکی ہی نہیں ہوں جس نے بھی بتایا ہے' غلط بتایا ہے آپ کو۔"
وہ کسی بھی طرح اپنی بات کا یقین نہیں دلا پا رہی تھی۔ سٹپٹائے ہوئے انداز میں اٹھی اور تیز تیز بولتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

"ارے سنو تو" شامیر آواز یں ہی دیتا رہ گیا۔ لیکن خوش نصیب راہداری کے کنارے پہنچ کر مڑی اور جوں ہی اسے یقین ہوا وہ شامیر کی نظروں سے دور ہو چکی ہے۔ سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

✡ ✡ ✡

اگلے تین گھنٹے معاویہ بے مصرف فلک بوس میں پھرتا رہا۔

اونچی چھتوں والے کمرے 'طویل راہداریاں' چھوٹے بڑے خوب صورت لکڑی سے بنے دروازے 'اونچی اونچی فرانسیسی طرز کی منقش کھڑکیاں 'لکڑی کے ستون اور برآمدے 'قدیم طرز تعمیر کا منہ بولتا ثبوت' آگے کو نکلی ہوئی بالکونیاں اور ان پر جھکے ہوئے دلکش چھجے۔ خوب صورت زینے 'ایرانی قالینوں سے ڈھکے ہوئے فرش اور تنہائی کی وہ خوشبو جو پرانی عمارتوں میں ایک فینٹسی کی طرح اڑتی پھرتی ہے۔ اب آسیب زدہ تھا یا منحوس۔ جو بھی تھا لیکن فلک بوس دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

ایسے ہی پھرتا پھراتا معاویہ 'وسامہ کی لائبریری میں آگیا۔ جو کہ دوسری منزل پر تھی۔ یہیں سے وہ آسیب ایک ہیولے کی صورت وسامہ کے تعاقب میں آیا تھا اور وسامہ سیڑھیوں سے گر گیا تھا۔

معاویہ بھاری دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا تو دروازہ کھلنے سے ہلکی سی گرد اڑ کر فضا میں پھیل گئی۔ کمرہ کھلا اور روشن تھا۔ بڑی سی کھڑکی جو اسٹڈی ٹیبل کے بالکل سامنے تھی اور جہاں سے دھوپ براہ راست میز پر پڑتی تھی اس پر اس وقت بھاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ اسٹڈی ٹیبل اور دیگر فرنیچر کو سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ فضا میں گرد کی ہلکی سی مہک رچی بسی محسوس ہوتی تھی لیکن ناگوار بالکل نہیں تھی۔ فرش اور قالین پر گرد کی تہہ جمی ہوئی واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ پروں کے پھڑپھڑانے کی دھیمی سی آواز پر معاویہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کمرے کا ایک اونچا روشن دار تھوڑا سا کھلا رہ گیا تھا جس کے آگے چھوٹے سے چڑیا نما پہاڑی پرندے نے گھونسلہ بنا رکھا تھا۔ ایک لحظہ میں کمرے میں موجود گرد کی وجہ معاویہ کو سمجھ آگئی۔

اس نے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ ایک جھٹکے سے ہٹایا تو روشنی کی موٹی سی لہر کمرے میں داخل ہو کر پھیل گئی۔ معاویہ نے پردہ ہٹا کر کھڑکی بھی تھوڑی سی کھول دی۔ سامنے لیکن دور شام کی وادی تھی اور اونچے ہرے بھرے پہاڑ تھے۔ نیچے فلک بوس کا ڈھلوانی لان تھا اور سفید پری کا تالاب۔ جس کا شفاف پانی تیز دھوپ کی کرنوں سے چمک رہا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا باہر دیکھتا رہا پھر ہاتھ جھاڑتا ہوا کتابوں کی الماریوں کی طرف آگیا جو کمرے کے تین اطراف میں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں بہت سی کتابیں تھیں 'جو بیشتر معاویہ کے مرحوم دادا جان کی ملکیت تھی اور جنہیں بعد میں معاویہ نے بخوشی وسامہ کو دے دیا تھا۔ فلک بوس کی ایک دلچسپی یہ کتابیں بھی تھیں جن کا شوق وسامہ کو یہیں رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ دنیا جہان کے موضوعات پر لکھی ہوئی ان کتابوں کی تعداد اتنی تو ضرور تھی کہ انہیں فلک بوس سے نکال کر کہیں اور رکھنے کے لیے ایک چھوٹے موٹے مکان کی ضرورت پڑتی۔ وسامہ ساری زندگی میں اتنا روپیہ جمع نہیں کر سکا تھا کہ اپنی رہائش کے لیے ایک مکان خرید سکتا تو ان کتابوں کو کہاں رکھ سکتا تھا۔ سو فلک بوس میں آکر رہنے لگا اور فلک بوس کے آسیب نے اس کی جان لے لی۔

معاویہ ہاتھ جھاڑتا کتابیں دیکھنے لگا۔ اس ڈھیر میں سے پڑھنے کے لیے کوئی ایک کتاب منتخب کرنا بھی بہرحال ایک کام ہی تھا۔

طالب ماموں کی بات درست تھی۔ کتابوں کے اس ذخیرے میں حیات مابعد الموت پر کافی مواد موجود تھا۔ لیکن پڑھنے کے لیے اس نے ڈاکٹر کرنگٹن کی invisible world (غیر مرئی دنیا) کا انتخاب کیا اور کتاب لے کر اسی طرح کھڑے ہو کر پڑھنے لگا۔ کچھ پل سرکے۔ معاً اسے اپنے پیچھے سرسراہٹ سی محسوس ہوئی 'وہ سرعت

سے پلٹا۔ پیچھے آئے کت کھڑی تھی۔
"تم؟" وہ چونک گیا۔
آئے کت کی پیشانی سے فکر مندی کی سلوٹیں چھٹ گئیں۔
"میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔" وہ جیسے اسے سامنے پاکر پر سکون سی ہو گئی تھی۔
"لیکن تم اندر کیسے آئیں؟" معاویہ کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال بچھ گیا۔
"دروازے سے۔" اس کا انداز آئے کت کو ہراساں کر گیا تھا۔
"لیکن دروازہ تو بند تھا۔" اس نے سرسراتے لہجے میں کہتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بس اتنا سا کھلا تھا کہ ہوا کا گزر ہو سکے۔ کسی انسان کا گزر جانا مشکل تھا۔ اس کے دل میں شک کا ناگ کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔
آئے کت سٹپٹا سی گئی تو جلدی سے بولی۔
"نہیں معاویہ! دروازہ کھلا ہوا تھا' یہ جو اتنا سا بند ہو گیا ہے وہ بھی اندر آتے ہوئے مجھ سے بے دھیانی میں ہوا ہے۔" اس نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے والے انداز میں کہا تھا۔
شک کا ناگ پوری شدت سے پھنکارنے لگا لیکن آئے کت کی بات کا یقین نہ کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ بھی نہیں تھی۔
"تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟ کیا تمہیں مجھ پر شک ہے؟" اس نے مجروح لہجے میں کہا تھا۔
معاویہ شرمندہ سا ہو گیا۔ پتا نہیں وہ دل کی کیفیت کو چہرے پر آنے سے روک کیوں نہیں پا تا تھا۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے رخ موڑا اور کتاب واپس الماری میں رکھ دی۔
"تمہیں مجھ سے کوئی کام تھا؟"
آئے کت کو بلاشبہ معاویہ کے رویّے سے تکلیف پہنچی تھی۔ اس نے گہری سانس بھر خود کو بولنے پر آمادہ کیا تھا۔
"میں تمہیں کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔"
"بتاؤ؟"
"کیا ہم اس کمرے سے باہر جا کر بات کر سکتے ہیں؟" آئے کت نے منت بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔
"اس کمرے میں وسامہ کا بہت وقت گزرا ہے اب وہ یہاں نہیں ہے تو۔" درودیوار کو دیکھتے اور اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے اس نے جیسے بے بسی سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا اور ردو طلب نظروں سے معاویہ کو دیکھا تھا۔
معاویہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے چلنے کا عندیہ دیا۔ آئے کت دروازے کی طرف بڑھی اور وہ دونوں آگے پیچھے چلتے کمرے سے باہر آ گئے۔
معاویہ نے بڑی احتیاط سے پیچھے دروازہ بند کر دیا تھا۔ کمرے کے سامنے کوئی چھ فٹ چوڑا برآمدہ تھا جس کے کنارے پر ساگوان کی لکڑی کا چھجا بنا ہوا تھا۔ جو نیچے گول لاؤنج نما کمرے کی طرف جھکتا تھا۔
وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ چلتے چلتے معاویہ اردگرد بھی نظریں دوڑا رہا تھا۔ اور برآمدے کے گول چکر کے ساتھ ساتھ اس کی نظریں گھوم رہی تھیں۔
"میں نے وہ مری ہوئی گلہری دیکھی ہے' اس کا سر بھی ٹھیک اسی انداز میں کٹا ہوا ہے جیسے ان گلہریوں کا سر کٹا ہوتا تھا جو وسامہ کو ملتی تھیں۔" پریشانی' بے بسی سے آئے کت نے کہا تھا۔
معاویہ کے سر پر جیسے فلک بوس کی چھت آ گری تھی۔
"اس کا مطلب ہے؟"

"مجھے نہیں پتا اس کا کیا مطلب ہے۔" آئے کت نے بے بسی سے کہا تھا۔
"یہ محض ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور.... اور نہیں بھی۔" وہ حد درجہ الجھن زدہ لگ رہی تھی۔
"میں عجیب کشمکش میں پھنسی ہوئی ہوں معاویہ! ابھی میرا دل چاہتا ہے میں یہاں سے کہیں دور بھاگ جاؤں اور مڑ کر کبھی فلک بوس کی شکل نہ دیکھوں۔ لیکن جیسے ہی میں یہاں سے جانے کا سوچتی ہوں کوئی طاقت میرے قدم جکڑ لیتی ہے اور میرا دل کہتا ہے جہاں وسامہ کی یادیں ہیں مجھے وہیں رہنا چاہیے۔" ابھی اس نے یہیں تک کہا تھا کہ معاویہ تیزی سے برآمدے کی گرل تک چلا گیا۔
اسی برآمدے کے سامنے والے حصے میں اسے کوئی ہیولہ سا دکھائی دیا تھا۔ کالے ملبوس میں لپٹے ہوئے کسی وجود کو اس نے خود پردے کی اوٹ سے نکل کر راہداری کی طرف جاتے دیکھا تھا۔
"اے کون ہے وہاں؟" معاویہ نے وہیں سے بے اختیار چلا کر کہا تھا۔ معاویہ کی آواز نے فلک بوس پر چھائی خاموشی کو توڑ دیا تھا اور اس کی آواز سارے میں پوری شدت سے گونجی تھی۔ جوں ہی اس کی آواز بلند ہوئی وہ ہیولہ تیزی سے بھاگا اور راہداری کے سرے پر غائب ہو گیا۔ معاویہ کے جسم میں ایک انجانی سی طاقت بھر گئی تھی۔ وہ پوری قوت سے اس ہیولے کے تعاقب میں بھاگا۔
آئے کت ہکا بکا سی اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ "معاویہ رکو۔ میری بات سنو۔"
لیکن وہ بھاگتا ہوا اس راہداری تک پہنچ گیا جہاں اسے ہیولہ دکھائی دیا تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ راہداری دور دور تک ویران پڑی تھی۔
آئے کت اس کے قریب پہنچ کر ہانپنے لگی۔
"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیوں پاگلوں کی طرح بھاگ رہے تھے؟"
"میں نے ابھی یہاں کسی کو دیکھا تھا۔" اس نے پریشانی سے کہا۔ "یہاں کوئی تھا میں نے خود دیکھا ہے۔"
آئے کت دم بخود رہ گئی۔
"لیکن مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔"
"یہ کیسے ممکن ہے؟ ہم دونوں ایک ہی جگہ کھڑے ہوئے تھے وہ یہاں سامنے سے گزرا اور۔" ہیجان کے عالم میں بولتا بولتا وہ ایک دم سے رک گیا تھا۔ کھٹ سے آ کر ذہن کے دالان میں ایک خیال گزرا تھا۔
"میں سمجھ گیا۔" اس نے بے قراری سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ "میں سمجھ گیا یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"
وہ ایسے بولتا ہوا نارمل نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تر تھا اور غم و غصے سے لال ہو رہا تھا۔ شور سن کر طالب ماموں اور صاعقہ ممانی بھی وہاں آ گئے تھے۔
"کیا ہوا معاویہ! تم چیخ کیوں رہے تھے؟" وہ دونوں سخت پریشان تھے۔
"معاویہ نے ابھی یہاں پر کسی کو دیکھا ہے؟ لیکن ہمارے آنے سے پہلے ہی وہ بھاگ گیا۔" آئے کت نے پریشانی کے عالم میں انہیں بتایا۔
"بھاگا نہیں ہے غائب ہوا ہے۔ ایسے جیسے دھوئیں کا کوئی بادل ہو۔" معاویہ نے کہا۔
طالب ماموں اور صاعقہ ایک ساتھ چونکے۔
"اس کا مطلب وسامہ غلط نہیں کہتا تھا کچھ تو ہے جو فلک بوس میں گردش کرتا ہے۔" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"کبیر سے کہیں ڈرائیور کو بلوا کر گاڑی تیار کروا دے ہم شام سے پہلے یہاں سے نکل جائیں گے۔" صاعقہ

ممانی نے سرسراتے لہجے میں طالب حسن سے کہا تھا۔
"کوئی یہاں سے نہیں جائے گا۔" معاویہ نے تیزی سے کہا۔
"جب تک میں اس آسیب کا پتا نہیں چلا لیتا کوئی یہاں سے جانے کا نام نہیں لے گا ممانی!" اس نے کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا زینہ عبور کر گیا۔
وہ تینوں وہیں پریشان کھڑے رہ گئے۔
"معاویہ کو سمجھائیں، وہ تو پاگل ہو رہا ہے۔ مافوق الفطرت قوتوں سے کون لڑ سکتا ہے بھلا۔" صاعقہ ممانی سب سے زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھیں۔
"کیوں پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو؟ میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ آسیب جیسی کوئی چیز نہیں ہے یہاں۔ وسامہ کا وہم تھا بس۔" طالب حسن ناراضی سے بولے تھے۔
آئے گت جواب تک اس طرف دیکھ رہی تھی جس طرف معاویہ گیا تھا اس نے کہا۔
"اور اب یہی وہم معاویہ کے دل میں بیٹھ گیا ہے۔" اس کا لہجہ فکرمندی سے سرسرا رہا تھا۔
"وسامہ نے بھی ایسی ہی باتیں کرنی شروع کر دی تھیں اسے بھی اٹھتے بیٹھتے سائے دکھائی دیتے تھے آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔"
"ہمیں واقعی یہاں سے چلے جانا چاہیے' اس سے پہلے کہ قسمت مزید کوئی نقصان ہمارے کھاتوں میں ڈال دے۔" اس کا مبہم خوف میں ڈوبا ہوا لہجہ وانداز ان دونوں کو ہی بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اوپر چھت پر آکر وہ بے قراری سے ٹہلنے لگی۔
"یہ کیا غضب ہو گیا اس کمینی صیام کو کیسے پتا چلا میں نے عامل بابا سے تعویذ لیا ہے؟" وہ یہاں سے وہاں ٹہلتی جا رہی تھی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔
"اور اگر پتا چل ہی گیا تھا تو شامیر کو بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہائے وہ کیا سوچتا ہو گا میرے بارے میں' تیرا بیڑہ ترے صیام! ہونہہ ہو اس چڑیل نے بالکونی کی تلاشی لی ہو گی' بندہ پوچھے جو تعویذ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر بالکونی کے کاٹھ کباڑ میں گرا اور خود مجھے ہی دکھائی نہیں دیا اس تک وہ صیام کیسے پہنچ سکتی ہے۔ اس کی نازک طبیعت نے اسے اس کاٹھ کباڑ میں ہاتھ ڈالنے کی اجازت کیسے دی ہو گی' ہائے میں کیا کروں؟ اگر صیام کو پتا ہے تو ممکن ہی نہیں فضیلہ چچی کو خبر نہ ہو اور اگر فضیلہ چچی بھی یہ بات جانتی ہیں تو تو اس کا مطلب عنقریب میری شامت آنے والی ہے۔ میری بے عزتی کروانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے تو نہیں دے سکتیں۔"
گھبراہٹ' بے چینی اور شرمندگی سے اس کا برا حال تھا۔
اپنی ہی جھونک میں ٹہلتے اسے پتا ہی نہیں چلا کب کمرے سے روشن امی نکلیں اور اسے خود سے باتیں کرتا دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئیں۔
خوش نصیب ان کے قریب پہنچ کر ٹکراتے ٹکراتے بچی۔
"یہ اکیلی کس سے باتیں کر رہی ہو؟" انہوں نے الجھ کر پوچھا۔ آواز میں نقاہت اور چہرے کی رنگت میں زردی گھلی تھی۔
"کک' کسی سے بھی نہیں۔" وہ صاف مکر گئی۔
"تم کسی سے تو بات کر رہی تھی خوش نصیب! میں تمہاری آواز سن کر ہی باہر نکلی ہوں۔" انہوں نے حیرانی سے

پوچھا کیونکہ واقعی اس کی آواز تو آرہی تھی۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی روشن امی! میں تو یہاں اکیلی ہوں اور اکیلے میں کون باتیں کرتا ہے۔" وہ دانت نکال کر بولی اور صاف ہی مکر گئی۔

"اور آپ کو میں نے کہا بھی تھا کہ آج سارا دن آپ بستر سے نہیں اٹھیں گی۔ چلیں، چلیں واپس جا کر لیٹیں۔" وہ زبردستی انہیں اندر لے جانے لگی۔

"میں بیماری میں بھی اتنی دیر نہیں لیٹ سکتی خوش نصیب! تمہیں پتا ہے مجھے دیر تک فارغ رہنے کی عادت نہیں ہے۔" انہوں نے لاچاری سے کہا۔

"عادت نہیں ہے تو اب عادت ڈال لیں۔" اس نے روشن امی کو کندھوں سے پکڑ کر ان کا رخ کمرے کی طرف موڑتے ہوئے کہا تھا اور پھر ان کے ہزار اعتراضات کے بعد بھی اس نے انہیں دوبارہ بستر پر لٹا کر ہی دم لیا۔ اور خود ان سے دوپہر کے کھانے کے لیے ہدایتیں لے کر باہر آگئی تھی۔ ناشتہ بنانے پر کچن میں جو کچھ ہوا' اس کا ذکر وہ سرے سے ہی گول کر چکی تھی۔ آج دراصل اس کے پاس بہت اہم معاملات تھے جن پر غور کرنا اور ان کا کوئی مناسب حل نکالنا اس کے لیے ازحد ضروری تھا۔ کمرے سے باہر آکر اس نے کچھ دیر سوچا۔

"صیام سے جا کر کچھ بھی کہنے سے بہتر ہے میں سید حاشامیر کے پاس جاؤں اور تعویذ والی بات سے صاف مکر جاؤں۔" اچانک سے اسے ایک بہتر حل نظر آنے لگا تھا۔

"بالفرض اگر تعویذ صیام کے ہاتھ لگا بھی ہے تو کون سا اس پر میرا نام لکھا ہو گا کہ وہ کوئی ثبوت پیش کر سکے۔" اس نے چٹکی بجا کر سوچا اور تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ آخری تاریخوں کا ایک چوتھائی چاند قوس کی طرح آسمان کے شفاف سینے پر دمک رہا تھا۔ ستارے دھیرے دھیرے قریب ہو رہے تھے۔

ہوا جیسے سروں سے دبے پاؤں چلتی تھی۔ جنگل کی طرف سے جانوروں کی آوازیں آنا بھی بند ہو گئی تھیں۔

فلک بوس خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسے میں معاویہ کے کمرے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھلا۔ اندر سے اس نے سر باہر نکال کر احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا۔ کمروں کے آگے بنی ہوئی راہداری دور تک ویران پڑی تھی۔ سامنے والے کمرے میں طالب ماموں اور صاعقہ ممانی سکونت پذیر تھے۔ سامنے کی ہی داہنے ہاتھ پر آئے کت کا کمرہ تھا۔

سر پر پہنی ہوئی پی کیپ ٹھیک کرتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے احتیاط سے دروازہ بند کیا اور دبے پاؤں چلتا راہداری سے باہر نکل آیا۔

اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا جس کی بناوٹ ایسی تھی جیسے اس میں کوئی ٹھوس چیز رکھی گئی ہو۔

ایک راہداری سے نکل کر وہ دوسری میں داخل ہوتا چند ثانیے کے لیے رک کر دور تک نظریں دوڑاتا پھر اگلا قدم اٹھاتا تھا۔ راہداریاں' دالان اور ایسے ہی کئی راستے عبور کر تا وہ فلک بوس کے درمیانی حصے میں پہنچ گیا۔ یہ وہی جگہ تھی' جہاں وسامہ کی زندگی میں ایک عامل صاحب نے بیٹھ کر آسیب کو بھگانے کے لیے چلہ کاٹا تھا اور خود اس آسیب کے ہاتھوں مار کھا کر واپس بھاگ گئے تھے۔

پرانے زمانے کے مکانات کے صحن کی طرح کا یہ گول سا احاطہ تھا۔ جس کا فرش مضبوط پتھروں سے بنا ہوا تھا' جس کے چاروں اطراف برآمدے کی سیڑھیاں آتی تھیں' بالکل درمیان میں ایک آرائشی پودا لگا ہوا تھا' جس

کے گرد پکی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ یہ ہندوانہ طرز تعمیر تھا کسی دور میں شاید یہاں مورتیاں بھی رکھی جاتی تھیں۔ فلک بوس جن نواب صاحب کی ملکیت رہا تھا ان کی ایک زوجہ محترمہ ہندو بھی تھیں اور فلک بوس کا یہ حصہ شاید انہیں کے زیر تصرف رہا ہوگا۔

فلک بوس کا حق ملکیت معاویہ کے دادا کے پاس آنے کے بعد یہاں کافی تبدیلیاں کروادی گئی تھیں 'غالباً' اسی دور میں وہ مورتیاں بھی ہٹادی گئی ہوں گی جن کا یہ استھان اس صحن میں تعمیر کیا گیا تھا۔ فلک بوس سے جڑی ہوئی ایک روایت یہ بھی تھی کہ اس ہندو عورت کو بھی یہیں قتل کیا گیا تھا جس کی روح اب فلک بوس پر قابض ہوئی بیٹھی تھی۔ بہرحال ستون کی آڑ میں رک کر معاویہ نے وہ چھوٹا سا بیگ کھولا اور اس میں سے جدید ٹیکنالوجی کا ایک ہاتھ کے برابر کیمرہ برآمد کیا۔ اس کیمرے کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کچھ تار بھی تھے۔ معاویہ نے اپنی پی کیپ میں نصب چھوٹی سی ٹارچ نما لائٹ جلائی اور احتیاط کے ساتھ ان تاروں کو کیمرے میں جوڑنے لگا۔

اپنا کام کرتے ہوئے وہ مستقل ادھر ادھر بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ معاً" اس کے پیچھے کسی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ معاویہ اپنی جگہ سے اچھل کر پلٹا کیمرہ اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔

معاویہ کے ڈرنے پر پیچھے کھڑی آئے کت کے لیے اپنی بے ساختہ امڈتی ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ فلک بوس کے سناٹے میں اس کی مدھر ہنسی کسی جھرنے کا سر بن کر گونجنے لگی۔

"سوری۔" وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے جیسے اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

معاویہ جو خفت کے مارے ٹھیک ٹھاک ناراض ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔ کسی کی ہنسی اتنی مدھر بھی ہو سکتی ہے؟ کوئی ہنستے ہوئے اتنا خوب صورت بھی لگ سکتا ہے؟

"سوری معاویہ! میں تمہیں ڈرانا نہیں چاہتی تھی۔" وہ ابھی بھی مسکرا رہی تھی اور اس مسکراہٹ کو چھپانے کی تگ و دو میں ہلکان ہوئی جاتی تھی۔

معاویہ نے بمشکل اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور سنجیدگی سے کیمرے کے تار جوڑتے ہوئے بولا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"یہی سوال میں تم سے پوچھنے والی تھی۔" آئے کت نے اس کا موڈ بھانپ کر اب قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"فلک بوس میں تو دن کی روشنی میں اکیلے گھومتے ڈر لگنے لگا ہے.... تم بڑے جی دار ہو جو اتنی رات کو اکیلے پھر رہے ہو۔"

معاویہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور بولا۔

"مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا.... اس آسیب کا تو میں بہت برا حشر کرنے والا ہوں۔" وہ جذباتیت سے بولا تھا۔

آئے کت نے اس کی بات پر ایک گہری سانس لی جیسے کہہ رہی ہو وقت تمہیں سب سمجھادے گا۔ پھر ذرا اس سے قریب ہو کر ہاتھ میں پکڑے کیمرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ ڈیجیٹل کیمرہ ہے...."

"وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے لیکن تم اس کے ساتھ کر کیا رہے ہو؟"

"اسے میں یہاں لگا رہا ہوں۔" کیمرے میں تار جوڑ کر اس نے کیمرے پر لگا چھوٹا سا مک بند کر دیا 'اب یہ کیمرہ ایک چھوٹی سی چمگادڑ کی طرح دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے بعد معاویہ نے اپنے چھوٹے سے بیگ سے ایک لیدر بیلٹ جیسی چیز برآمد کی' اس کا ایک سرا اپنی کمر کے گرد لپیٹا اور دوسرا ستون سے باندھ دیا ایک ہاتھ سے کیمرہ پکڑے دوسرے ہاتھ سے بیلٹ کا سہارا لیے وہ ستون پر رینگتا ہوا چڑھا۔ اور دس منٹ کی محنت کے بعد چمگادڑ کی شکل کا وہ

کیمرہ اس نے ستون کے ساتھ نصب کر دیا۔ کیمرہ اس نے ایسے لگایا تھا کہ جہاں آئے کت کھڑی تجسس سے سر اٹھائے معاویہ کو اپنا کام کرتے دیکھ رہی تھی' وہاں سے کیمرہ ہرگز نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔
معاویہ نے احتیاط سے نیچے اتر کر ہاتھ جھاڑے' کیمرے کو مہارت سے لگا دینے پر وہ خوش اور پرجوش نظر آ رہا تھا۔
"اس بھٹکی ہوئی روح کا راز عنقریب کھلنے والا ہے....." اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اوراوپر کیمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں نے ایسے ہی کیمرے فلک بوس کے کچھ اور حصوں میں بھی لگا دیے ہیں۔ ان کی ریکارڈنگ میرے لیپ ٹاپ پر شو ہوتی رہے گی۔ اور اگر واقعی کوئی آسیب بن کر پہلے وسامہ کو اور پھر ہمیں ڈرا رہا ہے تو میں اسے دیکھ لوں گا۔"
"میرا خیال ہے تمہیں اپنی کامیابی کا اتنا یقین نہیں رکھنا چاہیے۔" آئے کت نے آہستہ سے کہا تھا۔
"اگر وہ کوئی انسان ہے تو یقیناً" ریکارڈنگ ہو جائے گی لیکن اگر وہ واقعی کوئی سپر نیچرل چیز ہوئی تو.....؟" اس کا لہجہ اب خوف سے سرسرا رہا تھا۔
"اول تو مجھے یقین ہے وہ کوئی انسان ہی ہے....." معاویہ نے کہا۔
"اور اگر ایسا نہیں ہے تو بھی ہمیں پتا چل جائے گا' اس کیمرے میں بڑے پاورفل لینسز لگے ہوئے ہیں۔ جو روشنی کی تیز سے تیز لہر کو بھی کیچ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔" معاویہ نے پرجوش لہجے میں لیکن دبی ہوئی آواز میں اسے بتایا۔
"خدا تمہیں کامیاب کرے۔" آئے کت نے صدق دل سے دعا دی۔ ایک نظر کیمرے کی طرف دیکھا اور وہ دونوں اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دیے۔
ایک چھوٹا سا جگنو روشنی کی ننھی سی کرن بن کر فلک بوس کے تاریک صحن میں چکر کاٹنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

خوش نصیب اب شامیر کے کمرے کے باہر متذبذب سی کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں وہ ڈبا تھا جو تقریباً" ڈیڑھ گھنٹہ قبل شامیر نے اسے بطور تحفہ دیا تھا اور دوسرا ہاتھ بار بار دستک کے ارادے سے اٹھ کر دوبارہ پہلو میں گر جاتا تھا۔ کسی کو جا کر اپنی صفائی پیش کرنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک کام ہوتا ہے اور خوش نصیب یہ کام کرنے چلی آئی تھی۔
بہرحال اس نے ہمت مجتمع کی اور دروازے پر ہلکی سی دستک دے ڈالی۔ اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔
لیکن دوسری طرف خاموشی ہی رہی۔ ایسا لگتا تھا اندر کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ اگلی بار خوش نصیب نے زیادہ زور سے دستک دی۔ دروازہ لاک نہیں تھا سو ہلکی چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ خوش نصیب نے اندر نظر ڈالی۔ اندر نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔
"شاید شامیر موجود نہیں ہے' میں چاکلیٹس اندر میز پر رکھ دیتی ہوں۔"
یہی سوچ کر اس نے دروازے کو دھکیلا اور اندر چلی آئی۔ اندر نیم تاریکی میں آتی سردیوں کی خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ خوش نصیب میز کے پاس آئی اور کرسی کے بالکل سامنے کچھ اس رخ پر چاکلیٹ کا ڈبا رکھا کہ اندر آتے ہی شامیر کو نظر آ جائے۔ اس نے ڈبے کا زاویہ دو تین بار درست بھی کیا' پھر جوں ہی مطمئن ہو کر پلٹنے لگی' میز پر داہنے ہاتھ پڑی ایک کتاب اس کی نظر میں آ گئی۔

خوش نصیب بری طرح چونک گئی۔ کتاب کے سرورق پر ایک خوفناک چہرہ بنا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا اس چہرے میں آگ بھڑک رہی ہے۔ نیچے کتاب کا ٹائٹل لکھا تھا Demons The Angry Spirits۔

اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر وہ کتاب اٹھالی اور اس چہرے کو غور سے دیکھنے لگی۔ کتاب اٹھاتے ہی اس میں سے چند صفحات نیچے گر گئے۔ خوش نصیب کو کتاب کے سرورق پر بنے چہرے کو دیکھ کر خوف آرہا تھا اس نے کتاب جلدی سے رکھ دی اور جھک کر وہ صفحات اٹھانے لگی جو زمین پر گرے تھے۔ لیکن برا ہوا اس وقت کا۔ جب اس نے شامیر سے ملنے کا ارادہ کیا تھا۔

وہ صفحات بھی اس نے بے دھیانی میں کھول کر دیکھے اور اسے ایک بار پھر ایسا لگا جیسے آسمان اس پر ٹوٹ کر گر رہا ہو۔ کاغذ پر گول دائروں کی صورت میں کوئی گراف بنا ہوا تھا جس میں اردو' انگلش اور کسی نامعلوم رسم الخط میں اعداد لکھے ہوئے تھے۔ گراف کے درمیان میں ایک عجیب سا چہرے کا اسکیچ بنا ہوا تھا ایسا لگتا تھا جیسے کوئی انسانی چہرہ پوری قوت سے چیخنے کی کوشش کر رہا ہو اور وہیں اس کا چہرہ منجمد کر دیا گیا ہو۔

خوش نصیب کے دل میں ایک دم سے بڑی تیز اور زور آور لہر پیدا ہوئی۔ کچھ غلط ہونے کا احساس بہت شدید تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

جب وہ میز پر کسی اور چیز کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی۔ اسے اپنے کان کے بالکل قریب شامیر کی آواز سنائی دی۔ وہ اچھل کر پلٹی ڈر کے مارے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور لہراتا ہوا پیروں میں گر کر ساکت ہو گیا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو خوش نصیب؟"

شامیر اپنی بے تحاشا لال آنکھیں اس کے چہرے پر جمائے کھڑا تھا۔ خوش نصیب کا دل بے ہنگم دوڑنے لگا اور حلق اتنا خشک ہو گیا کہ کانٹے سے چبھتے محسوس ہونے لگے۔

"وہ... مم' میں' میں..." وہ اتنا ڈر چکی تھی کہ بول بھی نہیں پا رہی تھی۔

"تم ڈر کیوں رہی ہو؟" اپنی لال انگارہ آنکھوں کے ساتھ وہ ذرا سا مسکرایا۔

خوش نصیب اپنے پیچھے رکھی میز پر دونوں ہاتھوں کے سہارے مزید پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی اثنا میں اس کا ہاتھ کتاب سے جا ٹکرایا۔ بے ساختہ اس نے وہ کتاب اٹھالی۔

"یہ کیا ہے؟" ڈرتے ڈرتے اس نے کتاب شامیر کے سامنے کی۔

شامیر نے کتاب اس کے ہاتھ سے لے لی' لیکن اپنی آنکھوں کو ایک پل کے لیے بھی خوش نصیب کے چہرے سے ہٹنے نہ دیا۔ بلکہ خوش نصیب کو تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پلکیں بھی نہیں جھپک رہا۔ اور یک ٹک اسے دیکھ رہا ہے۔

"یہ راستہ ہے... میری منزل تک پہنچنے کا۔" شامیر نے ہلکی آواز میں اور اتنے اجنبی لہجے میں کہا تھا جیسے وہ شامیر نہ ہو بلکہ کوئی اور ہی ہو۔

"کیسا راستہ؟ کون سی منزل؟"

"جنات تک پہنچنے کا راستہ..." وہ اس کے کان کے بالکل قریب جھک آیا اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"تم چلو گی میرے ساتھ؟ اس راستے پر؟" وہ سرگوشی کر رہا تھا اور نیم تاریک ماحول میں خوش نصیب کا معصوم سا دل خوف کی دلدل میں دھنستا چلا گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

"چھوٹے چاچو فری ہوں گے چلو ان کے پاس چلتے ہیں۔" یہ صلاح مروا کی تھی' وہ باقی کزنز کو سمیٹتی چاچو کے کمرے میں پہنچ گئی تھی' جہاں چاچو دادا جی کے حکم پر نواڑی پلنگوں کی قطار لگائے انہیں بننے میں مصروف تھے' جھاڑ پونچھ بھی انہوں نے اکیلے ہی کی تھی' صاف چمکیلے پایوں والے پلنگ کہیں سے بھی پرانے نہیں لگ رہے تھے صفائی کرنے والے ماہر ہاتھوں نے انہیں چمکا دیا تھا۔

حماد' ذیشان اور فری' بڑی تیز طرار بھابی کے بچے تھے اور درمیان والی چلتر فرحین بھابی کی مروا اور سلمان پانچوں قطار بنائے کھڑے تھے جو باری باری ان کی منتیں کیے جا رہے تھے کہ انہیں آئس کریم کھلانے لے جایا جائے مگر وہ شام کا وعدہ کر کے دوبارہ کام میں مگن ہو گئے تھے۔ گرمیوں کی آمد آمد تھی کمروں میں مچھر مکھی کے راگ راگنیاں سنانے کا آغاز کر چکے تھے اور ابا جی کو ساری چارپائیاں سارے پلنگ تیار چاہیے تھے ایک دم تیار۔ وہ صبح سے برس رہے تھے کہ کسی کو خیال ہی نہیں کہ سب باہر صحن میں سوئیں گے کیسے' نہ پنکھے صاف کیے نہ چارپائیاں ٹھیک کی ہیں بد تہذیب اولاد" وہ غصے سے دھاڑے۔

دادا جی کو غصہ ہر وقت آتا تھا اور بے حد آتا تھا۔ چھوٹے چاچو ان کے حکم کی تعمیل کے لیے ہمیشہ ہی اٹھتے تھے' آج بھی اٹھے تھے اکیلے اسٹور سے سارے پلنگ نکالے اور کام شروع کر دیا تھا کوئی نہیں جانتا تھا کہ انہوں نے کھانا بھی کھایا تھا کہ نہیں۔ سب کو یہ نظر آ رہا تھا کہ پلنگ انہوں نے کسی نہ کسی طرح نکال لیے تھے۔

بڑا عماد اور چھوٹا عباس دونوں باہر کسی کام سے نکلے ہوئے تھے چھوٹے چاچو جن کا نام دادی نے مغیث علی رکھا تھا مگر وہ انہیں ببلی کہتی تھیں' کتنی ہی بار انہوں نے ٹوکا بھی مگر دادی اس پیار کے نام سے دستبردار ہونے کو نہیں آتی تھیں چھوٹے چاچو نے ایم اے' بی کام اور نجانے کیسے کیسے کورس کر رکھے تھے نوکری اچھی تھی مگر ان کی بوسیدہ حالت سے ہرگز بھی یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ بہت اچھا کماتے ہیں۔

بھابیاں مہینے کے مہینے شکل دکھاتیں۔ بڑی فرحین محبت سے بال سنوارتی اور اپنی کم تنخواہ کا رونا رو رو کر ان کا پیٹرول تک کا خرچا لے جاتی چھوٹی بھی ہر مہینے ایسے ہی صفایا کرتی تھی پھر دونوں لڑ پڑتی تھیں بالآخر ساری تنخواہ آدھی آدھی کرنے والا فیصلہ ہو گیا۔

چاچو جی لڑائی جھگڑے اور تنگ دستی دور کرنے کو اوور ٹائم کرنے لگے اپنا خرچا صبر شکر کر کے نکالنے لگے مگر ان کی صحت گرتی چلی گئی' کھانا کچن سے مل گیا تو کھا لیا نہیں تو سو گئے' وہ کسی کو اپنے کپڑے دھونے کی بھی تکلیف نہیں دیتے تھے۔ دادا جی اور دادی جی کے کپڑے بھی چپکے سے دھو کر تہ کر کے رکھ دیتے۔

چھوٹی بھابی کے بچوں کو ہوم ورک کروانا' چھوٹے بچوں کو چپ کروانا ہو۔ دوائی پلانی ہو' وہ سگھڑ سیانی خواتین کی طرح سالن پکانے سے لے کر چھوٹے موٹے بٹن لگانے تک ماہر تھے' چھوٹی بھابی کی کمر میں درد ہوتا وہ حاضر ہوتے۔ بڑی بھابی کا بی پی لو ہوتا وہ اچھا سا پلاؤ بنا لیتے۔

سب کی زندگی میں سکھ بھرنے والے چاچو سب کا خیال رکھتے تھے۔ بڑی بہن کے بچہ ہوا تھا انہوں نے آفس سے کچھ لون لے کر اچھی سی چھوچھک تیار کی۔ بہنوئی بہن کے جوڑے لیے گئے۔ چھوٹی کو ساس نے

فریج نہ لانے کا طعنہ مارا تو وہ کئی دن تک پلاننگ کرتے پھرے کہ وہ کیسے آپی کی ساس کا منہ بند کریں۔ بالآخر ایاز اپنے کولیگ کے توسط سے ایک اچھی کمپنی کا فریج قسطوں پہ مل ہی گیا اور ساس کا منہ بند ہو گیا تھا۔

دادی جی بلائیں لیتے نہ تھکیں اور بہن نے خوشی سے لال چہرے سے رونا شروع کر دیا تھا ایک ہی بھائی تھا جسے ان کا خیال تھا جو بھائی تھا تو بھائی بن کے دکھایا بھی تھا' بڑے عباس اور عماد کی طرح بے حس نہیں جنہیں اپنا بینک بیلنس بنانے اور نت نئی چیزیں خریدنے سے ہی فرصت نہیں تھی یہ اور بات تھی کہ فریج کی قسط اور لون والے پیسوں کی ادائیگی نے ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے کر دیا تھا مگر فرائض کی ادائیگی اور ماں کی دعائیں انہوں نے سمیٹ لی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ابا جی کا غصہ تھا تو سوا نیزے پر مگر انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ چھوٹے چاچو نے بہن کو کس درد سے نکالا تھا انہوں نے تو بچپن سے محنتی سے چاچو کے ذمے ہر کام لگا کر مطمئن زندگی گزاری تھی۔

بڑی بھابی نے اچار کے لیے لسوڑے تڑوانے ہوں اچار کے لیے تیل منگوانا ہو چھوٹی بھابی نے باریک قیمہ جو ایک دم تازہ اور تندرست جانور کا ہو اس کی تلاش میں بھی چھوٹے چاچو ہی نکلتے۔ آج کیا پکنا ہے اور کس جگہ سے کیا سستا ملتا ہے اور کیسا مل سکتا ہے یہ بھی چاچو کو پتا ہو تا دادی کے پاؤں دبانے کو بھی رات گئے تک چھوٹے چاچو ہی میسر ہوتے وہ فرماں بردار جو تھے باقی دو کو پروا نہیں تھی'

چھوٹے چاچو کو بتا دیا تو ٹھیک ورنہ بچوں کی طرح ناراض ہوتے شکوہ کرتے پائے جاتے۔ کچن میں تب تک بڑبڑ کرتے رہتے جب تک کہ کوئی آکر منا نہیں لیتا۔ وہ چپ نہیں ہوتے تھے مہینے کے مہینے بھابیاں آکر دکھ سکھ بانٹتیں اور غائب ہو جاتیں کیونکہ پیسے مل جاتے تھے۔ بٹ جاتے تھے برابر اور چاچو اتنے گھٹیا اور گرے پڑے نہیں تھے نہ سوچ چھوٹی تھی کہ بڑوں کی طرح اپنی بیوی کے لیے بھی کچھ بنوا کے چھپ چھپا کے رکھ لیتے۔

بڑے اور چھوٹے نے تو دو دو تولے کے کنگن نکالے تھے اور ماں کئی دنوں تک کلستی رہی تھی چھوٹے چاچو نے تو اتنی بددعائیں اور اماں کو دکھ میں دیکھ کر کنگن تو کیا شادی کا نام لینا بھی گناہ سمجھ لیا تھا۔ بہنوں کے دکھ سکھ میں پیش پیش رہتے' ادھر سے پکڑے ادھر سے مانگے اپنے لیے سستے سے کپڑے' سیل والی جوتی اور سگریٹ پان کی عادت نہیں تھی سب کچھ بچ بچا کر سب کو خوش رکھتے مایوس کسی کو نہ کیا۔

یہ اور بات تھی کہ احسان نہ بیاہی بہنوں نے مانا' نہ بھائیوں نے بلکہ پیسوں اور چیزوں میں ذرا سی دیر ہوئی تو بے حسی کا خطاب' دوسرے کو زیادہ دینے کا طعنہ فٹ سے دے مارتے۔ مگر چھوٹے چاچو نے کبھی برا نہیں مانا وہ برا ماننے والے تھے بھی نہیں بہنوں کے بچوں کی چھوچھکوں پہ چھوچھک تیار کرتے اور بروقت پہنچاتے رہے بلکہ کئی بار بھابیوں کے لیے دائی کا انتظام بھی رات گئے انہوں نے کیا۔ پریشانی میں ٹہلتے پھرے۔ اپنے بھتیجے بھتیجیوں کی پریشانی بھائیوں کے گھروں کے بکھیڑے۔

وہ اپنی ذات میں انجمن تھے بہت بڑی انجمن۔ جس میں خود ان کی اپنی ہی گنجائش نہیں تھی۔ حماد ذیشان اور فری وغیرہ چھوٹے چاچو سے پیسے بھی اینٹھتے تھے۔ بڑوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی اپنے چھوٹے چھوٹے مسائل لے کر ان کے پاس ان کے کمرے میں آتے' جہاں وہ لوہے کا بڑا صندوق پلنگ کے نیچے رکھے لیٹے ہوتے۔

(وہ اپنے کپڑے اسی صندوق میں رکھتے تھے) اور اپنے دکھ درد بیان کر کے کچھ نہ کچھ مانگ کر لے جاتے اور پھر باغیچے میں بیٹھ کے چھوٹے چاچو کو بیوقوف بنانے کے قصے ایک دوسرے کو سناتے اور محظوظ ہوتے مگر مرو اب سولہ سال سترہ سال کی تھی۔

وہ بچپن سے چاچو کو اسی طرح دیکھتی آئی تھی' کسی

کو چاچو کی فکر نہیں تھی وہ سب کی فکر میں اپنے آپ کو بھول چکے تھے۔ اسے ان پر ترس آتا تھا۔ کبھی دادی چاچو کو باتیں سناتیں تو کبھی دادا، کبھی بھابی اپنی پریشانیاں شیئر کرتیں اور وہ آبدیدہ ہو جاتے۔ وہ نجانے کہاں کہاں اوور ٹائم کرتے تھے۔

بچے اچھے سکولوں میں پڑھتے تھے، اچھا کھاتے پہنتے تھے مگر ان کے رونے پھر بھی کم نہیں ہوتے تھے۔ وہ شوہروں کے بجائے چاچو کو تھکاتی تھیں وہ جان مارتے تھے حقیقت میں اور حاصل کچھ بھی نہیں کوئی خوش نہیں تھا۔

مروا ان سے پیسے نہیں مانگتی تھی بلکہ ان کے لیے کھانا چھپا کر رکھتی تھی، رات گئے جب وہ لوٹتے تو کچن میں مروا ہی انہیں ملتی جو کھانا گرم کرتی اور چائے بنا دیتی۔ وہ ایسے سادہ تھے کہ اپنا اس طرح خیال رکھے جانے پر بھی شرمندہ ہو جاتے۔ وہ کماتے تھے تو ان کا بھی کوئی حق تھا مگر انہوں نے خود کو پہچانا ہی نہیں، پڑھ لکھ کر گنوایا تھا بس۔

کبھی کبھار وہ اکتا جاتے، انہیں ذرا سا غصے میں دیکھ کر دادی چڑھ دوڑتیں "ہاں کرلے تو بھی شادی' تیرے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں جو بڈھا بڈھی پر ضائع ہو رہے ہیں چھوڑ دے بھئی ہمیں جتنا کھلایا ہے احسان ہے تیرا۔" دادی کی اس بات پر وہ اپنے بال نوچ لیتے، یہی بات انہیں کئی سالوں تک خاموش کروانے کی تدبیر تھی۔ وہ طعنہ نہیں سن سکتے تھے یہ بات برداشت نہ تھی اور ان کی یہ خامی سب کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بے قصور ہو کر بھی مجرم بن جاتے اور وہ واقعی مجرم تھے اپنے مجرم۔

ان کے سامنے اپنے سفید ہوتے بال تھے، وہی بچے جن کی پیدائش پہ وہ فکر مند تھے آج ان کی شادیوں کی بات چیت چل رہی تھی اور ان کے بارے میں کسی نے نہیں سوچا تھا، سب کو اپنے عیش اور سکون کی فکر تھی ان کی نہیں کسی طرح نہیں۔

✲ ✲ ✲
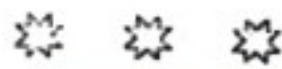
پھر چاچو کو محبت ہو گئی تھی عنایہ سے۔ عنایہ ان کی مصروف سی زندگی میں یوں داخل ہوئی کہ انہیں خود بھی خبر نہ ہو سکی تھی، دل عجب لے پر دھڑکنا شروع ہو گیا تھا، ایک سرد سی شام فرحین بھابھی نے انہیں نسرین خالہ کے ہاں بریانی دینے بھیجا تھا وہیں ان کی ملاقات عنایہ سے ہوئی، اس کا رسمی سا انداز انہیں بے اختیار کر گیا تھا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھے تھے۔

"دل بغاوت میں ہے۔"

ان کی واپسی بھی بڑے بوکھلائے ہوئے انداز میں ہوئی تھی۔ ہر وقت مصروف رہنے والے چاچو اب کھوئے کھوئے رہتے۔ ایک دم سے سب کو فکر مندی نے گھیر لیا تھا، سارے کام "تلپٹ" ہونے لگے تھے اور وہ جو سنجیدہ سنجیدہ پھرا کرتے تھے' ایک دم سے ہنستے مسکراتے پائے جا رہے تھے، بے رونق چہرہ بہار کی آمد کا پتا دیتا تھا۔

عنایہ کوئی بہت خوب صورت لڑکی نہیں تھی۔ پچیس چھبیس سال کی خوش مزاج سی لڑکی تھی اور اوپر سے پڑھائی کا تڑکا۔ وہ بلا کی شوخ لڑکی تھی مگر بری نہیں تھی، اسے بھی چاچو اچھے لگے تھے مگر چاچو کی طرح ہوش نہیں اڑے تھے۔ نسرین خالہ' عنایہ کی طرف سے فکر مند تھیں مگر چاچو کی طرف سے وہ اکیلے ہی فکر مند تھے۔ ایک دھماکا تھا جو سب کے پرخچے اڑا کے رکھ گیا تھا' سب تڑپ اٹھے تھے بہنیں فون پہ ہیلو ہیلو کرتی رہ گئیں، بھابیاں آنکھیں پھاڑے' صدمے سے چاچو کو دیکھے جا رہی تھیں' دادی عنایہ کو کوسنے میں مصروف تھیں۔

مروا نے دیکھا اور چاچو کی ہلکی سی ضد نما التجا۔ مروا نے سنی جو کسی نے نہیں کبھی نہ سنی۔ سب ان کے ہمدرد بنے انہیں سمجھا رہے تھے' زمانے کے حالات گوش گزار کر رہے تھے اور وہ بے بس ہو کر ہار رہے تھے۔

پلک پہ آ کے سوچا کہ اب کدھر جائے
سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو گر پڑا آنسو

ان کے خواب ٹوٹ کے پلکوں پہ ٹکے تھے' سب اپنے اپنے گھروں میں آباد تھے۔ وہ کیوں نہیں' کیا محبت کرنا ان کا حق نہیں تھا عباس بھائی نے محبت کی محبت کا دم بھرا۔ عماد اور فرحین نے زور دار عشق کے بعد زبردستی امی سے منوایا تھا مگر وہ کب تک دوسروں کا بوجھ اٹھائے پھرتے۔

وہ تو یہ بوجھ شادی کے بعد بھی اٹھانا چاہتے تھے گوئی ان پر یہ نیا حسین بوجھ بھی آنے دے مگر سب کے سپاٹ چہرے اور دادی کی التجاؤں' بد دعاؤں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا' وہ سب کے درمیان گھرے بیٹھے تھے اور چپ تھے۔ سب دیکھ رہے تھے ٹوٹ کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"چاچو' چاچو ادھر دیکھیں' مروا کی ہلکی سی آواز ان کے کانوں میں آئی تھی' وہ ان کے کمرے کے سامنے دادی سے چھپ کے انہیں بلا رہی تھی' وہ جلدی سے چپل پہن کر باہر آگئے۔ اس نے جلدی سے انہیں بازو سے پکڑا تھا اور چپ رہنے کا اشارہ کرتی' آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی' وہ بھی بادل نخواستہ آ ہی رہے تھے۔ پتا نہیں کیا دکھانا تھا' وہ اوپر ہی جانا چاہتے تھے مگر مروا نے انہیں وہیں روک لیا تھا اوپر فرحین اور ثمینہ بھابی (اس کی امی) محو گفتگو تھیں۔

"بد ھونہ ہو تو بخار ہوا ہے شادی کا' اس سڑی شکل والے کو کیا سوجھی اچھا خاصا کھیل بگاڑ دیا اس مردود عنایہ نے اور یہ بدبخت مغیث کب سے ہیرو سمجھنے لگا خود کو' اے بھائی روک لو اس کو ورنہ تو یہ گیا ہاتھ سے۔"

سب سے محبت کی چاہ رکھنے والے چاچو دھڑام سے نیچے آگرتے جو مروا انہیں سنبھال نہ لیتی۔

وہ قدموں کی چاپ سمیٹے آرام سے نیچے اتر آئے تھے۔

"سن لیا چاچو آپ نے خیر خواہوں کی باتیں' کچھ ایسے ہی خیالات پھوپھو اور دادی کے بھی ہیں۔ اب تو یقین آگیا نا۔ آپ کو' منہ بنا کے بولے گئی۔

اس رات چھوٹے چاچو ساری رات نہیں سوئے۔ دوسروں کے لیے نہیں اپنے لیے۔ کیا مستقبل تھا ان کا ان کے جیسے بدھو کا' وہ واقعی بدھو تھے اب تک بے وقوف بنتے آئے تھے۔ مروا سمجھاتی تھی ڈھکا چھپا کہتی بھی تھی مگر وہ ہی ان سنی کر دیا کرتے تھے۔

بڑی بھابی چھوٹی بھابی سب کے چہرے کتنے خوفناک تھے' یہ انہیں آج پتا چلا تھا' اپنے سے آدھی سے بھی کم عمر بھتیجی نے وہ راہ دکھائی تھی جو انہوں نے کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح ہی صبح وہ تیار ہوئے تھے' بڑی بھابی نے میٹھے میٹھے تیر مارنا شروع کیے تھے' چھوٹی نے بنا لاگ لپٹ کے مہنگائی کا رونا رونا شروع کیا تھا مگر وہ اپنے بال ترتیب سے جما رہے تھے بس۔ دونوں نے بچوں اور شوہروں کے لیے میز سجائی تو وہ بھی بنا ناشتہ کے جانے کے' بیٹھ گئے اور اچھی طرح ناشتہ کر کے اٹھ گئے' آج انہیں کوئی اوور ٹائم نہیں کرنا تھا' بس اک کام کرنا تھا' نسرین خالہ کی طرف جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

عنایہ اور چھوٹے چاچو کی شادی زیادہ دھوم دھام سے نہیں ہوئی تھی بملی سے آج وہ مغیث احمد ہو گئے تھے کوٹ پینٹ میں آج ان کے جیل سے جمے بال اور ہی چھب دکھلا رہے تھے۔

گیٹ پر اک کار آکے رکی تو ماورا بجی سجائی کار میں جا گھسی۔ اور چاچو کو چاچی کے ہمراہ دیکھ کر چیخ اٹھی۔ انہوں نے عنایہ کا ہاتھ تھاما اور اندر چلے آئے' آج کمرا ویسا ہی تھا مگر سارے سامان نے آکے سیٹ ہو جانا تھا۔ دادی' بھابی' بچے سب حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔ دادا نے آکر دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا' انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی مگر باقیوں نے نہیں۔

چاچو کے مضبوط قدم بتاتے تھے کہ آسرا دینے والے کو بھی آسرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی حسین آسرے کی!

☼

زندگی جب اختتام پذیر ہو
میں خدا کے سامنے کھڑی ہوں
اور امید کروں کہ کوئی صلاحیت
اب مجھ میں باقی نہیں رہی
اور خدا سے کہہ سکوں
میں نے وہ سب لے لیا، جو تو نے دیا تھا۔

وہ سہج سہج قدم رکھتی لڑکی اچانک رکی اور اپنی پھولی ہوئی جالی دار فراک کو ایک جانب سے ہلکا سا اٹھاتے، دوسرے ہاتھ کو آسمان کی جانب بلند کرتے وہ "نے" میں گم ہو گئی۔ اس نے کچھ نہیں چھپایا۔ اس نے اپنے ہاتھ اور جھولی اللہ کو دکھانا چاہی جو ہر طرح سے خالی تھی۔ وہ آدم میں سے تھی تو آدم ہونے کا حق ادا نہ کرتی کیا؟ اپنے ہونے کے وجود کو تلاش نہ کرتی کیا؟

وہ آج وہاں موجود تھی۔ اس کے سامنے، جسے وہ سفر کے آغاز پہ، اولین دنوں میں ہی ایک کنویں میں دھکیل چکی تھی۔ جسے وہ ساتھ لیے کبھی آگے نہیں بڑھی تھی۔ نہ اسے یاد کیا، نہ یاد آنے دیا، مگر وہ سالوں بعد بھی اسے ڈھونڈتی اس تک آ پہنچی تھی۔

یہاں... جہاں وہ کھڑی تھی، یہاں اسے نہیں ہونا چاہیے تھا، پھر بھی وہ یہاں موجود تھی۔ مسکراتے ہوئے، اس کا مذاق اڑاتے ہوئے وہ اس کا امتحان بن کر آئی تھی، اس نے بھی امتحان ہی دیا پھر۔

"میں تو تمہیں دفنا آئی تھی۔" وہ اس کی موجودگی پہ حیران تھی اور اس نے اپنی حیرت چھپانے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ قہقہہ لگا کے ہنس دی۔

"تو میں تمہیں اتنے برس یاد رہی۔" اس کے پہچاننے نے اسے مسرور کیا تھا۔

"انسان جس کا قاتل ہو، اسے کبھی بھولتا ہے کیا؟" اس نے نفرت سے دیکھا اور "نفرت" نے اسے محبت سے۔

صرف "وہی" کیوں وہاں تھی۔ اس کے اندر تو بہت کچھ رہا تھا۔ شاید وہ باقی سب کے مقابل اس میں زیادہ رہی تھی۔ جتنی وہ زیادہ رہی تھی، اتنی مضبوط کھڑی تھی۔

"یہ لمحہ تو وہ ہے جس کا تم نے سالوں انتظار کیا ہوگا۔ تم اس لمحے کو میرے بغیر کیسے گزار سکتی تھیں؟ میں اس لمحے میں گزرا ہوا ہر لمحہ لوٹانے آئی ہوں۔ وہ سب جسے تم بھول رہی ہو۔" وہ جو بھیانک تھی، کیسی خوب صورت بن کر سامنے آئی تھی۔

"میں ماضی کا کوئی حصہ، نہ حال میں چاہتی ہوں نہ ہی مستقبل میں۔" وہ سخت لہجے میں کہتی پلٹی۔

"تم ماضی کو کیسے بھول سکتی ہو؟" اسے جیسے اس پر غصہ آیا۔

"ماضی اسی قابل ہوتا ہے کہ اسے بھلا دیا جائے۔" اس نے جتنے پیار سے اپنے شانے پہ آتے بالوں کو جھٹکا تھا، اتنے ہی پیار سے اسے لاجواب کیا تھا۔

"دیکھو... وہ سامنے، وہاں وہ سب موجود ہیں۔" نفرت سلگنے لگی۔ شہماہ کو اس کا یوں سلگنا بہت بھایا تھا، وہ اس کی خصلت تھی جو وہ دوسروں کو منتقل کرتی تھی، شہماہ کو اسے اس تک ہی رکھتے ہوئے خود کو بچانا تھا۔

"وہ سب میرے بلانے پر ہی یہاں موجود ہیں۔" اس نے بھی دیکھے بغیر ہی جواب دیا۔ دیکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی بھلا؟ دیکھے بنا بھی وہ جانتی تھی کہ کون کہاں کھڑا، بیٹھا ہے۔

"انہوں نے تمہیں رد کیا؟"

"مجھے نہ یاد ہے، نہ ہی پروا۔" شانے اچکاتے وہ لاپروا سی بن گئی۔

"اور وہ سب وہاں بیٹھے ہیں، جنہوں نے تمہاری تذلیل کی۔" اس نے ان سب کی جانب اشارہ کیا۔

"ذلت رب نے اپنے پاس روک کے رکھی اور مجھے عزت سے نوازا۔" وہ ہنوز لاپروا بنی رہی، جیسے وہ بیٹھے ہیں تو بیٹھے رہیں۔

"ان میں سے کسی نے تب تمہارا ساتھ کیوں نہ دیا؟ جواب ساتھ نبھا رہے ہیں۔" وہ بھڑک بھڑک کر جلنے لگی اور اس کا چہرہ کھلنے لگا۔

شہماہ نے سامنے کی نشستوں پہ بیٹھے ان سب پہ نگاہ ڈالی اور ——— ایسے مسکرائی، جس پہ سب مر مر جاتے۔

"نہ کسی نے مجھے اٹھانا تھا، نہ کوئی مجھے گرا پایا۔ نہ میں رکی، نہ میں جھکی۔"

وہاں بہت سا شور تھا، تالیوں کی گونج، سر بکھیرتا ساز اور دور گونجتی آوازیں... ان ہی آوازوں میں اس کے اپنوں کا نام گونجا۔

"ان کا حوالہ آج تم بن رہی ہو، جو کبھی تمہارا حوصلہ نہ بن سکے۔" ایک مکروہ قہقہہ ——— گونجا۔ جو پہلے اس کا مذاق اڑا رہی تھی، اب خود مذاق بنتی جا رہی تھی۔

"وہ ان کی بدقسمتی رہی ہوگی شاید... یہ میری خوش قسمتی ہے یقیناً۔" وہ بھرپور انداز سے مسکرا دی۔

اس کی نفرت... نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"تم نے یہ کہاں سے سیکھا شہماہ... جب تک میں تم میں تھی، تم یہ سب نہیں جانتی تھیں۔" حیرت کی کوئی انتہا تھی تو "وہ" تھی۔ اسٹیج پر اس کا نام پکارا جا رہا تھا۔ شہماہ۔ اس کا جانا اب فرض تھا اور جواب دینا اس پہ قرض دونوں کی ادائیگی واجب تھی۔

"تخلیق کے اصولوں میں پہلا اصول ہے محبت، تخلیق محبت بنا ادھوری اور تخلیق کار اپنی تخلیق بنا اور سب سے بڑا تخلیق کار وہ رب ہے جو ہر تخلیق کار کو محبت سے یہ سب سکھاتا ہے۔ تمہارے ہوتے میں یہ سب کیسے سیکھ سکتی تھی۔ جہاں نفرت ہو، وہاں پھر محبت کا کیا کام؟"

ایسا پیارا جواب وہ نہیں دے سکتی تھی۔ یہ وہ نہیں تھی، یہ وہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ سالوں پہلے کی روتی بسورتی، بددعائیں دیتی، نفرتیں لٹاتی لڑکی، وہ تو بڑی شان سے بڑھ رہی تھی۔ اس کی نفرت، وہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ وہیں کہیں ماضی میں...

شہماہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

چھتیس انچ کی پلازمہ اسکرین پر بہت سے رنگ اور شہابی چہرے جگمگا رہے تھے، مگر وہاں کوئی بھی اسکرین کی جانب متوجہ نہیں تھا۔ اس کی سکے والی پنسل بڑی

تیزی اور مہارت سے کاغذ پر کچھ بنا رہی تھی۔ گھنگھریالے بال گیلے ہونے کے باعث کمر پر کھلے پڑے تھے، جن سے چند ایک لٹیں اس کے چہرے پہ گرتی آنکھیں چھپا رہی تھیں۔ وہ بار بار انہیں کان کے پیچھے اڑستی پورے انہماک سے پنسل چلائے جا رہی تھی۔ اس کا ارتکاز لمحے بھر کو نہیں ٹوٹا تھا، مگر ٹوٹا تو بہت ٹوٹا۔

اسکرین پہ بہت جوش میں ایک نام پکارا جا رہا تھا۔ ایک بڑا نام اور اس کا کام..... کالے سکے والی سرخ پنسل چلنے سے انکاری ہو گئی۔ اس نے باقاعدہ سر گھما کر اپنی پشت پہ لگی پلازمہ اسکرین کو دیکھا جہاں بڑے پیمانے فیشن شو چل رہا تھا۔ فیشن انڈسٹری کا بڑا نام 'اپنے کام اور ماڈلز کے ساتھ تالیوں کی گونج میں ایک بڑے اسٹیج پہ کھڑا تھا۔ گیارہ سالہ شہر ماہ کو فیشن انڈسٹری کی کوئی سوجھ بوجھ نہ تھی، مگر یہ سب اسے چونکا رہا تھا' ابھار رہا تھا' اتنا اور اس حد تک کہ اس کا اپنا کام کہیں بیچ میں رہ گیا تھا۔

"رمیض بھائی! یہ ڈیزائنر کیا ہوتا ہے؟" اس نے سامنے صوفے پہ لیٹ کر کتاب میں گم اپنے اٹھارہ سالہ تایا زاد سے پوچھا۔ سر کتاب کی دنیا سے اٹھاتے رمیض کو اس مداخلت پہ سخت کوفت ہوئی۔ ایک نظر پلازمہ اسکرین پہ پڑی تو دوسری استعجابیہ دیکھتی شہر پہ، منہ کے زاویے عجیب ٹیڑھے میڑھے سے ہو گئے۔

"جو کوئی آئیڈیا ڈیزائن کرے پھر اسے۔ بنا بھی ڈالے۔" بے زاری سے دیا گیا جواب۔

"مطلب؟" وہ پنسل انگلیوں میں پھنسائے' ہاتھ ھوڑی تلے رکھے بڑے اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ گویا رمیض کی بے زاری کو محسوس بھی نہ کیا ہو اور اگر محسوس کر بھی لیا گیا ہو تو کچھ اہمیت نہ دی ہو۔

"اپنا خیال کاغذ یا کمپیوٹر پہ بنا کر اسے حقیقت میں ڈھالتے سچ کر دکھاؤ۔" وہ کچھ دیر سوچ کر بولا ...... تو اس نے شہر کے لب "واؤ" والے انداز میں کھول دیے۔

"ڈیزائنر تو بہت کمال کا ہوتا' پھر۔" وہ خاصی سے زیادہ مرعوب نظر آ رہی تھی۔

"ہوتا ہو گا۔" وہ پھر سے کتاب کھولنے لگا تھا کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر اس کے برابر آ بیٹھی۔

"کس کس کے ڈیزائنر ہوتے ہیں؟"

"ہر چیز کے.... کپڑوں سے لے کر جیولری حتیٰ کہ گھر تک کے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے اٹھی تو رمیض کو لگا کہ اس کے سوالات کا سلسلہ ختم ہوا۔ وہ پھر سے کتاب اٹھانے کا ابھی ارادہ ہی کر رہا تھا کہ وہ اپنی اسکریپ بک، جسے وہ اکثر لیے پھرتی تھی' اٹھائے پھر سے چلی آئی۔

"کیا ڈیزائنر ایسے ڈیزائن بناتے ہیں؟" رمیض جو پڑھنے کے ارادے سے بڑی فرصت سے بیٹھا تھا' جانتا تھا کہ اب اس گھر کی شہر' اگلے ایک گھنٹہ اسے کچھ نہیں پڑھنے دے گی۔ اس نے کوفت کا شکار ہوتے ہوئے ایک نظر اس کی اسکریپ بک پہ ڈالی اور نظر ہٹانا بھول گیا۔ وہ بے یقینی سے صفحے پہ صفحے پلٹتا گیا۔ عروسی مغربی طرز کے گاؤن جن کی فال بڑی خوب صورتی سے آبشار جیسی اوپر سے نیچے گرتی' بل کھاتی' مختلف رنگوں' کاموں سے مزین..... ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت اور شان دار.....

"شہر! یہ سچ میں تم نے بنائے ہیں؟" وہ اس درجے مہارت پہ حیران تھا اور شہر انجان۔

"آپ کو پسند آئے؟" وہ اپنے ڈیزائن دکھاتے معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

"پسند..." وہ اس ایک لفظ پہ قریباً" چیخ ہی پڑا تھا۔

"پسند بہت عام لفظ ہے ان کے آگے۔ یہ بے مثال ہیں۔"

"سچ۔؟" وہ اتنی بہت سی تعریف پہ پھٹنے والی ہو گئی۔

"شہر تم نے یہ سب کہاں سے دیکھا؟"

"اس میں دیکھنے جیسا کیا ہے؟ یہ سب بنانا تو بہت ہی آسان ہے۔ میں پورا دن یہی سب تو کرتی ہوں۔" اور اپنا اتنا اہم راز یوں افشا ہونے پہ اس نے لبوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔

رمیض اسے گھورنے لگا۔ "اگر تم اتنا شان دار کام

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

نہ کررہی ہوتیں تو آج تمہاری خیر نہیں تھی۔"
"تو کیا ڈیزائنوز بھی ایسے اچھوتے خیالات کو کاغذ پہ اتارتے ہوں گے۔" وہ پُرجوش تھی۔
"ایسا ہی کچھ ہوتا ہوگا۔"
"مطلب میں ڈیزائنو بن گئی؟" اب کی بار دبی دبی سی چیخ اس کے حلق سے برآمد ہوئی تو قہقہہ رمیض کے حلق سے۔۔۔
"لو! ایسے نہیں بن جایا کرتے ڈیزائنو۔"
شہر نے باقاعدہ برا سامنہ بنالیا۔
"تو پھر کیسے؟"
"اس کے لیے پڑھنا پڑھتا ہے، کام سیکھنا پڑتا ہے، محنت کرنا ہوتی ہے جیسا کہ۔۔۔" اس کی بات اس نے بیچ میں سے کاٹ دی۔
"یہ اچھے نہیں ہیں کیا؟ ابھی تو آپ انہیں بے مثال کہہ رہے تھے۔ اب مثالیں کہاں سے لانے لگے؟" اسے برا لگا، بلکہ بہت برا۔
"شہر! یہ بہت اچھے ہیں، مگر تمہاری عمر کے لحاظ سے۔۔۔ ابھی ان میں بہتری کی گنجائش ہے۔ تمہیں ان پہ محنت کرنا ہوگی۔ انہیں معیاری بنانا ہوگا۔" شہر جلدی جلدی اپنا — سامان سمیٹنے لگی۔ منہ تھا کہ غبارے سا پھولا ہوا، آنکھیں تھیں کہ بہنے کو تیار۔۔۔ وہ سامان اٹھائے چل پڑی۔
"شہر!" وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس بارے میں اس قدر حساس ہوگی، ورنہ جھوٹا ہی سہی اسے دلاسا دے دیتا۔
وہ پل بھر کو رکی، مڑکر اسے دیکھا گہری سانس لی اور اپنے آنسوؤں کو روک کر بولی۔
"میں یہ سب کروں گی جو جو آپ نے کہا، وہ سب مگر میں ڈیزائنو ہی بنوں گی۔"
رمیض حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا اور وہ جو ہمیشہ اپنی اسکریپ اور اسکیچ بکس اٹھائے تایا ابو کے ہاں پائی جاتی تھی، اس دن کے بعد سے رمیض نے اس کو کبھی اسکیچز بناتے نہیں دیکھا۔ وہ اسکیچز بنانا

چھوڑ چکی ہوگی، یہ خیال رمیض کو چھوڑ دینے کی ضرورت تھی کہ وہ شہواہ تھی۔ اکھڑ، ضدی۔۔۔
رمیض کو آتے جاتے وہ نظر آجاتی۔ کبھی ٹیرس پہ، کبھی لان میں، تو کبھی سیڑھیوں پہ، وہ اسے دیکھ کر ان دیکھا کردیتی۔
رمیض بھی ان دنوں اپنے انٹری ٹیسٹ کی تیاری میں بے حد مصروف تھا، سو وقت نہ نکال سکا کہ اس کی ایک آدھ کلاس ہی لے ڈالے۔ پھر جن دنوں اس کا ایڈمیشن ہوچکا تھا، اتفاق سے ٹھیک ان ہی دنوں وہ ایک شام مکمل فراغت پا کے اپنے کمرے میں اپنی ادھوری کتاب — پڑھنے بیٹھا تھا کہ وہ آگئی۔ کچھ گھبرائی اور کچھ کچھ روئی سی۔ اس کے ہاتھوں میں اسکیچ بکس کا ڈھیر تھا کہ وہ نازک سی لڑکی ان کے نیچے دب گئی تھی۔
"مجھے آپ سے فیور چاہیے؟" نہ سلام، نہ دعا، نہ جانے کتنے مہینوں بعد وہ اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ وہ بھی روٹھی روٹھی سی۔
"آؤ شہر بیٹھو۔۔۔" کتاب اس نے ایک طرف رکھ دی۔
"میں بس یہ اسکیچ بکس دینے آئی ہوں، آپ انہیں سنبھال لیں۔ میں جب مناسب سمجھوں گی، انہیں لے جاؤں گی۔" اس نے بدقت اپنی بات مکمل کی اور اپنی اسکیچ بکس کو قریباً ٹیبل پہ گرا ڈالا۔
"کچھ ہوا ہے کیا؟ مجھے بتاؤ، بیٹھ کے بات کرلیتے ہیں۔" رمیض نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا جسے اس نے نظرانداز — کردیا۔
"آپ پلیز کسی کو بھی مت بتایئے گا۔"
"ارے یہ کون سا دنیا کے نوادرات میں سے ہیں کہ انہیں کوئی چرالے گا۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا جس پہ شہر کی آنکھوں میں واضح برہمی در آئی تھی۔
"میری دنیا کی نوادرات میں سے ہی ہیں۔" پہلے کی نسبت وہ کچھ سختی سے بولی۔
"اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔ آئی ایم سوری۔" اس نے

ہاتھ اٹھاتے ہوئے فوراً" اپنی غلطی تسلیم کرکے اس کا اثر زائل کرنا چاہا۔ "میں انہیں بہت سنبھال کر رکھوں گا اتنا ہی جتنا ان کو سنبھالنے کا حق ہے۔"

ایک اطمینان تھا جو اس نے شہر کی آنکھوں میں اترتے دیکھا تھا۔ ممنونیت، احسان مندی، پھر وہ تیزی سے پلٹ گئی۔

اور اس دوران وہ رضائی میں دبکے روشاک کو دیکھ نہ سکی جو رضائی میں سے ہلکی سی درز بنا کر بڑی دلچسپی سے اسے یوں رونے کے بعد اب سوں سوں کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے نکلتے ہی رضائی سے منہ باہر نکالے حلق پھاڑ پھاڑ کر ہنسنے لگا۔

"شرم کر کچھ....." رمیض نے تاسف سے سر ہلایا۔ شرم اور وہ کرتا؟ اس سے بہتر تھا رمیض توبہ کر لیتا اور رمیض نے توبہ ہی کی پھر۔

"اُف..... اُف..... اُف..... میں تو قسم سے شرم کر کرکے ہی اتنی دیر خاموش رہا۔ اب اور شرم نہیں ہو پا رہی مجھ سے....." وہ ہنس ہنس کر دہرا ہوا جا رہا تھا۔

رمیض شہر کی اسکیچ بکس دیکھنے لگا۔ چند ماہ پہلے کے دیکھے گئے اور اب کے بنائے گئے اسکیچز میں بہت فرق تھا۔

✡ ✡ ✡

اور اگلی رات ہی معاملہ ان پہ کھل گیا جب رات کے کھانے پہ وہ سب چاچا جی کے ہاں مدعو تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پہ سب معمول کے مطابق تھا، سوائے چاچا جی کے موڈ اور شہر کی صورت کے.....

"مبارک ہو رمیض بھائی ایڈمیشن کی، مگر خالی خولی مٹھائی سے کام نہیں چلے گا۔ ٹریٹ دینا پڑے گی۔" مہاہ اسے دیکھتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

"کیوں نہیں..... جب کہو، جہاں کہو۔"

"تم نہیں چلو گی شہر؟" روشاک کی زبان میں، خاموشی سے کھانا کھاتی شہر کو دیکھ کر کھجلی ہوئی۔ یوں بھی عرصے بعد وہ بورڈنگ ہاؤس سے گھر آیا تھا۔

"اس پہ ابھی پابندی ہے۔" مہاہ کھانا کھاتے اس انداز سے بولی جس نے بیک وقت روشاک کو مزا دیا تو شہر کو سلگا دیا۔ شہر نے کھا جانے والی نظروں سے کھانے کے بجائے مہر کو دیکھا تو رمیض نے روشاک کو، دونوں نے ہی ان نظروں کو نظرانداز کر دیا۔

"وہ کیوں؟" روشاک تو ایسا مسکین بن کر پوچھنے لگا، جیسے نہ کچھ سنا نہ دیکھا۔

شہر کو تپانے میں تو وہ مزا تھا جس پہ وہ چاچی جی کی بنائی بریانی اور امی کے بنائے کوفتوں تک کی قربانی دے سکتا تھا۔

"کیونکہ بچوں کو پہلے سیکھنا چاہیے کہ انہیں کیا اور کیسے کرنا ہے۔ پھر ہی ان پہ آزادی جچتی ہے۔" مہر جو محض چار برس شہر سے بڑی تھی، اس کے منہ سے یہ سب شہر کو سننا اچھا نہیں لگا۔

وہ پلیٹ غصے سے سرکاتی ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھ جاؤ شہر....." اماں نے اسے گھرکا۔ اماں کا من پسند کام۔

"آپ کی بیٹی کے طعنوں نے پیٹ بھر دیا میرا۔ مزید گنجائش نہیں ہے۔" وہ بھاگ کر باہر نکل گئی۔

"جانے دو اسے، بہت دماغ خراب ہو چکا ہے اس کا۔" چاچا جی نے چاچی جی کو ڈپٹا۔ وہ بے بسی سے وہیں بیٹھ گئیں۔

"میں جا کر دیکھوں اسے؟" روشاک نے بھائی کے کان میں سرگوشی کی۔ رمیض نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ روشاک سر کھجاتے، کہنے لگا۔

"اس بار تو میں سیریس تھا۔ چلیں جیسے آپ کی مرضی..... ویسے وہ کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے، نہیں؟"

رمیض، ابو اور چاچا جی کی طرف دیکھتا ان کی باتوں پہ یوں سر ہلا رہا تھا گویا سب سن کر ازبر کر رہا ہو۔ کان تو روشاک کی بک بک پہ لگے تھے جو منہ ہی منہ میں کچھ اس انداز سے بولتا کہ اسے اپنا اور شہر کا کوئی پرانا جھگڑا سنا رہا تھا کہ اس کے لب دیکھنے میں بالکل ساکت لگتے اور

محسوس ہوا گویا معصوم بچہ کب سے خاموش بیٹھا کھانا کھاتے بس بور ہی ہوئے چلا جارہا ہے۔

رمیض کھانے کے بعد قہوہ لے کر باہر لان میں چلا آیا جہاں وہ بیٹھی رونے کا شغل فرما رہی تھی۔ یہ نیا مشغلہ حال ہی میں اپنایا تھا ان محترمہ نے' ورنہ وہ خاصی ڈھیٹ واقع ہوئی تھی۔

وہ سیڑھیوں پہ اس کے برابر آکر بیٹھ گیا اور خاموشی سے اسے سوں سوں کرتے سنتا رہا۔

"ہوا کیا ہے؟" جب اس کی سوں سوں میں کچھ کمی آئی تو رمیض نے پوچھنے کی جسارت کرڈالی۔ اس نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا کہ ہوا کیا ہے؟ بس ابا کل میرے اسکول گئے تھے اور جب واپس آئے تو ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیسے اور کن الفاظ میں ڈانٹیں۔ بس کل سے صرف ڈانٹے چلے جارہے ہیں۔"

"اوہ... تمہاری کسی ٹیچر نے شکایت لگادی ہوگی۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں سب کی فیورٹ ہوں' پرفیکٹ ہوں۔ میری شکایت تو کوئی لگا ہی نہیں سکتا۔ بس ابا آتے ہی' فرماتے گئے اور ان کی وہ "تھانے داری" میرے کمرے کی تلاشی لیتی' میری ہر شے تباہ کرنے لگ گئی۔ لیکن وہ میری اسکیچ بکس تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ اب محفوظ ہیں۔" اس نے اتنے یقین سے کہا جتنا خود رمیض بھی اپنے پر نہ کرسکتا تھا۔

"اب تم مجھ سے خفا نہیں ہو؟"

"میں کب خفا تھی؟"

"اتنے مہینوں سے تم ہمارے ہاں نہیں آئیں۔"

"تو اتنے مہینوں سے آپ نے بھی تو مجھے نہیں بلایا۔"

"میں کیسے بلاتا' جب تم آئی ہی نہیں۔"

"تو آپ یہاں آکر بلالیتے۔" وہ بن کر بولی۔ رمیض ہنس پڑا۔

"شوکی ٹھیک کہتا ہے کہ..." اس کی بات شہر نے بیچ میں کاٹ دی۔

"آپنے اس بھائی کا تو نام بھی مت لیں۔ وہ شوکی نہیں بہت شوخا ہے۔ بے حد کمینہ اور..."

"اچھا بس بس..." رمیض نے ہاتھ جوڑ ڈالے۔ ورنہ دو چار گالیاں تو کہیں نہیں گئی تھیں۔

"چلو اب اندر چلو۔"

"جب تک آپ کا وہ بھائی اور میری وہ بہن اندر ہیں' میں اندر نہیں جاؤں گی۔"

"باہر ٹھنڈ ہے' بیمار ہو جاؤ گی۔"

"اندر جاکر ان دونوں کی بوتھیاں برداشت کرنے سے بہتر ہے میں باہر کی ٹھنڈ برداشت کرلوں۔"

وہ اٹھ کر لان کی کرسیوں کی جانب بڑھ گئی اور رمیض اندر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

اندلس خاندان میں سب ہی بہت پڑھے لکھے اور اعلا عہدوں پر فائز تھے۔ یوں جیسے ڈاکٹر' انجینئر' سی ایس ایس آفیسر بننے کے لیے مفت کا دربار لگا ہو' آتے جاؤ بنتے جاؤ۔ مجال ہے کسی بچے کا رجحان کسی اور جانب بھی ہونے دیا جائے۔ تیمور اکبر جو شہر کے اسکول یہ خبر لینے گئے تھے کہ کس کی اجازت سے شہر کو آرٹس رکھوائی گئی' نئی نئی کہانیاں سنتے وہاں سے لوٹے تھے۔

ٹیچرز اس کی تعریفوں میں رطب اللسان تھیں۔

اس کے آرٹ ورک کو سراہا جارہا تھا کہ وہ ان کے اسکول میں اور اسکول سے باہر کتنے مقابلے جیت چکی ہے۔ اسکول کا نام کتنی جگہوں پر روشن کرچکی ہے۔ عنقریب وہ انٹرنیشنل لیول پہ بھی جانے والی ہے اور اسکول سے جڑے ہر فرد کو یقین تھا کہ وہ یہ مقابلہ جیت کر آئے گی۔ وہ ایک بہترین آرٹسٹ کے باپ تھے' یہ وہ جان گئے تھے اور انہیں اس پہ کسی قسم کا فخر نہیں ہوا تھا۔ وہ یہ سب جاننے وہاں نہیں آئے تھے۔ وہ اس کی پڑھائی کے بارے میں جاننے میں دلچسپی رکھتے تھے اور وہاں کوئی ٹیچر بھی اس کی پڑھائی کے بارے میں بات نہیں کر رہا تھا۔

"اس کی اسٹڈیز کی بات کریں۔" مجبوراً انہیں خود ہی ہر ٹیچر کو پکڑ پکڑ کر پوچھنا پڑا اور سب سے انہیں ایک سا جواب ملا۔

"وہ ایوریج اسٹوڈنٹ ہے۔" اور آگے کی کہانیاں سناتے استاد ان کی برداشت سے باہر تھے۔ وہ ایک لفظ "ایوریج" ان کے دماغ میں پھنس گیا تھا۔

وہ "ایوریج" کیوں تھی؟ وہ سب اس کی پڑھائی پہ توجہ کیوں نہیں دیتے تھے؟ سب نے مل کر اسے آرٹ ورک پہ کیوں لگا رکھا تھا۔ وہ اسکول اپنی بیٹی کو پڑھنے بھیجتے تھے' آرٹسٹ بننے نہیں۔ سب ٹیچرز کا ایک سا جواب تھا کہ "شہر تو بنی بنائی آرٹسٹ ہے۔ اسے اسی فیلڈ میں آگے جانا چاہیے۔"

ایک اس لفظ "آرٹس" نے انہیں سلگا دیا تھا۔ ان کے خاندان میں آج تک کوئی اس فیلڈ میں آگے نہیں گیا تھا تو وہ شہر کو کیسے جانے دیتے۔ اسے سب کزنز کی طرح سائنس ہی پڑھنا تھی' بھلے سائنس اس کی سانس کھینچ لیتی اور وہ اس روز نہ صرف اس کے داخلہ آرٹس سے سائنس میں کروا آئے تھے' بلکہ ایسے اسکول سے بھی اسے اٹھوا آئے تھے جو اس سائنسی دور میں آرٹس پڑھنے کو اہمیت دیتا ہو۔

گھر پہنچ کر انہوں نے شہر کے منہ سے ایک بھی وضاحتی جملہ نہ نکلنے دیا۔ انہیں وضاحت کے نام پر ایسی آگ مہر نے لگائی۔ اس نے شہر کے کمرے سے ہر وہ شے ہٹادی' جلا ڈالی جو اس کے مطابق شہر کی پڑھائی پہ اثر انداز ہو سکتی تھی۔

اور وہ شہماہ جو ڈیزائنر بننے کا سوچ بیٹھی تھی اس ضد میں آکر خود سے عہد کر بیٹھی کہ وہ اپنی سوچ کو حقیقت میں بدل کر رہے گی۔

☼ ☼ ☼

وہ سب سے چھپ کر گھر کے پیچھے واقع جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈ سے پرے اس کنویں پہ آبیٹھتی جو اس گھر کا حصہ ہو کر بھی گھر سے جدا تھا۔ اس گھر کے دو پورشنز آمنے سامنے تھے' ایک بڑے بھائی بلال اکبر کا دوسرا چھوٹے تیمور اکبر کا۔

گھر کے پچھلے حصے میں شہر کے دادا جان زین اکبر نے کنواں کھدوایا تھا۔ دادا جان اس سے بڑی انسیت رکھتے تھے۔ جب دونوں بھائیوں نے اپنے اپنے پورشنز علیحدہ سے بنوائے تو دادا جان کی وصیت کے مطابق اس کنویں والے حصے کو غیر استعمال شدہ چھوڑ کر اس طرح الگ کر دیا کہ درختوں کے پیچھے کنویں کا وجود جیسے غائب ہو کر رہ گیا اور اسی کنویں کے دامن میں وہ باغی سی شہر اپنے اسکیچز بناتی' پناہ ڈھونڈ بیٹھی تھی۔

وہ رمیض کے گھر آکر چھٹیاں گزارنے پہ اس سے ملنے' باتیں کرنے کی غرض سے تایا ابو کے پورشن میں چلی ضرور جاتی تھی' مگر اپنی اسکیچ بک لے جانے کی غلطی اس نے کبھی نہیں کی۔ وہ اکثر اس سے اس کے شوق کے متعلق پوچھتا اور وہ اپنے اس شوق کو گناہ کی مانند چھپا کر بات گھما دیتی۔ رمیض سے اس کی دوستی تھی' وہ اسے کبھی اس کام سے منع نہ کرتا' مگر وہ اب کسی بھی رسک سے ڈرتی تھی۔ وہ محتاط رہنے لگی تھی۔ مبادا مہر کبھی بھی چھاپہ مارلیتی۔

وہ اماں کی شکایت دور کرنے کہ وہ انہیں وقت نہیں دیتی' ان کے پاس بیٹھتی تو کینو چھیل کر کھاتے وقت گزارتی۔ اماں کی ساری باتیں "میری مہر" سے شروع ہو کر "نکمی شہر" پہ ختم ہو جاتیں۔ اماں کی یہ لوری
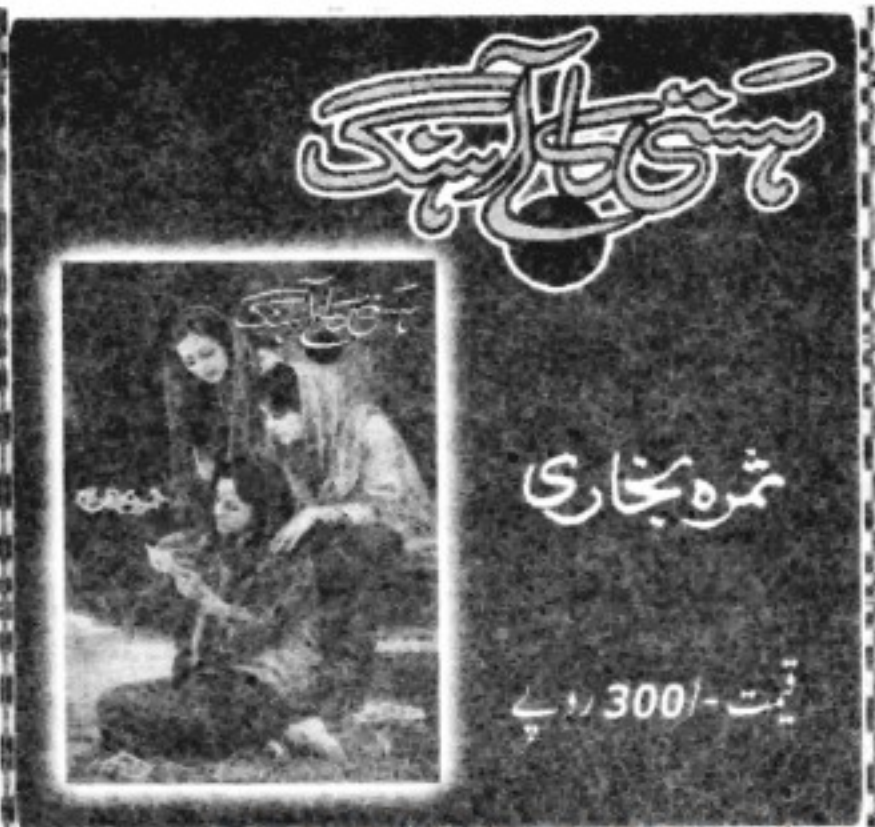
بچپن سے وہ سن کر تھک چکی تھی' مگراماں گا گا کر نہ تھکیں۔

وہ بے زار صورت بنائے سب سنتی رہتی' حتیٰ کہ اماں کہنے پر مجبور ہو جاتیں۔ "نہ جانے کس ڈھیٹ مٹی کی بنی ہو تم؟" اور وہ خاموشی سے اپنی جگہ چھوڑتی انہیں بتلا جاتی کہ وہ کس ڈھیٹ مٹی سے بنی ہے۔

جب کبھی اس کے میزائل انجینئر ابا اسے اپنے پاس بٹھا کر نئی ایجادات کے متعلق بتا رہے ہوتے تو وہ تخیل میں کوئی لہنگا گاؤن' گھاگرا چولی ڈیزائن کر رہی ہوتی اور ابا کے چند سوالات پوچھنے پر وہ ہونقوں کی طرح ان کی شکل دیکھنے لگتی۔

"ایسا نالائق بچہ ہمارے خاندان کی سات نسلوں میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔" ابا اس سے مایوس ہوتے خود ہی اس کے پاس سے اٹھ کر چلے جاتے۔

مہر جو حال ہی میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ بنی تھی' اس کے پاس وہ کیا بیٹھتی۔ اسے بس تین موضوعات پر ہی بولنا آتا تھا۔ میں...... میں ہی...... اور بس میں...... اور تینوں ہی شہر کے ناپسندیدہ موضوعات تھے۔ ایسے میں وہ الگ رہنا ______ پسند کرتی تھی۔ رمیض اور روشاک ہاسٹل ہوتے تھے' سو اس کی واحد پناہ گاہ وہ پوشیدہ کنواں تھا۔

وہ پہر میں سب کے سو جانے کے بعد وہ اپنی فیشن ٹول کٹ لیے دبے قدموں پچھلی جانب چلی آتی۔ وہیں کنویں کی منڈیر پہ بیٹھ کر اپنے تخیل کو کاغذ پر اتارتی رہتی۔ کنویں پہ نصب بلی کے گرد بندھی رسی سے چرمی مشکیزہ بندھا ہوا تھا' جسے وہ کنویں میں ڈال کر اسے کھینچتی' پانی نکال لیتی۔ اتنے برسوں بعد بھی نہ وہ کنواں سوکھا تھا' نہ اس کا پانی نیچے ہوا تھا۔ مشکیزے سے گرتے' ٹپکتے پانی کو وہ پہروں سن سکتی تھی' دیکھ سکتی تھی۔ یہ اس کے پسندیدہ کاموں میں سے ایک تھا۔ کنویں اور اس کے ٹھنڈے پانی کے نزدیک بیٹھنا اس گھر کے سرد لوگوں کے پاس بیٹھنے سے کئی گنا بہتر محسوس ہوتا تھا۔

اور پھر ان ہی ڈھیروں خاموش دنوں میں سے اس کی زندگی کا ایک بُرا دن بھی آگیا' جسے وہ پھر سالوں دل سے نہ نکال سکی۔ وہ اسکول کے سہ ماہی امتحانات میں کیمسٹری میں فیل ہو گئی تھی۔ حالانکہ اس نے پوری کوشش کی تھی۔ مگر اس کا دل ان مضامین میں نہیں لگتا تھا۔

ابا اس کا رزلٹ کارڈ ہاتھ میں لیے اسے محض تاسف سے دیکھ رہے تھے اور مہر اس پہ برس رہی تھی۔ اسے خاموش پا کر وہ اس پر مزید برہم ہوتی رہی۔ اماں نہ اسے سنا رہی تھیں اور نہ ہی بچا رہی تھیں۔ وہ رو رہی تھی' غصے میں بھی تھی' مگر وہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی۔ کسی قسم کی بحث نہیں کر رہی تھی۔ نہ آگے سے جواب دے رہی تھی۔

"کوئی جواب ہو گا تو تم دو گی نا۔ تمہارا جواب تمہاری نالائقی ہے شہر۔" اور مہر کے طعنوں نے پہلے سے اس میں زہر بھر رکھا تھا۔ اس وقت تو اس کا دل بس یہی کیا کہ وہ الٹے ہاتھ کی رکھ کر لگائے اسے۔ تب ہی رمیض نے بیچ میں آتے شہر کو مزید ڈانٹ سے بچایا تھا۔

"تم جاؤ شہر یہاں سے۔ میں بات کرتا ہوں۔" اسے اس کے کمرے میں بھیج کر وہ اس کی کون سی وکالت کرنے والا تھا۔ رمیض اور گھر والوں کے مابین کیا بات ہوئی' وہ نہیں جانتی تھی۔ بس اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ ابا' اماں سے متنفر ہو گئی تھی جنہوں نے اپنی ایک بیٹی کے ہاتھوں دوسری کو بے عزت ہوتے دیکھا۔ ایک بیٹی کو چن کر دوسری کو ٹھکرا دیا۔

لائق بیٹی کو اپنا کر دوسری کو نالائق سمجھتے بغیر بنا ڈالا۔ وہ اس کو ایک بار تو سنتے' بولنے کا موقع دیتے۔ شاید وہ انہیں سمجھا ہی پاتی۔ وہ انہیں دکھا پاتی کہ نہ تو وہ نکمی ہے نہ ہی نالائق' بس وہ اس راہ کی راہی نہیں ہے جسے انہوں نے اس کے لیے چنا ہے۔ غلط تو اس کی راہ بھی نہیں تھی۔ لیکن جسے وقت نے ثابت کرنا ہو' اسے کبھی انسان ثابت نہیں کر پاتا۔

اسی دن ایک اور بڑی بات بھی ہوئی تھی۔ کنویں کی منڈیر پہ ڈھیروں آنسو بہاتی شہر نے اس کی حمایت کرتے

رمیصہ کے لیے دل میں اک خاص جگہ بناڈالی محبت کی اور ایسی ہی ایک خاص جگہ اس نے مہر کو بھی دے ڈالی۔ نفرت کی۔

☆ ☆ ☆

قطار در قطار لگے درختوں سے پیچھے شہماہ کی وہ دنیا جہاں اسے نہ کوئی نالائق کہہ پاتا' نہ تلاش کرپاتا' تب مسخر ہو گئی جب ایک روز اسکیچ بناتی شہر کو درختوں کے بیچ کسی کے ہونے کا گمان ہوا۔ اس نے چونکتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا اور اس کا اسکیچ بناتا ہاتھ وہیں ہوا میں معلق رہ گیا۔ جس ڈر سے وہ نظریں چرائے مطمئن سی ہو کر اک عرصہ جیتی رہی تھی' وہ ڈر اب اس کے سامنے روشاک کی صورت حقیقت بنا کھڑا تھا۔

وہ بڑی سنجیدہ صورت بنائے' بازو سینے پہ باندھے' ایک ٹانگ موڑ کر درخت سے ٹکائے' دوسری کے سہارے کھڑے درخت سے ٹیک لگائے ایسی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "پکڑی گئیں نا۔" شہر نے جلدی سے اپنی اسکیچ بک اپنے پیچھے چھپالی۔ روشاک کو دکھانے سے بہتر تھا وہ اسے کنویں میں پھینک دیتی۔

"تو یہ وہ جگہ ہے جہاں یہ شہماہ تیمور نے خود کو چھپا لیا ہے۔" وہ اب آگے بڑھتا' گھومتا ہوا اس جگہ کو اس قدر دلچسپی سے دیکھ رہا تھا' گویا کسی انجان جزیرے کی دریافت ہاتھ آئی ہو۔ شاید وہ خود کو لمبس سمجھ رہا تھا۔

"سو میں نے تمہیں پالیا۔" وہ اب جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے مقابل کھڑا تھا جس کی زبان اسے دیکھتے ہی پہلی بار گنگ رہ گئی تھی۔

"اچھی جگہ ہے' تمہارے آنے سے آباد ہو گئی ہے' نہیں؟" وہ نظریں جمائے اسے دیکھتا رہا اور شہر الفاظ ڈھونڈنے لگی۔

"کیا یہ گونگستان ہے جہاں آنے سے تمہاری زبان کھو گئی ہے اور اب میں معصوم سا شہزادہ بھولے بسرے یہاں آگیا تو مجھے تمہیں تمہاری زبان لوٹانا پڑے گی۔"

"کب آئے تم؟" وہ ہمت کرکے بول ہی پڑی۔ کچھ تو بولنا ہی تھا۔

"کہاں؟" یہاں یا گھر؟ خیر دونوں جگہ جب بھی آیا تم نہیں جان پائیں اور جو تم چھپا رہی ہو میں اسے جانتا ہوں۔" اس کا اشارہ اور نظریں پیچھے کیے ہاتھوں پر تھیں۔

شہر کی پل بھر کو سانس رکی اور بحال ہوئی۔

"شور..... میرا مطلب ہے روشاک....." اس کی بات ــــ روشاک نے اچک لی۔

"او نہوں..... وہی کہو نا جو کہتی ہو۔ شور..... میں تو شور ہوں نا' پھر یک دم روشاک کیسے بن گیا۔"

اور شہر کو لگا کہ اسے موقع مل گیا ہے اس کا مذاق اڑانے کا' اس پہ طنز کرنے کا' اس سے بدلہ لینے کا۔

آج وہ واقعی ثابت کردے گا کہ وہ "شور" ہے اور شور کر کرکے پورے گھر کو وہاں جمع کرلے گا کہ آؤ دیکھو یہ محترمہ یہاں کیا کرتی ہیں۔ یہ ہے ان کی نالائقی کا راز۔ یہاں پوشیدہ کر رکھا ہے اس نے اپنا شان دار مستقبل' آگ لاکر پھر اٹھتا دھواں دیکھے گا۔ وہ جلنے لگے گی تو وہ اسے دیکھ کر مسکرائے گا کہ اسے کہتے ہیں "شور کرنا۔"

"روشاک! دیکھو بچپن گزر گیا اور اب بچپنا دکھانا اس سے بڑا بچپنا ہے۔ ہماری ساری مقابلے بازی اور لڑائیاں ماضی ہو گئیں' میں انہیں یاد نہیں کرنا چاہتی۔ تم بھی انہیں بھول جاؤ۔ ہو سکتا ہے سب کی نظروں میں یہ ایک چھوٹا کام ہو' مگر میں اسی کام کو بہترین طریقے سے کر سکتی ہوں۔ میں بہت سے گدھوں میں سے ایک گدھا' بہت سے شیروں میں سے ایک شیر' بہت سے ہاتھیوں میں سے ایک ہاتھی نہیں ہونا چاہتی۔ میں کسی ریوڑ کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔ اس سب سے الگ ہو کر انسان ہونا چاہتی ہوں۔ منفرد' ممتاز....."

"تم اس سب کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ حکم نہیں' التجا ہے یہ۔"

وہ سر جھکائے اٹھائی اسے یہ سب کہہ رہی تھی اور وہ

ہنوز اسی انداز سے کھڑا تھا۔ آنکھیں سکیڑے' پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ دیر دیکھنے کے بعد وہ بے فکری سے بولا تھا۔

"او کے۔۔۔" اس نے بس اتنا ہی کہا' بس اتنا ہی کہ شہر کو اس قدر حیران کر ڈالا کہ وہ اگلے دس منٹ وہاں سے ہل ہی نہ سکی اور جب وہ ہلنے کے قابل ہوئی تو وہ جا چکا تھا۔

روشاک بس اتنا سا کہہ کر مان جاتا یہ کیسے ممکن تھا۔

کیا ضرورت تھی بھلا اسے یہ سب کہنے کی۔ اسکیچ بک چھپانے کی۔ اس کے سامنے اپنے خیالات سنانے کی۔

وہ بھلے بچپن سے نکل آئی ہو' مگر روشاک تو روشاک تھا نا۔ جان بوجھ کر اسے زچ کرنے والا' ستانے والا۔ انجان رہ کر وہ شاید کچھ نہ کرتا جتنا اب جان کر کرنے والا تھا۔ اسے خود پر غصہ آیا' اپنی بے وقوفی پہ افسوس ہوا۔ اگر وہ اتنا ہی کہہ دینے پہ قانع ہو گیا تھا تو عملاً" کبھی اتنے پہ نہیں مانے گا۔ وہ "شور" اسے یونہی نہیں کہہ دیتی تھی۔ وہ شر تھا اور یہ بات شہر سے بہتر اور شہر سے بڑھ کر بھلا کوئی جان سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تو تم نے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ لیا ہے روش؟" مہر اس سے مخاطب تھی اور شہر اسے دیکھنے سے اعراض برت رہی تھی۔ نہ جانے کب' کیسے' کس انداز سے وہ اس کا راز کھولے گا' اسے بے عزت کروائے گا۔

وہ ایک عرصے بعد نہ جانے کون کون سے امتحان' ٹیسٹ دے کر گھر آیا تھا۔ جب بھی وہ اور رمیض چھٹی پہ گھر آتے تھے' اماں ہمیشہ انہیں کھانے پہ مدعو کرتی تھیں۔ اس رات ڈائننگ ٹیبل پہ اماں کے سوا کوئی بڑا موجود نہیں تھا اور اس کی وجہ بھی شہر کو جلد ہی معلوم ہو گئی تھی۔ تایا ابو کو بغیر بتائے روشاک نہ صرف آئی ایس ایس بی کلیئر کر چکا تھا' بلکہ اس کی فائنل سلیکشن بھی ہو چکی تھی۔ تایا ابو اس سے خفا تھے' وہ اس کے ایئر فورس میں جانے کے حق میں نہیں تھے اور روشاک نہ صرف فراغت کے سبب چھٹیاں گزارنے گھر آیا تھا' بلکہ تایا ابو کو منانے کے لیے بھی آیا تھا۔ تایا ابو کی ناراضی کے پیش نظر ہی ابا اور تائی امی بھی کھانے پہ موجود نہ تھے۔

"بالکل۔۔۔ میں تو ہمیشہ سے ایئر فورس میں ہی جانا چاہتا تھا اور ابو میرے شوق سے واقف تھے۔ یہ انجینئر بن کر تاروں سے کھیلنا' سوفٹ ویئرز بنانا' سڑکیں اور پل تعمیر کرنا' مشینوں سے کھیلنا۔ یہ سب ہی میرے بس سے باہر ہے۔ میں تو بس اڑنا جانتا ہوں۔ پہلے بغیر پروں کے اڑتا تھا' اب پروں پہ اڑوں گا۔"

"لگتا ہے کیڈٹ کالج واقعی گدھوں کو انسان بنانے کا کام کرتے ہیں۔"

"اور یہ موقع تم گنوا چکی ہو۔ چچ چچ چچ۔"

دونوں ہنسنے لگے۔ شہر کو اپنا آپ ان کے درمیان عجیب ۔۔۔ سا لگا۔ سو وہ اٹھ گئی۔ یوں بھی کھانا وہ ختم کر چکی تھی۔

اسے اٹھتے دیکھ کر وہ فوراً" بولا۔ "شہر بیٹھو نا۔ ہمیں کمپنی دو۔"

"مجھے کچھ کام ہے۔" نظریں جھکائے اس نے بدقت بہانہ تراشا۔

"ہاں جانتا ہوں' بہت مصروف رہتی ہو۔ پھر بھی کچھ وقت تو نکال سکتی ہو میرے لیے۔" تو اب وہ اسے ایسے جتائے گا' فائدہ اٹھائے گا۔ شہر نے خفگی بھری نگاہ اس پہ ڈالی جو بہت عام سے انداز میں سر جھکائے کھانا کھا رہا تھا۔ مجبوراً" اسے بیٹھنا ہی پڑا۔

"یہ ہماری شہر کچھ زیادہ فرماں بردار نہیں ہو گئی چاچی۔۔۔" وہ ایک شرارت بھری مسکراہٹ لیے اماں سے مخاطب تھا' مگر دیکھ رہا تھا۔ وہ لب اور مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔

"خاک فرماں بردار ہے۔ کسی طرف سے مجھے اطمینان نہیں ہے اس کو لے کر۔ مہر کو دیکھو۔" اماں کا "مہر نامہ" شروع ہونے اور شہر کے زاویے بگڑنے کی دیر تھی کہ روشاک نے موضوع بدل دیا۔

"آج رات رمیض بھائی بھی آ رہے ہیں ابو سے بات کرنے۔" اور شہر کا دل تھا کہ نئی لے پر بجنے لگا۔ سب کا دھیان روشاک کے مسئلے پہ تھا اور اس کا رمیض پر.....

☆ ☆ ☆

وہ نہیں جانتی تھی کہ رمیض کے آنے پہ تایا ابو کے گھر جو بڑوں کی میٹنگ تھی اس میں کس نے کیا رائے دی۔ رمیض نے کیا دلائل دیے۔ روشاک نے کیا کہا۔ تایا ابو کو کس بات نے ماننے پہ مجبور کیا۔

وہ بس اتنا جانتی تھی کہ روشاک نے اپنا شوق منوالیا تھا۔ وہ باغی قرار پایا تھا۔ سب کا غصہ 'ناراضی وقتی تھے' وہ جانتا تھا۔ سو وہ وہی کرنے جا رہا تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ خواب چھوٹا تھا یا بڑا' خواب پورا ہو رہا تھا۔ روشاک نے ثابت کر دیا تھا' وہ ایک بے خوف لڑکا تھا۔

اس معاملے کے حل ہوتے ہی وہ رمیض کے سر پہ کھڑی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ رمیض' روشاک کو اپنے ارادوں سے باز رہنے پہ مجبور کرے اور یوں بھی وہ اس سے ملنا چاہتی تھی۔

رمیض واپسی کی تیاری کرتے ہوئے اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ وہ محض روشاک کے بلانے پہ وہاں آیا تھا اور اس کے مسئلے کے حل ہوتے ہی واپس جا رہا تھا۔

"آپ مجھ سے ملے بغیر واپس کیسے جا سکتے تھے؟" وہ غصے سے فوت ہونے کے قریب ہو گئی۔

"نہیں جا سکتا تھا۔ بالکل بھی نہیں جا سکتا تھا۔" وہ کان پکڑے کھڑا تھا۔

"مگر آپ جا رہے تھے۔"

"میں ابھی تم سے ملنے ہی آ رہا تھا کہ تم آ گئیں۔" اپنے بیگ کی زپ بند کر کے وہ اسے بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔

"تو فیصلہ آپ کے حق میں ہوا۔" وہ یکدم ساری ناراضی بھول گئی تھی۔

"شوکی کے حق میں...." اس نے تصحیح کی۔

"ہاں مگر آپ نے کروایا نا اور اب میں چاہتی ہوں کہ آپ میرا معاملہ بھی حل کروا کے جائیں۔"

"ڈونٹ ٹیل می اب تم بھی باغی ہونے جا رہی ہو۔"

"میں اپنے اور شور کے مسئلے کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔" وہ اس کے بیگ کی زپ کھولتی بند کرتی کنفیوز سی ہو رہی تھی۔ اور مسئلے کی نوعیت وہ رمیض کو نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ خوف زدہ رہتی تھی تب ہی۔

"لڑائی ہوئی ہے پھر سے تم دونوں کی؟ یار! اب بڑے ہو گئے تم دونوں؟" وہ اپنا کمرہ سمیٹنے لگا۔

"آپ شور کو سمجھائیں کہ ہر شے مذاق نہیں ہوتی' نہ زندگی مذاق ہوتی ہے۔ اس بچپنے سے باہر نکل آئے۔ میرے لیے کوئی ایسا مسئلہ کھڑا نہ کرے کہ میں ساری زندگی اس سے باہر نہ نکل سکوں' اپنی خوشی سے جی نہ سکوں' سانس نہ لے سکوں۔"

"سب ٹھیک تو ہے نا؟" اس نے ٹھٹکتے ہوئے پوچھا۔ شہر کا جھکا سر اثبات میں ہل گیا۔ وہ چاہ کر بھی اسے نہیں بتا سکی۔

رمیض ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے کمرے کا ادھ کھلا دروازہ دھڑ سے پورا کھل گیا۔ روشاک اس کھلے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ غصے کے سبب لال ہو چلا تھا۔

"آپ اپنی اس دوست سے پوچھیں کہ زندگی میں کب میں نے اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

پوچھیں! اب میں نے ایسا کیا کیا؟"

رمیض ناسمجھی سے روشاک کو دیکھ رہا تھا جس کی آواز غصے سے پھٹ رہی تھی۔ پھر اس نے شرمساری شہر کو دیکھا' جس کی آنکھوں میں پانی بھرا تھا اور وہ اس کے بہنے کے خوف سے پلکیں نہیں جھپک رہی تھی۔ اس کی پلکیں بھی جیسے ساکت تھیں۔

"میں اسے سب کے سامنے بتا سکتا ہوں' گرا نہیں سکتا۔ نہ خود گر سکتا ہوں۔ اسے مذاق میں جلا سکتا ہوں میں' زندگی کو مذاق نہیں سمجھتا' مگر —

رہے' یہ اس کا راز میرے اندر اس کنویں کی گہرائی سا رہے گا جو اسے محبوب ہے۔"

کب وہ وہاں آیا تھا' کب اس نے وہ سب سنا' کتنا سنا وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ بس وہ آیا' چلا آیا اور چلا گیا۔

"کوئی مجھے بتائے گا کہ کیا ہوا ہے؟ شہر! وہ کس راز کی بات کر رہا تھا؟"

رمیض جو کب سے حیران کھڑا سب سن رہا تھا' دیکھ رہا تھا' اب پوچھ رہا تھا۔

شہر اسے نہیں سن رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور کچھ کہے بنا' اس کی طرف دیکھے بنا وہاں سے چلی آئی۔

اگلے روز رمیض واپس ہوسٹل چلا گیا تھا۔

روشاک وہیں اندر باہر ہوتا اسے دیکھتا اور خفا خفا سا رخ پھیر لیتا۔

زندگی میں اس نے کبھی شہر کے ساتھ ایسا نہیں کیا تھا۔ زندگی میں کبھی ایسا شہر نے بھی ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ لڑتے تھے' روٹھتے تھے اور پھر من بھی جاتے تھے۔ دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو منایا نہیں تھا۔ دونوں میں سے کبھی کسی کو یہ ضرورت نہیں پڑی تھی۔ مگر اب شہر کو یہ ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔

روشاک کو اگلے ہفتے ٹریننگ کے لیے ایک لمبے عرصے کے لیے چلے جانا تھا۔ وہ اسے ناراض نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ اسے ناراض نہیں بھیج سکتی تھی۔ چھیڑنے' مقابلہ کرنے' روٹھنے' من جانے' ضد میں آنے' بڑے سانجھے رشتے نکلتے تھے اس کی طرف' کیسے جانے دیتی اسے یوں ہی۔

"مجھے بات کرنی ہے تم سے۔" وہ سیدھی اس کے کمرے میں چلی آئی۔ ایسے ہاتھ جو نہیں آ رہا تھا دنیا کا مصروف ترین بندہ۔

"ہمارے درمیان کی ساری باتیں کہہ دی گئیں' سن لی گئیں۔" وہ اپنے شیلف پہ سی ڈیز ارینج کرتے ہوئے مصروف سا بولا۔

"وہ غلط باتیں تھیں' جو غلط مقام پہ کہی گئیں۔ میں انہیں درست کرنے آئی ہوں۔"

"ان باتوں کو اسی جگہ' اسی وقت پہ کہا جانا تھا۔ وہ الفاظ اب لوٹ نہیں سکتے۔ نہ پلٹ سکتے ہیں۔" وہ ہنوز اسی طرح مصروف رہا۔ سی ڈیز کو ترتیب سے رکھ کر ایک بار پھر سے ترتیب دینے لگا۔

"ہم تو لوٹ سکتے ہیں' پلٹ سکتے ہیں۔"

وہ سیدھا ہوا' پلٹا' اس تک آیا۔ اس کے مقابل ہوتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

"تم سے واحد رشتہ رکھتا تھا۔ بچپن کا اور اسی میں سب رشتے پوشیدہ تھے۔ تم نے اس واحد رشتے کو توڑ ڈالا۔ اتنے پیارے رشتے کو توڑ کر کیا جوڑنے آئی ہو شہر ماہ؟ میں ایک پیارے رشتے کے بدلے دوسرا پیارا رشتہ ہی جوڑوں گا' جوڑنا ہے تو بتاؤ ورنہ جاؤ یہاں سے۔"

شہر نے اسے دیکھا' غور سے دیکھا اور غور سے دیکھا اور پھر وہ دھندلا گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی وہاں سے لوٹ گئی۔ اور روشاک اگلے ہفتے کے بجائے اگلی صبح ہی نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

روشاک کب گھر آتا تھا' وہ نہیں جانتی تھی۔ اماں کی اس کے اعزاز میں دی گئی دعوتوں کو اکثر وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال جاتا۔ وہ ان کے ہاں آتا بھی ہو تو اسے کبھی خبر نہیں ہو سکی۔ کالج میں ایڈمیشن کا وقت آ پہنچا تھا۔ اسے یا تو اب بولنا تھا یا کبھی نہیں بولنا تھا' اگر روشاک کی مان لی گئی تھی تو اس کی بھی مان لینی چاہیے تھی۔

ابا کے فارم لا کر تھمانے اور اس کی انہیں پُر نہ کرنے کی دیر تھی کہ ایک ہنگامہ تھا' جو یہاں وہاں برپا ہو گیا۔ شہر آرٹس پڑھے گی' یہ سب کے لیے نامنظور تھا۔ شہر سائنس پڑھے گی' یہ اسے منظور نہ تھا۔

ابا نے کہہ دیا تھا۔ "یہ آرٹس پڑھے گی تو اس گھر میں نہیں رہے گی۔"

اس نے بھی کہہ ڈالا۔ "میں سائنس پڑھوں گی تو

کالج نہیں جاؤں گی پھر۔" وہ بھی ابا کی ہی بیٹی تھی۔

دونوں جانب ضد آکر ٹھہر گئی تھی۔ اماں اسے واسطے دیتیں تو وہ کان بند کر لیتی۔ ابا کو سمجھانے جاتیں تو ڈانٹ سن کر لوٹ آتیں۔ مہر نجانے کیوں اس جنگ میں خاموش رہی تھی۔

ویک اینڈ پر رمیض آیا تو وہ اسے منانے لگی۔

"آپ بات کریں گے تو وہ مان جائیں گے' آپ کو منانا آتا ہے۔ پہلے شور کے لیے اپنے ابا کو منایا اب میرے لیے ابا کو منائیں۔"

رمیض بے چارہ اسے حوصلہ دیتے دونوں کے سامنے پیش ہو گیا۔ وہ باہر کھڑی سننے کی کوشش کرنے لگی' ناکام رہی تو وہیں کنویں پہ جا کر بیٹھ گئی۔ ابا کبھی نہیں مانیں گے "اس کا دل کہہ رہا تھا۔ وہ وہاں اس کی آمد سے انجان تھی۔

"اتنی جلدی کیسے ہار مان سکتی ہو تم؟ خواب دیکھنے والے تو اتنی جلدی ہار نہیں کرتے۔" اس نے سر اٹھا کر دھندلی نظروں سے روشاک کو دیکھا۔ جس دھند میں وہ سال پہلے کھو گیا تھا' اسی دھند میں اسے پھر سے کھڑا ملا۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر گرے۔

وہ مسکرایا اور اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اپنی پوروں پہ اس کے آنسو چن لیے۔

"اگر انسان کا کوئی جنون ہو تو اس پہ لازم ہے کہ خود کو جنونی ثابت بھی کرے۔ اپنے جنون کے لیے لڑنا کیوں نہیں سیکھا' رونا کیوں سیکھ لیا؟ اپنے جنون کی حفاظت کیوں نہ سیکھی لوگوں پہ بگڑنا کیوں سیکھ لیا کہ وہ تمہارے جنون پہ حرف نہ کہیں" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ روشاک نے ہلکی سی اس کے سر پہ چپت لگائی۔

کنویں کے مشکیزے سے پانی بوند بوند ٹپک رہا تھا اور ایک مشکیزہ روشاک کے سامنے ٹپ ٹپ کر رہا تھا۔

"رمیض بھائی میرا مقدمہ لڑ رہے ہیں۔ وہ سب کو منا لیں گے۔ انہوں نے تمہارے لیے بھی تو سب کو منا لیا تھا۔" وہ ہولے سے ہنس دیا۔

"رمیض بھائی کبھی اپنے لیے نہیں بول سکے اور تمہیں لگتا ہے کہ وہ میرے لیے بولے ہوں گے۔ شہر بی بی! اپنے لیے خود کھڑے ہونا اور بولنا پڑتا ہے۔ وکیل اور گواہ خود بنو گی تو جیت پاؤ گی۔ گواہوں کی غیر موجودگی میں فیصلے نہیں سنائے جاتے۔ اٹھو' جاؤ اور اپنا مقدمہ پیش کرو۔ جنونی ہو تو اب باغی بنو۔"

اس نے آنسو پونچھے اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی کھڑا کیا۔

"جاؤ۔" وہ اسے آگے دھکیلتے ہوئے بولا۔ وہ آگے بڑھ کر پھر سے مڑی۔

"میرے آنسو۔" اس کی آواز رندھی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔ روشاک نے اپنی انگلی کی پور اٹھا کر اسے دکھائی جو خشک تھی۔

"سب آنسو میرے اندر اتر گئے۔" وہ بس اسے دیکھتی رہ گئی۔

اور اندر گہری خاموشی تھی۔ رمیض بھائی نے کیا کہا' کیا نہیں' کون کتنا خفا تھا کتنا نہیں' وہ یہ سب جانے بغیر اندر داخل ہوئی اور ڈرے بغیر بولنے لگی۔

"ابا! میں آرٹس پڑھوں گی' نہیں تو ان پڑھ رہوں گی۔" تایا ابو شاید اب تک انجان تھے تب ہی حیران تھے۔ ابا غصے سے غرائے۔

"اب تم نافرمان ہو رہی ہو شہر۔"

"میں اگر اپنے شوق کے لیے آواز اٹھا رہی ہوں تو میں نافرمان ہوں؟" نہ وہ ڈری' نہ جھجکی' بس مودب سی ہو کر بولی اور ہاتھ باندھے سب کے درمیان کھڑی رہی۔

"شہر۔" ابا پہلے سے کئی گنا غصے میں تھے۔ تایا ابو اور رمیض نے مل کر انہیں روکا۔

"میں بات کرتا ہوں تیمور۔" تایا ابو نے ابا کو کچھ کہنے سے روکتے اسے دیکھا۔

"تم پہلے بول لو تاکہ تمہیں شکوہ نہ رہے کہ تمہیں بولنے کا موقع نہیں ملا۔ مگر جب میں بولوں گا تب میں ہی بولوں گا' تم محض سنو گی۔" شہر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں یہ بات سمجھ نہیں سکی کہ آرٹس پڑھنے والوں کو نالائق کیوں مانا جاتا ہے۔ میں ایک خواب رکھتی ہوں اور اسے پورا کرنے کے لیے آرٹس پڑھنا چاہتی ہوں۔ ایک صلاحیت ہے مجھ میں، جس کا حق ادا کرنا چاہتی ہوں، کچھ کرنا چاہتی ہوں، بننا چاہتی ہوں۔ تو میں نالائق کیسے ہو گئی؟

میں اسی پھل کے بیج کی آبیاری کر سکتی ہوں جو میرے اندر رکھا گیا ہے۔ میں سیب کے بیج سے انگور کی بیل نہیں اگا سکتی۔ مجھے اپنے اندر کی شہر کو زندہ رکھنا ہے اس کی تسکین ضروری ہے۔ وہ مر گئی تو میں کیسے زندہ رہ پاؤں گی؟ ہر بچہ ڈاکٹر، انجینئر بننے کے لیے پیدا نہیں ہوتا، میں بھی نہیں ہوئی۔ مجھے وہی کرنے دیں جس کے لیے پیدا کی گئی ہوں۔ آپ میرے وہ پر کاٹ دیں گے۔ جو قدرت نے مجھے دیے ہیں تو مصنوعی پروں پہ اڑنے کی کوشش میں ساری عمر میں گرتی رہوں گی۔ کبھی اڑ نہیں سکوں گی۔

میں جو پڑھنا، بننا چاہتی ہوں، ایک عرصہ اس سے محبت کرتی آئی ہوں۔ ابا کے خواب سے اب محبت نہیں ہو پائے گی مجھے۔

ہماری فیملی کہیں سے بھی اتنی کنزرویٹو تو نہیں ہے پھر کیوں مجھے میری مرضی کے سبجیکٹس چننے کی اجازت نہیں۔ سائنس پڑھ کر ناکام ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ آرٹس پڑھ کر کامیاب ہو جائے۔

جب روشاک کو اپنا خواب پورا کرنے کا حق دیا گیا ہے تو مجھے کیوں نہیں، اسے خواب دیکھنے کی اجازت ہے اور مجھے نہیں۔ وہ اپنی مرضی سے جی سکتا ہے اور میں نہیں، صرف اس لیے کہ وہ ایک لڑکا ہے، بیٹا ہے اور میں لڑکی۔"

آخر میں بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ جتنا اور جس قدر بول سکتی تھی بول چکی تھی۔ ہر ہر پہلو سے۔۔۔ دلائل دے چکی تھی۔ ڈرائنگ روم میں یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ اور اس خاموشی کو تایا ابو نے توڑا۔

"ہم نے تمہاری ساری باتیں سن لیں، تم بہت جگہوں پہ ٹھیک بھی ہو لیکن ایسا نہیں ہے کہ تم ساری جگہوں پہ ٹھیک ہو۔"

بات لڑکا لڑکی ہونے کی نہیں ہے، بات ان فیلڈز کی ہے جو تم دونوں نے چنی۔ ایئر فورس آفیسر کا مستقبل شان دار ہو سکتا ہے، اس لیے روشاک کی مان لی گئی۔ فیشن ڈیزائننگ کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا، اس لیے تمہاری نہیں مانی جا سکتی۔" وہ کچھ بولنے لگی تو تایا ابو نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"ایک خواب تمہارا ہے اور ایک تمہارے باپ کا تمہارے باپ کا خواب وہ ہے جو وہ تمہاری پیدائش سے دیکھ رہا ہے۔ دونوں خوابوں کی عمروں میں فرق ہے اور دونوں کے ٹوٹنے میں بھی فرق ہو گا اور دونوں کے ٹوٹ کر چبھنے میں بھی، دکھ کا انتخاب تم خود کر سکتی ہو اب۔"

اس نے سر جھکا رکھا تھا، آنسو روک رکھے تھے۔ تایا ابو خاموش ہو گئے۔

"اور اگر میں دکھ کا انتخاب ابا کو دوں تو وہ اپنا دکھ چنیں گے یا اولاد کا۔" اس نے سر اٹھا کر اپنے باپ کو دیکھا، اپنی مٹھی میں دبا فارم ان کے سامنے کیا اور وہیں رکھ کر چلی گئی۔

شام سے رات ہو گئی تھی کمرے میں پڑے پڑے اور اسی رات سے اگلا دن، وہ اسی طرح اپنے کمرے میں پڑی رہی۔ کوئی اسے پوچھنے، بلانے نہیں آیا۔ اماں بھی نہیں۔

شام میں وہ رمیض سے بات کرنے تایا ابو کے پورشن کی طرف گئی تھی۔ رمیض کا کمرہ خالی تھا۔ وہ تائی امی سے پوچھنے کچن کی طرف گئی تو رمیض کی آواز وہیں سے آ رہی تھی۔

"اس کی ہر بات سن لینا، مان لینے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ امی! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ وہ چھوٹی ہے، کزن ہے، اسی ناتے سے دوستی ہے۔" اس کی آواز کے ساتھ شہر کا دل دھڑکا تھا۔

"امی میں ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں، جس کا مستقبل شان دار ہو۔ میچورٹی ہو اس میں، ہماری ذہنی

ہم آہنگی ہو تاکہ وہ میرے ساتھ چل سکے۔ اس رشتے کو نباہ سکے اور شہر میں ان میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں ہے۔"

ایک بات بھی نہیں ہے' کچھ بھی نہیں۔" اس کے لہجے کی سرد مہری نہیں تھی' جس نے اسے مجسمہ کردیا تھا۔ یہ ان کے رشتے کی موت تھی جس کی ٹھنڈک اس میں اتر گئی تھی۔

"میں نے محض تم دونوں کی اٹیچ منٹ کی وجہ سے پوچھا ورنہ بھابھی تو کب سے مہر کے بارے میں مجھ سے بات کیے بیٹھی ہیں اور تیمور بھائی کی بھی یہی خواہش ہے۔ میں تو ہمیشہ سے خود مہرماہ کو تمہارے لیے پسند کرتی آئی ہوں۔ سمجھ دار اور سلیقہ شعار بچی ہے اور پھر ڈاکٹر بھلا ایسی بچی ہمیں پورے خاندان میں کہیں ملے گی؟"

"کہیں نہیں ملے گی۔" وہ مسکرا دیا۔ "آپ کی پسند میری پسند امی۔" وہ دونوں ہنس دیے اور شہر تو رو بھی نہیں سکی۔

اور کیسے سمجھ لیا شہرماہ تیمور نے کہ اس کی بات سن لینے والا' اس کی مدد کرنے والا' اس کا حوصلہ بڑھانے والا اسے اپنی زندگی میں بھی شامل کرلے گا۔ اس سے محبت کرنے لگے گا۔ کس قدر احمق تھی شہرماہ تیمور اس جیسے پریکٹیکل انسان سے وہ خود کو جوڑ بھی کیسے رہی تھی' وہ جو امیچور اور بے وقوف تھی۔ اس نے اپنی الماری میں سے رمیض کے دیے سارے گفٹس نکال نکال کر انہیں زمین پہ ڈھیر کرتے' بری طرح سے توڑ ڈالا۔ سب ہی کارڈز اس نے پھاڑ ڈالے' ساری وال ہینگز' پینٹنگز۔ جو اس کے ساتھ جاکر خریدی تھیں تار تار پھینکیں۔ وہ سارے کپڑے جو اس کی پسند کے تھے' پھینک دیے' یہ اس کا غصہ تھا۔

رمیض اور مہرماہ کی ساتھ میں لی گئی ساری تصاویر اس نے ایک ایک کرکے جلا ڈالیں۔ ان دونوں کے مل کر لگائے ہوئے پودوں کو اس نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ ان کا گھر کے پچھواڑے بچپن میں ایک ساتھ بنایا گیا مٹی کا گھروندہ جو وقت کے ساتھ مضبوط ہو چکا تھا' اس نے کدال لے کر کھود ڈالا' یہ اس کا حسد تھا۔

اور کیا کیا باقی تھا اس میں' کیا کیا سامنے آنا تھا؟

"مگر کبھی رمیض نے تو نہیں کہا کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔" اس کے اندر کی شہر نے اسے یاد کرانا چاہا۔

"یہ تم تھیں جو خود کہتی رہیں' سمجھتی رہیں' دھوکہ تو تم نے خود کو دیا ہے۔"

"خاموشی کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔ کیا میں اتنی احمق تھی کہ وہ زبان نہ سمجھ سکتی۔" اس نے اندر کی شہر کو جھڑکا۔

"تو تمہیں اقرار کرلینا چاہیے کہ یہ تم ہی تھیں جو احمق تھیں۔ ایک غلط شخص اور غلط جگہ سے تم نے امید لگالی تھی۔ غلط کیا تھا' تب ہی غلط ہی ہوا۔"

"خاموش ہوجاؤ' کیا تمہیں میں ہی ملی ہوں۔ کیا سب کو میں ہی ملتی ہوں۔" وہ چلائی۔

"شہر تیمور! تمہاری عمر کی لڑکیاں ایسی حماقتیں کرلیتی ہیں اور جب ایسی حماقت سرزد ہوجائے تو مان لینے میں کوئی برائی نہیں۔"

"میں اسے کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ اس نے میرا دل برباد کیا' وہ آباد نہیں رہ پائے گا۔ زندگی اسے ٹھکرائے گی۔ میں رو رہی ہوں' ہنس تو وہ بھی نہیں سکے گا۔" وہ بددعاؤں کے مقام تک آگئی تھی۔ اور یہ تھی اس کی نفرت جو غصے اور حسد سے کہیں زیادہ تھی اس میں.....

"میں ہر نماز میں اسے بددعا دوں گی۔"

"کیا کوئی نماز' بددعاؤں کے لیے بھی پڑھ سکتا ہے؟"

اسے افسوس ہوا۔ "یوں مت کرو' جیسے دعائیں اپنے کرنے والے تک خیر بن کر پلٹتی ہیں۔ بددعائیں بھی شر بن کر لوٹ آتی ہیں۔" اس کے اندر کی شہر نے اسے سمجھایا۔

اور وہ جیسے بے بس سی ہوکر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"ان سب نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ ابا' اماں بھی مہر کے لیے رمیض کو چاہتے ہیں اور میرے لیے

کوئی کچھ نہیں چاہتا‘ کچھ اچھا جو میرے لیے رکھا جاتا‘ میرے لیے چاہا جاتا۔“ اس کا اندر اب کی بار خاموش تھا۔

یہ اس کی خود سے جنگ تھی جس میں وہ جیتتی یا ہارتی کچھ فرق نہیں پڑتا‘ دراصل وہ ہار ہی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ بالکل خاموش ہو گئی تھی اور ابا کو لگا کہ وہ ان کے فیصلے کی وجہ سے ایسی ہو چلی ہے۔

پھر ایک روز ابا اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ میز پر سر ٹکائے بیٹھی تھی۔

”اگر اس سے تمہیں خوشی ملتی ہے تو تم اپنی خوشی پوری کر لو‘ مگر میں اسے کبھی تمہارے حق میں قبول نہیں کر سکتا۔“ وہ لوٹتے ہوئے اس کی میز پر فارم رکھ گئے تھے۔ اس کی پسند کے کالج میں پسند کے مضامین پڑھنے کا اختیار اسے دے دیا گیا تھا۔ مگر وہ خوش نہ ہو سکی۔ وہ قفل جو اس کے لبوں پہ لگ گیا تھا نہ ٹوٹا۔

اور تب بھی نہیں جب سب بڑوں نے مل کر مہر اور رمیض کا رشتہ پکا کر دیا‘ رمیض مزید تعلیم کے لیے اسکاٹ لینڈ جا رہا تھا سو اگلے مہینے کی دس کو ان کا نکاح تھا۔

اور یہ قفل تب بھی نہ ٹوٹا جب نکاح نامے پہ دستخط کرنے کے بعد مہر نے سب سے پہلے اسے گلے لگایا‘ اپنی اکلوتی چھوٹی بہن کو۔

اور کتنے ہی اسکیچز اس نے ادھورے چھوڑے اور کتنے ہی اس کے ہاتھوں برباد ہوئے‘ کتنوں کو اس نے پھاڑا‘ کتنوں کو جلا ڈالا‘ اس کا ذہن خالی ہو گیا تھا۔ بنانے کو کہیں بھی کچھ کیوں نہیں رہا تھا؟ بس یہی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ جو بنانا چاہتی‘ وہ بن نہیں پاتا‘ کچھ اور بن جاتا۔ وہ یہ سب بنانے تو وہاں نہیں آئی تھی یہ

بنانے کے لیے تو وہ سارے خاندان کے سامنے کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ رنگوں اور سوچوں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ ایسا سوانگ رچائے رنگ کیوں کھڑے تھے۔

”تم اب اچھے اسکیچز نہیں بناتیں۔“ روشاک اس کے پیچھے سے جھانک کر ”چچ چچ“ والے انداز سے بولا۔

وہ کنویں سے کچھ فاصلے پہ ایک پتھر پر بیٹھی تھی۔ چرمی مشکیزہ بوندیں ٹپکا تا رہا مگر اب وہ اس کی جانب متوجہ نہیں ہوتی تھی تب یہ اس کا محبوب مشغلہ نہیں رہا تھا۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔

”جانتی ہوں میں۔“ سادہ سا اعتراف۔

”اور مجھے شور بھی نہیں کہتیں۔“ سادہ سا اعتراض۔

”حق نہیں رکھتی میں۔“

”یہ حق تو میں بھی نہیں چھین سکتا۔“

اس نے اسی حق سے اسے دیکھا پھر۔

”اور تم ایک مضمون میں فیل بھی ہو گئی ہو‘ کیا یہ کیمسٹری سے زیادہ مشکل ہے؟“

اور وہ اسے کیا بتاتی کہ مضمون نہیں‘ یہ زندگی ہے جو مشکل ہو گئی ہے۔

وہ خاموشی سے اپنے بنائے اسکیچز کو دیکھنے لگی۔ ایک کے بعد ایک... یکساں‘ بے رنگ‘ پھیکے اور بھدے۔

”اب کچھ اچھا نہیں بن پاتا مجھ سے۔“ اس نے سر اپنی بک پہ رکھ دیا۔

”محبت کے بغیر کچھ بن نہیں پاتا اور جس دل میں نفرت آ جائے وہاں محبت کا دم نکل جاتا ہے۔“ وہ اس کے برابر میں اس کی مانند سر گھٹنوں پہ رکھے بیٹھ گیا۔

شہر نے ایک مدت بعد کسی کو حیرت سے دیکھا‘ محویت سے سنا۔ کیا اپنے اندر حسد‘ نفرت‘ بغض پالتے وہ اس قدر بدبودار ہو گئی تھی کہ اس کے اندر کا تعفن باہر تک پھیلنے لگا تھا۔

”بچپن کے ساتھی دل کے ساتھی ہوا کرتے ہیں‘ ان سے کچھ نہیں چھپ سکتا‘ تم نے کیوں کیا ایسا شہر؟ وہ سب غلط ہو سکتے تھے مگر قابل نفرت نہیں۔“

"ان سب نے میری تذلیل کی ہمیشہ' بے عزت کرتے رہے' مہرماہ کو ہر کسی نے ہر جگہ آگے کیا' مقام دیا اور مجھے ہمیشہ رد کیا۔
میں کہیں بھی نہیں تھی' نہ بابا اماں کی نظر میں' رمیض کی نظر میں' کہیں تو ہوتی' کچھ تو ہوتی' ایسا نہیں تھا کہ میں کچھ بن نہیں سکتی تھی' بس ایسا تھا کہ ان کے مطابق نہیں بن سکتی تھی۔ تو کیا خاندان کے ایسے سب ہی بچوں کو سب سے الگ کر دینا چاہیے۔ پھینک دینا چاہیے۔ وہ سب مجھ سے محبت نہیں کرتے' میری پروا نہیں کرتے تو میں کیوں ان کے لیے اپنی محبت دکھاؤں' اپنے دل میں ان کی جگہ بناؤں نفرت ہے تو نفرت ہی سہی۔"
"جو تم سوچ رہی ہو وہ غلط ہے اور اگر وہ درست بھی ہے تو تم نے اس کا توڑ کیوں نہ کیا شہر؟ تم اس کے آگے جوڑنے کیوں بیٹھ گئی؟ کیا تم نے زندگی سے یہ سیکھا ہے کہ کوئی توڑے تو ٹوٹ جاؤ' روکے تو رک جاؤ' مارے تو مر جاؤ' اگر یہی سیکھا ہے تو پھر تم نے کچھ نہیں سیکھا منفی کے مقابل کچھ ہو تو مثبت ہو' اور مثبت کے مقابل بھی مثبت ہو ورنہ کچھ نہ ہو۔"
"نفرت کبھی محبت نہیں سکھا سکتی۔"
"دادا جی کہا کرتے تھے' یہ کنواں بڑا دیالو ہے' ایک دم بے نیاز' اس میں نفرت ڈالو تو بدلے میں محبت اچھالتا ہے' اس کنویں کی سنگت میں کچھ تو سیکھا ہوتا شہر۔ تم ایک کنویں جیسی بھی نہ ہو سکیں۔" اسے جیسے افسوس ہوا۔
"تم تو انسانوں میں سے ہونے چلی تھیں پھر تم نے انسانوں میں سے بھٹکے ہوؤں کو ہی کیوں چنا' ان کے جیسی کیوں نہ بن سکیں جن پر فضل ہوتا ہے۔"
"جو فضل تھا وہ اب نہیں رہا' سارے رنگ جو مٹھی میں قید تھے' مجھ سے کھو گئے اور تخیلات کے سب رستے مجھ سے گم ہو گئے۔"
"تم سے رنگ کھو گئے؟ وہ ہر اس شخص سے کھو جایا کرتے ہیں جو دوسروں کی زندگی میں رنگ نہیں چاہتا۔

رستے ہر وہ شخص گم کر دیتا ہے' جو بھٹک جاتا ہے۔"
شہر نے اپنی اسکیچ بک ہوا میں اچھال دی۔
"تم پہ بوجھ نفرت کا ہے اس کا نہیں جسے تم اٹھا کر پھینک رہی ہو۔ جب تھک جاؤ نفرت کرتے کرتے تو اس کنویں تک آ جانا۔ یہ تمہیں ہلکا کر دے گا۔"
تو یہ رنگ اور تخیلات نہیں تھے جو اس سے کھو گئے تھے' یہ وہ خود تھی جو بھٹک گئی تھی۔ کہیں گم ہو گئی تھی۔
اور اس دن کے بعد سے نہ وہ کچھ بنا سکی نہ ہی امتحان میں پاس ہو سکی۔ آفاق میں خالق کی ہر تخلیق عشق سے ہے اور آدم کی کسی تخلیق میں عشق کا تغافل وہ قبول نہیں کرتا۔
تو وہ ہار گئی' ایک بار پھر سے' اس بار خود سے اور آ کر جھک گئی' ہر تخلیق کے تخلیق کار کے پاس' تھک کر' نامراد ہو کر۔
"یارب میں غلط تھی اور مجھے اب اس اقرار سے انکار نہیں۔ اقرار رحم لاتا ہے' تو تو مہربان ہو جا مجھ پر۔ اقرار حقارت ہٹاتا ہے' تو تو اسے ہٹا دے مجھ سے اقرار قرار دیتا ہے' تو تو قرار دے دے مجھ کو۔" اس نے کنویں کی منڈیر پہ بیٹھتے خود کو نیچے جھکا لیا۔
"میں سب بغض' حسد' نفرت نکال باہر کرتی ہوں تاکہ محبت کے لیے جگہ بنا سکوں' کیا تم نے سنا؟" وہ کنویں میں جھانکتی چلائی۔ پانی نے اس کی آواز ہلکی سی گونج کی مانند اس تک لوٹائی۔ گویا محبت لوٹائی ہو۔
"میں کسی نفرت نامی شے کو اندر نہیں پالتی نہ میں کسی کا برا چاہتی ہوں' کیا تم نے سنا؟" اور اٹل بید کے درخت کی گھٹا نے اس کے کندھے کو تھپکتے اسے شاباشی دی۔
"میں عشق سے ہر تخلیق کی ابتدا چاہتی ہوں' حسد مجھے زیبا نہیں دیتا' کیا تم نے سنا؟"
اور رب کی جانب سے اسے حاسدوں کی فہرست سے پاک کیا گیا۔
"میں نے کبھی کوئی بددعا کسی کے نام جو کی تو انہیں دعائے صغیرہ سے بدل ڈال کیونکہ میں اپنے لیے دعا

چاہتی ہوں۔ کیا تم نے سنا؟"

اور مونج کی گھاس نے جھک جھک کر اس کے "تائب" ہونے پہ سجدہ شکر ادا کیا۔

"میں شہر ماہ تیمور' سارے ہی شر سے خود کو پاک چاہتی ہوں۔ کیا تم نے سنا؟"

اور دور درختوں کی اوٹ سے جھانکتے ہیولے نے ہولے سے مسکراتے واپسی کی راہ لی اور اسے پیاری سی دعا دی۔

"ہاں اچھی لڑکی میں نے سنا' قدرت سے سنا اور ہمارے رب نے سنا' وہ سب ہی رنگ تم تک لوٹ آئیں جو تم نے کھو دیے اور تخلیق کے سب ہی رستے تم پر کھول دیے جائیں۔"

کنویں کی منڈیر پر ٹانگیں نیچے لٹکا کر بیٹھی لڑکی سارے آنسو کنویں میں گرا دینا چاہتی تھی' سارے گناہ سارے ملال۔

اور تخلیق کار جو حساس ہوتا ہے' نہ کسی سے حساب مانگتا ہے' نہ حساب رکھتا ہے۔ اس نے بھی سارے حساب مٹا ڈالے اور فضل نے اسے جالیا۔

☼ ☼ ☼

وہ بیچلرز کے بعد ہی اس ٹیکسٹائل انڈسٹری میں انٹرن شپ کرنے لگی تھی جنہوں نے کالج کی ایک ایگزی بیشن میں ہی اس کے ڈیزائن پسند کرتے اسے یہ آفر کی تھی۔

وقت نے اس کے کام میں نکھار پیدا کرتے ہوئے اسے انفرادیت عطا کی تھی۔ اپنی قابلیت اور محنت کی بدولت وہ بہت جلد انٹرن شپ سے جاب پہ آگئی تھی۔ ایک مخصوص حصہ اس کے کام کو سراہنے لگا تھا۔ پہچاننے لگا تھا۔ وہ گمنام سے نامور ہونے لگی تھی۔ مگر یہ سفر اس اکیلی کا تھا' اس میں ابا اماں یا اس کی فیملی میں سوائے روشاک کے۔۔۔ کسی کا کوئی حصہ نہ تھا اور اسے اب اس بات کی پروا بھی نہیں تھی۔ جنون کام سے تشفی پاتا ہے' لوگوں کے ساتھ سے نہیں۔ لوگ تو کم ہی ساتھ دیا کرتے ہیں۔ یہ بات اس کی سمجھ میں جلد آگئی تھی' اب جا کر آئی ہوتی تو وہ یہاں نہ ہوتی۔

اور اپنا بچپنا' وہ اسے یاد نہ کرتی اور یاد آنے پہ بس مسکرا دیتی اور آگے بڑھ جاتی۔ کامیاب انسان کبھی ماضی میں نہیں جیا کرتے' وہ بھی جینا چھوڑ چکی تھی۔

"میں نے اڑتے اڑتے خبر سنی ہے کہ کچھ کمال کیے ہیں آپ نے لگتا ہے' بہت جلد آپ کے نام کی لان بھی آنے والی ہے۔ شہر ماہ لان۔" وہ صبح اپنے آفس کے لیے نکل رہی تھی جب وہ اپنے مخصوص جاگنگ ڈریس میں ملبوس گیٹ سے اندر آرہا تھا۔ گاڑی کی طرف جاتی شہر ماہ اسے دیکھ کر رک گئی تھی۔

"کب آئے آپ آفیسر صاحب؟"

"غالباً" تب' جب تم کوئی نیٹ' جارجٹ کے فراک' ساڑھیاں ڈیزائن کر رہی ہو۔" وہ مسکرا دی۔

روشاک کی اسے چھیڑنے کی عادت نہیں گئی تھی' اس نے چڑنا چھوڑ دیا تھا۔

"تمہاری اسکیچ بکس کا ایک ڈھیر میرے کمرے کی الماری میں نجانے کب سے پڑا ہے۔ بہت بار سوچا کہ تمہیں لوٹا دوں' بس ہمت نہیں کر سکا۔" وہ کچھ سنجیدہ نظر آیا۔ بات کو کہیں سے تو بڑھانا تھا نا۔

"کون سی اسکیچ بکس؟" وہ چونکی۔

"تمہاری کچھ امانتیں۔" اسے یاد آگیا۔ اور بہت کچھ یاد آکر بھول گیا۔

"تمہاری چوری کی عادتِ ابھی تک نہیں گئی۔"

"میں بھلا کیوں انہیں چرانے لگا۔ وہ تو ہمیشہ سے میرے پاس ہی تھیں گویا میری ہی ہوں۔"

شہر نے نظریں سیکڑ کر اسے تکا تو وہ سر کو ہلکی سی جنبش دیتا جیسے اپنی ہی بات سے بہت محظوظ ہوا ہو۔ ان بے سروپا باتوں کے بجائے اسے براہ راست کام کی بات کرنا چاہیے۔

"تم جو بھی بکواس کر رہے ہو' نہایت فضول ہے۔" شہر کو اس کا انداز چڑا گیا تھا اور وہ جو ابھی کچھ دیر پہلے سوچ رہی تھی کہ اب وہ چڑنا چھوڑ چکی ہے' غلط

ثابت ہوئی۔ شہر کا اب بھی اس کی باتوں پر تپنا اسے بے حد اچھا لگا۔

"تب تو اس بے تو فضول ہی ہوگی۔" وہ اچھل کر اس کی گاڑی کے بونٹ پر بیٹھ گیا۔

"میں سنجیدہ ہوں۔"

"سچ؟ میں یہی تو پوچھنا چاہ رہا تھا۔" وہ اسے تپانے پر خوش سا ہوا۔

"شور۔"

"مچاؤ گی تو سب کو پتا لگ جائے گا۔ ابھی مجھے ابو امی سے تو بات کرنے دو۔" وہ ایسی معصومیت سے اس کی بات اچک کر بولا تھا کہ وہ محض بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"سالوں پہلے اس پیارے رشتے کے بدلے کیسا پیارا رشتہ چپکے سے مجھ سے باندھ گئیں۔ بتایا کیوں نہیں کہ مجھے بدل دو گی' بتایا کیوں نہیں کہ دوستی کے بدلے محبت سونپ دو گی۔" اور شہر چپ چاپ کھڑی اسے سنتی رہی۔

"اب بتاؤ کہ اسکیچ بکس بھجوا دوں؟ تم انہیں ساتھ لاؤ گی یا وہیں رہنے دوں؟"

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" وہ اس انداز میں بولی جس میں اقرار بھلے نہ ہو انکار بھی نہیں تھا۔

روشاک اب مسکراتے ہوئے شہر کو گاڑی اسٹارٹ کرتے دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے ہفتے ہی اسے فردوس صاحب نے مقامی سطح پہ ہونے والی اس ایوارڈ تقریب کی بابت بتایا جس میں وہ بطور "نیو ٹیلنٹ" نامزد کی گئی تھی اور اسے اپنی پوری فیملی سمیت شرکت کرنا تھی۔

فردوس صاحب اسے دعوت نامہ اور پاسز دینے آئے تھے۔ اسی دعوت نامے کو دیکھتے' پڑھتے وہ سوچ رہی تھی کیا ابا مان جائیں گے؟

رات کھانے کی میز پہ تایا ابو بھی موجود تھے۔ بڑے دوستانہ ماحول میں کھانا کھایا جا رہا تھا۔ اگلے ہفتے ہی مہر اور رمیض بھی پاکستان آرہے تھے۔ اور ہوتا ہے نا کبھی کہ ایک ساتھ ہی ساری آزمائشیں آپ کے سامنے آکھڑی ہوتی ہیں۔ یہ دیکھنے کہ آپ کتنا مضبوط ہو چکے ہیں۔ کتنا مقابلہ کرتے ہیں اور کتنا ڈر کر بھاگتے ہیں۔ تو کچھ ایسا ہی ہونے جا رہا تھا۔

"اگلے ہفتے ایک ایوارڈ تقریب ہے ابا جس میں میں نومینیٹ ہوں آپ سب بطور فیملی آئیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔" کھانے کے بعد چائے پیتے تایا ابو اور ابا اس کے پاسز تھمانے پہ حیران ہوئے تھے۔

تایا ابو جنہیں اس فیلڈ میں اس کا مستقبل نظر نہیں آتا تھا' ان کی بصارت نے اس کی ترقی کی ساری منزلوں کو کھنگال ڈالا۔ ابا' جو کبھی اس کے فیصلے کو اس کے لیے قبول نہ کر سکے تھے' انہیں اس دن اس سے بہتر کوئی فیصلہ اس کے حق میں نہ لگا تھا۔ وہ ایوارڈ لیتی یا نہیں' وہ جیت چکی تھی۔

پھر کس کس نے تقریب میں ابا اماں کو خوش قسمت قرار دیا' کس نے تایا ابو کو اس کے حوالے سے اہمیت دی۔ کون مہر اور رمیض کے سامنے اسے سراہتا رہا' اس کی تعریف کرتا رہا۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ ان کی نظروں میں غیر اہم سے اہم بن چکی تھی۔ قابل فخر اور قابل ستائش ہو چکی تھی تو بھی اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اس مرحلے سے نکل چکی تھی۔

اسٹیج پہ ابا اماں کو اسے ایوارڈ دینے کے لیے بلایا جا رہا تھا۔ اس کے اپنوں کو پھر اس کا نام پکارا جا رہا تھا۔

"شہراہ" بہت سے حوالے اس کے نام کے آگے پیچھے لگائے جا رہے تھے' بتائے جا رہے تھے۔ اسے ان سب سے بھی سروکار نہیں تھا۔

غصہ' حسد نفرت سب وہیں ماضی میں رہ گیا تھا۔ ہر طرح سے' ہر طرف سے۔ ہر شے اس کے مقصد کے سامنے بے مقصد ہو چکی تھی۔ راہ جنون میں اوپر اٹھ چمکنے والی "شہراہ" راہ جنون میں آگے بڑھ چکی تھی۔

عطیہ خالد

بڑی دیر سے خالہ کے قابو آیا ہوا تھا دانش' عرف دانی۔ دکان کھولنے کی خوشی میں مٹھائی لے کر آیا ہوا تھا۔

"کس چیز کی دکان کھولی ہے بیٹا تم نے؟" خالہ نے بڑی دیر مٹھائی کے رنگا رنگ ڈبے کا جائزہ لے کر اس کو بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"کریانے کی دکان خالہ۔" دانی نے خوش ہو کر بتایا۔

"اچھا! اگر پھل سبزی کی کھولتے تو اچھا ہوتا۔ چلو اب کھول لی تو کھول لی۔"

"جی خالہ۔" دانی بولا۔

اتنے میں نومی نے مٹھائی کا ڈبا کھول لیا۔ جلدی سے ایک گلاب جامن منہ میں ڈال کر مٹھائی کا ڈبا دانی کی طرف بڑھایا۔

"ارے وہ ہمارے لیے لایا ہے۔"

خالہ نے ڈبا فوراً" واپس کھینچ لیا۔ دانی غریب نے بڑھا ہوا ہاتھ گڑبڑا کر پیچھے کیا۔ نومی نے دوبارہ چپکے سے ڈبے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ خالہ نے تاڑ لیا اور زور زور سے اس کے ہاتھ پر مارا اور ڈبا اپنے پیچھے الماری میں رکھ دیا اور الماری کے آگے گول تکیہ رکھ کر ٹیک لگا لی۔ اتنے میں منا چائے بنا کر لے آیا تھا۔ ٹرے میں تین کپ تھے۔ مگر دانی' نے احتیاطا" ہاتھ نہ بڑھایا اور اچھا ہی کیا۔ کیونکہ خالہ 'نومی اور منے نے کپ اٹھا لیے تھے خالہ بولیں۔

"اچھا کیا جو دانی کی چائے نہیں بنائی۔ یہ ابھی جا کر کھانا کھائے گا۔ چائے تو بھوک کا ناس مار دیتی ہے۔"

دانی کی شکل... اللہ معاف کرے دیکھی نہ گئی اس بات پر....

"ہاں تو بیٹا! میں کہہ رہی تھی کہ جو کمانا لا کر اپنی اماں کے ہاتھ پر رکھنا۔ تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی ہوں۔"

"بالکل نہیں دانی بھائی! کچھ رقم اپنے ہاتھ میں بھی رکھنا۔" منا بولا۔

"اس جاہل کی مت سنو۔" خالہ نے اپنے ایف

اپنے پاس بیٹے کو جاہل بناتے ہوئے لحہ نہیں لگا تھا۔

"تمہاری بیوی بڑی چوٹی ہے اس کو ہرگز مت بتانا کہ کیا کمائی ہے تمہاری۔"

"جی خالہ۔" دانی سعادت مندی سے بولا۔

"اور سنو بیٹا! جب یہ نومی اور منا آئیں تمہاری دکان پر تو بیٹا' ریس مناتب' (ریٹ مناسب) رکھنا۔"

حسب عادت ان سے الفاظ الٹ گئے۔ ہنس ہنس کر نومی اور منا لوٹ پوٹ ہو گئے۔ دانی بھی خالہ کی گھوریوں کے باوجود ہنس پڑا۔ منا قریب تھا خالہ نے ایک ہاتھ اس کو جڑ دیا۔ مگر وہ ہنستا رہا۔

"اچھا خالہ! چلتا ہوں۔" دانی سلام کر کے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"بڑی بے چینی میں رات کٹی آپا! دل چاہتا تھا کہ اڑ کر آپ کے پاس پہنچوں۔" خالہ صبح ناشتہ کرتے ہی اپنی بہن کے گھر پہنچ گئی تھیں۔ "دانی بتا رہا تھا کہ اس نے کریانے کی دکان ڈالی ہے۔"

"ہاں ڈالی تو ہے۔" آپا بولیں۔

چائے بناتی ہوتی رابعہ کو دیکھ کر خالہ آہستہ سے بولیں "آپا! پیسہ کہاں سے آیا دوکان کے لیے۔"

"کہاں سے آتا خالہ! میرا زیور بیچا ہے۔" رابعہ نے آواز سن ہی لی۔

"اچھا اچھا زیور بیچا ہے تمہارا۔" خالہ نے سکون کا سانس لیا اور بولیں۔ "میں تو ڈر ہی گئی تھی کہیں آپا سے نہ ہتھیالی ہو رقم۔" پھر چائے کی پیالی دیکھ کر بولیں "رابعہ یہ کاڑھا تو میں نہیں پیوں گی۔ یہ گرا دو اور بس جب ایک گھونٹ رہ جائے تو اس میں دودھ ملا کر لے آنا۔"

"خالہ! دودھ ختم ہے۔" رابعہ نے ترنت جواب دیا۔

"اچھا! پھر ایسا کرو جو کیلے میں لائی ہوں ناں۔ پورے نو ہیں۔ ان میں سے تین میرے لیے لے آؤ۔ اور باقی آپا کے لیے سنبھال دو۔"

"خالہ یہ کیلے نہ چھ نہ بارہ۔ نو کا کیا حساب ہوا؟" رابعہ بولی۔

"ارے تین نومی' منے اور عاقب کے واسطے گھر رکھ کر آئی ہوں۔" کیلے کھا کر خالہ نے پیر اوپر کر لیے اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگالی۔ اور کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ پھر پوچھا۔

"آپا دوپہر کو کیا پکوا رہی ہیں؟"

"گوشت میں گوبھی ڈالنے کا ارادہ ہے۔" آپا بولیں۔

"اے ہے کیا ہی اچھا ارادہ ہے۔ بس سالن اتنا بنوا لینا کہ میں جاتے وقت ساتھ لیتی جاؤں۔ شام پڑے جا کر کہاں پکاتی پھروں گی۔ اور رابعہ گھی ذرا کھلے ہاتھ سے ڈالنا ہنڈیا میں بلکہ بھونتے پر مجھے دکھا لینا۔"

"خیر تو ہے خالہ! آج ایک لفظ الٹا نہیں بولا آپ نے۔" رابعہ نے جل کر کہا۔

"ارے الٹے لفظ بولتی ہو گی میری جوتی..... یہ پنکھا تو میری طرف کرو' کس قدر **مکھر مچھی' مچھا مکھے' مچھی مکھا۔**"

"جی خالہ! بہت مکھیاں اور مچھر ہو گئے ہیں آج کل۔" قہقہہ لگا کر رابعہ بولی اور پیڈسٹل کا رخ ان کی طرف کر دیا۔

"کس قدر بدتمیز ہے تمہاری بہو آپا۔" کہہ کر جو آپا کی طرف رخ پھیرا تو وہ بھی دوپٹے میں منہ چھپائے ہنس رہی تھیں۔

"چھوڑو اس میری بہو کو!" آپا نے ہنسی دبائی "تم یہ بتاؤ اپنی بہو کب لا رہی ہو؟"

"کیسے لے آؤں بہو آپا۔ ابھی عاقب کی نوکری کو وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ کچھ جمع تو ہو۔"

"اور کتنا وقت چاہیے تمہیں۔ زیور تو بنوا چکی ہو۔ اور عاقب کی نوکری کی اچھی کہی تم نے' چار سال تو ہو گئے اس کی نوکری کو۔"

"ذری دیر کو ٹہل لوں ورنہ گیس سے پیٹ پھولنے لگتا ہے۔" جواب دینے کے بجائے وہ اٹھ گئیں۔ ٹہلتے ٹہلتے رابعہ کی ہانڈی پر بھی نظر ڈالی۔ وہ سبزی کے

چھلکے پھینکنے کے لیے اٹھی تھی۔ فوراً" ایک پیالی تیل بھر کر ہنڈیا میں ڈالا اور ڈوئی ہلادی۔ پھر آپا کی طرف آکر پوچھا۔

"کتنے بجے آتا ہے دانی؟"

"دو بجے آتا ہے کھانا کھانے۔" آپا بولیں۔

"اچھا اچھا! دو بجے آتا ہے دانی۔" پھر برآمدے میں لگے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ سوا ایک ہو رہا تھا۔

"بیلنس ہوگا تمہارے موبائل میں رابعہ؟"

"جی ہے خالہ!" رابعہ نے آٹا گوندھتے ہوئے جواب دیا۔

"بس آٹا گوندھ کر میری اس سے بات کروا دینا۔"

"آپ ان کے آنے تک نہیں رکیں گی؟" حیرت سے رابعہ نے کہا۔

"رکوں گی۔ ضرور رکوں گی۔ مگر مجھے ابھی اس سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

رابعہ نے نمبر ملا کر دانی سے کہا کہ یہ خالہ آپ سے بات کریں گی۔

"دانی! جیتے رہو بیٹا' دکان پر ہی ہو' اچھا! اچھا! ٹھیک۔ چینی ہو گی تمہاری دکان میں۔ بس دو کلو چینی' ایک پتی کا ڈبہ اور ایک ڈالڈا گھی کی پیٹی لیتے آنا۔ ہاں! ہاں! میں تمہارے گھر میں ہوں۔"

"یہ سودا کیوں منگوایا تم نے گھر میں سب موجود ہے۔" آپا نے گڑبڑا کر کہا۔

"ارے آپا اپنے لیے منگوایا ہے میں نے۔" پھر رابعہ کی طرف دیکھ کر بولیں "کھانا تیار نہیں ہوا اب تک' دانی تو آتا ہوگا۔"

"تیار ہے خالہ۔" رابعہ نے روٹی ہاٹ پاٹ میں اتارتے ہوئے جواب دیا۔ اتنے میں دانی میاں بھی مطلوبہ سودا لے کر داخل ہوئے۔ سلام کا جواب دیتے وقت بھی خالہ کی نظر سودے پہ ہی تھی۔ ایک تھیلا اس نے بیوی کو پکڑایا اور ایک خالہ کو۔

"ارے یہ چینی کیسی میلی میلی سی ہے۔" شاپر کے اوپر سے ہی خالہ نے جائزہ لیا۔ "چلو اب تم لے آئے ہو۔ خیر ہے۔"

رابعہ نے کھانا لگا دیا تھا۔ سالن کا بھرا ہوا ڈونگا دیکھ کر وہ بولیں "تمہارے لیے سالن الگ کر دیا یا نہیں۔"

"کر دیا ہے خالہ! آپ بے فکر ہو کر کھائیں۔" رابعہ نے جواب دیا۔ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو رابعہ جھٹ پٹ چائے بنا لائی۔

"یہ اب کہاں سے آگیا دودھ؟" خالہ فوراً" بولیں۔

"یہ ملک پیک لے کر آئے ہیں۔"

"اچھا!" کو خوب لمبا کھینچ کر انھوں نے پیالی پکڑلی۔

"چائے ذرا ڈھنگ کی بنائی ہے اب کے تم نے' ورنہ دل کچا کچا سا ہو رہا تھا گوبھی کی ہیک سے۔ تلی نہیں ٹھیک سے تم نے۔" پیٹ بھر سالن کھانے کے بعد ان کو یاد آیا۔

"تو آپ نہ کھاتیں خالہ! میں آپ کو دال دے دیتی' رات میں پکائی تھی۔" رابعہ نے بھی ادھار چکایا۔ خالہ چپکی ہو رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد دانی دکان کے لیے نکلنے لگا تو بولیں۔

"ارے بیٹا ذرا رک مجھے لے چلو نفیسہ کے گھر تک ذری دیر کو مل کر جاؤں گی۔"

"جلدی کیجئے پھر۔" دانی بولا۔ جھٹ سے برقع اوڑھ خالہ اس کی سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر نفیسہ کے گھر پہنچ گئیں اور اترتے ہوئے بولیں۔

"دانی! کل منے کو دکان میں بھیجوں گی سودے کی لسٹ دے کر۔ سب سودا احتیاط سے دینا اور پیسوں کی فکر نہ کرنا۔" اور جھپاک سے دروازہ کھول کر نفیسہ کے گھر کے اندر داخل ہو گئیں۔ ان کے سلام کی آواز سن کر نفیسہ جلدی سے باہر آئی۔ اس کے گھر اس کی بچی کا رشتہ دیکھنے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ وہ خالہ کو دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔ بیٹھک میں عورتوں کو بیٹھا دیکھ کر وہ ادھر ہی کو لپکیں۔

"ارے نفیسہ یہ کون لوگ ہیں؟" خالہ مہمانوں کو غور سے دیکھ کر بولیں۔

"بیٹھیے خالہ! اپنے عزیز ہی ہیں۔" نفیسہ نے کہا۔

"اے لو! تمہارے کون سے عزیز ہیں جن کو میں نہیں جانتی۔" وہ بولیں۔

"عروسہ کے رشتے کے لیے آئے ہیں یہ لوگ۔" نفیسہ نے مجبوراً بتایا۔
"لو تو ابھی کہاں سے ہو گئے تمہارے عزیز۔ ابھی بیچی (بچی) ہی کہاں تم نے ان کو۔"
مہمان حیرانی سے خالہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔
اتنے میں عروسہ بڑی سی ٹرے سنبھالتی ہوئی لائی اور سلام کرنے کے بعد میز پر رکھ دی۔ لوازمات دیکھ کر خالہ کی طبیعت رواں ہو گئی۔ مہمانوں میں سے جو غالباً لڑکے کی ماں تھی نے اس نے پوچھا۔
"بیٹی! کیا نام ہے تمہارا۔"
"اے لو نفیسہ! ان کو تو لڑکی کا نام تک نہیں معلوم؟" خالہ نے ناک پر انگلی دھر کر پوچھا۔
لڑکے کی بہن نے مسکرا کر پوچھا "پڑھتی ہیں؟"
"نامی (نویں) میں دو بار فیل ہو کر پڑھائی چھوڑ دی۔" خالہ نے فوراً جواب دیا۔
"نفیسہ نے تو بتایا تھا کہ لڑکی بی اے پاس ہے۔" وہ گھبرا کر مہمانوں کو سموسے اور مٹھائی کی پلیٹیں پیش کرنے لگی۔
"اے عروسہ! ذرا میری پلیٹ تو مجھے جلدی سے پکڑانا۔" خالہ نے بے تابی سے کہا۔
"کیا شوق ہیں آپ کے؟" لڑکے کی بہن نے پھر عروسہ سے پوچھا۔
"ارے رات دن ڈرامے دیکھتی ہے۔ یہی ایک شوق ہے اس کو۔"
خالہ کے جواب سے عروسہ روہانسی ہو گئی۔
"یہ آپ کی سگی خالہ ہیں؟" لڑکے کی ماں نے اب کے نفیسہ سے پوچھا۔
"جی ہاں! جی ہاں! میں ان کے خالو کی سگی بیوی ہوں۔" تیزی سے سموسے کھاتے ہوئے خالہ بولیں۔ آپ بھی لیدیئے (لیجیے)" منہ میں پورا گلاب جامن ڈال کر خالہ بولیں۔
"کیا کرتے ہیں آپ کے خالو۔" انہوں نے پوچھا۔
نفیسہ نے فوراً کہا "وہ فوت ہو گئے۔" خالہ نے ٹکڑا جوڑا "کئی برس گزر گئے۔"

"ان کو فوت تو ہی جانا چاہیے تھا۔" وہ بولیں۔
"ارے ہمارے میاں تمہے فوت ہوتے یا جیتے، تم کون ہوتی ہو بولنے والی" خالہ جوش میں کھڑی ہو گئیں۔ گود سے گر کر پلیٹ چکنا چور ہو گئی۔ نفیسہ حیرت سے کبھی اپنے مہمانوں کو دیکھتی تھی کبھی خالہ کو۔

"ارے نکال باہر کر ان منحوس عورتوں کو نفیسہ۔ میں نے عروسہ کے لیے ایسا اچھا رشتہ دیکھ رکھا ہے۔"
اس قدر عزت افزائی پر مہمان خواتین تو تیزی سے باہر کی طرف لپکیں اور نفیسہ ان کے پیچھے۔
"ارے جانے دو نفیسہ، دفعان کر و ان کو، تم ہماری بات سنو!" خالہ نے نفیسہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اتنے میں وہ عورتیں دروازے سے باہر نکل گئیں۔
"خس کم جہاں پاک" خالہ نے ہاتھ جھاڑ کر کہا۔ نفیسہ آنسو بھری آنکھیں لے کر دھم سے کرسی پر گر کر بولی۔
"یہ کیا کیا خالہ آپ نے؟ کس قدر مشکل سے یہ رشتہ آیا تھا عروسہ کا۔"
"لو اور سنو" وہ چمک کر بولیں۔ "وہ عورتیں ہی بہت چالباز اور چلتر تھیں ہمیں تو ایک نظر میں پہچان گئی تھی۔"
"تو آپ بتائیں، کون سا رشتہ ڈھونڈا ہے آپ نے عروسہ کے لیے۔" نفیسہ نے پوچھا۔
"بتائیں گے، اتی جلدی کاہے کی ہے، سوچیں گے پھر بتائیں گے، تم پہلے گرم چائے تو پلاؤ۔"
عروسہ کو گرم چائے لانے کا کہہ کر نفیسہ نے پھر خالہ نے پوچھا "اب بتا بھی چکیں خالہ۔"
عروسہ گرم چائے لے آئی تو وہ پی۔ نفیسہ بڑے صبر سے ان کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ عروسہ بھی بے چین نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"اپنی رابعہ کا بھائی ریاض دیکھ رکھا ہے ناں تم نے" بہت سوچ کر وہ بولیں۔
"وہ کپڑے کی دوکان والا" نفیسہ اشتیاق سے

بولیں۔

"ہاں! ہاں ایک ہی تو بھائی ہے اس کا۔"

"کیا رابعہ نے آپ سے کہا۔" نفیسہ کا شوق دیدنی تھا۔

"چل عروسہ! خالہ کے پیر دبا۔" جذباتی ہو کر بولی۔ خالہ نے ابھی تک کوئی واضح بات نہیں کی تھی۔ مزے سے پاؤں دبوا رہی تھیں۔

"لیکن خالہ لیبہ اپنی رابعہ کی ماں تو بہت خرانٹ عورت ہے۔" نفیسہ پھر بولی۔ "بچی دیتے ہوئے دل ڈرتا ہے۔"

"ارے تو اس کو کون دینے کو کہہ رہا ہے۔" خالہ ہنسیں (عجیب مکارانہ سی ہنسی)

"تو خالہ! ریاض سے بیاہنے کا اور کیا مطلب ہوا؟"

"ہوش کے ناخن لو نفیسہ! ریاض سے کیسے ہونے لگا عروسہ کا بیاہ۔"

"تو ابھی تو آپ نے کہا کہ ریاض دیکھا ہے؟"

"ہاں یہی کہا ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ ریاض سے رشتہ طے ہو گیا ہے؟ اس کی دکان میں ایک لڑکا کام کرتا ہے۔ میں تو اس کی بات کر رہی تھی۔"

اتنا سننا تھا کہ عروسہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور نفیسہ کی مارے صدمے کے آواز ہی نہ نکلی۔ دونوں کو ڈھیلا دیکھ خالہ نے ایک لمحہ میں برقع سر پر رکھا اور پردہ اٹھا کر باہر نکل گئیں۔ سڑک پر جاتے ہوئے رکشے کو روک کر سوار ہو کر گھر کی طرف چل دیں۔ لیکن راستے میں رک کر آپا کے گھر سے سالن کا ڈبا لینا نہ بھولیں۔

☼ ☼ ☼

اتوار کی صبح جلدی جلدی صفائی سے فارغ ہو کر خالہ اپنے صحن میں بکائن کے درخت کے نیچے بیٹھی بھنڈیاں کاٹ رہی تھیں۔ عاقب پیاز چھیل چھیل کر پلیٹ میں رکھ رہا تھا۔ دروازے پہ دستک ہوئی تو اس نے لپک کر دروازہ کھولا۔ رابعہ اور خالہ (جن کو بچے بھی آپا کہتے تھے) اندر داخل ہوئیں۔

"اخاہ! آپا آئی ہیں۔ بھابھی بھی ساتھ ہیں۔" وہ خوشی سے بولا۔ خالہ بھی جھٹ سے آگے بڑھیں۔

"بہت دن بعد آئیں آپا آپ؟ وعلیکم السلام، جیتی رہو۔" خالہ نے رابعہ کے سلام کے جواب میں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

سب لوگ صحن میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ صاف ستھرا صحن، سرخ اینٹوں والا فرش تھا۔ آج تو ہوا چل رہی تھی پنکھے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ عاقب فوراً جا کر ڈیڑھ کولڈ ڈرنک کی بوتل لے آیا اور گلاسوں میں ڈال کر مہمانوں کو پیش کی۔

"آپا کو تو شوگر ہے۔" خالہ فوراً بولیں۔ مگر انہوں نے گلاس پکڑ لیا تھا۔

"ایسا بھی پرہیز نہیں کرتی میں۔"

"ارے مجھے بھی دے دے بچے عاقب ذرا سی۔" خالہ کے کہنے پر عاقب نے لبالب گلاس بھر کر خالہ کو پکڑا دیا۔

"ہم بھنڈیاں نہیں کھائیں گے خالہ! پچھلی بار بھی آپ نے بھنڈیاں کھلا دی تھیں، تیل سے بھری۔" رابعہ نے کٹی ہوئی بھنڈیاں دیکھ کر منہ بنایا۔

"ارے بھابھی! آج ہم آپ کو کڑاہی کھلائیں گے۔" عاقب فوراً بولا۔ تیزی سے مشروب کا گھونٹ لینے کے چکر میں خالہ کو پھندا لگ گیا۔ بڑی مشکل سے بولیں۔

"کہاں ہے چکن کڑاہی؟"

"چکن فریزر میں ہے اور اس کی کڑاہی بنا دوں گا میں۔" عاقب نے خالہ کی گھوریوں کو قطعاً نظرانداز کر دیا تھا۔ منا اور نومی بھی میچ کھیل کر آ گئے تو رونق لگ گئی۔ عاقب اور نومی نے چکن کڑاہی بنائی اور تندور سے روٹیاں لے آئے، سلاد کے ساتھ کھانے کا مزہ آ گیا۔ کھانا کھا کر لڑکے ٹی وی لگا کر بیٹھ گئے۔ اور خالہ، آپا اور رابعہ کے ساتھ کمرے میں لیٹ کر باتیں کرنے لگیں۔

"رابعہ! تمہارے بھائی ریاض کی دکان میں جو لڑکا کام کرتا ہے، کیسا ہے؟"

"کیوں خالہ! آپ کو اس کی یاد کیسے آئی؟" رابعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"وہ اپنی نفیسہ کی بچی (کسی طرح منہ سے بچی نہ نکلا) ہے ناں عروسہ! اس کے رشتے کے لیے پوچھنا چاہ رہی تھی۔"

"خالہ! وہ شادی شدہ ہے۔ دو بچے ہیں اس کے۔ ارے آپ کیوں نہیں بنا لیتیں عروسہ کو اپنی بہو۔ آپ کی بھانجی کی بیٹی ہے۔ ادھر ادھر جو تاک رہی ہیں آپ رشتے۔ پچھلے دنوں آپ نے رفیق رکشے والے کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے رابعہ۔ میں تو خود کہنے والی تھی کہ عاقب اسی کے جوڑ کا ہے۔" آپا بولیں۔

"ارے عروسہ نویں فیل۔ میرا بچہ سولہ پاس۔"

"تو خود پڑھا لے گا۔ گھر کی بچی ہے خدمت کرے گی اور شکل و صورت کی بھی کتنی پیاری ہے۔"

"صرف شکل پر ریجھ جاؤں آپا میں نفیسہ نے تو کوئی گن نہ سکھایا اس کو۔"

"تو تم سکھا لینا اور سچی بات ہے غریب بھانجی ہے ایک ہی بچی ہے اس کی۔ اسے آسرا دو گی تو خدا بھی راضی ہو گا۔"

لاکھ 'خالہ' نے ادھر ادھر کی کوشش کی۔ مگر 'آپا' کیسے چوکتیں۔ کل ہی شام تو عاقب نے "آپا" کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تھا کہ وہ عروسہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اور دونوں ساس بہو کو تھری پیس لان کے جوڑے پیش کیے تھے۔ اور تاکید کی تھی کہ اماں کو کان و کان خبر نہ ہونے دینا کہ عاقب ایسا چاہتا ہے، ورنہ جو گت بنتی اس کی وہ تو عاقب کے ہونے والے بچے بھی یاد رکھتے۔

خالہ نے جوڑے اور بھانجے کی محبت کا ایسا حق نبھایا کہ شام ہی کو رکشہ میں بیٹھ کر تینوں خواتین کا یہ قافلہ نفیسہ کے گھر جا پہنچا۔ عروسہ سر پر مہندی لگائے اوپر شاپر چڑھائے منی بیگم کی "اک بار مسکرا دو" کہ سنگ سنگ مسکرا رہی تھی۔

آپا نے فوراً ہی نفیسہ کے کان میں آنے کی غرض بیان کر دی تھی۔ اس نے میاں کو بازار دوڑایا اور عروسہ کو فوراً سرو ہونے کی ہدایت کی۔ خود چائے کا پانی رکھ کر خالہ کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ قلاقند، چکن تکے، فروٹ چاٹ اور ٹھنڈی بوتل 'خالہ کو تو آنے کا مقصد ہی بھول گیا۔ نفیسہ بھی بار بار ان کی پلیٹ بھر رہی تھی۔ "آپا" نے توجہ دلائی تو وہ ہڑبڑا گئیں 'قلاقند کا پورا ٹکڑا منہ میں تھا۔

"رشتے، تمہارا ہم نفیسہ مانگتے ہیں۔" تیزی سے بولیں۔

سب سے اونچا قہقہہ رابعہ کا تھا۔ وہ مزید گڑبڑا کر بولیں "نفیسے ہم تمہارا رشتہ مانگنے آئے ہیں۔"

"رہنے دو تم!" آپا جھلا کر بولیں۔ "نفیسہ! ہم تمہاری بیٹی عروسہ کا رشتہ اپنے بیٹے عاقب کے لیے مانگتے ہیں۔"

"قبول ہے! قبول ہے خالہ۔" نفیسہ کھلکھلا کر خالہ سے لپٹ گئی۔

عروسہ کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔ فوراً عید کا نیلا جوڑا اور ماں کا شاہانہ لال دوپٹہ اوڑھ 'میک اپ کر کے تیار ہو گئی۔ رابعہ جا کر اس کو لے آئی۔ خالہ نے فوراً دستی سے ہاتھ پونچھ کر سر پر پیار دیا اور بولیں۔

"پھر نفیسہ ازاجت (اجازت) ہے۔"

رابعہ بولی "خالہ ازاجت ہے" سب ہنس پڑے۔ خالہ نے پانچ سو روپے عروسہ کے ہاتھ پر رکھے تو آپا نے کہنی زور سے ان کی پسلی میں چبھوئی۔ مجبوراً خالہ کو وہ لفافہ نکال کر دینا پڑا جس میں عاقب نے دو ہزار روپے رکھ کر دیا تھا۔

"بس یہ رسم ہو گئی۔ اب نفیسہ تم شادی کی تیاریاں کرو۔ دو مہینے بعد ہم اپنی امانت لے جائیں گے۔" آپا بولیں۔

"چاہیں تو یہ امانت ابھی لے جائیں۔" نفیسہ کے میاں کے منہ سے کچھ یوں نکلا کہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

"رات روی تھی... سماں شمس..."

قونیہ شہر کے اس نواحی سرائے میں دنبے کے گوشت کے گاڑھے شوربے کے ساتھ، پہاڑی بچوں کے گالوں کی مانند پھولی ہوئی خمیری روٹی کھانے کے بعد وہ سرائے کی طعام گاہ میں بیٹھا مسافروں کا خاموشی سے جائزہ لے رہا ہے۔ اس کے سامنے بیٹھا مسافر کھانے کو کچھ اس رغبت اور عجلت میں کھا رہا ہے کہ یوسف اس سے نظریں ہٹانے میں ناکام ہے۔ مسافر نے بھی جب اپنے مقصد حیات "پیالے میں پڑے دنبے کو نیست و نابود کردینے" سے فراغت حاصل کرہی لی تو اس کی اپنی طرف دلچسپی دیکھ کر بچکانہ انداز سے مسکرانے لگا۔

"تین دن سے سفر میں ہوں... صبح سے صرف ایک کھجور اور دو سوکھی انجیریں کھانے کا مجرم ہوا ہوں۔"

"اس صورت میں تو یہ چار پیالے بھی ناکافی ہیں۔" وہ شرارت سے مسکرادیا۔

"ابھی اصطبل میں اپنے گھوڑے کی خیر خبر لینی ہے۔ تھوڑا لاڈلا ہے میرا۔ آخر مان ہی جائے گا۔ پھر تسلی سے کھانا کھاؤں گا۔"

"واللہ! ابھی اس کا کھانا باقی ہے۔" اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے اس نے قہوے کی پیالی کو منہ سے لگالیا جو خدمت گار لڑکا اس کے سامنے رکھ گیا تھا۔ سرائے کی طعام گاہ میں مسافروں کا اژدھام تھا اور سرائے کے چھوٹی عمر کے خدمت گار لڑکے قہوے کی پیالیاں، سالن کی رکابیاں اور پانی کی صراحیاں لیے کچھ ذمہ داری سے، کچھ عجلت سے مصروف تھے۔ دیواروں پر خوب چمکا لٹکائی گئی لالٹینیں اور طعام گاہ کے دروازے کے عین اوپر دائیں بائیں جلتی مشعلیں اسے رات کا پیغام دے رہی تھیں کہ "کل صبح تمہیں

مکمل ناول

ہر صورت قونیہ شہر میں داخل ہو جانا ہوگا۔" جس ست روی سے اس نے یہاں تک کا سفر کیا تھا' اس ست روی کے باوجود وہ مزید اپنی اس منزل سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا' جس کی سمت بابا نے زبردستی اسے رخصت کیا تھا۔

وہ اس سفر سے بہت ناخوش تھا۔ اصفہان کا باشندہ' قونیہ آنے پر راضی نہیں تھا۔ بابا نے اس پر جبر کیا' جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتے آئے تھے۔ نظیر شعراوی نے 'اپنے مال و جنس کی تجارت میں اپنے بیٹے یوسف شعراوی کو بھی شامل کر لیا تھا اور اسے گھوڑے پر بٹھا کر قونیہ کے سب سے بڑے تاجر کے گھر کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ اسے اس تاجر کی بیٹی سے شادی کرنی تھی۔

"مجیب درّانی۔" نظیر شعراوی اس کا نام سونے کے سکوں کی کھنک سے زیادہ کھنک دار آواز میں لیتے۔

"مجیب درّانی شہر سے باہر ہے... کیا اسی لیے شہر کے کتوں نے دیوانہ وار بھونکنا کم کر دیا ہے۔"

ابو فاشا کی دعوت میں مجیب درّانی کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھایا گیا اور اسے کتوں کی معیت میں یاد کیا گیا۔ شہر کے معززین نے ایک جان دار قہقہہ لگایا اور ان سے ذرا ہٹ کر بیٹھے عکرمہ نے شاکی نظروں سے ان سب کی طرف دیکھا۔ اسے شک ہوا کہ اس کے باپ کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ مردار کی شکلوں جیسے یہ مغرور اور عیار بوڑھے اس کے باپ کی دولت اور دبدبے سے جلتے ہیں۔ اس کا بس چلے تو ان پر تیر' تلواریں سونت لے اور گھوڑوں کے سموں تلے ان کی زندہ لاشیں روند ڈالے۔

"ذرا ہوش سے' مجیب درّانی کا خاندان یہیں موجود ہے۔" حقے کی نے منہ سے پرے کرتے کسی عیار بوڑھے نے کہا۔

"ہم بھی مجیب درانی کی مدح سرائی ہی کر رہے ہیں کہ جب وہ ایرانی قالینوں میں شاہی نوادرات' زعفران' زمرد اور سونے کے کھوٹے سکے چھپا کر لاتا ہے تو اس کی چال کسی بھیڑیے کی طرح ولکی ہو جاتی ہے۔"

ایک اور قہقہہ ابو فاشا کے محل نما گھر کے باغ کی زینت بنا' جہاں رات کی دعوت میں شہر کے معززین شام سے جمع تھے۔ کم خواب سے سجی نشستوں پر براجمان معززین' کھانے سے فراغت کے بعد کتنے بھیڑ اور بھیڑوں کی باتوں میں مصروف تھے۔ خدمت گار' غلام' مشروب سے بھری صراحیاں لیے جھک جھک کر ان کے آب خوروں میں انڈیل رہے تھے۔

مشعلوں کی روشنی' شمع دانوں کی سجاوٹ' تھالوں میں سجے میوے' باغ کے اطراف محرابی بالکونیوں میں بیٹھی شادی شدہ بڑی عمر کی خواتین جن کے ہاتھ زیورات کے بوجھ سے اٹھتے نہ تھے' گردن تنگیٔ آرائش سے حرکت نہ کرتی تھی' کی باتیں خدمت گاروں اور غلاموں کی دردسری سے شروع ہو کر ریشم کے تھانوں کی کم یابی' قالینوں اور ظروف کی چڑھتی ہوئی قیمتوں اور متوقع شادی بیاہ کے معاملات تک پہنچ چکی تھیں۔

"عزیزہ خاتون! آپ یشفین کی شادی گھر کے کسی خدمت گار سے کریں گی؟" خاتون عبدالحئی نے پوچھا۔

عزیزہ خاتون کے دل کو ٹھیس لگی۔ "ہرگز نہیں... یشفین اور لیلیٰ میں فرق کیسا جو میں یشفین کی شادی کسی خادم یا غلام سے کروں۔"

"فرق تو ہے... لیلیٰ بیٹی ہے اور یشفین...." خاتون عبدالحئی نے ارادتاً بات مکمل نہ کی۔ عزیزہ خاتون کو ایک اور دھچکا لگا۔ لوگوں کی یادداشت کمال کی ہوتی ہے۔ ماضی کتنا ہی صدیوں پرانا کیوں نہ ہو جائے' وہ اسے حال کی طرح یاد رکھتے ہیں۔ یشفین ان کی مرحومہ کنیز اور مرحوم خدمت گار کی بیٹی ہے' یہ بات سارے شہر کو معلوم بھی ہے اور یاد بھی۔ لیکن یہ معلوم نہیں کہ عزیزہ نے لیلیٰ اور یشفین کو ایک سے دو نہیں ہونے دیا۔ لیلیٰ بیٹی تھی تو یشفین بھی وہی تھی۔

انہوں نے ذرا دور قالین پر دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی یشفین کو دیکھا۔ اس کے لباس کا رنگ سبز تھا' اس کی آنکھیں بادام رنگ تھیں' اس کے حسن کی پرکاری' شہر کی کسی بھی خوب صورت لڑکی سے کم نہیں تھی۔ اس کی آواز کا ترنم' عادات' سوجھ بوجھ' عقل و دانائی' کتنی ہی لڑکیوں میں اسے ممتاز کرتی تھی۔ لیلیٰ کی طرح وہ بھی مدرسے سے فارغ التحصیل تھی۔ مہینے میں ایک بار دریا کی سیر کے لیے جاتی اور دن میں شہر سے باہر باغ میں ٹہلنے کے لیے۔۔۔ لیلیٰ کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو یشفین کے پاس نہیں تھی اور پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ فرق تو ہمیشہ رہے گا۔

"بابا صلاح کے لیے نشست کا اہتمام کیا جارہا ہے۔" ایک لڑکی نے آکر اعلان کیا اور سب لڑکیاں تقریباً" بھاگتے ہوئے محرابی برآمدے میں قالین پر آمنے سامنے ترتیب سے بیٹھ گئیں۔

"لڑکیوں کو لگتا ہے کہ بابا صلاح انہیں ان کی قسمت کا حال بتادیں گے یا ان کے ہونے والے دولہا کے بارے میں ضرور کوئی دعا دیں گے۔ لڑکیوں کو یہ خوش فہمی آخر ہوئی کب؟"

"چند سال پہلے جب انہوں نے مائدہ کو اپنا رومال دیا اور اسے ایک شہزادے جیسا دولہا ملا۔"

"پھر تو مائدہ سے وہ رومال لے کر شہر بھر کی لڑکیوں کو باری باری دے دینا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ہمارا شہر شہزادوں کا شہر کہلانے لگے۔" سب ہنسنے لگیں اور عزیزہ خاتون بھی ہنسے بغیر نہیں رہ سکیں۔

بابا صلاح آچکے تھے۔ ان کا شہر میں قیام محدود تھا۔ اسی لیے لڑکیوں نے ابو فاشا کی دعوت میں آنا فرض سمجھا تھا۔ لڑکیاں انہیں کچھ بھی سمجھتی ہوں' لیکن درحقیقت وہ سرزمین عرب میں پھیلے اپنے مدرسوں اور کتب خانوں کی وجہ سے معروف تھے۔ ان کی عزت و تکریم شاہی ایوانوں تک تھی۔ وہ ان میں سے کتنی ہی لڑکیوں کے استاد بھی تھے' ان کے باپوں کے بھی۔ یشفین اور لیلیٰ جب چھوٹی تھیں تو ان ہی کے مدرسے میں پڑھنے کے لیے جاتی تھیں۔ پھر وہ دمشق چلے گئے۔

ان کی طبیعت میں عجز اور دانائی اتنی غالب تھی کہ جب وہ جوان تھے تب بھی خواتین انہیں ایک باپ' ایک بھائی کی حیثیت سے اپنا محرم سمجھتی تھیں' نامحرم نہیں۔ بابا صلاح کو بھی مردوں کے معاملات سے زیادہ عورتوں کی فہم و فراست کی فکر رہتی تھی۔ اس لیے وہ ہر اس انسان کو اپنا دوست رکھتے تھے جو اپنی بیٹی کو مدرسے میں علم کے لیے بھیجتا ہے اور جو سفر سے واپسی پر زیورات کے ساتھ اپنی بیوی کے لیے کتاب بھی لاتا ہے۔

مسند پر بیٹھے اپنے سفر کی کہانیاں سناتے بابا صلاح اور ان کے پیچھے جھانکتا تو یہ شہر' یشفین نے رات کو ہزار داستان پایا۔

"بابا صلاح کا رومال مجھے ہی ملے گا نا۔۔۔" لیلیٰ نے یشفین کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہو سکتا ہے وہ تمہیں خنجر دے دیں۔ جو جواں مردی کی نشانی ہے۔"

"یہ ظلم اور بغاوت کی نشانی بھی تو ہے۔ تم ہی کہتی ہو۔"

یشفین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "مجھے قلم کہنا چاہیے تھا۔"

"کیا وہ معلم ہوگا؟"

"تمہیں معلم پسند نہیں؟"

"تم جانتی ہو کہ میں کیسے رو رو کر مدرسے جاتی تھی۔ اب تم چاہتی ہو کہ وہ مدرسے میں بھی پڑھاتا رہے اور مجھے بھی گھر میں شاگرد بنائے رکھے۔" لیلیٰ نے شرارتی سی شکل بنا کر کہا۔

یشفین اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ کتنی ہی نک چڑھی لڑکیوں نے اسے گھور کر دیکھا تو اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ بابا صلاح بھی اپنا قصہ سنا کر خاموش ہو گئے تھے۔ یعنی اب لڑکیوں کا انتظار ختم ہوا۔ ان میں سے کسی ایک بھی لڑکی نے غور سے وہ باتیں نہیں سنی ہوں

گی جو اتنی دیر سے بابا صلاح سناتے رہے تھے۔ انہیں تو اس چرمی تھیلے کی فکر ستا رہی تھی جو بابا صلاح الدین ہر بار اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ جس میں سے ایک بار ایک رومال برآمد ہوا تھا جو مائدہ کا نصیب بن گیا تھا۔

سب سے پہلے خاتون ابو باشا بابا صلاح کے سامنے آکر دو زانو بیٹھ گئیں۔

"اگر ساری دنیا کے چراغ بجھ جائیں تو کیا کرنا ہوگا محترم خاتون۔"

"دن کا انتظار......"

"اگر رات بہت لمبی ہو جائے؟"

"آگ کا انتظام......"

"آگ کہیں بھی میسر نہ ہو تو کیا روشن کرنا ہوگا؟"

"صبر کا چراغ......" بابا صلاح نے خوش ہو کر تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور اپنا قلم نکال کر خاتون کے ہاتھ رکھا۔

"آپ کی دانائی نے مجھے متاثر کیا۔ میں آپ سے خوش ہوا ہوں۔"

پھر ایک ایک کر کے سب ان کے سامنے آکر بیٹھنے لگیں۔ کسی کو ہاتھ کا زیور ملا' کسی کو پیشانی کا۔ کسی نے ریشم حاصل کیا' کسی نے جائے نماز۔ لڑکیوں میں بے چینی بڑھنے لگی۔

"کیا اس بار بابا صلاح اپنے تھیلے میں رومال نہیں لائے۔"

"اگر تمہیں بہت نیند آرہی ہو تو تم کیا کرو گی لیلیٰ بیٹی......؟"

"میں سو جاؤں گی بابا......"

"تم نے راتیں' کئی دن سوتی رہی ہو' نیند پھر بھی غالب رہے تو؟"

"تو سوتی رہوں گی نا' یا بابا...... مجھے کون سے خطۂ عرب کے میدانوں میں گھوڑے دوڑانے ہیں۔"

خوش گلو پرندے کے دل والی لڑکی لیلیٰ نے اتنی معصومیت سے کہا کہ قالین پر بیٹھی سب لڑکیاں اور دور نشستوں پر براجمان خواتین ہنسنے لگیں۔ لیلیٰ درّانی کو فراغت بہت پیاری تھی۔ فراغت حاصل کرتی تو آئینے کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ اسے سورج کی کرنوں میں اپنے حسن کی چاندنی کو دیکھنا پسند تھا' گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر سفر کرنا نہیں۔ بابا صلاح نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک کتاب نکالی۔

"نیند غفلت کی نشانی ہوتی ہے اور یہ غفلت تمہیں عزیز بھی ہے۔ یہ کتاب پڑھا کرو۔"

لیلیٰ نے کچھ ایسے منہ بنالیا کہ لڑکیاں جو سب سمجھتی تھیں' نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنا شروع کر دیا۔ تو رومال اس کے بھی حصے میں نہیں آیا۔ رومال شاید کسی

کے حصے میں بھی نہیں آنے والا تھا۔

"مجھے کچھ اور دے دیں......" لیلیٰ صاف صاف رومال کا ذکر نہیں کر سکی۔

"میری بیٹی! میں تاجر نہیں ہوں۔ نہ ہی آرائش فروش۔ یہ سب تو تمہیں تمہاری عقل اور سوجھ بوجھ پر مل رہا ہے۔ کتاب کے ملنے پر تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ میں نے یہاں موجود چھ بے عقلوں سے اس کتاب کو بچائے رکھا۔"

"یعنی میں سب سے زیادہ بے عقل ہوں؟"

"نہیں! تمہیں سب سے یادہ ہوش مندی کی ضرورت ہے میری بیٹی۔"

لیلیٰ اٹھ کر بشفین کے پاس آئی اور منہ بنا کر بولی۔ "تم نے قلم اور معلم کا ذکر کیا اور یہ دیکھو' میرے ہاتھ میں کتاب آگئی۔"

بشفین کو اس پر اتنا پیار آیا کہ اس کے گال پر چٹکی بھری۔ ایک ایک کر کے دوسری لڑکیاں بھی جا کر بیٹھ گئیں۔ سوال وجواب ان سب کو حد درجہ محظوظ کر رہے تھے۔ ان سب کے قہقہے نیچے باغ تک سنے جا سکتے تھے۔ آخر میں بشفین اٹھی۔ وہ اس لیے بھی ایسی محفلوں میں پہل نہیں کیا کرتی تھی کہ وہ اپنی حیثیت ہمیشہ یاد رکھتی تھی۔ یہاں عزیزہ کی وجہ سے اسے وہی عزت و تکریم حاصل تھی جو لیلیٰ کو تھی' لیکن وہ اس عزت تکریم کو سب سے آخر میں ہی وصول کرتی تھی۔

وہ بابا صلاح کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اسے بھی رومال نہیں دیا جائے گا' اسے کسی شہزادے کا انتظار نہیں تھا۔ وہ ایک خادمہ تھی اور اسے اپنے آقاؤں کے حکم پر ہی سر تسلیم خم کرنا تھا۔ وہ اپنے دل میں ایسی کوئی چاہت نہیں رکھتی تھی جو اس وقت وہاں موجود ہر لڑکی کے دل میں تھی۔

"تم ایک فرماں بردار بیٹی اور بااصول انسان ہو۔"

"اگر ایسا ہے تو مجھے خوشی ہے 'یا بابا۔" اس کی آنکھیں ہر طرح کے لالچ سے مبرا تھیں۔ اس کی ہر جنبش پر احترام اور وفاداری غالب تھی۔ بابا صلاح اسے بہت پسند کرتے تھے۔ وہ ان کی لائق شاگرد رہی تھی۔ اس کے دل کی پاکیزگی انہیں خاص پسند تھی۔

"دنیا میں سب سے زیادہ حقیر انسان کون ہے؟"

"جو دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔"

"اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں اس پوری دنیا کا چکر لگانے جا رہا ہوں تو میں کس جستجو میں جا رہا ہوں؟"

"اگر آپ دانا ہیں تو خود سے زیادہ دانا کی' اگر درویش ہیں تو خدا کی' اگر طالب ہیں تو علم کی اور اگر ایک عام انسان ہیں تو دنیا کی ہر چیز کی جستجو میں جا رہے ہیں۔"

عزیزہ خاتون نے فخر سے بشفین کو دیکھا۔ بابا صلاح کے چہرے کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ انہیں بشفین کے جوابات کس قدر پسند آئے ہیں۔ بابا صلاح نے خوش ہو کر تھیلے میں ہاتھ ڈالا' لیکن ان کا ہاتھ تھیلے سے خالی ہی باہر آیا۔ سب کو نظر آ رہا تھا کہ تھیلا تو خالی ہو چکا ہے۔

"یا بابا! آپ کی دعا میرے لیے کافی ہو گی۔" بشفین نے فوراً" کہا۔

"تم جیسی وفادار بیٹی کے لیے ہمت و حوصلے کی دعا اور یہ میرا رومال۔" اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر انہوں نے یک دم اپنا رومال نکال کر اس کے سامنے کیا۔ قونیہ شہر کے وزیروں' پاشاؤں' تاجروں کی شہزادیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

بشفین کے چہرے کا رنگ اڑ گیا' اس نے کانپتے ہاتھوں سے رومال کو پکڑ لیا۔ اس نے خود کو صرف بابا کی دعا کا حق دار ٹھہرایا تیزی سے لیلیٰ کے پاس آتے اس نے رومال کو اس کی گود میں اچھال دیا اور جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"میں نے تمہارے لیے بابا کی جیب سے رومال حاصل کیا ہے۔"

✲ ✲ ✲

رات گئے گھر واپسی پر گھوڑا گاڑی میں بیٹھے لیلیٰ نے بشفین کے کان میں سرگوشی کی۔ سامنے ہی ماں بیٹھی

اونگھ رہی تھیں۔

"کیا مہمان نے یہاں آنے کے لیے سفر اختیار کرلیا ہو گا۔"

شفین ہنس دی۔ "تمہیں ابھی سے اتنا بے قرار نہیں ہونا چاہیے لیلیٰ۔"

"امینہ مجھ پر طنز کررہی تھی۔ کہنے لگی تمہارے بابا کو اتنے بڑے شہر میں کوئی لڑکا پسند نہیں آیا جو اتنی دور سے مہمان آرہا ہے۔"

"اس سے کہنا تھا کہ شہزادے ہمیشہ دور سے ہی آتے ہیں۔"

لیلیٰ نے خوش ہو کر اسے دیکھا۔ "تم برجستہ جواب دیتی ہو۔ میری زبان میں لکنت پڑ جاتی ہے۔ تم نے بابا صلاح کا دل بھی جیت لیا' انہوں نے تمہیں دعا عنایت کی۔ لیکن مجھے ان کی دعا مبہم لگی۔ کیا مطلب تھا ان کی دعا کا؟"

شفین نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ "شاید یہ کہ میں مشکل حالات کا ہمت سے مقابلہ کرسکوں۔"

"اللہ نہ کرے کہ تم پر کبھی مشکل وقت آئے۔"

☼ ☼ ☼

سرائے کی رات عجیب رہی۔ اسے رات بھر یہ لگتا رہا کہ اصطبل سے کوئی اس کا گھوڑا کھول کر بھاگ رہا ہے۔ نئے شہر میں چوری کے اس وہم نے اس کے مزاج کو گرم کردیا۔ ویسے بھی وہ گرم مزاج لے کر ہی سفر کے لیے نکلا تھا۔ وہ شہر کے اتنے قریب آچکا تھا کہ وہ جس قدر بھی تاخیر کا مظاہرہ کرتا' ظہر سے پہلے شہر تک پہنچ جاتا۔ اس سارے سفر کے دوران وہ یہ ہی چاہتا رہا کہ اسے ڈاکو لوٹ لیں یا زخمی کردیں یا وہ راستہ بھٹک جائے ورنہ اس کا گھوڑا کسی کھائی میں پھنس جائے اور وہ دوسرے قافلوں میں پناہ لیتا کسی ایسے شہر پہنچ جائے جہاں اس کے بابا اسے ڈھونڈ نہ سکیں۔ لیکن وہ اپنی ماں کو اپنی سلامتی کے پیغامات بھجواتا رہے۔ یا اس سے کوئی ایسا جرم سرزد ہو جائے کہ اسے قونیہ شہر میں داخل ہی نہ ہونے دیا جائے اور وہ مایوس (دل ہی دل خوش) صورت اپنے شہر' اپنی ماں کے پاس لوٹ جائے۔

گھوڑے نے بھی شاید جان لیا تھا کہ اس کا مالک کتنا بددل ہو چکا ہے کہ اس نے بھی اپنی چال میں تیزی لانے کی کوشش نہیں کی اور دونوں شہر کی طرف جانے والے راستے پر آوارہ گردوں کی طرح' جنہیں گھر جانے کی کوئی جلدی نہیں ہوتی' دھول اڑاتے رہے۔ دور سے شہر نظر آنا شروع ہوا تو اس کا منہ بن گیا۔ بے زاری سے اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور اس کا رخ سبزے کی طرف موڑ دیا۔ دن ڈھلنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ وہ سبزے پر چہل قدمی کرسکتا تھا۔ کیا ضرورت تھی میزبان کے محل میں جاکر قید ہونے کی' جہاں وہ اس کی بے جا خوشامد کریں گے اور سفر کا بے زار کن احوال بصد شوق سننا چاہیں گے۔ دمشق سے فرات تک پکنے والے سارے کھانے اس کے سامنے ڈھیر کردیے جائیں گے اور محترم کی بیٹی اسے بہانے بہانے سے دیکھنے کی کوشش کرے گی۔

کچھ دیر تک وہ یوں ہی باغ کی سیر کرتا رہا۔ گھوڑے کو گھاس چرنے لیے چھوڑ دیا۔ کچھ دور سبزے پر رکھی اسے ایک صراحی نظر آئی۔ اسے پیاس لگی تھی' اس کا پانی ختم ہو چکا تھا۔ پھر صراحی کے قریب اسے ایک لڑکی بھی دکھائی دی۔ اسے مانگ کر پانی پی لینا چاہیے تھا' کیونکہ وہ شام تک شہر کے اندر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ لڑکی کے قریب گیا جو زمین پہ جھکی شاید کچھ کھود کر نکال رہی تھی۔

"تمہاری صراحی میں پانی ہے تو مجھے دے دو.... مجھے پیاس لگی ہے۔"

اچانک آواز پر لڑکی کچھ ایسے گھبرا گئی کہ قریب رکھی صراحی ہاتھ لگنے سے لڑھک گئی اور سارا پانی زمین پی گئی۔ سر سے پھسلتے دوپٹے کو اس نے کھینچ کر پیشانی تک گھسیٹا اور کان سے پلو پکڑ کر چھپانے کی کوشش کی اور پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"کیا اجنبیوں سے ایسے مخاطب ہوا جاتا ہے؟"

دھوپ میں تیزی تھی' شاید اسی لیے اس کے لہجے میں

بھی تپش تھی۔

"میں نے تو صرف پانی مانگا ہے۔" وہ پیاسا تھا شاید اسی لیے لہجہ تیز تھا۔

اور مانگنے والوں کی آواز میں ایسی للکار ہوتی ہے؟" دھوپ بہت ہی زیادہ تیز تھی۔

"میں نے تو التجائیہ مانگا ہے۔" وہ شرمندہ ہوا کہ آخر کار مجیب درانی کے گھر جانا موخر نہیں ہو سکا تو اس نے غصہ اجنبی لڑکی پر کیوں اتارا۔

"ایسے التجائیہ کہ میری صراحی پھسل گئی' پانی بہہ گیا۔" لڑکی پھولوں کے ڈھیر کے پاس بیٹھی تھی' اس کے قریب ہی کھاد رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ گیلی مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے اور وہی مٹی دوپٹا کھینچتے ہوئے اس کے ناک' گال' بھنوؤں پر نقش ہو چکی تھی۔

یوسف شعراوی ایک بدتمیز انسان رہا ہو گا' وہ شنگرفی دوپٹے کی اوٹ سے جھانکتی لڑکی کی آنکھوں کے غصے اور مٹی سے بنے نقش و نگار کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے خط اسود میں لکھے رومی کے شعر کو شمس کی نظر سے پڑھ رہا ہو۔

لڑکی نے صراحی اوپر اس کے پاس کی۔ "اب اسے وہاں سے بھر کر لا دو۔" ہاتھ سے اس طرف اشارہ بھی کیا۔ صراحی پکڑ کر' کچھ دور سے بھر کر لا کر اس نے اس کے قریب نیچے رکھ دی۔ وہ بڑی تن دہی سے کھاد ڈالنے میں مصروف تھی' اس لیے اس پر قطعاً" کوئی توجہ نہ دی۔

"میں مسافر ہوں... راستہ بھول گیا ہوں۔"

اصفہان سے قونیہ آتے ہوئے اس نے کسی سے ایک بار بھی یہ نہیں کہا تھا کہ وہ مسافر ہے۔ جو سفر ہی اسے منظور نہیں تھا۔ اس کا اعلان کیسے مطلوب ہوتا۔ البتہ اپنی منزل پر پہنچتے ہی اسے یاد آ گیا کہ وہ تو "مسافر" ہے اور راستہ بھی بھول گیا ہے' جبکہ شہر وہ سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔

صراحی سے پانی نکال کر پھولوں پر چھڑکاؤ کرتے اس کے ہاتھ رک گئے' اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ "راستہ بھول جانے والے مسافر باغ میں فراغت سے ٹہلا نہیں کرتے۔"

"میں ٹہل نہیں رہا' میرے گھوڑے کو بھوک لگی تھی' اس کی خوراک کی خاطر رک گیا تھا۔"

لڑکی نے سر گھما کر ذرا دور اسی کی طرح "ٹہلتے گھوڑے" کو دیکھا۔ "گھوڑے کو اتنی بھوک لگی ہے کہ وہ گھاس کھا نہیں رہا تھا سونگھ رہا ہے۔"

بھنا کر یوسف نے گھوڑے کی لگام کو پکڑا اور اس پر بیٹھ گیا۔ وہ لاجواب ہو گیا تھا اور بلاوجہ ہی اسے اس پر غصہ آ گیا۔

"کیا اس شہر کے سب ہی لوگ تم جیسے بدتمیز اور بدلحاظ ہیں۔"

"اتنے نہیں جتنے تم ہو... تم گھوڑے پہ سوار ہو کر ایک لڑکی سے مخاطب ہو۔ کیا تم میں اتنا بھی اخلاق نہیں کہ ایک عورت کو کبھی بھی بلندی سے مخاطب نہیں کرتے۔ نہ پہاڑ کی چوٹی سے' نہ گھوڑے کی پیٹھ سے۔" یوسف نے اپنا سر گھومتے ہوئے محسوس کیا۔ اسے لگا کہ اس کی اب تک کی زندگی اکارت گئی۔ مدرسوں کی مار' کتابوں کے رٹے' عقل مندی اور دانائی کی باتیں' سب ہیچ رہیں۔ وہ فوراً" گھوڑے سے کود کر نیچے کھڑا ہو گیا۔

"میں اس شہر میں اجنبی ہوں۔"

"یعنی آخر کار یہ فیصلہ ہو گیا کہ یہ ہی وہ شہر ہے جس کا راستہ تم کچھ دیر پہلے تک بھولے ہوئے تھے۔"

"صبح سرائے میں اس نے کس کی شکل دیکھی تھی... آآآ... پانی کے برتن میں اپنی..."

"شہر کے راستوں کے بارے میں انجان ہوں۔"

"حیرت ہے۔ ایک مسافر' ایک عورت سے راستہ پوچھنا مناسب سمجھتا ہے۔ وہ یہ تک نہیں جانتا کہ عورتیں راستے نہیں بتایا کرتیں' یہ کام مردوں کے ہوتے ہیں۔ ورنہ انہیں بھٹکا ہوا مانا جاتا ہے۔" یوسف کی ساری عقل مندی اس کے قدموں میں آ گری۔ اس کا مکر اس کا منہ چڑانے لگا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے ایڑ لگا دی اور چارہ ہی کیا تھا۔ کیا وہ اپنی ساری عقل مندی سے وہیں ہاتھ دھو بیٹھا تھا؟

شہر کے اندر داخل ہو کر وہ گھوڑے سے اتر گیا اور اس کی لگام پکڑے پکڑے چلنے لگا۔

"شہر اچھا ہے۔" اپنی تختیاں لہراتے' چلاتے' چھٹی کے وقت مدرسے سے نکلنے والے بچے جب اس کے قریب سے گزرے تو اس نے سوچا۔

بڑھئی جو میز کی سطح پر کیلیں ٹھونک رہا تھا اس کو دیکھتے' قہوہ پیتے دو بوڑھے۔ اجنبی کو اپنے شہر میں دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائے انہیں ہاتھ پیشانی تک لے جا کر سلام کرتے اور خشک میووں کا تھال سر پر اٹھائے خوانچہ فروش جو نامعلوم کس زبان میں آوازیں لگا رہا تھا کے قریب سے گزرتے اسے شہر اور زیادہ اچھا لگا۔

ٹھیک ہے اسے مجیب درآبی کے گھر جانا ہی ہے' لیکن خوش آئند بات یہ ہے کہ وہ یہ جان چکا ہے کہ اس نے اپنی اب تک زندگی میں دو بڑی غلطیاں کی ہیں۔

"گھوڑے پر سوار ہو کر لڑکی سے بات کرنے کی۔۔۔ اسی لڑکی سے راستہ پوچھ لینے کی۔" مشک فروش کی دکان کے اندر سرسری جھانکتے ہوئے اس نے اپنی دو اور غلطیاں جان لینے کا ارادہ کیا۔

اسے اس لڑکی سے دوبارہ ملنا چاہیے۔۔۔ لیکن کیسے۔۔۔؟

اسے اس لڑکی سے کچھ اور باتیں کرنی چاہئیں۔۔۔ لیکن کیوں؟

وہ اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہے۔۔۔ لیکن؟ ہاں۔۔۔ بس دیکھنا چاہتا ہے۔

☆ ☆ ☆

خالی صراحی کو ہاتھ میں پکڑے وہ گھر میں داخل ہوئی اور حوض کے کنارے بیٹھ کر اپنے پیروں کی مٹی دھونے لگی۔ پانی میں اسے اپنا عکس نظر آیا تو چہرے پر مٹی لگی نظر۔۔۔ آئی۔ وہ جلدی جلدی منہ دھونے لگی۔ لیلیٰ جو اس کے انتظار میں نہ جانے کتنے پہر سے اپنا سانس روکے ہوئے تھی' بالائی منزل سے پھلانگتی ہوئی نیچے آئی کہ راستے میں آنے والی کتنی ہی چیزیں اس کی ٹھوکر سے لڑھک کر ادھر ادھر جا گریں۔ ماں عزیزہ نے تاسف سے لیلیٰ کو دیکھا۔

"وہ آچکا ہے۔۔۔" لیلیٰ نے کچھ اس شدت سے اس کے کان میں گھستے ہوئے کہا کہ وہ حوض میں گرتے گرتے بچی۔ یشفین ویسے تو بھنائی ہوئی تھی' لیکن لیلیٰ کے جوش پر اپنا غصہ بھول گئی۔

"کب؟ عکرمہ تو کہہ رہا تھا شاید وہ عید کے چاند آئے۔"

"وہ بہار کے چاند آچکا ہے۔ میرا خیال ہے' مجھے رات کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ پکا لینا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے ایسا غضب ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ سنا ہے حکیم بابا شہر سے باہر ہیں۔" لیلیٰ نے اس کی کلائی پر چٹکی بھری۔

"ماں اس کے لیے رات کی دعوت کا انتظام کر رہی ہیں۔ کیا ہم چپکے سے اسے دیکھ آئیں۔"

"عکرمہ کہاں ہے؟"

"مہمان کو آرام کرنے کے لیے چھوڑ کر وہ گھر سے باہر چلا گیا ہے۔" لیلیٰ کو شرارت سے دیکھتی' وہ حوض کے کنارے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں کوشش کرتی ہوں۔"

"ضرور کرو۔۔۔ ناکام نہ لوٹنا۔" جوش سے لیلیٰ کی آواز بلند ہو گئی اور خادمائیں کھی کھی کرنے لگیں۔

ناکام نہ لوٹنے کے لیے یشفین صحن سے گزرتی' روش پر چلتی' باغ کی دیوار کے پاس آئی جس کے دوسری طرف مہمان خانہ تھا۔ دیوار میں خادموں' خدمت گاروں کی آمدورفت کے لیے ایک دروازہ تھا۔ مہمان خانے کے تین اطراف باغ تھا۔ ایک طرف اصطبل جس کا دروازہ شہر کے معروف راستے کی طرف کھلتا تھا۔ مجیب درآبی کے خاص مہمان آٹھ کمروں اور ایک وسیع طعام گاہ پر مشتمل اسی مہمان خانے میں رہتے تھے۔ یہیں شہر کے معززین کی دعوتیں کی جاتیں۔ یہیں مجیب درآبی کے کاروبار سے متعلق معاملات طے پاتے۔

وہ بند دروازے کے پاس آئی تو وہاں خادموں کی کافی چہل پہل تھی۔ وہ کوشش کرتی تو شاید اندر چلی جاتی اور مہمان کی ایک جھلک دیکھ کر لیلیٰ کو بتا دیتی' لیکن اسے یہ ڈر تھا کہ عکرمہ مہمان خانے کے بیرونی دروازے سے اندر آگیا تو بہت ناراض ہوگا۔ وہ ویسے بھی اس پر ناراض ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ اس نے بہانے سے ایک خادم سے بس اتنا کہا۔

"رات کے لیے مہمان سے ان کی پسند کے کھانوں کے بارے میں پوچھ لیا جائے۔"

کہہ کر وہ باورچی خانے میں آگئی جہاں ماں عزیزہ کھانے کی خاص نگرانی کررہی تھیں۔ اس نے انہیں باہر بھیج دیا اور کھانوں کی صورت حال دیکھنے لگی۔ ماں عزیزہ کے جوش پر وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ ایک انسان کے لیے انہوں نے بیس مہمانوں جتنا کھانا بنوانا شروع کررکھا تھا۔ باورچی خانے میں آگ پر اور باہر باغ میں کوئلوں پر' جس حساب سے کھانے پک رہے تھے' وہ کسی دعوت میں پکائے جانے والے کھانوں کی تیاری کا عندیہ دے رہے تھے۔

وہ باغ کے کھانوں کی صورت حال دیکھنے کے لیے باہر نکلی تو خادم اس کے پاس آیا۔ اس کا منہ اترا ہوا تھا۔

"مہمان بے زبان ہوتا ہے۔ اگر مجھ سے میری پسند پوچھی گئی تو میں کسی بادشاہ کی طرح حکم صادر کروں گا' حکم عدولی پر میں سر قلم کرادوں گا' کیا یہ منظور ہے۔"

"یہ مہمان نے کہا ہے۔" یشفین' خادم کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ اب وہ لیلیٰ کو جاکر کیا بتائے کہ مہمان کافی بدزبان ہے۔

وہ لیلیٰ کے پاس آئی جو آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بالوں کو یہ درتہ بٹھا رہی تھی۔ وہ تیار ہو رہی تھی جبکہ وہ جانتی تھی کہ یہ ممکن نہیں کہ ایک جھلک ہی سہی مہمان اسے دیکھ سکے۔

وہ شہر کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ اگر وہ ایک دن نقاب اتار کر شہر میں چہل قدمی کرلیتی تو سارے شہر میں اس کے حسن کے چرچے ہوتے۔ حسن اور پھر اس کی آرائش۔ ملبوسات' زیورات' سامان آرائش اور خوشبوئیں' وہ ان کی ایسے مالک تھی کہ دنیا کی ہر عورت محروم ہی تھی۔ اس کی آواز شیریں اور میٹھی تھی۔ انداز میں بڑی معصومیت تھی۔ گھر کی خادمائیں اسے بے وقوف کہتیں۔ لیکن یشفین جانتی تھی کہ ساری دنیا بھی کھنگال لی جائے گی تو ایک لیلیٰ حاصل نہیں ہوپائے گی۔ اگر وہ بے وقوف تھی بھی تو وہ دوسروں کے لیے بے ضرر تھی۔

"تم ناکام لوٹ آئی ہو' تمہاری شکل بتا رہی ہے۔"

"مہمان کے آتے ہی تم نے میری شکل پڑھنا سیکھ لی ہے۔" لیلیٰ ہنسنے لگی۔ یشفین نے محبت سے اس کی ہنسی کو دیکھا۔ جس انداز میں وہ آج ہنس رہی تھی' پہلے کبھی نہیں ہنسی تھی۔ وہ خوش تھی تو وہ بھی خوش تھی۔ اس کا سب کچھ لیلیٰ اور ماں عزیزہ ہی تو تھے۔ اس کے اپنے بابا عبدالوہاب جو لیلیٰ کے دادا کے تجارتی قافلوں کے نگران تھے۔ ایک قافلے کے ساتھ سفر میں ڈاکوؤں کے حملے میں مارے گئے۔ وہ تب ایک سال تین ماہ کی تھی۔ جب چھ سال کی ہوئی تو ماں الزہرہ گھر میں بھڑکنے والی آگ میں پھنسی لیلیٰ کی جان بچاتے ہوئے اپنی جان گنوا بیٹھیں۔

"بابا نے وفاداری نبھاتے جان دے دی اور ماں نے لیلیٰ کی جان بچاتے۔"

اس کے بابا اور ماں کی قربانیاں اس کے نسب میں سنہرے حروف سے لکھ دی گئیں۔ ماں عزیزہ نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ اس کے رونے پر وہ تڑپ اٹھتیں۔ اسے بہلانے کے ہزار جتن کرتیں۔ انہوں نے اسے لیلیٰ کے کمرے میں سلانا شروع کردیا۔ گودام کی طرف جہاں خادماؤں کے لیے رہائش مخصوص تھی' وہاں سے اس کا سامان اٹھالیا گیا۔

وہ بڑی ہوئی تو اسے لیلیٰ کے کمرے کے ساتھ والا کمرہ دے دیا گیا۔ اس کا کمرہ لیلیٰ کے کمرے سے چھوٹا تھا' لیکن آرام دہ اور خوب صورت تھا۔ کمرے کی کھڑکی لیلیٰ کے کمرے کی طرح باغ کے رخ کھلتی تھی' جس کے عین سامنے حوض اور فوارہ تھا۔ آہستہ آہستہ

اس کے پاس بھی وہ سب آنے لگا جو لیلیٰ کے پاس تھا۔ اس کے کمرے میں رکھا صندوق خوب صورت کپڑوں اور زیورات سے بھرنے لگا۔ اس کا بستر نرم گرم اور ریشمی ہو گیا۔ کمرے کی آرائش لیلیٰ کے کمرے کی طرح کر دی گئی۔ سب سے خاص یہ کہ بچپن کی سہیلی لیلیٰ اس کی بہن بن گئی تھی۔

وہ ایک خادمہ کی بیٹی ہے' یہ بات وہ کبھی نہیں بھولی تھی۔ اس نے سارے گھر کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا ایسا نہیں تھا کہ اسے ہاتھ سے کام کرنا پڑتا تھا۔ اس پر کوئی سختی نہیں تھی' لیکن وہ لیلیٰ کی طرح ایک بیٹی بن کر کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ صبح گھر میں کسی بھی خدمت گار سے پہلے اٹھتی اور باغ اور حوض کی صفائی شروع کروا دیتی۔ کھانے کی تیاریاں دیکھتی۔ اخراجات کا حساب لکھتی۔ اناج کا ایک ایک دانہ اس کی نظر سے ہو کر گزرتا۔ بازاروں سے وہ خود دیکھ بھال کر اشیا لاتی۔ تاجروں سے ریشم کے تھانوں' مسالوں اور زیورات کی خرید و فروخت میں بلا کی فہم و فراست کا مظاہرہ کرتی۔ وہ ماں عزیزہ اور لیلیٰ کے لیے سب سے بہترین لباس حاصل کرنے میں ہمیشہ کامیاب ہو جاتی۔

خادموں پر وہ سختی نہیں کرتی تھی' لیکن اس کی نرمی ہی کڑی سختی تھی۔ مہمانوں کی خدمت میں کوئی کسر نہ رہنے دی جاتی۔ مجیب درانی کی دعوتوں کا انتظام کئی کئی دن پہلے ہی شروع ہو جاتا تھا اور وہ ان دعوتوں کو فقید المثال بنا دینے میں کوئی عذر نہ رکھتی۔ چونکہ اسے لیلیٰ کے برابر جگہ دے دی گئی تھی تو اسے گھر کی کسی بھی خادمہ سے زیادہ اپنی وفاداری نبھانی تھی۔ یہ بھاری ذمہ داری تھی' لیکن وہ اپنی ماں کی طرح بہادر تھی جو جلتی ہوئی آگ میں کود گئی تھی۔

ماں عزیزہ اور لیلیٰ کی محبت کا کوئی مول نہیں تھا' لیکن جتنی محبت وہ دونوں اس سے کرتی تھیں' اتنا ہی مجیب درانی اور عکرمہ اس سے خائف رہتے تھے۔ عکرمہ' ماں عزیزہ کے خیال سے اکثر خاموش رہتا تھا' لیکن مجیب درانی گاہے بگاہے اسے یہ یاد دلاتے رہتے تھے کہ وہ ان کی صرف "کنیز" ہے۔ وہ لیلیٰ کی محبت کے ہاتھوں مجبور تھے' ورنہ لیلیٰ کے کمرے کے ساتھ کے کمرے کو وہ اصطبل بنا دیتے لیکن کسی خادمہ کو نہ دیتے۔ یشفین عکرمہ اور مجیب درانی کے رویے سے اچھی طرح سے واقف تھی۔ اسی لیے وہ اس حقیقت کو اپنے دل سے فراموش نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ کون ہے۔

✿ ✿ ✿

"یقیناً" تمہیں عکرمہ پر غصہ آیا ہوگا کہ اس نے مہمان کو پردے میں کیوں رکھا ہوا ہے۔" لیلیٰ کی سہیلیاں اور وہ دریا کی سیر کے لیے آئی تھیں۔ وہ سب دریا کے کنارے قالین پر بیٹھی تھیں۔ ذرا دور خادمائیں کھانا پکا رہی تھیں۔

"مہمان غصیلا ہے۔" یشفین نے شرارت سے کہا اور لیلیٰ کے شرمیلے چہرے کو دیکھا۔

"اچھا..." وہ سب ایک ساتھ چلائیں۔

"کس بات پر غصہ کرتا ہے۔" فاطمہ نے پوچھا۔

"کہتا ہے' میری دلہن مجھے دکھائی جائے... ورنہ میں پورے شہر کو پانی میں بہا دوں گا۔"

"اللہ اللہ..." لیلیٰ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

"چپ رہو یشفین۔"

"تم بولتی رہو یشفین... اچھا یہ بتاؤ تم نے دیکھا ہے اسے؟؟"

"نہیں' لیکن لیلیٰ... چاہتی ہے کہ وہ اس سے زیادہ خوب صورت ہو... کیوں لیلیٰ؟" لیلیٰ کے گالوں پر اناری رنگ بکھر گئے۔

"اس دریا میں اپنا ہاتھ ڈبو دو لیلیٰ' تاکہ سارا شہر جان لے 'لیلیٰ' شرما رہی ہے۔" ایک اور قہقہہ بلند ہوا۔

"لیلیٰ کا دولہا باغ کی دیوار کے اس پار ہے اور لیلیٰ اسے دیکھنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ یہ ظلم ہے۔ مجھے عرب کے سلطان کی تلوار دی جائے' تاکہ میں اس ظلم کے خلاف میدان میں اتروں..." صنوبر نے کھڑے ہو کر تلوار کو بلند کیا اور للکار کر کہا۔

"میں کیوں تڑپوں گی۔ وہ تڑپ رہا ہوگا۔" لیلیٰ نے

آخر کار شرمانا ترک کیا۔

"اگر میں لیلیٰ کی جگہ ہوتی تو کسی مرد ملازم کا بھیس بدل کر اسے دیکھ آتی۔" اُم کلثوم نے کہا۔ لیلیٰ نے منہ کھول کر ام کلثوم کو دیکھا۔ پھر وہ قہقہہ لگانے لگی۔

"آج رات میں یہ کرنے کی کوشش کروں گی۔"

"لیکن دیکھنا پکڑی نہ جانا.... شفین! تم کیوں نہیں کوشش کرتیں؟"

"نہیں نہیں.... شفین! تم اس طرف ہرگز نہ جانا۔ یہ نہ ہو وہ لیلیٰ کی بجائے تمہیں پسند کرلے۔"

"تو کرلے پسند.... شفین کیا کم ہے مجھ سے...." لیلیٰ نے فوراً کہا اور شفین کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"کیوں نہ اس کے کمرے میں چوہوں کو چھوڑ دیا جائے۔ تاکہ وہ گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئے اور ہم اسے بالائی منزل سے دیکھ لیں۔" شفین نے دانش مندانہ انداز سے اپنی دانش مندی ظاہر کی۔

"چوہوں کو زحمت نہ دو.... تم دونوں چوہیاں ہونا۔" پھر سے ایک ساتھ سب کے قہقہے بلند ہوئے اور دریا کے پانی نے کبھی نہ رُکنے والے وقت کو سوالیہ دیکھا۔

٭ ٭ ٭

"مہمان بہت شکایتی اور غصے والا ہے۔ وہ کل اس چیز کی شکایت بھی کررہا تھا کہ چراغوں کی روشنی مدھم اور دھواں زیادہ ہے۔ کیا کبھی چراغوں سے بھی اتنا دھواں نکلا ہے کہ وہ کھانسی کے عارضے میں مبتلا کردے یا بینائی کو دھندلا دے۔" وہ اپنی نگرانی میں کھانا بنوا رہی تھی کہ خادموں کی کھسر پھسر اسے سنائی دی۔

"رات بھر اسے ریشم کم خواب کا بستر بھی کاٹتا رہا ہے۔ اسے اس پر بھی اعتراض رہا ہے کہ اس کے گھوڑے کو ٹھیک سے کھلایا پلایا نہیں جارہا۔ گھوڑا بھی مالک پر گیا ہے' میں نے پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی تو اس نے مجھے لات کھینچ ماری۔"

شفین زیر لب مسکرائے بنا نہیں رہ سکی۔ اس نے مہمان کے لیے کھانے کے تھال تیار کرکے ایک ایک کرکے خادموں کے ہاتھوں میں دیے۔ رات کو جو کھانا اس کے لیے اتنے اہتمام سے بنایا گیا تھا اس نے کچھ خاص رغبت سے نہیں کھایا تھا۔ اس لیے اسے کہنا پڑا۔

"مہمان مکرم سے کہنا' رزق کے ضیاع پر ان سے جواب طلب ہوگا۔"

واپسی پر تھال خالی ملے۔

"مہمان ضدی ہے تو فرماں بردار بھی ہے۔ غصیلا ہے تو صلح جو بھی ہے۔" وہ لیلیٰ کے کان میں گھسی کہہ رہی تھی۔

"تو پھر ہم بھیس بدل کر مہمان خانے میں جائیں۔"

"مجھے لگتا ہے ہم اسی بھیس میں قتل کردی جائیں گی۔ عکرمہ کے غصے سے تم واقف ہو۔"

"اگر میں ایسے قتل ہوگئی تو لیلیٰ اور مجنوں کی طرح عرب کی ریت پر گلستاں بن کر لہلہاؤں گی۔"

"تم لیلیٰ ہو لیکن وہ مجنوں نہیں۔"

"اسے مجنوں بننے میں کتنا وقت لگے گا شفین...." لیلیٰ نے منہ لٹکالیا۔

شفین نے قہقہہ لگایا۔ "ایسی المیہ باتیں نہ کرو۔"

"دیکھونا' اتنا خاص مہمان گھر میں موجود ہے اور بابا گھر میں موجود نہیں ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ ہم ایک لمبے عرصے تک اس غصیلے مہمان کے میزبان بنے رہ سکتے ہیں اور مہمان شہر کی سیر بھی کرلے گا۔"

مہمان شہر کی سیر کررہا تھا' بازار میں ٹہل رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اس خطاط کے پاس بیٹھا رہا تھا جو سنگ مرمر پر شیرازی کے اشعار کے خط کھینچ رہا تھا۔ پھر وہ اس ظروف ساز کی دکان میں آگیا جو ہر راہ گیر کو دکان میں آنے کی دعوت کچھ اس انداز میں دے رہا تھا جیسے اندر ظروف نہ ہوں' عقاب' گھوڑے یا شیر ہوں.... وہ بھی زندہ.... وہ بھی آپ کے حکم کے تابع.... آئیے ان پر آکر بیٹھ جائیے۔ ورنہ انہیں اپنے گھر لے جائیے۔

وہ ظروف دیکھنے لگا۔ اسے چاندی کی ایک صراحی

پسند آئی۔ وہ اسے ہاتھ میں لے کر خریدنے کے بارے میں سوچنے لگا۔

"یہ کوئی عام صراحی نہیں' عزیزم... ایسی ہی ایک صراحی سلطان کے محل میں موجود ہے۔ یہ دو ایک جیسی صراحیاں تھیں جو بندرگاہ سے بچھڑ گئیں۔ اگر تم اسے خرید لیتے ہو تو..."

ظروف ساز اپنے موٹے پیٹ اور گردن تک جھولتے بالوں میں الہ دین کے چراغ کے جن کی مانند لگ رہا تھا۔

"تو سلطان ہی اسے کیوں نہیں خرید لیتے؟"

"سلطانوں کے مزاج سے تم واقف ہو۔ ایسی چیزیں ان کی ناک سے نیچے ہی رہتی ہیں جو عام آدمی کے ہاتھ میں آجاتی ہیں۔"

اس نے صراحی واپس رکھ دی۔ سلطان کے محل کے لیے۔ پھر ماں کے لیے ایک کنگھی دیکھنے لگا۔

"واہ عزیزم! تمہاری پسند کی داد دینی پڑے گی۔ تم نے ساری دکان چھوڑ کر شیریں کے گیسوؤں کو چھو کر آنے والی کنگھی کا انتخاب کیا۔ تمہاری محبوبہ اسے..."

"یہ میں اپنی ماں کے لیے..." اس نے جتا کر کہا۔ مسکرا کر بھی...

"تمہاری محبوبہ تمہاری ماں کے ہاتھ میں یہ کنگھی دیکھ کر جل جائے گی۔ ظالم محبوبہ کو جلانے کا یہ موقع ہاتھ سے جانے نہ دو۔" فوراً" سمجھ کر اس نے بات بدل دی۔

یوسف زیر لب ہنس دیا۔ ظالم محبوبہ کو جلانے کا موقع اس نے ہاتھ سے جانے دیا۔ کنگھی واپس رکھ دی ظروف پر ایک اور نظر ڈالتے ہوئے اس نے یہ جانا کہ وہ جو سامنے پیالہ رکھا ہے' وہ صلاح الدین ایوبی کے اس محافظ کا پیالہ ہے جس نے سلطان کو قتل کرنے کے لیے آنے والے کا خنجر اپنے سینے پر کھایا تھا اور وہ طشتری جس کی سطح اپنی چمک کھو چکی ہے' مولانا رومی کے حجرے میں کھجوروں سے بھری رکھی رہتی تھی اور وہ خوب صورت شمع دان شہزادی کا ہے' جو وہ ہر رات شہزادے کو کہانیاں سناتے ہوئے خوف سے بچنے کے لیے روشن رکھتی تھی۔

یوسف نے آگے بڑھ کر آئینہ پکڑ لیا۔ وہ چاند کی شکل کا' نقشین چوکھٹے میں چشمے کے پانی کی طرح شفاف آئینہ تھا۔ الہ دین کے جن نے اسے آئینے کی کہانی سنانا شروع کر دی تھی' لیکن وہ اس کہانی کو سن نہیں رہا تھا' کیونکہ دکان کے جس کنارے پر وہ کھڑا تھا' اس کے پیچھے بازار کا عکس اس آئینے میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آئینے کو ہاتھ میں پکڑے نظر آنے والے عکس کے موافق اسے گھما رہا تھا۔ پورے بازار سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا' لیکن جس سے تھا وہ جگہ جگہ رک کر خریداری کر رہی تھی۔ وہ خطاط کے پاس بھی کھڑی ہو گئی تھی اور اس نے بڑھئی کے پاس بھی کھڑے ہو کر کچھ چیزوں کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے ہدایات دی تھیں۔

اس کے ساتھ دو عورتیں تھیں جن کے ہاتھوں میں سامان کے تھیلے تھے۔ وہ اتنے وزنی ہو چکے تھے کہ اس نے انہیں اشارہ کیا کہ وہ چلی جائیں۔ وہ چلی گئیں تو وہ اپنی سیاہ چادر سنبھالتی ظروف ساز کی دکان کی طرف آنے لگی۔ وہ بالکل کنارے پر ہی تو کھڑا تھا' آئینے میں یوں یک دم اسے اتنا قریب آتے دیکھ کر اس کے ہاتھ سے آئینہ پھسل گیا اور وہ عین اس کے پیروں میں گر کر ٹوٹا۔ وہ ڈر کر کچھ قدم دور ہوئی اور اپنی چادر کا پلو کھینچ کر دانت میں لے لیا۔ پھر وہ اتنے قیمتی آئینے کو اٹھانے کے لیے فوراً" جھکی اور عین اسی وقت وہ بھی جھک گیا۔ ٹوٹی ہوئی کتنی ہی کرچیوں میں ان دونوں کا عکس سورج کی کرنوں کی طرح بکھر گیا۔ اس کی آنکھ اور آنکھ کا غصہ کتنی ہی آنکھوں میں مرتسم ہو گیا۔

آئینے کی کہانی سناتے الہ دین کے جن کی زبان کو جھٹکا لگا اور اس نے مڑ کر اس آئینے کا حشر دیکھا' جو مجنوں نے لیلیٰ کو دیا تھا۔

"اللہ اللہ مجنوں کا آئینہ لیلیٰ کے قدموں میں کرچی کرچی... اب اس کی قیمت چار گنا ہو گئی نا۔"

"سلام چچا..." خائف نظروں سے اسے دیکھ کر

چراغ کے جن کو سلام کر کے وہ آگے بڑھ گئی۔ وہ شرمندہ شرمندہ سا اٹھ کر کھڑا ہوا اور جلدی سے جن چچا کے ہاتھ میں سکے دیے اور اس کے پیچھے چلنے لگا۔

"مجھے خود سے بات کرنے کی اجازت دیں گی؟" اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ دوبارہ اس سے ملے گی تو وہ ایسے بات شروع کرے گا جو اسے نامناسب نہ لگے۔ یا جواب میں اسے کچھ سخت الفاظ سننے کو نہ ملیں۔ وہ اس سے چند قدم دور چل رہا تھا۔

وہ رکی اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ "کتنے شریف انسان ہیں آپ.... سرراہ ایک خاتون سے بات کرنے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔"

یعنی ساری سوچ وبچار بے کار رہی۔ بات سچ تھی، حرکت نامناسب۔ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"پھر یہ اجازت کہاں مل سکتی ہے؟"

"اس شہر میں حکیم بھی میسر ہیں اور حکمت بھی.... جس سے چاہیں مل کر اپنا علاج کروالیں۔" بھنا کر اس نے کہا اور چلی گئی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ کیا کرے اور کیا نہ کرے کی حالت میں....

شام کو مجیب درّانی کے گھر کا خادم اسے ڈھونڈتا ہوا آیا۔

"آج رات آپ کو جناب عبدالفتاح کی دعوت میں شریک ہونا ہے۔"

اسے یاد آیا، عکرمہ نے اسے دن میں ہی بتا دیا تھا کہ آج رات اسے شہر کے ایک معزز کی دعوت میں شرکت کرنی ہے جو سلطان کے مشیر خاص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ گھر واپس آیا اور عکرمہ کی معیت میں دعوت میں آگیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ عکرمہ اس بات پر پھولے نہیں سما رہا کہ ان کی وجہ سے اسے سلطان کے مشیر خاص کے قریب ہونے اور اس کے محل میں جانے کا موقع مل رہا ہے۔ ویسے تو اسے مجیب درّانی کے گھر کی کوئی ایک بھی چیز پسند نہیں آئی تھی، لیکن عکرمہ تو اسے خاص طور پر ناپسند ہوا تھا۔ وہ جتنا وقت اس کے ساتھ رہتا تھا، مجیب درّانی کی دولت، رتبے، جاہ وجلال کی کہانیاں ہی سنتا رہتا تھا۔ اب اسے کامل یقین ہو چکا تھا کہ مجیب درّانی اس سے کہیں بڑھ کر ہے جتنا وہ بابا کی باتوں سے سمجھتا رہا تھا۔ اگر وہ ماں کو عہد دے کر نہ نکلا ہوتا کہ وہ آخری وقت تک معاملات میں نرمی برتے گا تو شاید وہ کسی رات اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر اس شہر سے بھاگ جاتا۔

✡ ✡ ✡

دعوت میں مصری مغنیہ اپنی آواز کا جادو جگا رہی تھی۔ باغ میں ہر طرف چہل پہل تھی۔ عکرمہ کے ساتھ وزیروں، تاجروں، پاشاؤں، امراء سے ملتے ملتے وہ اتنا بے زار ہو چکا تھا کہ اس نے خوش دلی سے ہوں ہاں کرنا بھی بند کر دیا تھا۔ اس کی ساری تحمل مزاجی، آنکھوں کی سختی کے راستے رخصت ہو جانے کو تھی کہ عکرمہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے محل کے اندر لے آیا تاکہ اسے وہ نوادرات دکھا سکے جو مشیر خاص کی ملکیت تھے اور جن سے طرح طرح کے اعزازات منسلک تھے۔ اسے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، خاص کر دن میں آئینہ ٹوٹنے کے بعد سے لیکن وہ باہر کے ہنگامے کی نسبت اندر کچھ سکون محسوس کر رہا تھا۔

"میں ان کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔" عکرمہ سے جان چھڑانے اور کچھ وقت اکیلے رہنے کے لیے اس نے کہا۔ عکرمہ کا دل مغنیہ کی آواز میں اٹکا تھا۔ وہ یہاں اسے متاثر کرنے لایا تھا، لیکن یوں اس کے ساتھ بندھ کر بیٹھنے نہیں۔ اسے جلدی باہر آنے کا کہہ کر وہ چلا گیا۔

نوادرت سے لبالب بھرے کمرے میں وہ کچھ دیر یوں ہی ٹہلتا رہا۔ پھر چپ چاپ نشست پر بیٹھ گیا۔ اونچی دیواریں، قیمتی سامان آرائش، روشن فانوس، کمخواب کے پردے، منقش نشستیں۔ وہ بے زاری سے ایک نظر دیکھ کر رہ گیا۔ اسے دولت کی نمائش نے بھی متاثر نہیں کیا تھا۔

کچھ دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا، پھر ایک قدیم نایاب کتاب کی ورق گردانی کی کوشش کرنے لگا، جس کے

حروف اتنے دھندلے اور مٹے ہوئے تھے کہ انہیں پڑھنے کی کوشش کرنے سے بہتر تھا کہ وہ اپنی آنکھیں پھوڑ لیتا۔ اپنی آنکھوں کو پھوڑنے سے بچانے کے لیے اس نے کتاب بند کردی۔ مغنیہ اور اس کے سازندے خاموش ہوچکے تھے۔ اس سے پہلے کہ عکرمہ اسے باہر سے لینے آئے' اسے ہی اس کے پاس چلے جانا چاہیے۔ کمرے میں موجود تین دروازوں میں سے وہ ایک دروازے سے باہر نکل گیا۔ راہ داری سے گزرتے دوسرے کمرے کی کھڑکی سے اسے باغ نظر آگیا۔

"عکرمہ مجھے اتنا گھما کر اس کمرے میں کیوں لایا تھا تاکہ میں پورے محل کی شان و شوکت سے متاثر ہوجاؤں؟"

اسے غصہ آیا کہ باغ تو یہ کچھ دور سامنے ہی ہے۔ ہاں واقعی باغ تو یہ سامنے ہی تھا۔ لمبی راہ داری ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک ساتھ کئی نسوانی چیخیں اس کی سماعت سے ٹکرائیں اور اس کے قدم جہاں تھے وہیں ساکت ہوگئے۔

راہ داری جو باغ کی سمت محرابی برآمدے میں نکلتی تھی اس کے آخری سرے پر کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے حیرت سے چیخ ماردی کہ ایک اجنبی مرد کا وہاں کیا کام۔ حواس باختہ ہوکر وہ جلدی سے واپس پلٹا اور کمرے میں گھس گیا' لیکن یہ کیا یہاں بھی چند خواتین موجود تھیں۔ وہ اتنی بری طرح سے شرمندہ ہوا کہ سر جھکا کر تیزی سے باہر نکلا اور نہ جانے کتنے دروازے' کتنی راہ داریاں' کتنے کمرے' پار کرتے کرتے وہ تھک گیا' لیکن راستہ تھا کہ مل ہی نہیں رہا تھا۔ اسے اپنے پیچھے بھاگتے قدموں کی آواز بھی آئی جیسے کوئی اسے غصے سے ڈھونڈ رہا ہو' شاید گھر کی خادمائیں۔ اگر ایسے وہ یہاں سے پکڑا گیا تو یہ تو شرمندگی کی انتہا تھی۔ نہ صرف وہ یہاں مہمان ہے' بلکہ وہ اس شہر میں بھی مہمان ہے۔ وہ تیزی سے ایک سے دوسرے راستے کی طرف مڑنے لگا۔ دروازوں کے پیچھے چھپ جاتا' ان کے پیچھے سے نکل آتا۔ کھڑکیوں سے جھانکتا' دیوان سے گزرتا' نشستوں کے اوپر سے پھلانگتا۔۔۔ اللہ اللہ۔۔۔ مدرسے میں جو اس نے سزائیں کاٹی تھیں' یہ سزا ان کی سردار سزا تھی۔

شاید ساری خواتین باغ میں دعوت میں موجود تھیں اور جو اکا دکا اندر تھیں' وہ ان سے ٹکرا رہا تھا۔ ورنہ اگر سب اندر موجود ہوتیں تو سارا قونیہ دیکھتا کہ مشیر خاص نے "مہمان خاص" کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

راستہ تھا کہ مل نہیں رہا تھا اور وہاں کوئی مرد خادم نظر نہیں آرہا تھا۔ یعنی کہ ابھی تک وہ اسی حصے میں تھا جہاں مردوں کا داخلہ منع تھا۔ زندگی میں اس پر اس سے زیادہ برا وقت نہیں آیا تھا۔ سب دروازے' کمرے' دیواریں' کھڑکیاں پہلے ہی ایک جیسی تھیں یا اسے پریشان کرنے کے لیے ہوگئی تھیں۔ وہ ایک دروازے میں گھستا تو دوبارہ گھوم کر وہیں آجاتا۔

پھر اسے ایک کھڑکی سے باغ نظر آیا۔ باغ خالی تھا۔ وہ کھڑکی کے راستے ہی باغ میں کود گیا۔ مبادا دروازے سے نکلے تو یہ باغ بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ واپس آئے تو کھڑکی ہی نہ ملے۔ باغ میں روشنی کم تھی۔ دور سے مغنیہ کی آواز آرہی تھی۔ یعنی وہ ٹھیک سمت جارہا تھا۔ اس خوشی میں کہ وہ ٹھیک راستے پر ہے' وہ اتنی تیزی سے قدم بڑھانے لگا کہ کسی سے ٹکرا گیا۔ ایک تیز "سی" اس کے کانوں سے ٹکرائی' پھر ایک چیخ' پھر دو چیخیں۔ وہاں وہ کھڑی تھی صراحی والی۔ اس کے ساتھ ایک بڑی عمر کی خاتون کھڑی تھیں۔ اس نے جلدی سے چہرے پر کان سے پلو کھینچا۔ خاتون نے البتہ یہ زحمت نہیں کی۔

"کون ہو تم۔۔۔ ایسے یہاں کیسے گھوم رہے ہو۔۔۔؟" خاتون نے شائستہ انداز سے پوچھا۔

"میں وہاں سے۔۔۔" وہ اتنا حواس باختہ ہوگیا کہ ہاتھ اٹھا کر مغنیہ کی آواز کی سمت اشارہ کرنے لگا۔ دونوں نے گردنیں گھما کر اس طرف دیکھا۔

"وہاں سے۔۔۔ ہاں وہیں سے آئے ہو تم۔۔۔ مشرقی سمت کی اس دیوار کو پھلانگ کر۔۔۔"

"دیوار... نہیں' میں تو وہاں باغ سے آیا ہوں۔"
خاتون نے آنکھیں چندھیا لیں۔ "باغ اور وہاں... سبزے کے نام پر وہاں آج تک ایک پتا نہیں کھلا۔"
اس کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔ تو یہ مغنیہ کی آواز پھر وہاں سے کیوں آرہی ہے۔ کیا وہ دیوار پھلانگ کر گا رہی ہے یا باغ ہی نے اپنی سمت بدل لی ہے۔
"میں جناب عبدالفتاح کی دعوت میں شریک ہوں۔"
"کیا جناب عبدالفتاح نے چوروں کو بھی شرکت کی دعوت دینا شروع کردی ہے۔"
"میں چور نہیں ہوں۔ ایک شریف اور معزز انسان ہوں۔"
"شریف اور معزز انسان دیواریں پھلانگ کر ادھر ادھر گھوم رہا ہے۔" خاتون محظوظ ہوئیں۔
"میں شریف ہی ہوں... یہ لڑکی... یہ مجھے جانتی ہے۔"
خاتون نے حیرت سے یشفین کو دیکھا۔ "تم اسے جانتی ہو یشفین؟ ان کا انداز کچھ ایسا تھا کہ یشفین تم اس چور کو جانتی ہو' واللہ۔"
"میں نہیں جانتی۔" باغ میں روشنی کم تھی' تو اس کی آنکھوں سے نکلتے شعلوں نے اس کمی کو پورا کردیا تھا۔
"میں آج ہی تو تمہیں بازار میں ملا تھا۔"
"واللہ... تم بازار میں ملتی ہو اس سے... تم ایسے لوگوں سے ملتی ہو لڑکی۔"
"اللہ اللہ! میں کب ملی ہوں۔" اس کی آنکھوں کے شعلوں کی لپٹیں بلند ہونے لگیں۔
"یعنی میں نے اس دن پانی مانگا... پھر آج بازار میں..." اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے اپنی پہچان کرا کر اپنے شریف ہونے کی ضمانت حاصل کرے۔
"مجھے شک تھا... تم چور ہو... چور ہی ہو..." خاتون کے عقب سے ذرا سا نمایاں ہوتے اس نے کہا۔
"محترم خاتون! میں ایک معزز مہمان ہوں۔ باغ سے اندر آیا تو بھٹک گیا' دوبارہ باغ کا راستہ نہیں ملا۔ میرا یقین کریں۔ ویسے بھی آپ مجھے سمجھ دار لگتی ہیں' تو پھر بہتر یہ ہی ہے کہ آپ سمجھ داری سے کام لے لیں اور مجھے راستہ سمجھا کر جانے دیں۔"
اس کی چور چور کی رٹ سے وہ گھبرا گیا۔ جتنی وہ دانا تھی' وہ اسے چور ثابت کر سکتی تھی۔ بہتر تھا وہ خود کو معزز ثابت کروا کر چلا جائے۔
خاتون سر ہلاتی رہیں اور اسے دیکھتی رہیں۔ "شمال کی سمت چلتے جاؤ' پھر دائیں مڑ جاؤ' دیوار میں دروازہ ہے' وہاں سے دوسری طرف نکل جانا۔ سامنے ہی باغ نظر آجائے گا۔ اگر تمہاری شناخت کے لیے میں نے کسی کو بلایا تو ہم دونوں کے لیے بہتر نہیں ہوگا۔"
وہ شمال کی سمت مڑ گیا۔ کچھ دور چل کر رک گیا اور پیچھے دیکھا۔ یشفین جو اسے شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھی اس نے جھٹ اپنا منہ واپس پھیر لیا۔
"تم یہاں رہتی ہو؟"
"نہیں۔ یہ یہاں نہیں رہتی۔" اس کے بجائے خاتون نے جواب دیا۔
"پھر یہ کہاں رہتی ہے؟" اس نے خاتون سے ہی پوچھ لیا۔ خاتون نے ہاتھ اٹھا کر دروازے کی سمت اشارہ کیا کہ اب تم جانا پسند کرو گے یا لے جائے جانا۔
اس نے جانا پسند کیا اور چھوٹا دروازہ کھول کر باغ کی سمت چلا گیا۔
"آپ نے اسے کیوں جانے دیا' وہ چور تھا۔"
"وہ چور نہیں تھا پیاری! وہ سچ بول رہا تھا۔ تم اسے نہیں جانتیں' لیکن شاید وہ تمہیں بہت زیادہ جانتا ہے۔ یہ تمہیں پہلی بار کہاں ملا تھا؟"
"باغ میں... میرے پھولوں کے پاس..."
"مجھے ہمیشہ سے معلوم تھا' تمہارے وہ چہیتے پھول تمہیں کوئی اجنبی خوشبو دیں گے۔"
"ایسے نہ کہیں۔" وہ شرما سی گئی۔
"دیکھو تم شرما رہی ہو۔ تمہارے گال دہک رہے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ لیلیٰ کے لیے جو مہمان آئے ہیں وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کیسے ہیں؟"

"نہیں گھر کی کوئی چیز پسند نہیں آتی۔"

"اور لیلیٰ.....؟"

"آقا درّانی سفر سے واپس نہیں آئے' ان کے آنے تک کچھ نہیں ہوگا۔"

"تم نے بھی نہیں دیکھا مہمان کو؟"

"نہیں....."

"عزیزہ سے کہنا' میں جلد ہی گھر آؤں گی۔ تمہارا شکریہ پیاری! تم نے میرا ہاتھ تھام کر میرے ساتھ چہل قدمی کی۔ میری طبیعت کا بوجھل پن کچھ کم ہے اب۔ تمہاری باتوں نے بھی دل کو سکون دیا ہے۔ تمہارے لیے ڈھیروں دعائیں۔ یہ اجنبی اگر دوبارہ ملے تو اسے بتا دینا کہ تم کہاں رہتی ہو۔ یہ نہ ہو وہ شہر کے ایک ایک آدمی کو روک کر پوچھے کہ "**شفین**" کہاں رہتی ہے؟"

شفین زیر لب مسکرا دی۔

✡ ✡ ✡

مجیب درّانی سفر سے واپس آگئے تھے۔ ان سے ملاقات بھی ایسے ہی رہی جیسے بابا سے رہتی تھی۔ سرد مہر' تجارتی کڑی۔ آج تک اس کے بابا نے اپنے دستر خوان پر کسی ایسے شخص کو کھانے کی دعوت نہیں تھی جوان کے لیے منافع بخش ثابت ہونے والا نہ ہو۔ ایک سال پہلے مجیب درّانی اور اس کے بابا تجارتی قافلے میں ہم سفر بنے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہیں اس کے بابا نے مجیب درّانی کے سونے کے دانت گن لیے ہوں گے اور یوسف کو انہیں پیش کرنے کا فیصلہ کرلیا ہوگا۔ مجیب درّانی نے بھی اسے ٹھونک بجا کر دیکھ لینے میں دلچسپی ظاہر کردی ہوگی۔

رات کے کھانے پر دعوت کے اہتمام کے ساتھ مجیب درّانی اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ نوالے منہ تک لے جاتے وہ اس کا جائزہ لیتے رہے تھے۔

"ایسا سیاہ فام حبشی جو تم جیسے جوان کو اٹھا کر پٹخ دے اس کی کم سے کم قیمت کیا ہوگی؟" بات کا آغاز ایسے کیا گیا کہ نوالہ اس کے منہ میں نمک بن گیا۔ اس کے چہرے کے عضلات سکڑ گئے۔ مجیب درانی نے اس کے چہرے کو بھانپ لیا۔

"اپنے باپ کی طرح منڈی جاکر کبھی کوئی غلام نہیں خریدا۔ اسے تو اپنے غلام گنتی میں یاد ہیں' تمہیں قیمت میں بھی نہیں یاد۔"

"میں انسانوں کی خرید و فروخت کا قائل نہیں ہوں۔" مجیب درانی نے اپنے تاثرات چھپا لیے اور خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ پہلی ملاقات کی اس گفتگو کے بعد ان کے درمیان اس وقت تک بات نہیں ہوئی جب تک مجیب درانی کے ہاں ایک بڑی دعوت کا انتظام نہیں کرلیا گیا۔

جو پہلے عکرمہ کرتا رہا تھا' اب وہ مجیب درانی کررہے تھے۔ اسے ایک ایک سے عہدے ۔ اور اختیارات کی فہرست سنا کر ملوایا جارہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مجیب درانی اور اس کے درمیان ہونے والی پہلی ملاقات ضرورت سے زیادہ تلخ ثابت ہوئی اور اس نے اس تلخی کو کم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ یہاں آگیا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجیب درانی نے اسے کسی غلام کی طرح خرید لیا ہے۔ اس کی برگزیدہ ماں' خاموشی جن کا شعار تھی اور اس کی تینوں بہنیں صبر جن پر فرض رہا تھا' انہوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ ایک بار بابا کے حکم پر عمل کرکے تو دیکھے۔ لڑکیاں اچھی ہی ہوتی ہیں۔ وہ لڑکی بھی اچھی ہوگی۔

"میں نے ہمیشہ وہ کیا جو آپ نے کہا' جو بابا نے چاہا۔ آپ کے اکیلے رہ جانے کا خیال نہ ہوتا تو میں کہیں بھی بھاگ جاتا۔ کوئی بھی کام کرلیتا۔ اپنے تجارتی قافلوں کے ساتھ بابا مجھے زبردستی اور **حکمیہ** گھسیٹتے رہے اور میں آپ کی خاطر اپنے دل پر پتھر رکھ کر ان کے کاروبار میں شریک رہا۔ سرحدوں کے محافظوں اور انتظامیہ کے ساتھ بابا کس طرح معاملات کو حتمی شکل دیتے رہے' یہ باتیں میرا سکون برباد کردینے کے لیے کافی

رہیں۔ مجھے قلم تراش کر انہیں فروخت کرنا منظور ہے‘ لیکن بابا کے کاموں میں شریک ہونا نہیں۔ لیکن آپ یہی کہتی ہیں کہ مجھے بابا کو تکلیف نہیں دینی چاہیے‘ ان کی حکم عدولی نہیں کرنی چاہیے۔“

”ہاں یوسف! حکم عدولی نہ کرو۔ وہاں کھلے دل سے جاؤ‘ اچھے اسباب کے لیے دعا کرو۔“

”میری تینوں بہنوں کو آپ نے یہی باتیں سکھا کر رخصت کردیا۔ ایک کی مال دار بوڑھے تاجر سے شادی کردی گئی۔ دوسری کو شیخ کی چوتھی بیوی بنا دیا۔ تیسری کو دو باغوں اور کچھ اعلا نسل کے گھوڑوں کے عوض بیچ دیا۔ مجھ سے بھی یہی چاہتی ہیں۔“

”تمہاری دائمی خوشیوں کے لیے دعا گو ہوں میں یوسف۔ فکر نہ کیا کرو۔ وہاں خوش امیدی لے کر جاؤ۔“

مجیب درابی کے کرخت چہرے اور تکبر سے سکڑی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر اسے ماں کی خوش امیدی‘ خوش فہمی لگی۔

”تمہیں قونیہ پسند نہیں آیا؟“ اپنے جیسوں کے جلو میں مجیب درابی نے پوچھا۔

”قونیہ کو کون ناپسند کرسکتا ہے۔“

”ایک ایسا شخص جو تم جیسا خود سر اور بے وقوف ہو۔“ پہلی ملاقات میں‘ دسترخوان پر کی گئی اس کی زبان درازی کا بدلہ مجیب درابی نے یوں سر محفل لیا۔ سب ہنسنے لگے۔ حقے کی نے منہ میں دبائے‘ مجیب درابی نے اپنی نوکیلی نظروں سے بڑے شوق سے اسے جتایا۔

”میں تمہارا باپ نہیں‘ جو تمہاری زبان درازی نظر انداز کردوں گا۔“

اسے غصہ آیا‘ لیکن وہ ضبط کرگیا۔ اس نے اپنے گھر میں بھی ایسی ہی باتیں سنی تھیں۔ وہ‘ ماں اور تینوں بہنیں‘ بابا کے سامنے ایسے ہی دو زانو بیٹھ جاتے تھے اور ان کی پھٹکار سنتے تھے۔

”اپنے بابا کو خط لکھ دو ورنہ کوئی آدمی چلا جائے گا تمہارا پیغام لے کر..... شادی کی تیاریاں میں شروع کروا لا ہوں۔“ اسے ایک طرف لے جا کر مجیب درابی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

اس کی انا پر ایک کاری ضرب پڑی۔ تو بابا نے اسے یہاں بھیجنے سے پہلے ہی بہت کچھ طے کرلیا تھا۔ اسے بوری میں بھری جنس کی طرح نمونے کے طور پر بھیج دیا تھا۔

”میں نے کبھی منڈی سے غلام نہیں خریدے‘ لیکن میں ایک معزز خاندان سے زوجہ کو پرکھنے کے لائق ہوں۔ آپ کی دختر سے میری شادی اس پرکھ کے بغیر ممکن نہیں ہوگی۔“

ماحول یک دم نفرین ہوگیا۔ مجیب درابی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ اس نے قطعاً ”پروا نہیں کی۔ اس کے شانے پر رکھا ہاتھ نوکیلا پنجہ بن گیا‘ جیسے اس کی گردن دبوچ لے گا۔

اگلے دن اس کی ملاقات کروانے کا انتظام کردیا گیا۔ اسے دخترِ درابی سے ملنے کی کوئی چاہت نہیں تھی‘ لیکن رات ماحول اور گفتگو اس انداز میں بدلے کہ وہ مجیب درابی کی انا پر جوابی ضرب لگائے بغیر رہ نہیں سکا۔ اب اس ملاقات سے بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔ یہ شادی اسے کسی صورت نہیں کرنی تھی‘ لیکن یہ ملاقات کرنی ہی تھی تاکہ مجیب درابی اور نظیر شعراوی کو یکساں انکار کرسکے۔

☼ ☼ ☼

وہ چاہ کر بھی گھر آئے مہمان کو دیکھ نہیں پائی تھی۔ دونوں نے مردانہ بھیس بدلنے کے بارے میں بھی سوچ لیا تھا‘ لیکن پھر وہ عکرمہ سے ڈر گئیں۔ وہ مہمان خانے میں ہی سوتا تھا۔ پھر بابا درابی آگئے۔ ماں نے کہا کہ مہمان اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔

”کیا بات.....؟“ وہ خوش ہونے سے پہلے گھبرا گئی۔

”شفین تمہارے ساتھ ہوگی‘ تم ایسے گھبرا کیوں رہی ہو۔ تمہارے بابا نے اجازت دی ہے۔“

اس کے خیال سے تو یہ اجازت اس بے چارے کو بہت دیر سے ملی تھی‘ لیکن اب مل گئی تھی تو خوف سے

اس کی جان نکل رہی تھی۔

"تمہیں اس سے بات کرنی ہو گی بشفین! ہم پردے کے اس طرف ہوں گے' اسے معلوم نہیں ہو گا۔" اس نے سب بشفین پر چھوڑ دیا۔

"لیکن شادی تمہاری ہے۔"

"شادی میں ہی کروں گی' لیکن بات تم کرو گی۔ بابا صلاح کہتے ہیں' مجھے ہوش مندی کی ضرورت ہے۔ اگر اسے کم عقل لڑکیاں ناپسند ہوئیں تو؟"

"تمہیں اپنے بارے میں ایسے ظالمانہ انداز سے نہیں سوچنا چاہیے۔" بشفین کو برا لگا۔

"آج کے بعد نہیں سوچوں گی... بس آج... ایک بار... اس سے بات تم کرو گی... وعدہ کرو گی نا؟"

"اسے دیکھنے' اس سے بات کرنے کے لیے تم اتنی بے قرار تھیں اور اب۔"

"ہاں تھی... لیکن اب تو میری جان نکل رہی ہے' اگر میں پردے کے اس طرف مر گئی تو زیادہ واویلا نہ کرنا۔"

بشفین نے قہقہہ لگایا۔ "تو تمہارا مرنے کا ارادہ بھی ہے۔"

"کیا پتا میں اسے دیکھتے ہی مر جاؤں۔"

"میں مرجانا پسند کروں گا' لیکن دختر درابی سے شادی کرنا نہیں۔" مہمان خانے سے گھر کی طرف آتے اس نے سوچا۔

عزیزہ خاتون نے اس سے اس کا حال احوال پوچھا۔ کچھ دیر باتیں کیں اور پھر وہ کمرے سے چلی گئیں۔ وہ کمرے میں چوبی منقش پردے کے اس طرف بے زاری سے بیٹھ گیا۔ پھر اٹھ کر اس نے کھڑکیاں بند کردیں اور پردے کھینچ دیے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس طرف سے اسے کسی بھی سوراخ سے ادھر دیکھ لیا جائے۔ اسے دختر درابی کو متاثر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

جب وہ دونوں کمرے میں آکر چوبی پردے کے اس طرف کھڑی ہوئیں تو انہیں کمرے میں روشنی بہت ناکافی لگی۔ جس طرف مہمان موجود تھا' اس طرف تو بہت ہی زیادہ اندھیرا تھا۔ چپکے سے چوبی پردے کے ننھے ننھے سوراخوں سے جب انہوں نے آنکھ لگائی تو انہیں خاطر خواہ صورت نظر نہیں آئی۔ وہ چوبی پردے کی طرف پشت کیے نشست پر بیٹھا تھا۔ لیلیٰ نے منہ بنا کر بشفین کو دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ یہ تو دکھائی ہی نہیں دے رہا۔ بشفین نے بھی منہ بنا لیا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ اسے خادموں پر بھی غصہ آیا جنہوں نے کمرے میں مناسب روشنی کا انتظام نہیں رکھا تھا۔

یوسف کو محسوس ہو رہا تھا کہ کمرے میں کوئی آچکا ہے۔ اسے آنے والے کی چالاکی پر غصہ آیا کہ اپنی آمد کی آہٹ خفیہ رکھی تو رکھی آواز دبالی... مجیب درابی کے گھر والے بھی... سب ہی عیار ہیں بس...

"میں آپ کے بابا مجیب درابی اور آپ کے بھائی عکرمہ سے مل چکا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان سے ملاقات میرے لیے خاصی مایوس کن رہی ہے۔ اس گھر میں قیام بھی میرے لیے کسی خوشی کا باعث نہیں بنا۔ آپ سے ملاقات سے بھی مجھے کوئی خاص امید نہیں ہے۔" یوسف نے سیدھے لفظوں میں بس انکار ہی کر دیا۔

لیلیٰ کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ بشفین نے چونک کر آڑی طرف دیکھا... یہ آواز... وہ اس آواز کو پہچانتی تھی... لیلیٰ نے اس کی کلائی کو شدت سے ہلایا کہ کچھ تو بولو' بلکہ فوراً" بولو... بشفین اب لیلیٰ کو کچھ بھی بتا دینے کی حالت میں نہیں تھی۔ وہ اسے اشاروں سے سمجھانے لگی' لیکن لیلیٰ کچھ ایسی حواس باختہ تھی کہ بس رو دینے کو تھی۔ جس مہمان کو ایک نظر دیکھنے کے لیے وہ بالائی منزل کی کھڑکیوں اور محرابوں میں ٹہلتی رہتی تھی' وہ اس ملاقات سے ہی ناامید تھا۔ لیلیٰ کے چہرے کے رنگ اور پھیکے پڑ گئے تو بشفین نے جلدی سے کہا۔

"آپ نے اس گھر میں موجود ہر چیز کو ناپسند کیا۔ ہر ایک پر اپنا غصہ نکالا۔ پھر یہ گھر آپ کے اطمینان کا باعث کیسے بنتا۔ آپ کا دل تو شاید پہلے ہی سے ناامید تھا۔ پھر اسے یہاں آکر اطمینان کیسے ملتا؟"

سوال کے پورا ہونے سے پہلے آواز کی ابتدا نے یوسف کو چونکا دیا۔ وہ اس آواز کو کیسے نہیں پہچانتا۔۔۔ وہ یک دم نشست سے اٹھا اور چوبی پردے کی طرف اپنا رخ کر لیا۔ ماں نے ٹھیک کہا تھا' لڑکیاں سب ہی اچھی ہوتی ہیں۔ مجیب درانی کی بھی۔۔۔ لیکن اسے افسوس بھی ہوا کہ وہ مجیب درانی کی بیٹی ہے اور یہ بھی کہ اس نے آتے ہی ایسی بات کہہ دی کہ شاید اس کا دل ہی ٹوٹ گیا ہو گا۔

"مجھے اعتراف ہے کہ میرا دل ہر طرح کی امید سے خالی تھا۔ مجھے اس سفر کی تمنا نہیں تھی۔ مجھے اس شہر سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لیکن اب میں نے اپنا یقین حاصل کر لیا ہے۔ تمہاری یہاں موجودگی نے مجھے ہر طرح سے یقین دلا دیا ہے۔ اب میں یہاں سے خالی ہاتھ لوٹ جانا پسند نہیں کروں گا۔" یک دم لیلیٰ کے چہرے پر رنگ لوٹ آئے' لیکن بشفین کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

"میں چند دنوں میں لوٹ جاؤں گا' لیکن جلد ہی واپس آؤں گا۔"

"سفر بخیر۔۔۔" یک دم لیلیٰ کے منہ سے نکلا اور یوسف کو احساس ہوا کہ اس نے کوئی دوسری آواز سنی ہے۔ اسے احساس ہوا کہ وہاں پیچھے دراصل دو لڑکیاں موجود ہیں۔ بشفین نے اپنا منہ سی لیا۔

"اللہ حافظ۔۔۔" پھر سے لیلیٰ نے کہا اور بشفین کا شانہ ہلایا کہ چلو اٹھو' چلیں' ورنہ میں تو مرنے والی ہوں اور تم واویلا شروع کر دو گی۔

یوسف نے پردے کے دوسری طرف ہلچل محسوس کی۔ شاید وہ دوسری لڑکی بشفین کی سہیلی تھی۔ وہاں سہیلی کو ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ یوسف مسکرانے لگا۔ اب وہ اپنی سہیلی کو بتائے گی کہ یہی وہ لڑکا ہے جو اسے باغ میں ملا تھا' پھر بازار میں اور پھر سے اس رات اور اس نے سے چور بنا دیا تھا۔

وہ دونوں پیچھے ابھی بھی موجود تھیں۔۔۔ وہ جانتا تھا۔۔۔ اسی لیے اس نے پردے کے ساتھ لگ کر سر کو دوسری طرف نکال کر اسے ایک نظر دیکھنا چاہا۔ وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھ چکی تھیں۔۔۔ اس نے آہستہ سے پکارا۔

"بشفین۔۔۔" بشفین نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ لیلیٰ جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔ وہ بشفین کو دیکھ رہی تھی کہ وہ اس کا نام کیسے جانتا ہے اور وہ بشفین کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ کس قدر حسین ہے۔" یوسف نے زیر لب کہا۔

"یہ کیسا ستم ہے۔" بشفین نے زیر دل سوچا۔

☼ ☼ ☼

لیلیٰ واپس آنے کے بہت دیر بعد تک خود کو آئینے میں دیکھتی رہی تھی۔ اسے اعتراض رہا تھا کہ اس نے صحیح رنگ کے لباس کا انتخاب نہیں کیا تھا اور وہ اسے یقین دلا رہی تھی کہ رنگ بھی ٹھیک تھا اور لباس بھی' وہ دنیا کی حسین لڑکی لگ رہی تھی۔ وہ اسے بتا چکی تھی کہ یہ وہی شخص ہے جو پہلی بار اسے باغ میں ملا تھا۔ لیلیٰ نے نئے سرے سے ساری باتیں سننی چاہیں اور اس بار بشفین کو کچھ باتیں حذف کرنی پڑیں۔

کمرے میں اس کے زیورات' لباس' خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں۔ جب وہ تیار ہو رہی تھی تو اس نے سارے صندوق کھول کر ان کا سامان باہر پھیلا لیا تھا۔ وہ سب ابھی بھی بکھرا ہوا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے قیمتی زیورات اٹھائے اور انہیں بشفین کو دے دیا۔

"انکار نہ کرنا۔۔۔" بشفین نے خاموشی سے پکڑ کر ایک طرف رکھ دیے۔ جب وہ خوش ہوتی تھی تو اپنی قیمتی چیزیں دے دیا کرتی تھی۔ سب سے پہلے بشفین کو پھر گھر کی دوسری خادماؤں کو۔

"مجھے یہ ساری چیزیں ہیچ لگ رہی ہیں بشفین۔ کبھی مجھے یہ کیسی پیاری رہی ہیں۔ زندگی میں ان کا مطلب ہی کیا ہے۔ تم یہ سب اٹھا کر لے جاؤ اور اپنی مرضی سے خادماؤں میں تقسیم کر دو۔" بشفین خاموشی سے لیلیٰ کو دیکھتی رہی۔

"تم ماں کو بتا دینا' وہ یوسف سے ہمارے رشتے کا عہد لیے بغیر اسے جانے نہ دیں۔" وہ اب بھی خاموش رہی۔ وہ دن اس کے دل پر بھاری رہا۔ وہ رات اس کے اعصاب پر سوار رہی۔

☆ ☆ ☆

چراغوں نے دھواں دینا چھوڑ دیا تھا۔ جو بستر اسے اتنے دنوں سے کاٹ رہا تھا' وہ رات ہی رات نرم گرم ہو گیا۔ کھانا اس نے کچھ اتنا تناول کر لیا کہ اس سے چلنا دوبھر ہو گیا۔ پہلی بار اس نے باغ کی آرائش پر غور کیا اور اسے خوب صورت پایا۔

ماں ٹھیک کہتی ہے' جو ہمیں چاہیے ہوتا ہے' وہ عین ہماری نظروں کے سامنے ہی ہوتا ہے۔ بس ہماری بینائی کام نہیں کرتی۔ جس لڑکی کو وہ سارے شہر میں ڈھونڈنے کا ارادہ رکھتا تھا' وہ اسی گھر میں موجود تھی' جس گھر میں وہ اتنے دنوں سے قیام پذیر تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس نے اس گھر کی کسی بھی چیز کو پسند نہیں کیا تھا اور گاہے بگاہے اپنا غصہ بھی ظاہر کرتا رہا تھا۔ لیکن اب یہ سب ختم کرنا ہوگا۔ مجیب درانی اور عکرمہ اسے ابھی بھی ناپسند تھے' لیکن اب انہیں برداشت کرنا ہی ہوگا۔

"تو تم اس گھر کے سب سے پرانے ملازم ہو؟" باغ میں ٹہلتے اس نے ایک خادم سے پوچھا۔

برجیس نے سر ہلا کر تائید کی۔ اپنے مشاہدے اور سوجھ بوجھ کی بنا پر وہ یہ جان گیا تھا کہ وہ "مجیب درانی" کا ہم مزاج نہیں ہے۔ اس نے زیادہ کرید نہیں کی تھی' لیکن اسے اندازہ تھا کہ یوسف وہاں اپنی مرضی سے نہیں آیا تھا۔ دوسرے خادم' مہمان یوسف سے خائف رہتے تھے' لیکن اسے یوسف اچھا لگا تھا۔

"مجیب درانی جیسے آقا کے ساتھ تم نے اتنے سال کیسے گزار دیے۔" یوسف نے شرارت سے پوچھا۔

برجیس مسکرا دیا۔ "رزق کے حصول کے لیے مستقل مزاجی اور برداشت شرط ہے۔"

"بہت خوب! دانائی کی بات کی ہے تم نے....."

"سختی کے ساتھ دانائی آ ہی جاتی ہے۔" یوسف اس کی بات سے خوش ہوا اور اسے شب بخیر کہہ کر سونے کے لیے چلا گیا۔

حوض کے شفاف پانی پر کچھ جگنو اڑتے رہے.... رات کی تاریکی میں کچھ راز سرنگوں رہے۔

صبح اس کی آنکھ باغ میں ہونے والے شور شرابے سے کھلی۔ نیند ایسی گہری تو نہیں تھی' لیکن جیسی بھی تھی وہ کچھ دیر اور سونا چاہتا تھا۔ باغ میں' حوض کے پاس کچھ ہلچل تھی۔ اس نے بستر پر لیٹے لیٹے کھڑکی کی طرف سر اٹھا کر باہر دیکھنا چاہا۔

سبزے پر' حوض کے پاس دستر خوان لگایا جا رہا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں میں تھی' اسے منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ فوارے کی بوچھاڑ کے پار اسے بشفین نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں مسلیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ بشفین وہاں موجود ہوتی۔ جس لڑکی کے ساتھ اس کی شادی کی بات طے ہونے کو تھی' وہ یہاں موجود ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ ناممکن تھا.... روایت کے خلاف....

وہ بستر سے اٹھا اور کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا.... وہاں وہی تھی.... بشفین.... وہ خادماؤں اور خادموں کو ہدایت دے رہی تھی۔ دستر خوان لگوا رہی تھی۔ کھانا رکھوا رہی تھی۔ وہ بری طرح سے چونکا اور اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکا۔ اسے کوئی بھی بات سمجھنے میں وقت لگا۔ یہ سب نظر کا دھوکا لگا۔ عکرمہ بھی وہاں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک چبھتی ہوئی نظر بشفین پر ڈالی' لیکن اسے کچھ کہا نہیں۔

"اپنے ہونے والے دولہا کے کمرے کے عین سامنے۔ وہ وہاں کیسے کھڑی رہ سکتی ہے۔ اسے اس کی اجازت کیسے مل سکتی ہے؟"

برجیس نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور اندر آ گیا۔

"ناشتا تیار ہے.... آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔"

اس نے اچنبھے سے برجیس کو دیکھا اور پھر سے کھڑکی سے باہر۔ بشفین بدستور وہیں کھڑی تھی' جیسے اس کے انتظار میں تھی۔ اس کے کھڑے ہونے کا

انداز مؤدب تھا۔ جیسے دوسرے خادموں کا تھا۔ برجیس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اس کی دانائی نے مہمان کی صورت پر سمٹ آنے والے تاثرات کی حقیقت کو بوجھ لیا۔

"وہ وہاں باغ میں..." یوسف نے بشفین کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ بشفین ہے... صبح کا یہ کھانا آپ کے لیے اسی کی طرف سے ہے۔ دختر درابی اور آپ کی متوقع شادی کی خوشی میں۔"

اس نے کھڑکی سے جھٹکے سے گردن گھما کر برجیس کو دیکھا۔ ٹھیک اسی وقت بشفین نے اپنی جگہ سے ادھر کھڑکی کی طرف دیکھا اور اس نے یہ جان لیا کہ مہمان کی غلط فہمی دور کر دی گئی ہے۔

"بشفین کون ہے؟"

"بشفین کے مرحوم والدین اسی گھر میں خادم تھے۔ لیلیٰ نے اسے بہن بنا لیا تھا اور عزیزہ خاتون نے بیٹی..." یوسف کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اگلا سوال کیا کرے۔ وہ ساری بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجیب درابی اور عکرمہ کے لیے وہ صرف ایک خادمہ ہی ہے۔" برجیس نے اس کی ساری الجھن دور کر دی۔

بشفین نے ایک نظر پھر سے کھڑکی سے نظر آتے یوسف کے چہرے کو دیکھا اور یہ جان لیا کہ ــــــ برجیس اپنا کام کر چکا ہے۔ گھر کے سب خادموں میں سے وہ صرف برجیس پر ہی اعتبار کر سکتی تھی۔ رات کو وہ برجیس کے کمرے میں گئی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ کسی بھی طرح مہمان کو اس کی حیثیت کے بارے میں بتا دے۔ جس طرح کل اس نے کمرے میں اس کا نام پکارا تھا' اسے جان لینے میں وقت نہیں لگا تھا کہ وہ کس غلط فہمی کا شکار ہو چکا ہے۔

یوسف شعراوی یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا... اس نے اپنا رخ پھیر لیا اور باغ کے سبزے پر چلتی' دروازے سے باہر آ گئی۔ عزیزہ ماں اور لیلیٰ ناشتے پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"تم نے یوسف کے لیے دستر خوان لگانے کا تردد کیوں کیا... مجھے برا لگا... تم نے ہمیشہ اپنے اور لیلیٰ کے درمیان فرق رکھا۔"

"یہ ان دونوں کے متوقع رشتے کی خوشی میں تھا۔"

"تم نے مہمان کے سامنے خود کو خادمہ کی حیثیت سے ظاہر کیا؟"

"وہ ابھی سو رہے تھے۔ میں انتظام دیکھ کر واپس آ گئی ہوں۔"

"تو آج ناشتا باغ میں ہو گا؟" لیلیٰ نے چہچہا کر پوچھا۔ یعنی وہ بالائی منزل پر جا کر اسے دیکھ آئے۔ بشفین نے سر ہلایا۔ چند نوالے کھا کر لیلیٰ بہانے سے اٹھ کر چلی گئی۔

"لیلیٰ نے کہا ہے کہ آپ مہمان سے عہد لیے بغیر انہیں جانے نہ دیں۔ وہ کل سے بہت خوش ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں اس کا چہرہ کیسے کھلا ہوا ہے۔"

"لیکن تمہارا چہرہ کیوں کملایا ہوا ہے؟ کوئی پریشانی ہے؟"

"مجھے کوئی پریشانی کیسے ہو سکتی ہے... آپ اور لیلیٰ میرے ساتھ ہیں۔"

"تم لیلیٰ پر جان نچھاور کرتی ہو۔ لیکن میں اتنی زیادہ محبت کی قائل نہیں۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا خوف رہتا ہے کہ تم میری محبت کو احسان سمجھتی ہو اور اسے کسی قرض کی طرح چکانا چاہتی ہو۔ میری بیٹی اگر ایسا ہے تو کبھی بھی ہماری محبتوں کا احسان چکانے کی کوشش نہ کرنا۔ تم خود کو دکھی کر لو گی۔ تمہاری پیاری ماں نے میری بیٹی کے لیے جان دے دی۔ کیا میں الزہرہ کی بیٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔"

بشفین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ چاہ کر بھی کوئی جواب نہ دے سکی۔ کچھ دیر بعد جب وہ لیلیٰ کے پاس اوپر گئی تو وہ مایوس صورت کھڑی تھی۔

"وہ تو باہر آیا ہی نہیں... وہ ابھی تک سو رہا ہے یا اسے بھوک ہی نہیں لگی۔" بشفین نے حیرت سے خالی باغ کو دیکھا۔ دستر خوان سمیٹا جا رہا تھا اور مہمان؟ وہ کہاں ہے؟

☆ ☆ ☆

مہمان شہر سے باہر اس باغ میں ٹہل رہا تھا جہاں وہ پہلی بار شفین سے ملا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ہر پہلو پر غور کر رہا تھا۔ فیصلہ وہ کر چکا تھا، لیکن اب اس فیصلے پر عمل درآمد کی فکر میں مبتلا تھا۔

شام کو وہ واپس آیا تو اسے پیغام دیا گیا کہ اسے مجیب درانی کے ساتھ ایک دعوت میں شرکت کرنی ہے۔ اس پیغام پر وہ بھنا گیا۔

"کیا ان لوگوں کو دعوتوں میں شرکت کرنے اور ان کا اہتمام کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں۔"

صورت حال کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اپنے رویے میں لچک لائے۔ حالات کی نزاکت کا خیال رکھے۔ وہ دعوت میں آ گیا، گو یہ سب اس کے اعصاب پر بہت بھاری رہا۔ مجیب درانی وہاں پہلے سے ہی موجود تھے۔

"یوسف شعراوی کے والد سے میری ملاقات تبریز میں ہوئی تھی۔ محصول سے کس طرح بچنا ہے، وہ میں نے ان کے والد سے سیکھا۔" اشارے سے اسے اپنے پاس بلا کر انہوں نے کہا۔ ان سب کے قہقہوں سے یوسف نے اپنے دماغ کی رگوں کو تنگ ہوتے پایا۔

"لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ تم بھی کچھ کر کے دکھاؤ۔" مجیب درانی نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

شہر کے معززین کی پروا نہ کرتے ہوئے یوسف نے ناپسندیدگی سے مجیب درانی کو دیکھا۔

"میں اپنے والد کے ہر غیر قانونی عمل سے نالاں ہوں۔ اپنے والد کی ایسی تجارت سے کوئی مجھے سروکار نہیں۔" یک دم سکوت چھا گیا۔ مجیب درانی نے اس کی جرأت کو حیرت سے دیکھا۔ پھر بات آگے بڑھائی۔

"اب تم میرے داماد بن چکے ہو۔ تمہارے والد کی طرح میں ان معاملات میں نرمی نہیں برتوں گا۔ میں تمہیں سکھاؤں گا کہ جوان، جوشیلے، خود سر غلام کو کیسے سدھایا جاتا ہے۔ اس کے غرور و تکبر کو کس طرح کچلا جاتا ہے۔ اس کی طاقت میں نکیل ڈال کر کیسے لگام اپنے ہاتھ میں رکھی جاتی ہیں۔ کیسے اسے صرف "غلام" بنا کر خود کو اس کا "آقا" بنایا جاتا ہے۔"

مجیب درانی کی آواز نیام سے نکلی تلوار تھی۔۔۔ انداز للکار۔۔۔ ہدف اس کی غیرت کا سر قلم کر دینا تھا۔

وہ سمجھ گیا تھا۔ کس غلام کی بات کی جا رہی ہے اور کون آقا بننے والا ہے۔

"میں آپ کا داماد بن جاؤں، یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکے گا۔ آقا و غلام کا یہ کھیل مجھے منظور نہیں۔ میں اپنا اسباب سمیٹ چکا ہوں۔ اس ملاقات کو خدا حافظ سمجھا جائے۔"

مجیب درانی اسے نظیر شعراوی سمجھا تھا جو اس کی تربیت کا آغاز ایسے سر محفل شروع کر دیا تھا۔ اس کی خود سری کا سر کچل دینے کی ترکیب، اس کا سر قلم کر دینے کی ترغیب بن گئی۔ مجیب درانی نے اس جوشیلے جوان کو ترحم سے دیکھا۔ ترحم سے اسے مجیب درانی کے ساتھ بیٹھے لوگوں نے بھی دیکھا۔

مجیب درانی کی ساری دولت، رتبہ، جاہ و جلال اپنے پیروں میں روند کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ان سب سے دور ہوتا گیا۔ عکرمہ اس کے پیچھے لپکا اور اسے طیش سے رک جانے پر مجبور کر دیا۔

"تمہیں اندازہ ہے تم نے کیا کیا ہے۔" عکرمہ نے اس کے بازو میں اپنا ہاتھ گاڑ دیا۔

یوسف نے تحمل سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے پرے کیا۔

"مجیب درانی تمہارے والد ہیں، میں ان کا غلام نہیں۔ میں جان چکا ہوں کہ وہ کیا ہیں۔ مجھے مجبور نہ کیا جائے کہ میں اور زیادہ سختی سے پیش آؤں۔"

"تم میرے باپ کے ساتھ سختی سے پیش آؤ گے۔" عکرمہ استہزائیہ ہنس دیا۔

"بہتر ہے کہ معاملات کو زیادہ نہ بگاڑا جائے۔ میں تمہاری ہمشیرہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"تمہیں لگتا ہے کہ تمہارے پاس انکار کا اختیار ہے؟"

یوسف نے حیرت سے عکرمہ کو دیکھا۔ آخر یہ لوگ

اسے کیا سمجھ رہے ہیں۔ انہیں کیوں یہ لگتا ہے کہ وہ اپنے سارے اختیارات ان کا مہمان بنتے ہی ان کے ہاتھ میں دے چکا ہے۔ کیا اس کے رد عمل نے انہیں ضدی بنا دیا ہے یا وہ پہلے سے ایسے تھے۔

"تم نے اس طرح بابا کو سر محفل انکار کر دیا۔ تم نے انہیں خفا کر دیا ہے۔ بہتر ہے کہ تم ان کے پاس واپس جاؤ اور اپنے الفاظ واپس لے لو۔ معافی مانگ لو۔" یوسف نے اس خود سر اور متکبر انسان کو غصے سے دیکھا۔ اس نے صاف صاف بات کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔

"مجھ پر اپنا حکم ایسے نہ چلاؤ عکرمہ! جس خیال کے تحت میں تمہیں جھیل رہا تھا' میں اسے ترک کرتا ہوں۔ یشفین سے نکاح کی اجازت میں خاتون درانی سے بہ آسانی لے لوں گا۔"

"یشفین۔" عکرمہ نے زیر لب یہ نام دہرایا اور اسے ساری بات سمجھنے میں وقت نہ لگا۔ لباس میں چھپے خنجر کو یک دم نکال کر اس نے یوسف کے دل کی طرف وار کرنا چاہا' لیکن یوسف نے بروقت اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایک خنجر میرے لباس میں بھی ہے عکرمہ....." اس کا ہاتھ جھٹک کر وہ وہاں سے چلا گیا۔

حقہ پیتے اپنے باپ کے کانوں میں عکرمہ نے آکر سرگوشی کی اور مجیب درانی کی صورت تلوار کی دھار بن گئی۔

٭ ٭ ٭

ایک لمحے کی تاخیر کو بھی گناہ سمجھتے اور شہر کے راستوں پر اندھا دھند گھوڑا دوڑاتے وہ واپس آیا اور اپنا اسباب سمیٹنے لگا۔ سارا دن وہ معاملات کو خوش اسلوبی سے نپٹانے کے بارے میں سوچتا رہا' لیکن رات نے ان معاملات کو اس کے ہاتھ سے نکال دیا تھا۔ وہ مجیب درانی سے یشفین کے لیے بات کرنا چاہتا تھا' لیکن اب یہ کسی طرح ممکن نہیں ہو سکے گا' وہ جان گیا تھا۔ اس نے برجیس کے ہاتھ یشفین کو پیغام بھیجا۔

یشفین اپنے کمرے میں چپ چاپ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا دل اس اجنبی کی طرف مائل ہو چکا تھا' جو شہر میں گاہے بگاہے اس سے ملتا رہا تھا۔ وہ اجنبی لیلیٰ کے لیے آنے والا مہمان ہے' اس حقیقت نے اس پر بڑا قہر برسایا تھا۔ برجیس نے آکر یوسف کا پیغام دیا تو جیسے اس کا دل بند ہو گیا۔ بے یقینی سے وہ برجیس کو دیکھتی رہی۔

"مہمان نے مجھے کیوں بلایا ہے.... یہ ٹھیک نہیں...."

"وہ جا رہا ہے.... بہت جلدی میں ہے۔" برجیس ساری کہانی تو سمجھ ہی چکا تھا۔ اب وہ اسے مشورہ دے رہا تھا۔

"جا رہا ہے۔" یشفین کو حیرت ہوئی۔ "ایسے کیسے.... کیا شادی کے معاملات طے ہو چکے ہیں؟" وہ شش و پنج کا شکار ہو گئی۔

"دیر نہ کرو یشفین.... وہ ایک شریف انسان ہے.... کم سے کم اس گھر کے ہر مرد سے زیادہ...."

ناچار برجیس کے پیچھے پیچھے چلتی وہ اس کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ برجیس کمرے کے اندر چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں کھڑکی کے پاس وہ آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ کھڑکی کی اوٹ میں اس طرف کھڑی ہو گئی اور وہ اس طرف۔ دونوں کی صورت ایک دوسرے سے اوجھل رہی۔

"میں جا رہا ہوں۔ مجیب درانی سے میں نے معذرت کر لی ہے' میں ان کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا۔"

ان الفاظ نے اسے بے حد تکلیف دی تھی۔ وہ مجیب درانی کے مزاج سے واقف تھی' انہوں نے یوسف کو بھی ناراض کر دیا تھا' لیکن لیلیٰ؟ اس کا کیا قصور تھا؟

"آپ نے ایسا کیوں کیا.... لیلیٰ معصوم دل لڑکی ہے.... اس کے دل کو ایسے تکلیف نہ دیں۔"

یوسف نے خود کو کھڑکی میں اس طرح نمایاں کر دیا کہ دونوں کا چہرہ آمنے سامنے آگیا۔ یشفین رو رہی

تھی۔ وہ کھلے آسمان سے جھانکتے چاند اور باغ کی محرابوں میں روشن مشعلوں کے پس منظر میں اس کی بے بسی پر دل گرفتہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

"دلیلیٰ معصوم دل، فرشتہ سیرت لڑکی ہو گی، لیکن میں نے جس کی صراحی کا پانی بہا دیا ہے، میں اس کی محبت میں بہہ جانے کا عہد کر چکا ہوں۔ محبت ہمیشہ لاعلمی میں ہوتی ہے اور معصومیت سے آشکار ہوتی ہے۔ میں تم سے اپنی محبت کے احساس کو پا چکا ہوں۔ میں اپنا عہد تمہیں دیتا ہوں۔"

وہ بے یقینی سے یوسف کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن اس کے لیے موت بن گئی۔ حوض کا پانی بہنے لگا، باغ کا سبزہ شعلہ ہوا، سب محرابیں گھوم گئیں اور اس نے خود کو ساری دنیا سے دور لے جانا چاہا..... وہ یک دم تیزی سے بھاگی۔ یوسف جلدی سے کمرے سے باہر نکلا۔ وہ اسے آواز دینے لگا کہ وہ رک جائے، لیکن وہ محرابوں کے ستونوں سے ٹکراتے، باغ کے سبزے پر بھاگتے، سر پر آگرنے والے آسمان سے بچتے، خود کو یوسف کی پہنچ سے دور لے جاتے، باغ کے دروازے سے باہر نکل گئی اور اپنے کمرے میں جاکر بند ہو گئی۔ برجیس اس واقعہ کا اکیلا گواہ بنا وہاں کھڑا رہا۔ یوسف نے باغ کے دروازے سے لوٹ کر بہت دکھ سے برجیس کو دیکھا۔

"کیا وہ اس لیے بھاگ گئی کہ اسے اپنے آقاؤں سے وفاداری نبھانی ہے؟"

"ہاں..... اور اس لیے بھی کہ اسے لیلیٰ کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچنے دینی۔"

"اس گھر میں داخل ہونے سے بھی پہلے میں اس سے شادی کا ارادہ کر چکا تھا۔ فیصلہ تو بہت پہلے ہی ہو چکا تھا۔"

"یوسف! واپس لوٹ جاؤ۔" جو بات برجیس کہنا چاہتا تھا اس نے آخر کہہ دی۔ "اب اس شہر میں تمہارا رہنا ٹھیک نہیں۔"

"تم نے سنا نہیں! ابھی ایک لڑکی کو میں نے اپنی محبت کا عہد دیا۔ اس عہد کو پورا کیے بغیر میں کیسے لوٹ جاؤں؟" اس نے برجیس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

☆ ☆ ☆

عکرمہ جانتا تھا کہ وہ ان کے گھر سے بھی جا چکا ہے، لیکن اس نے اپنے باپ کے اشارے کا احترام کیا کہ وہ یہاں سے کہیں نہ جائے۔ لوگوں کو اور باتیں بنانے کا موقع نہ دیا جائے۔

موقع انہیں مل چکا تھا۔ عکرمہ کے لیے اس تمسخر کو جھیلنا محال ہو گیا تھا، جو ان لوگوں کی آنکھوں سے جھلک رہا تھا، جو یوسف کے انکار کے وقت وہاں موجود تھے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا اور بات ایک کان سے دوسرے کان تک پہنچ چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جتنے لوگ وہاں موجود ہیں، وہ اس کے باپ کو پسند نہیں کرتے۔ وہ یا ان سے دبتے ہیں یا ڈرتے ہیں۔ وہ اس کے باپ کی بے عزتی سے محظوظ ہوئے ہیں۔ انہیں یوسف کی خودسری پسند آئی۔ ہو سکتا ہے، کل کچھ لوگ یوسف کو ڈھونڈ کر اسے شاباش دیں اور کچھ لوگ یوسف کو مجیب درانی کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہونے کے لیے اپنا سہارا پیش کریں۔

جب تک دعوت برخاست نہیں ہوئی، وہ دونوں وہاں موجود رہے۔ مجیب درانی نے لوگوں کی نظروں میں نظریں گاڑ دیں اور اپنی دہشت سے کسی کو یہ موقع نہیں دیا کہ کوئی اس سے سوال کر سکے۔ واپسی پر وہ تیزی سے اپنے گھوڑوں کی طرف آئے۔

"اسے شہر سے جانے نہ دینا۔" گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے مجیب درانی نے عکرمہ سے کہا۔ عکرمہ نے سر ہلا دیا۔ گھوڑے کی گردن میں اپنی انگلیاں گاڑ کر لگام کو جھٹکا دے کر ایڑ لگانے سے پہلے یہ بھی کہا۔

"التموش کو پیغام بھیجو۔ ایک "باندی" ہے، آکر خرید لے۔"

☆ ☆ ☆

جس وقت وہ شہر کی سرائے کے بستر پر دراز ہوا اس نے اپنی ماں کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ ماں کہا کرتی ہے کہ

دل سے یاد کرو تو بات اس دل تک پہنچ جاتی ہے، جس تک پہنچانی ہو۔ اس نے ماں کے دل کو پہلا پیغام بھیجا "کہ اسے ایک ایسی لڑکی سے محبت ہو چکی ہے، جس کے آقا کو اس سے نفرت ہو چکی ہے۔"

"مجیب درانی کی آنکھیں نفرت و غصے سے سکڑ گئی تھیں۔ افسوس کہ میری جلد بازی نے انہیں محفل میں شرمندہ کیا۔ مجھے خوف ہے کہ یشفین کا ہاتھ وہ کسی ادنیٰ خادم کے ہاتھ میں تو دے دیں گے، لیکن میرے ہاتھ میں ہرگز نہیں۔ برجیس کا کہنا ہے کہ یشفین ہر صورت مجیب درانی کا حکم ہی مانے گی۔ مجیب درانی جیسے انسان سے اپنی وفاداری نبھانا چاہتی ہے۔ میں خاتون درانی سے بات کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ وہ آپ کی طرح درویش صفت لگتی ہیں۔ ان سے ملاقات کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجیب درانی کی شخصیت کے بالکل الٹ ہیں، جیسے آپ اور بابا۔ اب مجھے یہیں رہ کر معاملات کو نپٹانے کی کوشش کرنی ہے۔ آپ میرے لیے دعا کریں۔"

ماں سے باتیں کرنے کے بعد وہ سو گیا۔ رات میں کئی بار اس کی آنکھ کھلی اور اسے چراغ کی ٹمٹماتی لو میں یشفین کی آنکھوں کا خوف شکلیں اختیار کرتا دکھائی دیا۔ دیوار پر پڑنے والی روشنی 'باغ میں بھاگتی یشفین کی یاد دلاتی رہی۔ چراغ کی لو [illegible] نے یوسف کے ہاتھ کا لکھا ہوا پیغام جلا دیا۔ گھر میں دو افراد کے علاوہ کسی کو خبر نہیں ہوئی تھی کہ مہمان جا چکا ہے۔

"یہاں سے جا رہا ہوں، لیکن شہر میں اس وقت تک موجود رہوں گا جب تک خاتون درانی سے ہمارے لیے بات نہیں کر لیتا۔"

"ہمارے لیے؟"

خط جل چکا تھا، لیکن اس کے حروف جلنے سے قاصر رہے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لیلیٰ کی طرح ہی اس گھر میں پرورش پانے کے باوجود وہ روز اول سے یہ جانتی تھی کہ ایک دن آئے گا اور آقا درانی کے اشارے پر اس کی کسی بھی غلام سے شادی کر دی جائے گی۔ اگر ماں عزیزہ کی درخواست مان بھی لی گئی تو اسے ایک اچھا گھر نصیب ہو جائے گا اور بس۔۔۔ لیلیٰ کی طرح اس نے کبھی کسی شہزادے کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ اس نے زندگی کو ہمیشہ حقیقت کی نظر سے دیکھا تھا۔ بیش قیمت لباس پہنتے ہوئے بھی، لیلیٰ کے تحائف کو کان، ہاتھ، سر پر سجاتے ہوئے بھی۔۔۔ آئینے میں جب وہ اپنی خوب صورتی کو دیکھتی تھی، تب بھی اسے یاد رہتا تھا کہ وہ ایک "خوب صورت کنیز" ہے اور بس۔ یہ خوب صورت کنیز آقا درانی کے مہمان کو، لیلیٰ کے لیے آنے والے یوسف کو کیسے کوئی امید دے دیتی۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ برجیس کے کمرے کا دروازہ بجا رہی تھی۔

"کیا ہوا۔۔۔ خیریت ہے۔۔۔" وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ وہ شرمندہ ہوئی کہ اس نے اسے نیند سے جگا دیا۔

"میں یوسف سے ملنا چاہتی ہوں، وہ کہاں ہے؟"

"شہر کی سرائے میں۔۔۔"

"میں سرائے تو نہیں جا سکتی۔"

"میں اسے شہر سے باہر باغ تک لے آؤں گا۔"

یشفین نے کچھ دیر سوچا اور ہاں میں سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے۔"

☆ ☆ ☆

مہمان خانے کے خادمین سے ہوتی ہوئی بات ماں عزیزہ کے کانوں تک آئی کہ مہمان کل رات واپس نہیں آیا۔ ماں عزیزہ نے عکرمہ کو بلا کر پوچھا۔

"یوسف کہاں ہے؟"

"اپنے ایک دوست کے گھر۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"لیکن وہ تو یہاں اجنبی تھا۔"

"کتنے دنوں سے وہ اس شہر میں رہ رہا ہے۔ دوست بن چکے ہیں اس کے۔ آپ فکر نہ کریں۔ یشفین کہاں ہے؟"

"وہ باغ تک گئی ہے۔"

"اچھا۔" عکرمہ نے اپنی اکڑی ہوئی انگلیوں کو چٹخایا

اور باغ کی سمت جانے کے لیے گھر سے نکلا۔
یوسف سرائے میں ہے' وہ یہ جانتا تھا۔ اسے شہر سے نکلنے کی جلدی نہیں ہے یہ بھی۔ التموش کو پیغام بھجوایا گیا تھا۔ عکرمہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس دو کوڑی کی کنیز کی گردن سربازار کاٹ کر نیزے پر ٹانگ دے اور اعلان کرے۔ "دیکھو' نمک حراموں کا انجام۔"
جب وہ باغ میں پہنچی تو اسے دور یوسف کا گھوڑا گھاس چرتا ہوا دکھائی دیا۔ یوسف اس کے قریب ایک درخت کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھا تھا۔
"اس لاپروا' بے فکرے انسان نے ہماری زندگیوں کو بے چینی سے بھر دیا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔
وہ کچھ اتنے غصے میں تھی کہ صراحی میں ایک خنجر چھپا کر لانا چاہتی تھی' تاکہ موقع ملتے ہی اس کے پیٹ میں گھونپ دے۔ ہاتھ میں پکڑی صراحی کو اس نے زمین پر پٹخا تو اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔
"تم آگئیں یشفین......" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"میں تمہیں اپنا نام لینے کی اجازت نہیں دیتی۔ تمہارے پاس اس کا حق ہے' نہ ہوگا۔"
"تمہیں کس بات نے مجھ سے اتنا بدظن کر دیا ہے؟" یوسف نے سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔
"میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا دکھ ہوگا کہ میری بہن کے لیے مہمان بن کر آنے والا انسان' اس سے یوں بے زاری کا عندیہ دے رہا ہے۔ جو اس جیسے ہیرے کو ٹھکرا سکتا ہے' مجھے اس پتھر میں کوئی دلچسپی نہیں۔ تم نے میری بہن کی انا کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ میں ایسے شخص کو ایک ہی صورت معاف کر سکتی ہوں کہ وہ اپنے الفاظ واپس لے لے۔ ماں عزیزہ اور مجیب درانی کے ہاتھ کو چوم کر آنکھوں سے لگا لے۔"
یوسف طنز سے ہنس دیا۔ "تمہیں کس چیز نے مجیب درانی کی اس درجہ وفادار غلام بنا دیا ہے؟"
یشفین نے ٹھٹک کر یوسف کو دیکھا۔ "میں ان کی کنیز نہیں ہوں۔ لیلیٰ میری بہن ہے۔"
"اگر تم ان کی کنیز نہ ہوتیں تو لیلیٰ کی بجائے تمہارا نام لینے پر عکرمہ میرے خون کا پیاسا نہ ہو جاتا۔"
معاملات کے اس درجہ بگڑ جانے کی یشفین کو توقع نہیں تھی۔ یوسف کی بات نے اسے حد درجہ پریشان کر دیا۔
"میں یہ کہنے آئی ہوں کہ یوسف جیسے سو بھی اگر میرے سامنے کھڑے ہو جائیں تو وہ لیلیٰ جیسی کسی ایک کی جگہ نہیں لے سکیں گے۔ میں اپنی گردن کاٹ لوں گی' لیکن اس کے دل کو یہ تکلیف نہیں پہنچنے دوں گی۔" اس نے یوسف کے دل میں موجود امید کی ذرا سی رمق کو بھی مٹا ڈالنا چاہا۔
یوسف اس کے منہ سے ایسی ہی کوئی بات سننے کی توقع کر رہا تھا۔ وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ یشفین نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔
"لیلیٰ کو عہد دے کر لوٹ جاؤ۔ مجھ سے کسی عہد کی امید نہ رکھنا۔"
"میں اس وقت تک اس شہر سے نہیں جاؤں گا جب تک تمہیں یقین نہ آجائے کہ تمہارا میرے راستے میں آجانا اللہ کی مرضی سے ہوا تھا۔ اپنی وفاداری کو اللہ کی مرضی پر غالب نہ کرو۔ جو آسمانوں پر طے ہو چکا ہے' اسے زمین پر بدلنے کی کوشش کرنا چھوڑ دو۔" اس نے اس مسافر اجنبی مہمان۔۔۔ یوسف کو دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اس کی سانس تھم گئی۔
"اگر تمہیں اپنا نمک حلال کرنا ہے تو مجھے اپنا عہد وفا کرنا ہے۔" پٹخ کر پھینکی گئی صراحی اٹھا کر یوسف نے اس کے ہاتھوں میں دی اور اس کی آنکھوں کی بجھی لو کو اپنی روشن آنکھوں سے منور کرنا چاہا' لیکن ناکام رہا۔

☼ ☼ ☼

"تم اس لڑکی کی حیثیت جانتے ہو؟" عکرمہ سرائے میں اس کے سامنے تن کر کھڑا پوچھ رہا تھا۔ وہ دونوں کو باغ میں ملتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ

دونوں اب یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔

"وہ تمہارے گھر کی خادمہ ہے.... جانتا ہوں۔" یوسف نے اطمینان سے کہا۔

"بابا نے ٹھیک کہا تھا' تمہاری حیثیت منڈی میں کھڑے ایک کبڑے غلام سے زیادہ نہیں' جس کی قیمت سکے نہیں روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے ہوتے ہیں۔" اس کے اطمینان پر وہ بل کھا کر رہ گیا۔

"وہ ٹکڑے میں تمہارے محل میں چھوڑ آیا ہوں... ان کے لیے کوئی اور کبڑا غلام دیکھ لینا۔"

"اپنے باپ سے پوچھ لو' جو ابھی بھی ان ٹکڑوں کو اٹھا کر کھانے پر بضد ہو گا۔"

"تم یہاں سے رخصت ہونے کا کیا لو گے؟ ایک سونے کا سکہ؟ دو یا دس؟"

"کسی نے ٹھیک کہا ہے' نیا شہر' نئے لوگ' ہر کسی کے لیے موافق نہیں ہوتے۔"

"میں ایسے اوہام پر یقین نہیں رکھتا۔"

"جلد ہی رکھنے لگو گے۔" وہ جانتا تھا کہ عکرمہ اسے دھمکی دے کر گیا ہے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ایک ایسے شہر میں رہنا جس کے آدھے سے زیادہ معززین مجیب ورابی کی مٹھی میں تھے' کتنا خطرناک تھا تو کیا وہ ڈر کر بھاگ جاتا یا وہ ڈر کر لیلیٰ سے شادی کے لیے ہاں کہہ دیتا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ ایک غلام کی حیثیت سے اپنے دام کھرے کر لیتا یا کبڑے غلام کی طرح روٹی کے ٹکڑے چن چن کر کھاتا۔

"جو آسمان پر طے ہو چکا ہے اسے زمین پر کوئی بھی نہیں بدل سکتا۔" رات کو سونے سے پہلے اس نے اللہ کی مرضی پر سوچا اور اطمینان سے سو گیا۔

اگلے دن صبح جب وہ برجیس سے ملاقات کے لیے شہر کی مسجد کے قریب سے گزرتے شہر سے باہر ویرانے کی طرف جا رہا تھا' اس کے گھوڑے کو شاہی سپاہیوں نے گھیرے میں لے لیا اور اسے گھوڑے سے اترنے کا حکم دیا۔ اس صبح کے بعد اسے کسی نے شہر میں نہیں دیکھا۔ کچھ عرصے بعد لوگ بھول بھی گئے کہ اس شہر میں کبھی کوئی مسافر گھوڑے کی لگام پکڑے آیا تھا اور وہ مجیب ورابی کے گھر کا راستہ معلوم کر رہا تھا۔

اس دن سے ایک رات قبل برجیس نے گھبراہٹ اور خوف کے زیر اثر بشفین کے کمرے کی کھڑکی جو باغ کی طرف کھلتی تھی' کو بجایا۔ جب وہ چراغ ہاتھ میں لیے کھڑکی کھول کر کھڑی ہوئی تو برجیس نے چراغ کو پھونک مار کر بجھا دیا۔

"مہمان خانے کی طرف سے التموش تمہیں اٹھانے آ رہا ہے۔ عکرمہ اس کے ساتھ ہے۔"

* * *

نظیر شعراوی اپنی خون کی خاصیت پر متکبر رہے تھے' لیکن یوسف جیسے نالائق نے ان کا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ اسے قونیہ سفر پر بھیجا تھا۔ نہ وہ خود آیا تھا نہ کوئی خط یا پیغام بھیجا تھا۔ توقع تو یہ ہی تھی کہ مجیب جیسے مال دار کی بیٹی سے شادی کے بعد وہ سونے کے سکوں سے لبالب بوریاں اپنے باپ کے پاس روانہ کرے گا۔ لیکن یوسف آج تک کسی توقع پر پورا اترا تھا جو اب اترتا۔ قونیہ میں شادی کر کے وہ اپنا گھر آباد کر چکا ہو گا۔ [illegible] کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر ثواب پہنچانے کے علاوہ اسے کوئی اور فائدہ دینے کی ترکیب نہیں سوجھی ہو گی۔ ناخلف اولاد کی بوٹی بوٹی اس کے احسانوں کے خون سے بنی تھی' لیکن اولاد تھی کہ خون کا ایک قطرہ بھی لوٹا دینے پر راضی نہ تھی۔

یوسف کی ماں نے واویلا مچا رکھا تھا۔ دو سال تین مہینے گزر چکے تھے۔ اس نے اپنی کوئی خیر خبر نہیں دی تھی۔ وہ قونیہ آنے جانے والے نہ جانے کتنے لوگوں سے درخواست کر چکی تھی کہ وہاں یوسف کو تلاش کر کے اس سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنی ماں کو اپنی خیریت کا پیغام بھجوا دے۔ لوگ خالی خولی تو ایسے کام نہیں کرتے' سونے کے سکوں کو استعمال میں لانا پڑتا ہے۔ یوسف کی کم عقل ماں ان کا خزانہ ہی خالی نہ کر دے' عاجز آ کر تجارتی قافلے کے ساتھ سفر کرتے نظیر شعراوی نے قونیہ کا رخ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

مجیب درانی نے ان کا خوش دلی سے استقبال کیا‘ لیکن یوسف سے متعلق لاعلمی کا اظہار کیا گیا۔

”مجھے آپ کے بیٹے کا انتظار رہا‘ لیکن وہ نہیں آیا تو میں یہ ہی سمجھا کہ آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ آپ ان معاملات کو آگے نہیں بڑھانا چاہتے۔“

نظیر شعراوی کو تو پہلے ہی یوسف کی نیت پر شک تھا۔ جس طرح منہ بنائے وہ سفر کی تیاری کر رہا تھا اور جس خودسری سے وہ اپنے باپ کو دیکھتا رہا تھا‘ یہ سب حرکتیں اس کے ارادہ کا کھوٹ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اس نے راستے میں ہی اپنی منزل بدل لی تھی‘ یا شاید وہ گھر سے ہی اپنی منزل کا تعین کر کے نکلا تھا کہ اسے قونیہ نہیں آنا... اور وہ قونیہ نہیں آیا تھا۔

”ہو سکتا ہے وہ یہاں آیا ہو‘ لیکن اگر ہمارے گھر آیا ہوتا تو میں اب تک دونوں کی شادی کر چکا ہوتا‘ جیسا کہ ہمارے درمیان طے پایا تھا۔ آپ کے بیٹے کے انتظار سے مایوس ہو کر میں نے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ میری بیٹی اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ لیکن مجھے یہ افسوس رہا کہ ہم دو دوست رشتے دار نہیں بن سکے۔“

نظیر شعراوی کو درانی کی بیٹی یا اس کی کسی خوشی سے اب کیا سروکار تھا۔ انہیں اپنے کھوٹے سکے پر غصہ تھا۔ نظیر شعراوی کی رگیں طیش سے تن گئیں۔ تو وہ یہاں آیا ہی نہیں۔ وہ بھاگ گیا۔ پہاڑوں کی طرف یا دریا کے کنارے کسی معمولی سی لڑکی سے شادی کر کے گھر آباد کیے ہوئے۔ کسی حجام یا قصاب کی دکان پر معمولی کام کرتے ہوئے یا کسی مدرسے میں معلم بنے۔ ورنہ یقیناً“ خانہ بدوشوں کے پاس پناہ لیے اور ان کی نسل کو پروان چڑھاتے ہوئے۔

نظیر شعراوی نے درانی کے گھر کے قیام کو مختصر کیا اور واپس اپنے شہر لوٹ گئے۔ بیٹے کی بغاوت نے ان کے اندر اتنی نفرت پیدا کر دی تھی کہ انہوں نے اس کی قبر تک تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ورنہ وہ اگر گھر سے باہر نکل کر شہر کی سرائے تک ہی چلے جاتے اور ان سے دو چار پہلے یہاں آنے والے صحت مند‘ دراز قد‘ چوڑے شانوں‘ گھنی بھنوؤں‘ روشن آنکھوں والے نوجوان کے بارے میں پوچھتے تو وہ اپنی یادداشت کو کھنگالتے کچھ نہ کچھ بتا دیتے۔

★★★

سرائے میں اس کے اسباب کی تلاشی لی گئی اور سلطان کے مشیر خاص عبدالفتاح کے گھر کے نوادرات اور کچھ خفیہ حساس دستاویزات اس کے سامان سے برآمد ہوئیں۔

مجیب درانی نے ہر اس انسان کو خرید لیا تھا جسے خریدا جا سکتا تھا۔ درانی کے دوست و دشمن جان گئے تھے کہ وہ یہ کیوں کر رہا ہے۔ اس طرح وہ اس سے اور خوف زدہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور منہ سی لیے اور وہ یہ بھول گئے کہ اصفہان سے آنے والا نوجوان یوسف شعراوی کوئی ایک‘ بھی جرم کیے بغیر ڈھیر سارے الزامات کے ساتھ قید خانے میں پتھر کوٹ رہا ہے۔

”وہ ان دستاویزات کو کس کے حوالے کرنے والا تھا‘ وہ کس کا مخبر تھا۔ اس کے ساتھی کون لوگ ہیں؟“

کتنے ہی مہینے اس پر تشدد ہوتا رہا‘ اسے الٹا لٹکایا جاتا رہا۔ انہیں اس سے اس سوال کا جواب چاہیے تھا جو انہیں بھی معلوم تھا کہ وہ نہیں جانتا۔ وہ لاغر ہو گیا۔ مسلسل تشدد نے اس کی صحت مندی کو زائل کر دیا۔ وہ ایک بہادر اور باہمت انسان نہ ہوتا تو اتنی سختی پر درانی کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لیتا۔ اسے درانی پر غصہ آتا۔ اسے اپنی بے بسی پر غصہ آتا۔ اس نے انتظامیہ کو سچ بتانے کی پوری کوشش کی۔ وہ چیختا اور چلاتا رہا۔ لیکن پھر وہ خاموش ہو گیا... سمندر کی موجیں‘ چشمے کے بہاؤ میں بدل گئیں۔

قسمت کے دکھ‘ آزمائش کا ایک چکر ہوتا ہے‘ ایک گول چکر۔ جب شروع ہوتا ہے تو پھر پورا ہو کر ہی ختم ہوتا ہے۔ مدت اور مقدار مقرر کرنا انسان کے بس میں نہیں۔ اس نے اپنے اعصاب کو پرسکون رکھنا سیکھ لیا تھا۔ غصہ کرنا‘ اپنے ماضی کے بارے میں سوچنا اس نے ترک کر دیا۔ یہ حقیقت اس پر واضح تھی کہ یہ سب مجیب درانی نے اس کے ساتھ کرایا ہے اور یہ حقیقت

بھی کہ اللہ کے علاوہ کوئی اس کی مدد نہیں کر سکے گا۔
سورج جیسے سوا نیزے پر تھا اور وہ سب پتھر کوٹ رہے تھے۔ عکرمہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ یہ اس کی قید کے ابتدائی مہینوں کی بات ہے۔
"تمہیں اپنی زندگی کے وہ دن یاد تو آتے ہوں گے جب تمہارے ہاتھ میں تمہارے گھوڑے کی لگامیں ہوا کرتی تھیں اور تم اسے شہر میں دوڑائے پھرتے تھے۔ افسوس اب تمہاری زندگی کی لگامیں کسی اور کے ہاتھ میں ہیں۔" اس نے سر اٹھا کر عکرمہ کو دیکھنے کی زحمت نہیں کی اور خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔
"تمہاری کھال مردہ چوہے جیسی ہو گئی' کیا تمہیں یہاں کھانے کو کچھ نہیں ملتا؟" اس نے اب بھی اسے نظر انداز کر دیا۔
"جس لڑکی کے لیے تم یہ مصیبت جھیل رہے ہو جانتے ہو وہ کہاں ہے؟ مصر کے قحبہ خانے میں...."
اب وہ نظر انداز نہیں کر سکا۔ پتھر کوٹتے یوسف کے ہاتھوں کا دم نکل گیا۔ اس کا ہتھوڑا ضرب لگانے کے لیے بلند ہوا تو ڈھے کر نیچے آگرا۔
"سارا شہر جانتا ہے' بابا نے اپنی بے عزتی کا بدلہ کس اہتمام سے لیا۔"
"ساری دنیا یہ جان لے گی کہ خدا نے ظلم کا حساب کیسے لیا۔" ہتھوڑا اس نے ایک بار پھر بلند کر لیا اور بلند ہی آواز میں کہا۔
اس دن کی رات اس پر بھاری رہی۔ جو کچھ مجیب درانی اور عکرمہ نے اس کے ساتھ کیا تھا' ان سے بعید نہ تھا کہ انہوں نے ہشفین کے ساتھ یہ نہیں کیا ہو گا۔ وہ جان گیا تھا کہ ان کے دل رحم سے خالی ہیں۔ انہوں نے اس لڑکی کی ساری معصومیت اور وفاداری کے باوجود اسے تکلیف پہنچانے کی قسم کھائی ہو گی۔ اس نے اپنے جسم کو بے روح پایا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید پرجیس اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا' لیکن درانی کے وفاداروں کے ہوتے ہوئے وہ قید خانے کا پھاٹک بھی پار نہیں کر سکا تھا۔

"تمہارا باپ آیا تھا تم سے ملنے۔ مجھے اس کی بے حسی پر ہنسی آئی۔" عکرمہ پھر اس کی حالت سے محظوظ ہونے آیا تھا۔
"یہ بتانے پر کہ تم یہاں کبھی آئے ہی نہیں' وہ الٹا تمہیں گالیاں دینے لگا کہ تم اس کی دولت لے کر کہیں بھاگ گئے ہو۔"
یوسف جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ بابا نے ایسا ہی کیا ہو گا۔ جو تھوڑا بہت مال اسباب انہوں نے اسے دے کر بھیجا تھا' انہیں یقین ہو گا کہ اسے بیچ کر وہ کہیں اور مزے کر رہا ہو گا۔ ساری زندگی بابا نے اسے کبھی یقین کی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ اب کیسے دیکھتے۔ انہیں تو بس اپنا نفع مقصود تھا' وہ چاہے کتنا بھی نقصان میں رہتا۔ آتے ہوئے بابا نے یہ تک کہنے میں عار محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجیب درانی کی بیٹی سے تعلق بنانے کی کوشش کرے۔ اگر درانی کسی بھی طور شادی سے ٹال مٹول کرے تو اس کے ہاتھ میں اس لی بی کا دل ہونا چاہیے' جسے وہ بروقت شمع دان پر رکھ کر درانی کو جلا سکے۔
ان کے گھر میں خادموں کی فوج تھی' لیکن کوئی ایک بھی خادم ایسا نہیں تھا جو رات کو "نظیر شعراوی" کو دعا دے کر سوتا ہو۔ ان کا گھر شہر کے بڑے اور خوب صورت گھروں میں سے ایک تھا۔ پھر بھی گھر کا کوئی ایسا کونا نہ تھا جہاں اسے سکون ملتا ہو' سوائے ماں کی گود کے۔ گھر میں ہونے والی دعوتیں تک لین دین کے معاملات سے مبرا نہیں ہوتی تھیں۔ ان کے رشتے داری اور مراسم سب تجارتی تھے۔ بیٹا کیسے اس سے الگ رہتا۔۔۔ بیٹیوں کی طرح انہوں نے بیٹے کے لیے بھی تیاری کرنی شروع کر دی تھی۔ تب ہی تو مجیب درانی سے تعلق بنا کر اسے ان کے پاس یہ کہتے ہوئے بھیجا تھا۔
"وہ ٹھنڈے مزاج کا گرم انسان ہے۔۔۔ خاموشی سے اس کی بات مانتے رہنا۔۔۔ پھر میں سب دیکھ لوں گا۔"
خاموشی سے اس کی بات مانتے رہنا یعنی اس کی بیٹی

سے شادی کرلینا۔ اس کے گھر میں رہ لینا۔ اختیارات ملتے ہی آزاد ہوتے جانا۔ درانی کے داماد کی حیثیت سے اعلا عہدے داروں سے مراسم پیدا کرنا‘ ضروری ہو تو ان کی بیٹیوں سے شادی کرلینا۔ دو‘ تین‘ چار جتنی شادیاں کرنا ضروری ہو کرلینا۔ وہ جانتا تھا کہ بابا کیسے جال بچھاتے تھے۔ لیکن اب وہ یہ نہیں جان پائیں گے کہ ان کے بیٹے کو درانی نے کس جال میں پھنسایا ہے۔

☆ ☆ ☆

قحبہ خانہ ہی اس کا مقدر تھا‘ وہ التموش کے ہاتھ بک چکی تھی‘ جسے سارا شہر ایک دلال کی حیثیت سے جانتا تھا۔ وہ دنیا بھر میں اپنا گھوڑا دوڑائے پھرتا اور ان موتیوں کو چن لیتا جو قحبہ خانے میں ہیروں کے دام بکتے۔ برجیس اس کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا تھا اور وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ ”التموش اور مجھے؟“

”جلدی کرو.... چابیاں تمہارے پاس ہیں۔ پچھلے باغ کی سمت سے بھاگ جاؤ‘ میرے گھر چلی جانا۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو۔ وہ ایسا کیوں کریں گے۔ میرا قصور کیا ہے؟“ وہ حواس باختہ ہو گئی۔

”تمہارا قصور یوسف ہے.... دونوں باپ‘ بیٹا پاگل ہو چکے ہیں۔“

برجیس جلدی سے اس کے کمرے میں کود گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا لیلیٰ کے کمرے کی طرف لایا۔ آہستگی سے دروازہ کھول کر اس نے اسے لیلیٰ کے قریب سو جانے کے لیے کہا۔ خود وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔ اسے دو افراد کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ پھر اسے اپنے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

”وہ اندر نہیں آئی۔“ یہ عکرمہ تھا۔

”وہ لیلیٰ کے کمرے میں ہو گی۔“ یہ مجیب درانی تھے۔ قدموں کی چاپ لیلیٰ کے کمرے کی طرف آئی۔ دروازہ کھلا اور عکرمہ نے اندر جھانک کر دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔

”وہ اندر ہے.... ایسا نہ ہو لیلیٰ بھی جاگ جائے۔ کل تک موخر کر دیں؟“

”اور جو التموش باہر کھڑا ہے۔ اس نے سارا انتظام کر لیا ہے‘ اسے آج ہی شہر چھوڑنا ہے۔“

”آپ جائیں‘ میں اسے بہانے سے اٹھا کر آتا ہوں۔“ کمرے کا دروازہ کھلا اور عکرمہ کے قدموں کی آہٹ پر وہ اتنا سہم گئی کہ دل چاہا چیخ مار دے۔

”کچھ خاص مہمان آئے ہیں‘ ان کے لیے کھانے کا انتظام کرنا ہے۔ شور کیے بغیر باہر آجاؤ‘ لیلیٰ کی نیند خراب نہ ہو۔“

ہولے سے شفین کا شانہ ہلا کر‘ چراغ کی مدھم روشنی میں‘ عکرمہ نے اس پر جھک کر کان کے پاس آکر سرگوشی کی۔ شفین نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسے دیکھنے لگی۔ برجیس کی بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ رہی۔

ایسا اکثر ہو جاتا تھا کہ انہیں رات کو اچانک آنے والے مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام کرنا پڑتا تھا‘ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ عکرمہ اس کی یا لیلیٰ کی خواب گاہ میں رات گئے آئے اور اسے یوں شانہ ہلا کر جگا دے۔ یہ کام صرف خادمائیں کرتی تھیں۔

وہ اتنی دکھی ہو گئی کہ سارا خوف ڈھل گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے عکرمہ کو اپنی آنکھوں کا افسوس چھپا کر دیکھا۔ یہ وہی انسان تھا جس کے ساتھ وہ اور لیلیٰ بچپن میں کھیلا کرتی تھیں۔ جو انہیں اونٹ کی سواری کروایا کرتا تھا۔ انہیں سیر کے لیے دریا اور باغ میں لے کر جاتا تھا۔ لیکن جب وہ بڑا ہو گیا تو ہو بہو اپنے بابا مجیب درانی جیسا ہو گیا۔

شفین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے سوچا کہ اسے التموش کے ہاتھوں بک جانا چاہیے۔ اس کے آقا اس کی بولی لگا چکے ہیں۔ اسے سر جھکا کر ان کے احسانوں کی قیمت چکا دینی چاہیے۔

”میں آ رہی ہوں۔“ لیلیٰ جاگ نہ جائے اسی ڈر سے اس نے آہستگی سے کہا۔

عکرمہ کمرے سے باہر چلا گیا تو اس نے جھک کر لیلیٰ کے گال پر بوسہ دیا۔ اس کا دل چاہا وہ لیلیٰ کو اٹھا دے اور اس کے گلے سے لگ کر روئے کہ دیکھو' تم میری بہن بنی رہی ہو' لیکن تمہارا بھائی میرا بھائی نہیں بنا۔ تمہارا باپ میرا آقا بنا رہا۔ وہ رات کے اندھیرے میں' بدنام زمانہ دلال التموش کو لے آئے ہیں' وہ مجھے بیچ چکے ہیں۔ انہوں نے میری وفاداری' میری خدمت کی قیمت "التموش" لگائی ہے۔ انہوں نے ایک بار بھی مجھ سے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ حقیقت کیا ہے۔ میں تمہارے لیے یوسف کی محبت ٹھکرا چکی ہوں' لیکن میری وفاداری کے عوض وہ اپنا طیش نہیں دبا سکے۔

اس نے چاہا کہ وہ چلائے کہ سب جاگ جائیں۔ وہ ماں عزیزہ کی گود میں پناہ لے لے۔ لیکن اس نے جان لیا کہ اگر آج وہ بچ بھی گئی تو کل کی رات آج سے بدتر ہوگی۔ آج وہ گھر سے نہ اٹھائی گئی تو کل سربازار اٹھالی جائے گی۔ مجیب درابی اور عکرمہ کے سامنے اب کوئی ترکیب کارگر نہیں رہے گی۔ وہ جان چکی تھی کہ اب ماں عزیزہ اپنی جان کا' لیلیٰ اپنی محبت کا واسطہ دے کر بھی اسے نہیں بچا سکیں گی۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ عکرمہ باہر ہی کھڑا تھا۔

"کسی اور خادمہ کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے' آؤ میرے ساتھ۔"

وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگی۔ باورچی خانے کی طرف لے جانے کی بجائے عکرمہ اسے مہمان خانے کی طرف لے جانے لگا' جہاں التموش اس کا انتظار کر رہا تھا۔ گھر پر سناٹے کا راج تھا۔ رات کے روشن چراغ اور مشعلیں اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ابھی اس نے باغ کی دیوار کے چھوٹے دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ برجیس یک دم سامنے آیا۔

"اس طرف گودام میں کھٹکا ہوا ہے۔ یقیناً" چور گودام سے اناج چرا رہے ہیں۔" اس نے سخت گھبرائے ہوئے انداز میں عکرمہ سے کہا۔

عکرمہ جھلا گیا۔ "تم اس وقت گودام کا پہرہ دے رہے تھے؟"

"شور سے میں اٹھ بیٹھا۔ بشفین! تمہارے پاس گودام کے تالے کی چابی ہے۔ ذرا بھاگ کر لا دو' ایسا نہ ہو چور سارا گودام خالی کر دیں۔ آقا درابی میری کھال کھینچ دیں گے۔"

عکرمہ اور بری طرح سے جھلا گیا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے.... میں دیکھ لوں گا گودام۔"

لیکن وہ چابی لینے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بھاگ چکی تھی۔ کمرے سے جلدی سے چابیوں کا پورا گچھا لے کر وہ کھڑکی سے باغ کی طرف کود گئی۔ بھاگتے ہوئے اس نے باغ پار کیا اور بیرونی دیوار کے چھوٹے دروازے کا تالا کھول کر باہر نکل گئی۔ دروازہ اس نے اپنے پیچھے بند کر دیا اور اسے باہر سے تالا لگا دیا۔

باغ میں کودتے ہوئے اس نے سناٹے میں عکرمہ کی [illegible] تھی۔

"لے [illegible] آؤ گودام کی چابی.... دفعہ ہو جاؤ' اب تم تو...." باہر نکل کر اس نے اپنے پورے چہرے کو چادر سے ڈھانپ لیا۔ وہ چھوٹی گلیوں میں گھس گئی اور اتنی تیزی سے بھاگنے لگی کہ گلیوں میں جھولتیں لالٹینیں' دیواروں میں نصب مشعلیں' کھڑکیوں سے جھانکتی چراغوں کی لو.... سرسرا گئیں۔ اسے شدت سے اندھیرا مطلوب تھا۔

اپنے پیچھے اسے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ وہ جتنی بھی تیزی سے بھاگی تھی' انہیں اپنے عقب میں آنے سے روک نہیں سکی تھی۔ سارا شہر آئینہ ہو گیا.... اندھیرا سورج ہو گیا.... ہر دیوار' ہر سائے پر اس کا عکس بن گیا۔

"ادھر دیکھو.... ادھر دیکھو.... ہاں.... تم اس طرف جاؤ.... تم یہاں اس طرف...."

وہ چھ تھے یا شاید چھ سو.... سارے شہر پر دشمن فوج نے چڑھائی کر دی.... ہر گلی' ہر نکڑ گھوڑوں کے سموں تلے لرزنے لگی۔

وہ سارے شہر میں بھاگتی' چھپتی پھر رہی تھی۔ چادر

کے پلو میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔ اپنی سسکیوں نے اپنے خوف کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اپنی حیثیت "کنیز" پر ماتم کناں تھی۔ کھلے آسمان کے نیچے، شہر کی گلیوں میں اپنی عزت بچانے کے لیے بھاگتے، اسے پہلی بار اپنی قسمت پر رونا آیا۔

ایک بار ایک گھڑ سوار اس کے بس قریب سے ہی گزر گیا۔ وہ ایک دیوار کے سائے کے ساتھ سایہ ہوگئی۔ اس کی سانسیں کوئی تلوار سے قلم کر رہا تھا۔ اس کی ہمت اس کی پوروں میں دم توڑ رہی تھی کہ اسے خود کو التموش کے حوالے کر دینا چاہیے۔ پھر وہ ایک نان بائی کے تندور کی اوٹ میں چھپ گئی اور گھڑ سوار اس کے قریب سے گزر گیا۔ وہ رات اس کا جال تھی، وہ جانتی تھی کہ وہ جال میں پھنس کر ہی رہے گی۔ برجیس کا گھر زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا، لیکن ایک قدم کا فاصلہ بھی اس کے لیے بہت تھا... اسے مر جانا چاہیے... ورنہ بک جانا چاہیے۔

☼ ☼ ☼

اونٹ پر بیٹھے اس نے قونیہ شہر کو الوداع کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے دنیا کی ہر چیز کو ہیچ پایا۔ اپنی حیثیت و مقام کو، کسی مردار کی طرح غلیظ پایا۔ جس وقت اس نے برجیس کے گھر کے دروازے پر دستک دی اس وقت اس کا سانس بس آخری دموں پر ہی تھا۔ جیسے ہی دروازہ کھلا، اندر قدم رکھتے ہی وہ بے ہوش ہوگئی۔ برجیس کی بیوی اسے مسلسل ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو خوف سے چیخ مار دی۔ برجیس کی بیوی نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اس کے منہ پر رکھ کر اس کی چیخ کو دبانے کی کوشش کی۔

"جلدی کرو شفین۔ میرے چچا تمہارے انتظار میں ہیں۔ تمہیں اناج کے ساتھ چھپ کر قافلے تک جانا ہے۔ تمہاری قسمت اچھی ہے۔ آج صبح ہی قافلے کی روانگی ہے۔" وہ بے یقینی سے برجیس کی بیوی کو دیکھتی رہی۔ اسے لگا کہ وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ ابھی وہ لیلیٰ کے کمرے میں تھی اور اب اس سے کہا جا رہا ہے تم قافلے کے ساتھ جا رہی ہو۔

"دوبارہ اس شہر میں نہ آنا۔"

اسے کہا جا رہا ہے تم یہ شہر چھوڑ دو۔

وہ یہ شہر چھوڑ رہی ہے... باغ اور اس کے پھول، لیلیٰ اور اس میں اپنی جان...

"التموش تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈتا رہے گا... تم چچا کے گھر سے باہر نہ نکلنا۔"

اس کی آزادی سلب ہو چکی ہے۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر جا رہی ہے۔ پردے میں اونٹ پر بیٹھے وہ شدت غم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اتنا کچھ بدل گیا۔ نیلا آسمان سیاہ ہوگیا۔ زمین دلدل ہو چکی۔ ایک اجنبی کے آنے سے... ایک مہمان کے آنے سے... سسکیوں کے ساتھ، آہوں کے درمیان اس نے یوسف شعراوی کو بددعا دی۔

"تم نے مجھے شہر بدر کیا ہے میری بددعا ہے کہ تم دنیا بدر ہو جاؤ۔ تم پر پہاڑوں سی سختی آپڑے۔ تم ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ کہ نکلنے کا چارہ نہ ہو پائے۔"

اسی صبح یوسف دنیا بدر ہوگیا۔ اپنی مصیبت سے نکلنے کا اس کے پاس کوئی چارہ نہ رہا۔ زندگی پہاڑوں سی سخت ہوگئی۔ اس کی عزیز ماں اس کے فراق میں رونے لگی اور اس نے قید خانے کی دیوار کے ساتھ سر ٹکا کر سب سے پہلے اس کے لیے دعا کی۔ "میری محبت تمہارے لیے بھی مصیبت لائی ہوگی۔ اس مصیبت کے نازل ہونے سے پہلے اس سے نکلنے کا سامان ہو جائے۔"

☼ ☼ ☼

اس نے زندگی میں کبھی کسی سے نفرت نہیں کی تھی، لیکن اب وہ ایک انسان سے نفرت کرنے لگی تھی۔ یوسف شعراوی سے۔ وہ بہت فرصت سے اسے بددعا دیتی تھی۔ وہ اس لمحے کو کوستی تھی جس لمحے وہ باغ کے پھولوں کو پانی دینے گئی تھی۔ وہ پھول اسے لے ڈوبے۔ وہ مسافر اسے لے ڈوبا۔

"جو پھول گھر کے باغ میں میسر ہیں' تمہیں ان کی اتنی فکر نہیں' جتنی اس باغ کے پھولوں کی ہے۔" لیلیٰ اکثر اسے تنگ کرتی۔

"میں نے ایسے پھول کہیں نہیں دیکھے۔ شاید کسی مسافر کے ہاتھ سے لگے ہیں۔"

پھولوں کی آبیاری مسافر کے ہاتھوں سے ہوئی تھی یا نہیں' لیکن اس کی بربادی مسافر کے ہاتھوں ہی ہوئی تھی۔ وہ ہر رات رو کر سوتی' ہر صبح لیلیٰ کا خیال لیے جاگتی۔ ماں الزہرہ کی وفات کے بعد ماں عزیزہ نے اسے اپنے سینے سے لگا کر رکھا تھا۔ لیلیٰ نے اپنے ننھے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔ ایک اجنبی آیا اور سب برباد کر گیا۔

برجیس کی بیوی کے چچا' بابا شوفی ایک ضعیف' لیکن باہمت انسان تھے۔ ان کی سرپرستی میں ان کے مرحوم بیٹے کی بیوہ اور دو بیٹے تھے۔ وہ اپنی بیوی اور بیوہ بہو کے ساتھ مل کر قونیہ سے جنوب کی سمت نواحی علاقے میں ایک سرائے چلاتے تھے۔ شروع شروع میں وہ سب التموش سے اتنے خوف زدہ رہے کہ اسے گھر میں چھپا کر رکھتے۔ وہ کتنے ہی مہینوں تک کمرے میں چراغ گل کیے خاموشی سے وقت گزارتی رہی۔ کوئی اسے نام سے مخاطب نہیں کرتا تھا۔ وہ پانچوں بڑی تن دہی سے اس کی حفاظت کر رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ ان کی بہو جمیلہ کی بھتیجی گاؤں سے ان کے ساتھ رہنے کے لیے آئی ہے۔

اس نے سرائے میں کھانا پکانے کی ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی تھی۔ بابا شوفی اسے منع کرتے رہے' لیکن وہ ایسے چھپ کر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے ان سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی باورچی خانے سے باہر نہیں آئے گی۔ اپنی آواز ظاہر نہیں کرے گی۔ ڈرتے ڈرتے انہوں نے اسے اجازت دے دی تھی۔

وقت نے دنوں' ہفتوں' مہینوں کے ساتھ سفر کرتے ان کا خوف زائل کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ پرسکون ہو گئی تھی یا کم سے کم کام کرتے وقت وہ پرسکون رہا کرتی تھی۔ ماں عزیزہ کے گھر کی طرح اس نے اناج کے ایک ایک دانے کا حساب رکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سرائے کے باورچی خانے میں صبح سے شام تک چولہوں میں آگ دہکاتی' کھانے بناتی' تندور پر نان لگاتی۔ اس نے ایک بڑے گھر کا انتظام سنبھالا ہوا تھا' سرائے کا نظم و نسق سنبھالنے میں اسے وقت نہیں لگا تھا۔

آہستہ آہستہ سرائے میں تبدیلیاں ہونے لگیں اور وہ دوسری سراؤں سے بہتر لگنے لگی۔ سرائے کے کھانوں کا ذائقہ پسند کیا جانے لگا۔ کمروں کے بستر' شمع دان' چراغ اور ٹھنڈے موسم میں گرم پانی کا انتظام خاص رہا۔

دو سال گزرے تو سرائے کا کام اتنا بڑھ گیا کہ انہوں نے چار خدمت گار رکھ لیے۔ ایک اس کے ساتھ باورچی خانے میں ہوتا۔ ایک اصطبل میں.... دو دوسرے معاملات دیکھتے۔ اپنے چہرے پر وہ پیشانی سے چادر کھینچ کر رکھتی تھی۔ گونگوں کی طرح کام کرتی تھی۔ عرصہ ہوا اس نے سورج کی کرنوں کو اپنے چہرے پر پڑنے نہیں دیا تھا۔ عرصہ ہوا وہ رات کو لیلیٰ کے پہلو میں سوتی تھی اور صبح روتے ہوئے اٹھتی تھی۔ سرائے کا کھانا جس کا ذائقہ مہمانوں میں مشہور تھا' اس سے اس کھانے کے دو نوالے نگلنا دوبھر ہو جاتا۔ اس کے حسن کی تاب برقرار نہ رہی۔ وہ راتوں میں رو کر' دنوں میں آنسو پی کر گزارتی رہی۔

☼ ☼ ☼

بہار ہر شے پر غالب تھی۔ سوائے لیلیٰ حمری کی آنکھوں کی خزاں کے۔ جو اسی وقت صحرا ہو گئی تھیں' جب اس کی پیاری سہیلی' اس کی عزیز از جان بہن اس لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی تھی جس سے اس کی اپنی شادی ہونے والی تھی۔ وہ شفیق کے دل کا بھید نہیں پا سکی تھی۔ اس غم نے اسے کبھی آسودہ نہ ہونے دیا۔

گھر میں شور برپا تھا۔ گھر کا قیمتی سامان' ماں عزیزہ کے صندوق میں رکھے سونے کے سکے اور زیورات غائب

تھے۔ ماں گم صم، سرخ آنکھیں لیے ساکت بیٹھی تھی۔ اس نے اس ساری صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی، لیکن سمجھ نہ سکی۔ وہ عکرمہ کی شکل دیکھ رہی تھی جو غصے سے بول رہا تھا۔

"آدھی رات کو میں نے خود اسے یوسف کے ساتھ بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ ساری رات پاگلوں کی طرح انہیں ڈھونڈتا رہا ہوں۔ آپ سے کہا تھا آنکھیں کھول کر رکھا کریں۔ اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں ڈالتی تھیں آپ۔"

"بھاگنا تھا، بھاگ گئی۔ جو لینا تھا لے گئی۔ جو بھی تھا، ہمارے گھر کی عزت تھی۔ اب سب خاموش رہو۔" بابا نے کہا۔

"آپ نے کیوں ان خادموں کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے۔" عکرمہ طیش سے بل کھا رہا تھا۔

"خاموش رہو.... سنا نہیں تم نے کہ اس بات کا اب کوئی ذکر نہیں ہوگا۔" بابا نے تیز آواز سے کہا۔ لیلیٰ نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خون آشام ہو گئیں۔ کیسی منحوس صبح تھی وہ۔

"یشفین نے ایسا کیوں کیا ماں؟" عزیزہ نے بڑھ کر لیلیٰ کو اپنی بانہوں میں چھپا لیا اور لیلیٰ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"وہ جہاں رہے خوش رہے۔" انہوں نے بڑے صبر سے کہا۔

"اب میں کیسے خوش رہوں گی اس کے بغیر.... وہ میرا سب کچھ لے گئی۔" اسے روتے ہوئے زمانے بیت گئے تو اس نے یشفین کے کمرے میں جا کر ایک ایک چیز کو غصے سے پھینک دیا۔ اس نے پورے کمرے کو تہ و بالا کر دیا پھر وہ دروازہ بند کر کے رونے لگی۔ کمرے کو اسی حالت میں چھوڑ کر اسے باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ چابی لیلیٰ نے دریا میں پھنکوا دی۔

اس کے بعد وہ مہینوں بیمار رہی۔ شہر کا ایسا کوئی حکیم نہیں بچا تھا جس سے اس کا علاج نہیں کرایا گیا تھا۔ دو چار دن وہ ٹھیک رہتی، پھر مہینوں کے لیے بیمار ہو جاتی۔

اس کی صحت یابی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن جو غم اس کے دل کو لگ گیا تھا اس کی دوا کسی حکیم کے پاس نہیں تھی۔ ماں نے بھی خاموشی اوڑھ لی تھی۔ عبادت میں مصروف رہتی تھیں۔ گھر ویران ہو گیا تھا۔ شہر اُجڑ گیا، باغ خزاں ہو گیا، دریا کا پانی بے سمت بہنے لگا۔ قونیہ کے آئینہ سازوں نے وہ آئینہ بنانا چھوڑ دیا جس میں لیلیٰ ذرا بی اپنا حسن دیکھ کر مسکرا دیا کرے۔

جیسے ہی وہ بیماری سے کچھ سنبھلی، بابا نے اس کی شادی عماد حمدی سے طے کر دی۔ جو عمر میں اس سے دس بارہ سال بڑا تھا۔ جس کی سیاہ داڑھی میں سفید بالوں کی جھلک نمایاں ہونے لگی تھی۔

اس نے جب پہلی بار اپنے دولہا کو دیکھا تو اسے یوسف یاد آ گیا۔ اس نے یوسف کے ہی خواب دیکھے تھے۔ لیکن وہ تو اس کی بہن کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو کوئی بددعا نہیں دی تھی، لیکن وہ انہیں یاد کر کے رو دیتی تھی۔ ان کی یاد ناسور تھی۔ راتیں نیند سے خالی، دل قرار سے۔ ہار سنگھار میں اس کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ شادی کے ملبوسات اور زیورات کو اس نے صندوقوں میں ہی پڑے رہنے دیا تھا۔

عماد حمدی اس کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ ان کی نیند خراب نہ ہو، وہ اپنی سسکیاں دبا لیتی۔ لیکن کبھی نیند میں یا خواب میں وہ یشفین کو پکارتے رو دیتی تھی۔

"کیوں رو رہی ہو لیلیٰ؟"

ایک رات اسے نیند سے بیدار کر کے عماد حمدی نے پوچھا۔ اس کے چہرے پر چھائے کرب کو دیکھ کر وہ غمگین ہو گئے۔ لیلیٰ بے بس ہو گئی اور عماد کے سینے سے لگ کر بہت دیر تک روتی رہی۔ لیکن وہ انہیں یہ بتا نہیں سکی کہ یہ تکلیف مجھے چین نہیں لینے دے رہی کہ یشفین نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اگر اسے یوسف اتنا ہی پسند آ گیا تھا تو وہ ماں کو بتا دیتی یا مجھے۔ کیا دنیا میں ایسی کوئی چیز تھی جسے میں یشفین کو دینے سے انکار کر دیتی.... یوسف بھی.... اس نے میرے سامنے یہ اقرار کیوں نہیں کیا کہ شہر میں ملنے والے اجنبی کو وہ

دل دے بیٹھی ہے۔ ★ ★ ★

وہ شہر میں ملنے والے اجنبی کو دل دے بیٹھی تھی، لیکن یہ دل وہ لیلیٰ کی خوشیوں پر نچھاور کرنے کا عہد کر چکی تھی۔

نظیر شعراوی نے اتنی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی کہ وہ اپنے دامادوں کو ہی بتادیں کہ یوسف کی کہیں کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ بلکہ انہوں نے ایک فرضی کہانی تیار کرلی تھی، تاکہ یوسف کی ماں ان کا سر نہ کھائے اور ان کی بچی کھچی دولت کو یوسف کو تلاش کرنے والوں میں تقسیم نہ کردے۔

"وہ اپنی بیوی کو لے کر مجھ سے ملنے کیوں نہیں آیا؟" نظیر شعراوی کی سنائی کہانی سنتے ہی انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

"آجائے گا' اتنی جلدی کیا ہے۔" انہوں نے اطمینان سے کہا۔

"پھر بھی کب آئے گا؟ کچھ بتایا تو ہوگا۔ کوئی خط بھی نہیں بھیجا میرے لیے۔"

"تمہیں خط پڑھنا آتا ہے؟"

"میں کسی سے پڑھوالیتی۔"

"خاموش رہ جاہل عورت۔ میرا سر نہ کھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بہت خوش ہے۔"

"میرا یوسف..... وہ خوش ہے تو میرا دل کیوں تڑپ رہا ہے۔" وہ بھی تڑپ رہا تھا۔ یہ خیال اسے بے قرار رکھتا کہ اس کی ماں اس کے فراق میں رو' رو کر دیوانی ہو چکی ہوگی۔ اس نے ایک لڑکی سے محبت کی اور زبان دے کر جان دینے والوں کی طرح' دل دے کر اس نے جان ہی دی..... اور ماں..... ماں کے لیے کیا کیا؟

ایسے ہی وقت اس کی بے چینی سوا ہو جاتی۔ بے بسی عروج پر ہوتی۔ پتھر کی سلوں پر ہتھوڑے کی ضربیں دماغ جھنجنا دیتی۔ اسے یقین ہوتا کہ ماں اس کی غیر حاضری پر صابر ہوگی' مشفق محفوظ ہوگی۔ لیکن اس کے مومن دل کے یقین کو' اس کا کافر وسوسہ سہما دیتا۔

اس نے بارہا کوششیں کی کہ وہ کسی طرح ماں کے پاس پیغام بھجوا سکے' لیکن ناکام رہا۔ کچھ پہرے دار اس سے ہمدردی رکھتے تھے' لیکن پیغام باہر بھجوانے کے لیے وہ کسی صورت تیار نہ تھے۔

"مجیب درابی کی بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ تم درابی کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لو۔ یوں قید خانے میں اپنی جوانی برباد نہ کرو۔ تمہاری بہادری زنجیر پا ہے اور تمہاری وجاہت کو دیمک چاٹ رہی ہے' کم عقلی چھوڑ دو۔"

"اگر معافی ہی مطلوب ہوتی تو درابی کی بیٹی میرے نکاح میں ہوتی۔"

"ضد نہ کرو۔ بلاوجہ کی غیرت موت کو دعوت ہے۔ تمہاری ماں تمہارے انتظار میں تڑپ رہی ہوگی۔ عکرمہ تمہیں کسی صورت باہر نہیں آنے دے گا۔ تمہیں لگتا ہے کہ تمہاری عبادت' تمہاری دعا اور صبر تمہیں یہاں سے آزاد کرادے گا؟"

"جس انسان میں غیرت نہیں اسے قابل احترام زندگی گزارنے کا حق بھی نہیں۔"

"تمہاری یہ ہی باتیں تمہیں لے ڈوبیں جوان۔" اگر یہ ڈوبنا تھا تو اسے سطح پر آنے کی کوئی تمنا نہیں تھی۔ عکرمہ جو گاہے بگاہے اس کی حالت سے محظوظ ہونے کے لیے آیا کرتا تھا' وہ اس کے اس ارادے کو اور پختہ کرتا رہا کہ اسے مر کر بھی درابی کی غلامانہ پیش کش پر غور نہیں کرنا۔

"پہرے دار بتا رہا تھا کہ تم معافی کے طلب گار ہو؟ مجھے پسند آئی یہ بات۔ لیکن اب تمہاری سزا بڑھ چکی ہے۔ تمہیں سارے شہر کے سامنے میرے باپ کے پیروں میں گر کر معافی مانگنی ہوگی۔"

"تمہیں اس غلط فہمی میں کس نے مبتلا کیا کہ ایسا کبھی ہوگا؟" وہ استہزائیہ ہنس دیا۔

"تو تم قید خانے میں خوش ہو۔"

"میں خوش ہوں کہ میں سزا کاٹنے والوں میں سے ہوں' دینے والوں میں سے نہیں۔ میں خوش ہوں کہ میری قید میرا انعام لے کر آئے گی' مجھے قید کرنے والے کے لیے عذاب..... میں خوش ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ جو بے بس ہوتا ہے اس کا چارہ گر خدا ہوتا

ہے۔"
عکرمہ نے قہقہہ لگایا۔ "ابھی تو سزا شروع ہوئی ہے' دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ فقط تین سال چار مہینے۔"

☆ ☆ ☆

بابا شوفی کی سرائے کا کام نفع بخش ہو گیا تھا۔ انہیں فائدہ ہو رہا تھا۔ ان کے کچے بے آرام گھر کی آرائش ہونے لگی تھی۔ مٹی کی زمین پر پتھر کی سلیں بچھ گئی تھیں۔ کھڑکیوں دروازوں کو چوکھٹوں سمیت بدل دیا گیا تھا۔ کمرے روشن اور آرام دہ ہو گئے تھے۔ ان کا گھر سرائے سے کچھ فاصلے پر ہٹ کر تھا۔ گھر کے معاملات سرائے سے الگ تھے۔ بابا شوفی کو یہ پسند نہیں تھا کہ گھر کو بھی سرائے بنا کر رکھا جائے۔ رات کو وہ انہیں حقہ دہکا کر دیتی' ماں کا بستر بناتی' دونوں بچوں علی اور عمر کو ان کا سبق دہرانے میں مدد دیتی اور کبھی جمیلہ کے ساتھ کچھ کڑھائی سلائی کرتی۔ جب کبھی جمیلہ دونوں بچوں کو کہانی سنا رہی ہوتی تو وہ چپ چاپ کونے میں اپنے بستر پر بیٹھی سنتی رہتی' لیکن جہاں کہانی میں کوئی شہزادہ آتا وہ نفرت سے منہ موڑ لیتی۔ کمرے سے گھر سے باہر نکل آتی۔ اسے وہ رات یاد آجاتی جب وہ التموش کے شکنجے سے نکلنے کے لیے بھاگتی پھر رہی تھی۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی کہ شہر کی گلیوں میں اس رات کیسا خوف تھا۔

زندگی تہ در تہ چٹانیں کھسکا رہی تھی.... کھائیاں دکھا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ چراغ بجھا کر اندھیرے کو چھت تک گھورتی رہتی اور کبھی چپکے سے گھر سے باہر نکل میدان میں کھڑی ہو جاتی۔ ہوا اس کے منتشر لمبے بالوں کو اڑانے لگتی اور وہ اپنے چہرے کو رات میں عیاں کیے دور سے گزرتے قافلوں کو دیکھتی۔

رات کو قافلے قیام کرتے ہیں' سفر نہیں۔ لیکن اسے ہمیشہ یہ ہی لگتا کہ کوئی آرہا ہے... دور سے... بہت دور سے... کوئی تو اس تک آہی رہا ہے... لیلیٰ... ورنہ ماں عزیزہ... وہ اسے یہاں ویرانے میں اکیلا کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ رات کی تیز ہوا سے اس کی چادر پھڑپھڑا رہی ہوتی۔ اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں اور بالآخر وہ رونے لگتی۔

جس رات وہ وہاں سے بھاگی تھی' اس رات کے دن برجیس کو عکرمہ کے ارادے کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے مجیب درانی اور عکرمہ کو مہمان خانے میں باتیں کرتے سن لیا تھا۔ وہ یشفین کو بتانا چاہتا تھا لیکن وہ اور لیلیٰ گھر پر موجود نہیں تھیں۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ یشفین کو ڈھونڈ کر مطلع کرتا۔ اپنی بیوی اور چچا کو ساری صورت حال سمجھا کر وہ اس انتظار میں تھا کہ سب خادم سو جائیں اور وہ رات کو یشفین کو ساری صورت حال اچھی طرح سے سمجھا دے' تاکہ وہ بابا شوفی کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائے' جو شہر میں اشیا کی خرید و فروخت کی غرض سے موجود تھے۔ اسے گمان تک نہیں تھا کہ التموش اسی رات آجائے گا۔

بابا شوفی سے اسے یہ سب معلوم ہو چکا تھا۔ پھر وہ برجیس کا انتظار کرنے لگی کہ شاید وہ آئے اور اسے کچھ گھر کے حالات کے بارے میں بتائے کہ اس کے دل کو تسلی ہو جائے۔ لیکن ان سالوں میں برجیس بھی نہیں آیا۔ اس نے ایک پیغام بھجوا دیا تھا کہ یشفین کی شادی کر دی جائے۔ لیکن اب اسے شادی سے کیا سروکار۔ لیلیٰ جیسی معصوم دل لڑکی کا دل اس کی وجہ سے دکھا۔ وہ شادی کر کے اپنا دل کیسے آباد کرلے۔ دل...؟؟

اندھیرے کے بادلوں میں گھوڑے پر سوار ایک مسافر اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا۔ وہ دور سے آہستہ آہستہ اس کی طرف آرہا ہوتا... اس کا نام لے رہا ہوتا اور وہ فوراً" اپنا رخ پھیر لیتی... سسکتی ہوئی بھاگ کر اپنے بستر پر گر جاتی اور انتظار کرتی کہ جلدی سے صبح ہو اور وہ دہکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں خود کو مصروف کر دے۔

"زندگی تہ در تہ معمہ تھی۔ فراق سہنا سکھا رہی تھی۔"

قید خانے کی مقررہ مشقت سے اگر کچھ وقت میسر آجاتا تو وہ ان پڑھ قیدیوں کو پڑھنے کی طرف راغب کرنے پر صرف کرتا۔ گو کسی بھی قیدی کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی نہیں تھی، لیکن اس نے اصرار سے کچھ کو راضی کرلیا تھا۔ پتھر کے چاک سے اس نے انہیں کم سے کم ہندسے پڑھنے لکھنے سکھا دیے تھے۔

ایک دن قید خانے میں سات رکنی جماعت پڑتال کے لیے آئی۔ سات کیا بارہ' بیس رکنی جماعت بھی آجاتی تو بھی انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا' کیونکہ وہ لگے بندھے طریقے سے آتے' پڑتال کرتے اور چلے جاتے۔ کھانے کو کیا مل رہا ہے۔ سونے کے بستر کیسے ہیں۔ پہرے داروں کا رویہ کیسا ہے۔ مشقت کا دورانیہ کتنا ہے۔ ان سب کی صحت اور بیماری کی صورت میں علاج اور دوا کی کیا صورت حال ہے۔

کسی قیدی کو بھی ان سب سوالوں کا جواب دینے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور ہوتی بھی کیوں؟ جب ان کا کام تھا آنا' پڑتال کرنا اور چلے جانا تو وہ کچھ بتا کر پہرے داروں کے تشدد کا عذاب کیوں بھگتتے۔ جماعت جب انصاف پسند' نظم و نسق پر عمل درآمد کرنے پر قادر نہیں تھی تو وہ کیوں پہرے داروں کو ناراض کرتے۔

اس بار جماعت کے ساتھ کوئی عماد حمدی آیا تھا۔ شاید اسے کوئی نیا نیا عہدہ ملا تھا یا اعزازی طور پر اسے اس جماعت کا رکن بنایا تھا کہ وہ کافی ہوش مندی سے قید خانے کی پڑتال کر رہا تھا۔ ایک ایک سے جا کر سوال کر رہا تھا اور جواب کے لیے اصرار بھی کر رہا تھا۔ سب نے رٹے رٹائے جواب دے دیے۔ کھانا اچھا ہے۔ اس دن اچھا کھانا بنتا۔ بستر آپ دیکھ لیں۔ بستر بھی نئے لا کر رکھ دیے جاتے۔ مشقت کا دورانیہ فجر سے عصر تک۔ اس دن اتنا ہی ہوتا۔ تشدد' صرف غلطی پر معمولی سزا۔ ورنہ ہتھوڑے سے ان کے پیروں کے ناخنوں پر ضربیں لگائی جاتیں۔ پتھروں سے ہاتھ پیر کچل دیے جاتے۔

"پڑھے لکھے لگتے ہو۔" عماد حمدی اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

یوسف خاموش رہا۔

"کچھ لکھتے پڑھتے ہو یہاں؟"

"نہیں!" یک حرفی جواب دیا۔

"کس جرم میں ہو یہاں؟"

"ایک تاجر کی بیٹی سے شادی سے انکار پر۔" ایک دم سے یوسف کے منہ سے نکل گیا۔ ورنہ اس کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے باقی سب کے لیے بھی پہرے داروں کا جلال عذاب بنے۔ ان کے کھانے روک لیے جائیں' بستر کھینچ لیے جائیں اور رات رات بھر ان سے مشقت کرائی جائے۔ پتھروں سے جسم کچلا جائے۔ عماد حمدی نے اسے غور سے دیکھا کہ کیا وہ مذاق کر رہا ہے۔

"کون تاجر...... کیسی شادی؟"

"جھوٹ بول رہا ہے یہ۔ اس نے جناب عبدالفتاح کے گھر سے شاہی دستاویزات چرائی تھیں۔ یہ بہت خطرناک اور چالاک انسان ہے۔ ہر طرح کا طریقہ اس پر آزما لیا ہے لیکن یہ بتانے کے لیے تیار نہیں کہ یہ کس کے لیے کام کرتا ہے۔ فرنگیوں کا جاسوس ہے یہ۔"

مجیب درانی کے وفاداروں میں سے ایک نے عماد حمدی کو اپنی طرف متوجہ کر کے جلدی جلدی اس کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ عماد حمدی نے گردن موڑ کر یوسف کو دیکھا۔ یوسف نے بھی اپنی نظریں عماد حمدی کی نظروں میں پیوست رکھیں۔

☼ ☼ ☼

"لیلیٰ! مجھے خوف ہے کہ میری بات تمہیں دل گرفتہ کر سکتی ہے لیکن میں اب یہ معاملات تمہارے ساتھ زیر بحث لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے مسلسل شکایتیں موصول ہو رہی ہیں۔ تمہارے بابا کے آدمیوں نے گاؤں کی ایک سرائے میں بہت توڑ پھوڑ کی ہے۔ عکرمہ نے ایک غریب نان بائی کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ عکرمہ نے اس کا گھر اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ تمہارے بابا کے ایک غلام کو بھی عکرمہ نے بری

طرح سے زدوکوب کیا ہے' میں نے اس کے زخم دیکھے ہیں۔ ایسے واقعات تو اب معمول بن چکے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ انہوں نے اپنے وفادار پھیلا رکھے ہیں جو مجھے بھی ان کے خلاف کچھ کرنے نہیں دیتے لیکن ایسا آخر کب تک چلے گا۔ اب یہ اطلاعات بھی ملنے لگی ہیں کہ وہ التموش کی سرپرستی کررہے ہیں۔ تمہارے بابا کے تجارتی قافلوں میں لڑکیاں چھپا کر لائی اور لے جائی جاتی ہیں۔ کیا ہماری عزتیں التموش کے ہاتھوں قحبہ خانے کی زینت بنیں گے۔"

"آپ التموش کو پکڑیں' بابا کے دشمن ان کے خلاف باتیں پھیلاتے ہیں۔"

"التموش صرف ایک انسان نہیں ہے' وہ ایک گروہ ہے لیلیٰ!۔ وہ اب تک پکڑا جاتا اگر تمہارے بابا جیسے لوگ اپنی دولت اور اختیارات سے اس کے سرپرست نہ بنے ہوتے۔"

"آپ کے عہدے دار ایماندار نہیں.... آپ ان پر سختی کریں۔ وہ دولت کے لالچ میں کیوں آتے ہیں؟"

"لیلیٰ تم اپنے بابا سے بات کرو۔ میں نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بھڑک گئے۔ وہ مجھے برا بھلا کہنے لگے۔ میرے تمہارے بابا کے ساتھ تعلقات بہت کشیدہ ہو چکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ تم سے کچھ کہتے میں نے تمہیں سب بتا دینا مناسب سمجھا۔"

"مجھے تکلیف دے کر آپ کو خوشی ہو رہی ہے۔ بابا کے بارے میں ایسے بات کریں گے اب آپ؟"

"لیلیٰ! کیا تمہاری ساری زندگی کمخواب اور ریشم کے لبادوں میں سجنے سنورنے میں گزری ہے؟ تم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تمہارے بابا کے پاس اتنی دولت کیسے آئی؟ وہ کس کسی چیز کی تجارت کرتے ہیں۔ تم نے کبھی ان کی شخصیت کی حقیقت کو جاننے کی کوشش نہیں کی؟" لیلیٰ عماد حمدی کا منہ دیکھنے لگی۔

"کیا ہے میرے بابا کی حقیقت؟"

"تمہارے بابا ایک اچھے انسان نہیں ہیں۔ اپنے فائدے کے لیے وہ کسی کا بھی نقصان کر سکتے ہیں۔"

عماد حمدی نے پوری کوشش کی کہ وہ ایسے الفاظ استعمال کرے۔ جو لیلیٰ کو بہت زیادہ تکلیف نہ دیں۔ ورنہ لیلیٰ کی آنکھ کا آنسو عماد کے دل پر گرتا تھا۔

وہ اگلے ہی دن گھر آئی اور ماں سے ملی۔

"بابا التموش کی سرپرستی کررہے ہیں' کیا آپ جانتی ہیں.....؟"

ماں نے حیرت سے لیلیٰ کو دیکھا۔ "کیا تم بالکل ہی پاگل ہو گئی ہو لیلیٰ۔ کیسی باتیں کرتی ہو؟"

"کس نے کہا ہے تم سے یہ.....؟" عکرمہ کو اندازہ تھا کہ یہ سب اسے کون بتا سکتا ہے۔

"سارا شہر کہہ رہا ہے....." لیلیٰ نے جلدی سے بات بنائی۔

"سارا شہر یا تمہارا شوہر۔ عماد حمدی سے کہو کہ اگر وہ بابا کے رتبے اور دولت سے خائف ہے تو ایسے اوچھے ہتھکنڈوں سے وہ یہ سب حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ ان کی غلطی تھی جو انہوں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ عماد حمدی کو دے کر' اسے اپنے برابر لے آئے۔ عماد حمدی کو جانتا ہی کون تھا شہر میں..... یہ کیا عماد کے پاس.....؟"

لیلیٰ نے حیرت سے عکرمہ کو دیکھا۔ "تم ان کے لیے کیسے بات کررہی ہو؟"

"تم بابا کے بارے میں کیسے سوال کررہی ہو؟ عماد حمدی بابا کے خلاف کیا کچھ کررہا ہے؟ وہ بابا کے تجارتی قافلوں کو سرحدوں پر روک لیتا ہے۔ وہ بابا کا نقصان کررہا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ اختیارات ہیں تو وہ ان کا ناجائز استعمال کررہا ہے۔ عماد حمدی کے آدمی اجناس میں اپنا مال چھپا کر بابا پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ غیر قانونی تجارت کررہے ہیں۔"

لیلیٰ بری طرح سے الجھ گئی۔ ماں کو الگ سے پریشان کر دیا۔ گھر آئی تو اس نے عماد سے صاف کہہ دیا۔

"اگر آپ کو ان کی دولت چاہیے تو مجھ سے کہیں میں لا کر دوں گی لیکن ان کے خلاف ایسی باتیں پھیلانا بند کر دیں۔ آپ داماد ہیں ان کے' انہیں عزت نہیں دے سکتے تو انہیں بدنام بھی نہ کریں۔ اگر التموش پکڑا نہیں جا رہا تو اپنے عہدے داروں کو برخاست

کردیں۔ بابا پراس کی سرپرستی کا الزام لگا کر اپنی جان نہ چھڑائیں۔"

عماد حمدی نے سرد نظروں سے لیلیٰ کو ——— دیکھا کہ ان کی بیوی کس قدر بے وقوف ہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں ایسے بے وقوف کو اس کی جنت میں ہی رہنے دینا چاہیے جب تک وہ خود اپنی جنت کا دروازہ کھول کر باہر جھانکنا ضروری نہ سمجھے۔

☼ ☼ ☼

وقت بیت کر ماضی ہو جاتا ہے' درد ٹھہر کر ویسا ہی تازہ رہتا ہے۔

بابا شوفی نے ایک دن اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اسے بڑے پیار سے سمجھانا شروع کیا۔ انہوں نے صاف تو کچھ نہیں کہا لیکن ان کا مطلب یہی تھا کہ اسے شادی کر لینی چاہیے۔ ماں اور جمیلہ کو وہ کتنی ہی بار انکار کر چکی تھی۔ بابا نے سوچا کہ شاید وہ اسے سمجھا سکیں۔

"جانتی ہو میں نے برجیس کو خط لکھ کر ساری صورت حال بتادی تھی۔ اس کا جواب بھی تم نے پڑھ لیا ہے۔ اس نے مشکل سے عکرمہ کا شک خود پر سے زائل کیا تھا کہ اس کا تم سے اور تمہارے بھاگنے سے کوئی تعلق نہیں۔ تم جانتی ہو ان لوگوں کو۔ اگر انہیں شک ہو گیا تو برجیس کا اور ہمارا خاندان خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس صورت حال میں تمہاری شادی کے لیے تمہاری ماں سے کیسے اجازت لی جا سکتی ہے۔ اگر کسی کو خبر ہو گئی تو..... ہم بوڑھے ہیں۔ تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔ تم کسی ایسے انسان کے زیر سایہ چلی جاؤ جو وقت پڑنے پر تمہاری جان و مال کی حفاظت کر سکے۔ ضد نہ کرو۔ عورت کی جان اس کی عزت میں مقید ہوتی ہے۔ التموش کا خوف میرے سر پر ابھی بھی منڈلاتا رہتا ہے۔ تم کب تک سرائے کے باورچی خانے میں خود کو چھپا کر رکھو گی۔ سرائے کی وہ جگہ تمہارا مقدر نہیں میری بیٹی! ضد نہ کرو۔"

یشفین نے لب سی لیے..... وہ یہ نہیں کہہ سکی کہ اسے شادی نہیں کرنی۔ زمین کے طول و عرض پر موجود اسے کسی انسان سے دلچسپی نہیں رہی۔ وہ سرائے کی آگ کے شعلوں میں اپنی زندگی گزار دے گی۔ تندور میں اپنا ہاتھ جھونکتے' وہ شادی کی لکیر کو ہی مٹا دے گی۔

کیا زندگی عرب کا صحرا ہے.....؟ ہاں..... لیکن زندگی اسی عرب کا نخلستان بھی ہے.....

سپاہیوں' پہرے داروں' قیدیوں کی ایک چھوٹی سی فوج تھی جو سرائے میں داخل ہوئی تھی۔ انہیں وہاں ایک رات قیام کرنا تھا۔

"جو جن صحرا کے طوفان سے نکلتے ہیں وہ ایسے خوف ناک ہوتے ہوں گے جیسے یہ قیدی ہیں۔" عمر اس کے پاس باورچی خانے میں آیا اور پوچھنے لگا۔

"شاید ایسا ہی ہو عمر....."

"اتنے ہی بدبودار اور گندے؟" بڑے پتیلے کے نیچے جھک کر عمر نے آگ کو برابر کرنا چاہا۔

"وہ قیدی ہیں..... قیدی ایسے ہی ہوتے ہیں۔" اس نے گردن میں ہاتھ ڈال کر عمر کو پکڑ کر کھڑا کیا کہ یہ تکلیف کرنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ آگ کو کہاں کم کرنا ہے کہاں برابر۔

"ان کے ہاتھوں' پیروں' منہ سے خون رس رہا ہے۔ وہ قیدی ہیں تو اس کا مطلب کیا یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایسی سختی روا رکھی جائے۔"

کھانا پکانے کے برتنوں کے قریب کھڑی ماں نے باورچی خانے کی دیوار کے ان سوراخوں میں سے دیکھتے ہوئے کہا جن سے وہ انہیں نظر آ رہے تھے۔ اس نے بھی سرسری نظر سے ان سب کو دیکھا۔ وہ کمزور لاغر تھے۔ گندے' غیر تراشیدہ بالوں' ویسی ہی الجھی داڑھیوں' گرد آلود جسموں کے ساتھ سالوں صحرا میں راستہ بھٹکنے والوں کی طرح۔ ان کی کھالیں ان کی ہڈیوں سے چپک گئی تھیں۔ ان کی آنکھیں' کھوپڑی کے پنجر میں حرکت کرتی' خوف ناک لگ رہی تھیں۔ پہرے دار اور سپاہی ان سے تھوڑا ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے تاکہ وہ ان کے جسموں سے اٹھتی بو کو خود سے دور رکھ سکیں۔

ہاتھ سے ناک کو ڈھانپ کر عمر باہر نکلا اور صراحی سے آب خورے بھر بھر کر انہیں پانی پلانے لگا۔ علی اور دوسرے خادموں نے رکابیاں ان کے سامنے رکھنی شروع کردی تھیں۔ پہرے داروں کو ان کی ہدایت کے مطابق خاص برتنوں میں کھانا دیا گیا تھا اور ان پانچ پانچ قیدیوں کے سامنے ایک ایک رکابی رکھ دی گئی تھی۔ پہرے داروں کا کھانا لگانے کے بعد بابا نے قیدیوں کے لیے رکابیاں بھرنی شروع کردی۔ اب وہ تندور پر روٹی لگا رہی تھی۔ علی اور عمر وہ روٹیاں باہر لے جارہے تھے۔ عمر ہر بار ناک بھوں چڑھاتا ہوا واپس آتا تو وہ ہنس دیتی۔

"فکر نہ کرو' وہ کل صبح چلے جائیں گے۔ ایک رات کی ہی تو بات ہے۔"

"لیکن مجھے خوف ہے وہ دوبارہ پھر لوٹ آئے..... فوج کے لیے راستے بنانے کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا.... برف باری کے ختم ہوتے ہی یہ پھر سے آجائیں گے۔"

"وہ لوٹ آئیں گے تو کسی اور سرائے میں بھی رہ سکتے ہیں۔"

"آپ کے ہاتھ کے کھانے انہیں کسی اور سرائے میں کیسے ملیں گے..... سپاہی یہیں آئیں گے۔"

"میں مزے دار کھانے بنانا چھوڑ دوں گی۔"

"پھر بابا کی سرائے کیسے چلے گی؟" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ تندور کی منڈیر پر بیٹھے بیٹھے اس نے روٹی کو رفیدے پر لگایا اور رفیدے کو ہاتھ میں پکڑے تندور کے منہ کی طرف بڑھایا کہ دیوار پر بنے سوراخوں سے اس نے بجھی ہوئی آنکھوں والے' دور دیس سے آنے والے' گھوڑے کی پیٹھ سے عورت کو مخاطب کرنے والے کو دیکھ لیا۔ رفیدہ تندور کے منہ پر اس کا ہاتھ سینکتا رہا۔ آگ کی تپش کا احساس اس کے پورے جسم میں دوڑ گیا۔ اس کا پورا جسم جل گیا۔ اس کا دل دہکتا ہوا تندور بن گیا۔

"آپ کا ہاتھ۔" عمر نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہی چیخ ماری۔ بشفین نے چونک کر اپنا ہاتھ پیچھے کیا اور ___ پانی کے برتن میں ڈبو دیا۔ ہاتھ اتنا جل گیا تھا کہ اس پر فوراً آبلے ابھر آئے۔ کھال پھٹ گئی۔ ہاتھ سیاہ ہو گیا۔ اس نے اپنی دونوں آنکھیں سوراخوں پر لگادیں۔

اس کے دائیں بازو پر شانے سے ہاتھ تک ایک گندا سا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ جو جمے ہوئے اور رستے ہوئے خون سے خون آلود تھا۔ وہ بائیں ہاتھ سے بمشکل نوالے بنا بنا کر منہ تک لے جارہا تھا۔ بائیں ہاتھ کی دو انگلیاں بھی جمے ہوئے خون آلود کپڑے کی پٹی سے لپٹی تھیں۔ اس کی ایک آنکھ پر زخم بنا ہوا تھا اور وہ ٹھیک سے کھل نہیں رہی تھی۔ ان گنت نئے' پرانے زخم تھے جو اس کے چہرے' ہاتھوں' پیروں' گردن پر نمایاں تھے۔ اسے دیکھتے ہی پہچان لینا مشکل تھا۔ اگر وہ یوسف شعرادی ہی تھا تو وہ یوسف شعرادی جیسا ہرگز نہیں تھا۔

جس شخص کو وہ اہتمام سے بددعائیں دیتی رہی تھی' اسے اس کی ساری بددعائیں لگ گئی تھیں کیا۔ اب اس کے دل کو قرار تھا؟

اس نے سالن کا بڑا برتن اٹھایا اور چلتی ہوئی' جلتی ہوئی' قیدیوں کی ٹولی کے پاس آئی جو چٹائی پر پھسکڑا مارے' ندیدے پن سے روٹی کے بڑے بڑے نوالے توڑ توڑ کر منہ میں ٹھونس رہے تھے۔ نجانے کتنے دنوں کے بھوکے تھے بے چارے۔

اس نے اپنی چادر کے پلو سے اپنا چہرہ چھپالیا اور اپنے جلے ہوئے ہاتھ سے ان کی رکابی میں سالن بھرنے لگی۔ اتنا بھر دیا کہ سب سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔ لیکن صرف ایک انسان سر جھکا کر کھاتا رہا۔ اس نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ دنیا سے بے زار ہو چکا تھا یا اس کا دل ہی بجھ چکا تھا۔ وہ اس کے سر کے قریب جھک گئی۔ اسے غور سے دیکھنے لگی۔

اس کے سر کے ڈھیر بالوں' جسم پر جمے میل' چہرے کے سکڑے ہوئے عضلات' آنکھوں کی بجھی ہوئی لو..... وہ وہ تو نہیں تھا جو کھڑکی کے اس طرف کھڑا کہہ دے..... "میں نے جس کی صراحی کا پانی بہادیا ہے' میں

اس کی محبت میں بہہ جانے کا عہد کر چکا ہوں۔"
جلے ہوئے ہاتھ سے اس نے روٹی کا ایک نوالہ توڑا اور اسے شوربے میں بھگو کر اس کے منہ کے قریب کردیا۔ سارے قیدی بشفین کو دیکھنے لگے۔ وہ اپنا کھانا موخر کر چکے تھے۔

یوسف نے اپنے جھکے ہوئے سر کے قریب آنے والے نوالے کو دیکھا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ چادر میں چھپا ایک چہرہ اور جلا ہوا ایک ہاتھ.... وہ ہاتھ کانپ رہا تھا.... چادر میں چھپی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

یوسف نے ہاتھ بڑھا کر نوالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسے یہ جاننے میں وقت نہیں لگا کہ جو اس کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو اس کے دل سے کبھی اوجھل نہیں رہی۔ خدا نے اس کی حفاظت کی' اس نے خود کو سرخرو پایا.... ایک لمبی قید کاٹنے کے بعد اس نے رہائی پائی۔

اس نے روٹی کا دوسرا نوالہ توڑا اور شوربے میں بھگو کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ یوسف نے سر جھکا لیا' اگر وہ ایسے ہی اس کی طرف نوالے بڑھاتی رہی تو وہ مغرور ہو جائے گا۔ اس نے نوالہ اس کے ہاتھ سے لیا اور آہستہ سے کہا۔
"یہاں سے جاؤ.... مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔"
باورچی خانے کی طرف بھاگ کر بھڑکتی آگ کے شعلوں کے آگے بھاپ اگلتے' برتنوں کے پاس کھڑی ہو کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
اگر وہ کسی آقا کی کنیز نہ ہوتی تو وہ یوسف شعراوی سے محبت کرتی....
اگر اسے کسی لیلیٰ درانی کی خوشی عزیز نہ ہوتی تو وہ اس کے گھوڑے کے پیچھے خیر کی دعا کرتی.... بد دعا نہیں....

☼ ☼ ☼
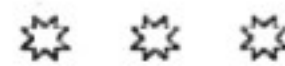
اس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا کیوں نہیں کی تھی کہ اگر مجیب درانی اپنی اس جیسی خادمہ کو التموش کے حوالے کر سکتا ہے تو وہ اس لڑکے کا کیا حال کر سکتا ہے۔ جس نے اس کی بیٹی پر اس کی خادمہ کو ترجیح دی۔ تندور پر روٹی لگاتے اسے معلوم ہوا۔
"یوسف شعراوی قیدی کیسے بنا۔"
جس رات یوسف نے لیلیٰ سے شادی سے انکار کیا تھا' اس سے اگلی رات ہی تو التموش اسے لینے آگیا تھا۔ اس نے ایک بار بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ پھر یوسف کے ساتھ کیا گیا ہوگا؟ اس نے سوچا تو بس اتنا کہ وہ کنیز تھی' سزا کا حق رکھتی تھی۔ آقا درانی کا سارا بس اس پر چلا۔ یوسف نے شادی سے انکار کیا تو وہ یہی سمجھے کہ اس نے یوسف کے ساتھ مل کر یہ سب کیا ہے۔ وہ مجیب درانی کے غصے سے واقف تھی۔ لیلیٰ کی دل آزاری نہ ہو اس لیے اس نے اسے کبھی یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ شہر کے لوگ مجیب درانی اور عکرمہ کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اسے کبھی کبھی لیلیٰ کی لاعلمی اور بے وقوفی پر غصہ بھی آتا تھا لیکن پھر اس کی معصومیت بشفین کو اسے کچھ بھی بتانے سے باز رکھتی تھی۔ وہ اسے لاعلم ہی رکھنا چاہتی تھی کہ مجیب درانی کے بارے میں شہر کے معززین کی بیویاں کیسی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ان سب باتوں کا علم رکھنے پر بھی اس نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ یوسف کامل سلامتی لیے شہر سے رخصت ہو گیا ہوگا۔ وہ اس کی زندگی برباد کر کے' اپنی خوشحال زندگی کی طرف لوٹ چکا ہوگا۔ محبت کا دعوا کرنے والا اب تک سب کچھ بھول چکا ہوگا۔ اس نے یہ کیسے فرض کر لیا؟
رات کو بابا شوفی یوسف سے کچھ باتیں کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔
"جس رات تمہیں التموش کے حوالے کیا جا رہا تھا' اس سے اگلی صبح یوسف کو قید کر لیا گیا تھا۔ اس پر کچھ اہم دستاویزات چرانے کا الزام تھا۔ اس پر کوئی مقدمہ نہیں چلنے دیا گیا نہ ہی وہ قاضی کے سامنے پیش ہوا ہے۔ بظاہر وہ قیدی ہے لیکن اس کی سزا کا تعین ہی نہیں کیا گیا۔ اسے اس وقت تک قید کاٹتے رہنا ہے جب تک مجیب درانی چاہے گا۔"

"مجیب درانی کئی غلاموں کا آقا تو ہو سکتا ہے ساری مخلوق کا خدا نہیں۔" یشفین نے غصے سے سوچا۔

☼ ☼ ☼

اگر اچانک قید خانے کا دروازہ کھل جاتا اور انہیں باعزت رہا کر دیا جاتا تو اسے اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی صرف اس حقیقت کو پا کر ہوئی کہ وہ محفوظ رہی ہے۔ اس پر وقت نے اپنی سختی کا شکنجہ نہیں کسا۔

"وہ ایک سرائے میں موجود ہے اور اپنا ایک ہاتھ جلا بیٹھی ہے۔" اس بات نے اس کے ہر زخم کو مندمل کر دیا ہے۔ اس کے خون رستے زخموں' اس کے مردہ پیروں' لاغر ہاتھوں کی ٹوٹی پھوٹی انگلیوں اور بدحال صحت کو۔ پیال پر سوتے' اس نے سرائے کے روشن دان سے جھانکتے آسمان کو بہت روشن پایا۔ اور دو ہاتھوں کو آسمان تک بلند ہوتے اور اس کی رہائی کے لیے گڑگڑا کر دعا کرتے۔

☼ ☼ ☼

وہ رات اس نے سرائے سے ملحق اس کمرے میں گزار دی تھی جس کے دوسری طرف یوسف سو رہا تھا۔ چھوٹی کھڑکی سے وہ یوسف کو دیکھ رہی تھی۔

"جو آسمانوں میں طے ہو چکا ہے' اسے زمین پر بدلنے کی کوشش کرنا چھوڑ دو۔" اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جلے ہوئے ہاتھ کی تکلیف پورے جسم میں پھیل گئی تھی لیکن دل کی تکلیف اس پر بھاری تھی۔ ایک دیوار ان دونوں کے درمیان حائل تھی لیکن اس نے اپنے دل کی دیوار گرا کر سب فاصلے مٹا دیے تھے۔

جس رات التموش سے اس کا سودا کر دیا گیا تھا' اس رات ہی وہ اپنے آقاؤں کے احسانوں کی ایک ایک پائی چکا آئی تھی۔ مجیب درانی اب اس پر کسی بھی طرح کا کوئی حق نہیں رکھتا تھا تو اس نے اپنے وجود کو اس کی کنیز کی حیثیت کیوں دے رکھی؟ یوسف کا قصور اتنا ہی تھا کہ اس نے اس کنیز کو پسند کر لیا تھا۔ جو اپنی جان دے کر بھی نمک حلال کرنا چاہتی تھی۔ لیلیٰ کی خوشی کے لیے اپنی خوشی قربان کر دینا چاہتی تھی۔ اس سے زیادہ یوسف کا قصور کیا تھا؟ اتنی سی بغاوت پر ہی اسے قید خانے کا قیدی بنا دیا گیا۔

چراغ گل کیے' کھڑکی کے اس طرف بیٹھے' اندھیرے میں راہیں تلاش کرتے یوسف کو دیکھتے یشفین نے اسے اپنی محبت کا عہد۔ دے دیا۔ اس کے لیے دعا کا آغاز کر دیا۔

☼ ☼ ☼

بابا شوفی نے کسی بھی پہرے دار کی پروا نہ کرتے ہوئے قیدیوں کے زخموں پر مرہم لگا دیے تھے۔ کچھ کے زخم ناسور بن چکے تھے۔ یوسف کا دایاں بازو بھی ان ہی میں سے ایک تھا جو ایک بڑے پتھر کے نیچے آکر چلا گیا تھا۔ اور بے جان شے کی طرح اس کے جسم کے ساتھ جھول رہا تھا۔ پتھر کوٹتے' راستے صاف کرتے' موسموں کی سختیاں سہتے' ان کے جسم ہڈیوں کے ڈھانچوں پر کھال کی نمائش ہو گئے تھے۔ اگر اب بھی انہیں واپس نہ لے جایا جاتا تو پھر وہاں ان کی قبریں ہی بنتیں۔

کھانا پکاتی یشفین کا دایاں بازو بھی مفلوج ہو گیا تھا۔ اس بات نے اس کے دل پر بہت قہر ڈھایا کہ وہ ایک ایسے شخص سے نفرت کرتی رہی ہے۔ جو اس سے محبت کی پاداش میں قید کاٹ رہا ہے۔

جب وہ لوگ چلے گئے تو اس نے اپنا اسباب تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اتنے سرد موسم میں سفر پاگل پن تھا۔ بابا شوفی اسے کسی صورت بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

"اب صبر سے کام لو بیٹی..... ایسے معاملات اپنے ہاتھ میں نہ لو..... اللہ ہے اس کے ساتھ۔"

"اللہ ہمیشہ ساتھ رہتا ہے لیکن دوا کے لیے حکیم کے پاس جانا پڑتا ہے..... انصاف کے لیے حاکم کے پاس....."

"مجھے تمہاری جان کا خوف ہے۔ تم کیسے اتنا لمبا سفر کرو گی۔ اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچا تو؟"

"نقصان کے ڈر سے کتنی دیر کسی کا نقصان کرتی رہوں؟"

☼ ☼ ☼

عکرمہ' التموش کا سرپرست بن گیا تھا۔ مجیب درابی نے اسے یہ تجارت سونپ دی تھی۔ دور دراز کے علاقوں میں ان کی سرگرمیاں بڑھتی ہی جارہی تھیں۔ وقت پڑنے پر وہ ڈاکوؤں کے گروہوں سے معاملات طے کرکے انہیں بھی استعمال کرلیتے تھے۔

مجیب درابی نے اپنے گرد انتظامیہ کے شکنجے کو کستے ہوئے دیکھا تو فی الفور اپنی سرگرمیاں محدود کردیں۔ وہ زیادہ تر وقت گھر میں رہتے۔ ورنہ کسی نہ کسی دعوت میں شریک ہوتے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جان لیں کہ وہ فارغ البال' بے ضرر' اپنے چھوٹے سے کاروبار سے کنارہ کش معمولی سے تاجر ہیں' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ حقہ پیتے' شہر کے حالات پر سلطان کے احکامات پر اظہار خیال کرنے والے ایک عام انسان۔ اب ان کے ہاتھوں میں ایک تسبیح بھی رہنے لگی تھی۔ دل پر پتھر رکھ کر انہوں نے کچھ مال اسباب خیرات بھی کیا تھا۔

داماد عماد حمدی اور سسر مجیب درابی کے تعلقات کی سرد مہری اب کوئی نئی بات نہیں رہی تھی۔ نئی بات یہ تھی کہ عماد حمدی نے ہی مجیب درابی کے گرد گھیرا تنگ کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ خود حکام سے مطالبہ کررہے تھے کہ مجیب درابی جیسے لوگوں سے سختی سے پیش آیا جائے۔

کیا اسی وقت کے لیے مجیب درابی نے عماد حمدی کو اپنا داماد بنایا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ عماد حمدی جلد ہی اعلا عہدوں تک رسائی حاصل کرلے گا۔ ان دنوں وہ شہر میں نیا نیا تعینات ہو کر آیا تھا۔ کتنے ہی مطلبی لوگ اسے اپنے حلقے میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ عماد حمدی کے بارے میں یہ افواہیں بھی گردش میں تھیں کہ بظاہر وہ انتظامیہ کا رکن ہے لیکن دراصل وہ شہر کے نظم و نسق پر کڑی نظر رکھنے والوں میں سے ایک ہے۔

انہوں نے عماد حمدی کو اپنا داماد بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ کسی برے وقت کے لیے انہوں نے اسے اپنی بیٹی دی تھی۔ ان کی دوربین نگاہوں نے عماد حمدی کا مستقبل دیکھ لیا تھا۔ وہ ان کے لیے ہر طرح سے نفع بخش تھا۔ عماد کے گھر کے مخبر خادموں سے انہیں کام کی باتیں معلوم ہوجاتی تھیں' یہ فائدہ کیا کم تھا۔

"اناطولیہ کے ایک گاؤں میں التموش روپوش ہے۔ اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جارہا ہے۔"

وہ التموش کو خبردار کردیتے اور وہ روپوش ہوجاتا۔ بیٹی لیلیٰ کے کان وہ الگ سے بھرتے رہتے تھے۔ انہوں نے لیلیٰ کو یقین دلایا تھا کہ اس کی عماد حمدی سے شادی ان کی ایک بڑی غلطی تھی۔ لیلیٰ ان کی فرماں بردار بیٹی تھی لیکن شاید وہ اپنے شوہر سے محبت کرنے لگی تھی۔

"وہ بہت اچھے ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"وہ ایک بے ایمان' لالچی انسان ہے۔ شہر کے حکام اعلا کے لیے درد سر بنا ہوا ہے۔"

درد سر تو وہ ان کے لیے بنا ہوا تھا۔ درحقیقت عماد حمدی کے اختیارات اس سے کچھ زیادہ ہی تھے جتنے وہ ظاہر کرتا تھا۔ لیکن کسی کے اختیارات کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں' مجیب درابی اپنے پیروں کے نشان نہیں چھوڑا کرتے تھے۔ اگر وہ غیر قانونی تجارت کرتے تھے یا سرحدی محافظوں کو انہوں نے مٹھی میں لے رکھا تھا تو یہ ایسا کوئی برا فعل بھی نہیں تھا۔ سب اپنے فائدے کے لیے یہی سب کرتے ہیں۔ رہی التموش سے تعلق کی بات تو خود التموش بھی یہ ثابت نہیں کرسکے گا کہ اس کا ان سے کوئی تعلق ہے۔

☼ ☼ ☼

بیٹی کی ماں بنتے ہی لیلیٰ جیسے دنیا کی سب سے ذمہ دار خاتون بن گئی تھی۔ اسے خود پر حیرت ہوتی کہ کیسے اس نے اپنی زندگی کو خود فراموشی میں گزار دیا۔ اس نے کوئی ایک بھی ڈھنگ کا کام کرنا کیوں نہیں سیکھا۔ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ زندگی سجنے' سنورنے اور بے فکری سے سوتے رہنے کے علاوہ بھی ہے۔

وہ اپنی بے وقوفیوں پر ہنس دیتی۔ اس نے بہت سے کام سیکھ لیے تھے۔ کچھ کھانا بنانے، کچھ گھر کی آرائش، کچھ سامان کی خرید و فروخت کی سوجھ بوجھ حاصل کرلی تھی۔ فارغ وقت میں وہ ننھی عنابیہ کے لیے کپڑوں پر پھول کاڑھتی رہتی۔ اس کے لیے موتیوں اور دھاگوں سے چھوٹے چھوٹے زیورات بناتی۔ جو گھر پہلے خادم دیکھتے تھے، اسے اب وہ خود دیکھنے لگی تھی۔ لیکن عماد حمدی صرف ایک وجہ سے خوش تھے کہ وہ اب خود خوش رہنے لگی ہے۔ اس نے رنج و غم کی تصویر بنے رہنا چھوڑ دیا ہے۔

ایک دن لیلیٰ اپنے گھر گئی تو پرانے سامان کو کھنگالتے ہوئے اس کے ہاتھ وہ کتاب لگی جو بابا صلاح نے اسے دی تھی۔

"تمہیں سب سے زیادہ ہوش مندی کی ضرورت ہے میری بیٹی۔"

کتاب کو سینے سے لگا کر وہ رو دی۔ اسے وہ وقت یاد آگیا تھا جب بابا صلاح کا رومال یشفین کے ہاتھ آگیا تھا اور وہ اس نے اسے دے دیا تھا۔

"تمہارے لیے میں نے بابا کی جیب سے رومال حاصل کیا ہے۔"

وہ جانتی تھی یشفین نے کبھی اپنے حق پر بھی اپنا حق ثابت نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے لیے بہترین کپڑے، زیورات، اور آرائش کا سامان لے کر آئی تھی۔ وہ اسے سب سے زیادہ حسین بنا دینا چاہتی تھی۔ پھر ایک یوسف کے لیے...... وہ اس سے دستبردار نہ ہوتی لیکن اسے بتا دیتی۔ اگر اسے بابا کا ڈر تھا تو وہ اسے اپنا رازدار بنا لیتی۔ یوسف سے، لیے اس نے اپنے لب کیوں نہ کھولے۔

بابا صلاح کے اس رومال کو اس نے سنبھال کر رکھ لیا۔ اگر زندگی ان دونوں پر مہربان ہوئی اور وہ یشفین سے ملی تو وہ رومال اسے لوٹا دے گی۔

جب وہ گھر واپس آئی اور عماد حمدی کے کتب خانے کے چراغوں میں تیل ڈالنے لگی تو عماد حمدی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تم کسی یوسف کو جانتی ہو لیلیٰ؟" چراغ اور تیل دونوں اس کے ہاتھ سے پھسل گئے۔ وہ جھٹکے سے گردن موڑ کر عماد حمدی کو دیکھنے لگی۔

"میں یوسف شعراوی اور یشفین دونوں کو جانتی ہوں۔" اس نے بے چینی سے کہا۔

عماد حمدی نے اپنی بیوی کی عجلت گرے ہوئے تیل اور چراغ کو دیکھا۔

"کہاں ہیں وہ؟" لیلیٰ نے بے قراری سے پوچھا۔ وہ لپک کر عماد حمدی کی نشست کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ آنکھیں یکایک آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"یوسف کئی سالوں سے قید میں ہے۔"

"اور یشفین؟" اس نے بے قراری سے پوچھا۔

"کہاں ہے وہ، مجھے بتائیں عماد۔ مجھے اس سے ملوادیں۔"

"کون یشفین لیلیٰ؟" عماد حمدی نے الٹا لیلیٰ سے پوچھا۔ لیلیٰ کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ اس کی آنکھ کا آنسو لہو رنگ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"کس چیز نے تمہیں اس موسم میں سفر کرنے پر مجبور کر دیا میری بیٹی! تم باہمت ہو لیکن ایسا سختیوں بھرا سفر تمہارے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ تمہاری ایسی صورت دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ مجھے تمہارا انتظار رہا لیکن ایسے موسم میں تمہارا آنا مجھے ٹھیک نہیں لگا۔"

"آپ کی مدد لینے آئی ہوں۔ انتظار نہیں کر سکتی تھی۔"

اس نے سفر کا ایک ایک پل اپنی سانس کے ساتھ گنا تھا۔ بابا صلاح کے حیات بخیر ہونے کی اس نے ہر ساعت دعا کی تھی۔ وہ دن میں بابا صلاح کے گھر پہنچ چکے تھے۔ شام تک ان کی آمد کے انتظار نے اسے بسمل بنائے رکھا۔ وہ اپنے مدرسے میں تھے۔ رات کو آسمان کے پہلے ستارے کے ساتھ گھر لوٹے۔

"تم نے مجھے خط کیوں نہیں لکھا؟" انہوں نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"خط مجھ سے زیادہ تیزی سے شاید آپ تک نہ پہنچتا۔"

"مجیب درابی کے گھر سے لاپتا ہونے کے بعد تم نے مجھے خط کیوں نہیں لکھا۔" انہوں نے غصے سے پوچھا۔

شرمندگی سے اس نے سر جھکالیا۔ اسے ایک بار خیال آیا تھا کہ وہ انہیں خط لکھے لیکن اس نے نہیں لکھا۔ مجیب درابی کے احسانوں کے بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھاتے' اس نے کسی اور کے احسان کو اٹھانا گوارا نہ کیا۔ وہ احسانوں سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اور اب شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس نے مجیب درابی اور بابا صلاح کو ایک ہی صف میں کھڑا کیوں کیا۔

"میں دو سال پہلے قونیہ گیا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تم گھر کا قیمتی اسباب لے کر بھاگ گئی ہو۔"

"میں اپنی عزت کی حفاظت کے لیے بھاگ گئی تھی۔ التموش مہمان خانے سے مجھے اٹھانے آگیا تھا۔"

بابا صلاح سہلانے لگے۔ "لوگ جھوٹ بولنے کا اپنا شوق پورا کرتے ہیں تو میں انہیں ٹوکتا نہیں۔ حقیقت میرے تجربے سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ میں حتی المقدور تمہارا پتا کروانے کی کوشش کی لیکن مجھے کوئی خبر نہیں ملی۔ اگر تم مجھے ایک خط لکھ دیتیں تو آج یہ نوبت نہ آتی۔"

"میں بابا شوفی کے ساتھ ان کے گھر تھی۔"

"محفوظ تھیں؟ یہ جان کر خوشی ہوئی۔"

"آپ یوسف کی مدد کریں گے؟"

"ہرگز نہیں...... اس کی مدد صرف اللہ کرے گا۔"

وہ جزبز ہو گئی۔

"اگر آپ میرے ساتھ نہیں آسکتے تو مجھے ایک خط لکھ دیں۔ اپنے کسی خادم کو میرے ساتھ روانہ کردیں۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے میری بیٹی! میری بصیرت مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔ میرا خط پڑھا جائے گا' اس پر عمل بھی ہو گا لیکن یوسف کو قید خانے میں ہی مار دیا جائے گا۔ سرِبازار یا شہر سے باہر۔ مجیب درانی کے بارے میں جتنی اطلاعات مجھے موصول ہوتی رہی ہیں' انہیں درست مانا جائے تو وہ کچھ بھی کرنے سے نہیں چوکے گا۔ تم اس کی جان کو اور خطرے میں ڈال دو گی...... صبر سے کام لو۔"

یشفین حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ "صبر سے کام لوں اور تدبیر؟"

"تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تم یہاں اب میرے پاس رہو۔"

"تو آپ میری مدد نہیں کریں گے؟"

"تمہاری مدد اللہ کرے گا......"

☼ ☼ ☼

"یشفین' بابا صلاح کے پاس ہے۔" عکرمہ نے یہ بات اپنے باپ کے کان میں بتائی۔ وہ حیران ہوتے رہے تھے کہ یہ لڑکی آخر ایسی کون سے جگہ جاکر چھپ گئی ہے جس کی بوان کے نتھنوں تک نہیں پہنچی۔ یوسف قید کاٹ رہا ہے۔ یہ ان کے انتقام کی ایک کڑی تھی' دوسری کڑی لاپتا تھی اور وہی انہیں مطلوب تھی۔ یشفین کی بابا صلاح کے پاس موجودگی کی خبر انہیں ان کے ایک مخبر نے دی تھی۔

"جو حساب رہ گیا تھا وہ بھی برابر کردو۔ سنا ہے ادھورے کام' دہکتی سلاخوں کی طرح سینے پر داغے جائیں گے۔ اسے یہاں لے آو' اس کی جان بخشی کے عوض یوسف کی خود سری کو مسل کر رکھ دو۔ وہ مجھ سے معافی مانگنے کے لیے تیار نہیں تھا' اب ہو جائے گا۔ التموش سے کہنا کہ وہ پھر روپوش ہو جائے۔ یہاں صورت حال خراب ہوتی جارہی ہے۔" مجیب درابی نے آئندہ کا سارا لائحہ عمل بنا کر عکرمہ کے ہاتھ میں تھمادیا۔

عکرمہ شہر سے غائب ہو گیا۔ مجیب درابی نے یہ مشہور کردیا کہ تجارت کی غرض سے روم گیا ہے۔

"میں عکرمہ کی یوں اچانک روپوشیوں سے تنگ آچکی ہوں۔ وہ مجھے بیوی بنا کر لایا ہے' یا گھر میں قیدی

بنا کر رکھنے۔" حقہ پیتے مجیب درانی نے عکرمہ کی کم عمر ناک چڑھی بیوی کو دیکھا' جسے اتنی تمیز نہیں تھی کہ بڑوں سے بات کیسے کی جاتی ہے۔

"تمہیں بتا کر گیا ہے وہ.... تمہیں روپوش ہونا لگتا ہے یہ۔"

"میرے بابا اور بھائی کہتے ہیں وہ روپوش ہوا ہے۔" وہ اور چڑ کر بولی۔

"بکواس کرتے ہیں تمہارے خاندان والے.... سارا شہر جلتا ہے میرے بیٹے سے۔"

مجیب درانی نے چلا کر کہا۔ عماد حمدی نے سارے شہر میں ان کی ناک کٹوادی تھی۔ کس طرح وہ ان کے خلاف ثبوت اکٹھے کرتا پھر رہا ہے' یہ بات سارا شہر جان گیا تھا۔ جن کینہ پرور دشمنوں کی زبانیں اندر تھیں' وہ بھی باہر نکل آئی تھیں۔ عماد حمدی وہ چوک تھی جو ان کی ہوش مندی کے باوجود ان سے ہوئی۔

عماد حمدی نے لیلیٰ کے غم کو اپنے دل پر محسوس کیا۔ وہ اس رات سے بیمار تھی جس رات اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ کچھ خفیہ دستاویزات چراتے ہوئے یوسف پکڑا گیا تھا۔ اسے یوسف کی فکر نہیں تھی اسے یشفین کی فکر تھی۔ پھر وہ کہاں گئی؟ یوسف تو قید خانے میں ہے' وہ کس کے ساتھ بھاگی تھی؟

وہ گھر آنا چاہتی تھی۔ ایک ایک سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یشفین گھر سے کیوں بھاگی؟ کیا زیورات کے لیے؟ سونے کے سکوں کے لیے؟ یہ سب تو پہلے سے ہی اس کی تحویل میں رہتے تھے۔ ماں عزیزہ اور اس نے پہلے بھی اس سب پر سوچا تھا لیکن جب انہیں کسی بھی بات کا کوئی سرا نہیں ملا تو وہ خاموش ہو گئیں۔ یشفین واقعی گھر سے غائب تھی اور یوسف بھی جا چکا تھا۔ انہیں یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ دونوں ساتھ بھاگے ہیں۔

عماد حمدی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس معاملے پر صبر سے کام لے لیکن وہ صبر نہیں کر سکی اور روتی رہی۔ عماد حمدی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اسے لیلیٰ کو کچھ بھی نہیں بتانا چاہیے تھا۔ اگر وہ یوسف کے بارے میں جان گیا تھا تو اسے لیلیٰ سے ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔

"مجھ سے وعدہ کرو لیلیٰ' تم یہ سب باتیں کسی سے نہیں کرو گی۔" لیلیٰ کو اپنے شوہر کی بے حسی پر رونا آیا۔ اتنے اختیارات کے باوجود وہ یشفین کو ڈھونڈ لانے کا کوئی جھوٹا وعدہ کرنے کے بجائے الٹا اس سے وعدہ لے رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

"جو آسمانوں پر طے ہو چکا تھا' اسے تم نے زمین پر میرے لیے دہرایا۔ یوسف شعراوی تم ایک بہادر انسان ہو۔"

یشفین کا دیا چھوٹا سا خط یوسف کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے ان گنت بار پڑھ چکا تھا۔ اس قید کا ایک ایک لمحہ اس پر بھاری رہا تھا' جب تک وہ اس خوف میں گھرا رہا تھا کہ یشفین التموش کے پاس ہے۔ اب یہ خط اس کے ہاتھ میں ہے اور یہ قید خانہ گل و گلزار ہے۔ اسے یقین تھا کہ ماں نے اس کے لیے ایک لمحہ بھی اپنی دعائیں ترک نہ کی ہوں گی اور یہ ان ہی کی دعاؤں سے ہوا۔ کوئی یشفین کو تکلیف نہیں پہنچا سکا۔

"عرب کے صحراؤں میں' جنوب کے پہاڑوں میں' مشرق و مغرب کے دریاؤں کے کناروں میں' کیا عورتوں کی کمی رہی ہو گی جو کسی ایک لیے خود کو قید خانے کا قیدی بنا لیا جائے۔" اس کے ساتھی اس سے کہتے۔ وہ ہنس دیتا۔

"تم نہیں سمجھو گے.... یا مجنوں سمجھے گا.... یا جنگجو سالار سمجھے گا۔ تم نہیں سمجھو گے...." وہ خود بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ زندگی کی ایسی مشقت اس نے کیسے سہ لی۔ اس کی جوانی کی بہاریں قید خانے کی خزاؤں میں گزریں' لیکن اس نے اف نہیں کی۔ کیا واقعی وہ ایک ایسا ہی باہمت و بہادر انسان تھا۔ کیا واقعی ہر سختی کو اس نے صبر سے زائل کیا۔

اس نے اللہ پر یقین کامل رکھا اور اس کی مدد کا انتظار کیا۔ بے شک اللہ کی مدد ہمیشہ سے اس کے ساتھ

موجود رہی تھی۔ ورنہ یشفین سرائے میں موجود نہ ہوتی اور وہ قید خانے میں زندہ نہ ہوتا۔

☼ ☼ ☼

"کیا زندگی انتظار کا دوسرا نام ہے؟ یا زندگی ایک ایسے آئینے کی مانند ہے جو ناپسندیدہ عکس مستقل دکھاتی ہے۔" یوسف قید خانے میں ہی رہا اور وہ اس کی مدد سے قاصر رہی۔ اس کی التجائیں بھی بابا صلاح کو قونیہ جانے پر مجبور نہیں کر سکی تھیں۔ وہ ان کے گھر میں رہنے پر مجبور تھی۔ انہوں نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ ان کی اجازت کے بغیر قونیہ نہیں جائے گی۔ بابا شوفی واپس جا چکے تھے۔

بہت صبر سے وہ چند دن گزارتی، پھر سے بابا صلاح سے بات کرنے کی کوشش کرتی اور ناکام رہتی۔ وہ یا اسے خاموش رہنے کے لیے کہتے یا وہ خود ہی خاموش رہتے۔ ان کی طرف سے کسی پیش قدمی کا انتظار کرتے کرتے تھک کر وہ رو دیتی۔ وہ عاجز آچکی تھی۔ کتنے مہینوں سے وہ ان کے پاس تھی۔ کیا وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ ہمیشہ یہیں چپ چاپ پڑی رہے اور آخر کار یوسف قید خانے میں مر جائے۔

"آپ یوسف کے لیے کچھ کر رہے ہیں یا نہیں؟" ایک دن وہ اپنے لہجے پر قابو نہیں رکھ سکی۔

"میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں نہیں اللہ کرے گا۔"

"آپ جانتے ہیں کہ اللہ کے کام اس کے بندوں کے ذریعے ہی انجام پاتے ہیں۔"

"میں یہ جانتا ہوں کہ میں نے تم سے زیادہ بے صبر انسان نہیں دیکھا۔ میں تمہیں جتنا سمجھ دار سمجھتا تھا تم اس سے کہیں زیادہ بے وقوف نکلیں۔ میں تمہیں کئی بار سمجھا چکا ہوں کہ سمندر میں جال پھینک کر ماہی گیروں کو کیسے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ بیج بو کر کسان کو فصل کے اگنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ناانصافی کی قید کاٹ کر، انصاف کا دروازہ کھل جانے کا انتظار بہر حال کرنا پڑتا ہے۔" وہ سر جھکا کر آنسو بہانے لگی۔

وہ ٹھیک کہہ رہے تھے، لیکن وہ بھی غلط نہیں تھی۔ سرائے میں تو اس کے پاس کرنے کے لیے بہت سے کام تھے۔ یہاں کیا تھا؟ بابا صلاح کے مدرسے میں پڑھنے والی بچیوں کی نگرانی کرنا۔ ان کی سبق میں مدد کرنا اور شام کو دریا پر ٹہلنے کے لیے چلے جانا۔ شروع میں بابا صلاح اسے اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے۔ وہ اچھی طرح سے سمجھتی تھی کہ وہ اس کا دل بہلانے کے لیے اسے یہاں لاتے ہیں۔ پھر وہ اتنی عادی ہو گئی کہ تقریباً" ہر دن وہاں جانے لگی۔ اس کا یہ معمول بن گیا۔ بابا صلاح یہی چاہتے تھے کہ اس کا وہاں جانا معمول بن جائے۔

اس دن بھی وہ وہاں موجود تھی۔ وہ دریا کے پانی کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ اسے دن کے بیت جانے اور شام کے ڈھل جانے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ وہ کنارے بیٹھی رہی اور اندھیرے نے روشنی پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ایسے ہی بیٹھے بیٹھے وہ چونک کر ڈر گئی جب کسی نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا اور اس کا نام پکارا۔

"یشفین...... میرے باپ کی کنیز! تو تم بھاگ کر یہاں آگئی تھیں۔" اس نے سر گھما کر دیکھا۔ دن کی ڈوبی ہوئی روشنی میں اس نے عکرمہ کو فوراً" پہچان لیا۔ اس پر یک دم ویسا ہی خوف طاری ہو گیا جیسا اس رات ہوا تھا جب وہ گھر سے بھاگی تھی۔

"تمہیں یوسف کے ساتھ مل کر نمک حرامی کرتے شرم نہیں آئی۔" وہ غرا کر بولا۔

"شرم آئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ تم نے مجھے التموش کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔" وہ ابھی بھی خوف زدہ تھی، لیکن اس نے نفرت سے عکرمہ کو سچ جتا دینا ضروری سمجھا۔ "اور جان لو میں اب تمہاری کنیز نہیں ہوں۔ یہ تمہارا گھر نہیں ہے، جہاں سے تم مجھے اٹھا کر التموش کے سپرد کر دو گے۔" عکرمہ نے کھینچ کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔

"جو اس رات بیچ دیا تھا، وہ آج اس کے حوالے کرنے والا ہوں۔" اس نے اس کے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ دیے کہ چلا نہ سکے۔

اس نے پورا زور لگا کر خود کو عکرمہ کی گرفت سے آزاد کروانا چاہا۔ اسے سامنے سے کچھ اور لوگ اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اسے یہ سمجھنے میں وقت نہیں لگا کہ وہ عکرمہ کے ہی لوگ ہیں۔ مچل کر خود کو عکرمہ کی گرفت سے آزاد کروا کر وہ پیچھے کی طرف تیزی سے بھاگی۔

وہ بھاگ رہی تھی، لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کا بھاگنا فضول ہے۔ جتنے قدموں کی چاپ اور گھوڑوں کی ٹاپ اس کے اطراف ابھر رہی تھیں وہ اسے کیسے بچ نکلنے دے سکتی تھیں۔ عکرمہ پیچھے ہی کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ محظوظ ہو رہا تھا کہ اس بار وہ ایک ناکام کوشش کر رہی ہے۔ یہ قونیہ نہیں، جس کی گلیوں میں چھپ کر وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔

وہ قونیہ نہیں تھا، دریا کا کنارہ تھا۔ جس کا پہرہ مہینوں سے عماد حمدی کے آدمی بھیس بدل کر دے رہے تھے۔ جس وقت وہ اپنا پورا زور لگا کر بھاگ رہی تھی اور التموش نے اپنے گھوڑے سے کود کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا، اس وقت وہ جال سمیٹ دیا گیا تھا جو ماہی گیروں نے التموش اور عکرمہ کو پکڑنے کے لیے بچھایا تھا اور جس سے یشفین لاعلم تھی۔

"عورتوں کو لاعلم ہی رکھنا چاہیے۔ ورنہ اپنی جلد بازی اور بے چینی سے وہ کام خراب کر دیتی ہیں۔" بابا صلاح نے اسے جان بوجھ کر لاعلم رکھا تھا۔ جتنی بے صبری وہ ہو چکی تھی انہیں یقین تھا وہ ان کے بچھائے جال میں التموش کو نہیں آنے دے گی۔ اس کی جلد بازی پول کھول دے گی۔

ایک بار یشفین اپنی جان بچانے کے لیے بھاگی تھی، آج وہ التموش اور عکرمہ کو پکڑوانے کے لیے بھاگی تھی۔ بابا صلاح نے خود یہ اطلاع عکرمہ کے کانوں تک اپنے آدمی کے ذریعے پہنچائی تھی کہ وہ وہاں ان کے پاس ہے۔ عماد حمدی ان کا شاگرد تھا۔ ان کے مدرسے سے فارغ التحصیل۔ اس سے زیادہ کون ان کا مددگار ہو سکتا تھا۔

✻ ✻ ✻

زندگی پلٹ کر چھ سال پیچھے چلی جاتی تو بھی اتنی حسین نہ لگتی جتنی اس وقت لگی جب وہ لیلیٰ کے سینے سے جا لگی۔ بابا شوفی کے گھر کے بستر پر آنکھیں موندے پڑے، وہ یہ یقین رکھتی تھی کہ اب بھی وہ لیلیٰ کو نہیں دیکھ پائے گی۔ اس کی آنکھیں قبر میں کھل جائیں گی، قیامت آ جائے گی، لیکن لیلیٰ اسے کہیں نظر نہیں آئے گی۔

لیلیٰ نے اسے خود سے الگ کر کے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھا۔ اس کی صورت پر زندگی کی سختیاں، صبر کے قلم سے رقم ہو چکی تھیں۔ اس کا لباس معمولی تھا۔ اس کا ہاتھ جلا ہوا تھا۔ اس کے حسن کی چمک، تجربات کی بھٹی سے سنولا گئی تھی۔ لیلیٰ نے اس کا جلا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو جان لیا وہ زندگی گزار کر نہیں، جھیل کر آئی ہے۔

"تم مجھے چھوڑ کر کیسے چلی گئیں۔"

"شاید ہر محبت کو جدائی کا داغ سہنا پڑتا ہے۔" وہ کہاں سے شروع کرتی اور کہاں تک سناتی۔

"ماں ٹھیک کہتی تھی۔ تم ہماری محبت کو احسان سمجھتی ہو۔ تم نے احسان چکا دیا۔" لیلیٰ غصے سے رونے لگی۔

وہ اسے کیسے بتاتی کہ اگر محبت کو صرف احسان سمجھا ہوتا تو وہ اسے یاد کر کے روتی نہ رہتی۔ یوسف کو قید میں نہ رہنا پڑتا۔ احسان تو کسی نہ کسی طرح چکا دیے جاتے ہیں، محبت کے بدلے میں محبت تو چکائی ہی نہیں جا سکتی۔

عماد حمدی نے لیلیٰ کے چہرے پر اس خوشی کو دیکھا جو چار سالوں کی اس کی شادی شدہ زندگی میں وہ ایک بار بھی اس کے چہرے پر نہیں دیکھ سکا تھا۔ ہاں وہ اپنی بیوی سے ایک جھوٹا وعدہ بھی نہیں کر سکا تھا کہ وہ یشفین کو ڈھونڈ کر لے آئے گا کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ یشفین کو مجیب درانی نے قتل کروا دیا ہو گا۔

"ایک تاجر کی بیٹی سے شادی سے انکار پر۔"

عماد حمدی نے یوسف کے منہ سے جب یہ فقرہ سنا تھا تو وہ چونکے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ قید خانے کے پہرے

دار اور انتظامیہ منہ کھولنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسے جو معلومات مل رہی تھیں' وہ ادھوری تھیں۔ اس نے شہر کے تاجروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی کہ وہ کس کے عتاب کا شکار ہوا ہے۔ اس کی سزا کا تعین کیوں نہیں کیا جا رہا۔ اسے قاضی کے سامنے پیش کیوں نہیں کیا گیا' لیکن اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

ایک رات لیلیٰ کو دیکھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ وہ اس شہر کی رہنے والی ہے۔ شاید وہ کسی ایسی بات کے بارے میں جانتی ہو جو اس کی مدد کر سکے۔

"تم یوسف شعراوی کو جانتی ہو؟" اس نے لیلیٰ سے پوچھا اور لیلیٰ نے اسے یوسف شعراوی کے بارے میں بتا دیا' لیکن لیلیٰ کی باتیں بھی ادھوری تھیں۔ اس نے خود ہی کڑی سے کڑی ملا کر کہانی جان لی۔ یشفین اور یوسف کے بیک وقت غائب ہونے کو اہم جانا اور اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ دن نہیں لگے کہ یہ سب کس کے کہنے پر ہوا اور قید خانے میں مجیب درابی کے وفادار منہ کیوں نہیں کھولتے۔

عماد حمدی نے آہستہ آہستہ ثبوت اکٹھے کرنے شروع کر دیے تھے۔ عکرمہ اور التموش کے گرد اس نے الگ سے گھیرا تنگ کر دیا تھا۔ پھر بابا صلاح کا خط اسے ملا۔ پچھلی بار جب وہ اس سے ملے تھے' اس نے اپنے سسر مجیب درابی کی سرگرمیوں کے بارے میں انہیں تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا۔ بابا صلاح سلطان کے ان اہم مشیروں میں سے ایک تھے جو اندر ہی اندر نظم و نسق پر گہری نظر رکھتے تھے۔ خط میں انہوں نے یشفین کے بارے میں لکھا تھا اور اسے اپنے پاس آنے کے لیے کہا تھا۔ انہوں نے مل کر یہ طے کیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ یشفین کے ذریعے التموش اور عکرمہ کو پکڑنا۔ یوسف کو قاضی کے سامنے پیش کرنا اور مجیب درابی کی سزا کا تعین کرنا۔

☼ ☼ ☼

"مردہ بدم زندہ شدم' گریہ بدم خندہ شدم۔" (میں مردہ تھا' زندہ ہو گیا۔ آنسو تھا' تبسم ہو گیا)

وہ شہر کے ان راستوں پر چلتا جا رہا تھا جن پر آج سے چھ سال چند مہینے پہلے' اپنے گھوڑے کی لگام پکڑ کر چل رہا تھا۔ زندگی اس کے لیے بہت بدل گئی تھی۔ اس کی شخصیت' اس کا مزاج بھی' لیکن شہر اتنا نہیں بدلا تھا۔ شہر اتنی جلدی کہاں بدلا کرتے ہیں۔ جس شہر میں وہ مسکراتے ہوئے داخل ہوا تھا' وہ شہر آج اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ ہاں قونیہ اتنا تو ضرور بدل گیا تھا۔

عماد حمدی نے اسے قید خانے سے سرکاری مہمان خانے میں منتقل کرا دیا تھا۔ وہیں اس کے ناکارہ ہونے کے قریب بازو کا علاج ہوتا رہا تھا۔ مہمان خانے میں بھی وہ ایک طرح سے قید ہی تھا' لیکن اچھے لباس' خوراک اور مشقت کے بغیر۔ اسے اس وقت تک وہاں رہنا تھا جب تک قاضی صاحب اس کی رہائی کی قانونی اجازت نہ دے دیتے۔ عکرمہ اور التموش البتہ قید خانے میں تھے۔ ان دونوں کے پکڑے جانے کی خبر نہ جانے کیسے درابی تک پہنچ گئی تھی اور وہ مراکش بھاگ گیا تھا۔ عماد حمدی کے آدمی اس کے پیچھے مراکش گئے تھے۔

قاضی کے سامنے اس کی پیشیاں ہوتی رہی تھیں اور ان سب لوگوں کو جو اس کی قید کے سلسلے میں درابی کے معاون بنے رہے تھے' سزائیں مل چکی تھیں۔ عماد حمدی نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ عکرمہ سے ملنا چاہتا ہے تو وہ اس کا انتظام کر سکتا ہے' لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔ ایک ایسے انسان کو جس کی سزا موت نہیں تو عمر قید تو ضرور رہی ہو گی' طنز کر کے یا اسے کچھ جتا کر وہ کیا خوشی حاصل کرنا چاہے گا۔

"عزیزم! آپ اس شہر میں اجنبی لگتے ہیں۔ مسافر ہیں۔ آئیے آئیے' مولانا رومی کا شہر قونیہ آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔ آئیے اس دکان کے اندر آجائیے۔ یہاں آپ کو وہ ظروف اور نوادرات ملیں گے' جو عرب کے طول و عرض پر کسی اور دکان میں نہیں ملیں گے۔ آپ کی خوش قسمتی کو سلام ہے۔ کل رات ہی میں ایک ایسا چراغ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں

جس کی روشنی میں خلیفہ ہارون الرشید کتاب کا مطالعہ کیا کرتے تھے.... آیئے عزیزم اپنی زوجہ کے لیے.... لیکن اگر آپ اتنے ہی خوش قسمت ہیں کہ زوجہ سرے سے موجود ہی نہیں تو اپنی محبوبہ کے لیے آئینہ لے جایئے۔ اگر مجنوں زندہ ہوتا تو وہ خود گواہی دیتا کہ "ہاں یہ وہی آئینہ ہے۔ جو میں نے اپنی لیلیٰ کو دیا تھا۔"

یوسف نے مسکرا کر الہ دین کے جن کو دیکھا۔ اس کی توند کچھ اور باہر نکل آئی تھی اور داڑھی میں سفیدی نمایاں ہو گئی تھی۔

"مجھے یہ آئینہ چاہیے چچا۔" اس نے کہا۔

"تم خوش قسمتوں میں سب سے زیادہ خوش قسمت ہو۔ اس آئینے کے لیے بہت سے لوگ آئے' لیکن اسے حاصل نہیں کر پائے۔ لو' یہ تمہارا ہوا۔"

چرمی تھیلے میں ہاتھ ڈال کر اس نے سکے نکالے اور الہ دین چچا کو دیے۔ اسی تھیلے میں "مجنوں" نے اپنی لیلیٰ کے لیے آئینہ رکھ لیا۔

"دولت عشق آمد من' دولت پائندہ شدم"
(سامان عشق نے مجھ ہی کو "جوہر" بنا دیا)

ماں عزیزہ دکھی تھیں۔ لیلیٰ اپنے بابا کے لیے' عکرمہ کے لیے کتنی پریشان تھی۔ یہ سب اس سے چھپا ہوا نہیں تھا اور ان سے بھی یہ چھپا ہوا نہیں تھا کہ اس نے اپنی زندگی کن مصیبتوں سے نبرد آزما ہو کر کاٹی ہے۔ وہ تینوں ایک دوسرے کے رنج و غم کو سمجھتی تھیں اور یہ بھی کہ اب ان کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ جو ہو چکا ہے اور ہونے والا ہے' وہ اسے بدل نہیں سکتیں۔ ماں عزیزہ نے صبر کر لیا تھا اور لیلیٰ اپنی بیٹی کے ساتھ دل بہلانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

اور بشفین.... وہ یوسف کے آنے کا انتظار کرتی تھی۔ ہر ساعت اسے یوسف کے انتظار میں کاٹی گئی آخری ساعت لگتی' لیکن پھر اگلی ساعت انتظار بن کر آجاتی۔

وہ لیلیٰ کے ساتھ اس کے گھر میں رہ رہی تھی۔ ہر آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ عماد حمدی کے گھر آنے والے ہر مہمان کو وہ یوسف سمجھتی۔ ہر دستک یوسف کی دستک لگتی۔ پیشیوں اور دوسرے معاملات سے وہ واقف تھی اور عاجز بھی۔ اس کے دل میں کیسے کیسے وسوسے آتے۔ اسے کیسے کیسے خوف لاحق رہتے۔ اسے لگتا' دریا صحرا ہو جائیں گے' لیکن یوسف نہیں آئے گا۔ حال ماضی ہو جائے گا اور وہ لوٹ نہیں سکے گا۔

بالکنی میں کھڑی لیلیٰ اپنی بیٹی کو گود میں لیے شہر کا نظارہ کروا رہی تھی اور وہ اس طرف گھر کے باغ کی طرف رخ کیے کھڑی تھی۔ لیلیٰ دوبارہ اسے گردن موڑ کر دیکھ چکی تھی۔ وہ خاموش تھی اور اداس۔ پھر یک دم لیلیٰ نے باغ کی طرف بالکنی میں گردن نیچے کر کے خادم کو آواز دے کر کہا۔

"پھاٹک کھول دو.... مہمان کو عزت و احترام سے اندر لے آؤ۔" بشفین لیلیٰ کی صورت دیکھنے لگی۔ لیلیٰ اسے دیکھنے لگی اور پھاٹک کھول دیا گیا۔ جس سے گزر کر مہمان اندر آگیا۔

"تم نے کہا تھا بشفین.... شہزادے ہمیشہ دور سے آتے ہیں.... وہ دیکھو' وہ آرہا ہے۔" باغ کی روش پر چلتے یوسف کی طرف لیلیٰ نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور وہ مسکرا دی۔ کتنے سالوں بعد یہ مسکراہٹ واپس اس کے چہرے پر لوٹ آئی تھی۔

"میں عنابیہ کے بابا کو اطلاع دینے جا رہی ہوں کہ ہمارا مہمان آچکا ہے۔" لیلیٰ جلدی سے نیچے چلی گئی۔

وہ اوپر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ دوپٹے کے پلو کو کھینچ کر اس نے دانت میں دبانا چاہا۔ باغ کی روش پر چلتے' پھولوں کی خوشبو سونگھتے' آزاد پرندوں کی زبان سمجھتے' یوسف نے محراب کے سائے میں قندیل کو روشن دیکھا۔

زندہ شدم.... خندہ شدم....

چلتے چلتے وہ وہ عین بالکنی کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا تو وہ اسے پکارے بغیر رہ نہیں سکی۔

"یوسف۔" یوسف نے مسکرا کر سر کو دائیں بائیں ہلایا....

"دولت پائندہ شدم۔"

"ہاں! تم مجھے پکار سکتی ہو.... ہر بلندی سے...."

"اور تم مجھے.... ہر منزل سے...." ✡

حافظہ خوشنود حنیف

ایک دفعہ مصباح میکے آئی۔ ہفتہ بعد سسرال واپس گئی تو ولی محمد نے اس کے لیے شکرپارے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ "کسی نے بھیجے تھے۔ مجھ سے اکیلے کھائے نہ گئے۔" اور مصباح خوشی سے پھولی نہ سمائی' اپنے شوہر کی ایسی محبت پر۔

"خاوند کا کھاؤ' مگر اس کے پیچھے۔" یہ بات بی بی زینب اکثر کہا کرتیں' مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا۔

"یہ بھلا کیا بات ہوئی' خاوند سے چھپا کر کیوں؟ وہ زندگی کا ساتھی زندگی کی گاڑی کا دوسرا پہیا۔ اس کی کمائی کو خرچ کرتے وقت اس سے چھپانا کیسے ممکن ہے؟ اور خاوند تو عورت کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہے۔ اس کی کمائی عورت نے نہیں خرچ کرنی تو اور کس کی کرنی ہے۔"

اس کی شادی ہوئی تو اس کا شوہر ولی محمد اکثر آتے ہوئے اس کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتا۔ جلیبیاں' دہی بھلے یا کچھ ایسی ہی چیز۔ مصباح اتنے سے خرچے پر حیران تو ہوتی' مگر اکٹھے مل کے کھانے میں لذت اور محبت محسوس کرتی۔

مگر یہ تو شادی کے اولین دنوں کی باتیں تھیں۔ جب ایک جان دو قالب ہوتے ہیں۔ دونوں کی ایک سوچ ہوتی ہے۔ کائنات کے ہر رنگ میں محبت اور خوب صورتی نظر آتی ہے۔ اپنے سے بڑھ کر کوئی خوش قسمت نہیں لگتا۔

خیر وہ دور گزرا۔ زندگی اپنے معمول پہ آئی۔ مصباح کو زندگی اپنے اصل میں رنگ نظر آنے لگی۔ وہ بھوک برداشت کرتے ہوئے اپنے شوہر کا انتظار کرتی اور خاوند صاحب خود کھانا کھاتے ہوئے اس سے رسماً بھی نہ کہتے۔ وہ منہ دیکھتی رہ جاتی۔ جب ولی محمد کھانا کھا کے فارغ ہوتا تو غصہ اور ناراضی سے کہتی۔

"میں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا کہ آپ کے ساتھ کھاؤں گی۔ آپ نے پوچھا ہی نہیں....."

وہ مسکرا کے کہتا۔

"تو کھا لیتی ناں، میں نے کب منع کیا ہے۔"

اور وہ سوچتی رہ جاتی، منع نہیں کیا تو دعوت بھی کب دی۔ آہستہ آہستہ خاوند صاحب کی لاپروائی و بے نیازی کے سبب اکیلے ہی کھانا کھانے لگی۔

کھانا وہ اپنے شوہر کی مرضی کا پکاتی۔ پوری محبت اور لگن سے۔ اسے شلجم انتہائی ناپسند تھے اور اس کے شوہر کو اتنے ہی پسند۔ وہ بھی شلجم گوشت، کدو گوشت، ٹنڈے گوشت۔ مصباح کو سبزیوں میں ہڈی آجاتی تو کھانے کا مزا ہی جاتا رہتا، مگر خاوند کو نہ کہتی۔

مصباح کو سبزیاں خشک اور بھنی ہوئی پسند تھیں۔ شوہر کو ہر سالن ہلکے شوربے والا۔ مصباح دھیرے دھیرے اپنی پسند بھولتی گئی۔ کچھ اور بھی چیزیں تھیں جنہیں مصباح خاوند کی ناگواری محسوس کرتے ہوئے چھوڑتی گئی۔ جن میں زیادہ پکانا، بانٹنا، مگر پھر بھی!

مصباح کی امی ہمیشہ خشک اور دم پہ پکے کھانے بناتیں۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت دیا تھا۔ کھیر، گاجر کا حلوہ یا سوجی کا حلوہ، زردہ کبھی کم نہ بناتیں۔ اولاد بھی سیر ہو کے کھاتی۔ آس پڑوس میں بھی بانٹتیں۔

کہتیں "کم میں صبر صدق ہی نہیں آتا۔ جب تک ساتھ والے گلی محلے میں بندہ نہ بانٹے۔"

یہ چیزیں ماں سے ہی بیٹی میں بھی آہی جاتی ہیں۔ جیسے ماں خوشی محسوس کرتی کھلا کے، ایسے بھی اچھا لگتا۔ مصباح کے گھر سوئی گیس نہیں تھی۔ سلنڈر جلاتی تو حلیم، ساگ، کڑھی ایسی سوغاتیں ماں ہی بنا کے بھیجتی۔

ایک دو دفعہ مصباح نے اپنے گھر کڑھی یا حلیم بنا کر آس پڑوس میں بھیجا تو خاوند صاحب سے وہ بے بھاؤ کی سنیں کہ الامان! بولے۔ "پتیلا بھر بھر بنانے کی کیا تک ہے ضرورت کا پکاؤ۔"

اور وہ آئندہ کے لیے محتاط ہو گئی۔ ماں کے گھر گیس بھی تھی اور دل بھی وسیع۔ جب زیادہ محنت طلب چیز کھانے کو دل چاہتا تو ماں سے فرمائش کر لیتی اور چیز حاضر۔

ماں پر اللہ بہت مہربان تھا۔ ماں کا دل تنگ نہیں تھا، توکل علی اللہ سے مالا مال تھیں۔ بھائی گاؤں سے سبزیاں ساگ بھیجتے تو فوراً داماد کو فون کرتیں۔ "آکر لے جانا۔"

ماں اکثر کہا کرتیں۔ "اللہ اور نبی کو یہ بات بہت پسند ہے کہ دوسروں کو کھانا کھلاؤ اور اپنا دسترخوان دوسروں کے لیے وسیع رکھو۔" کہتیں۔ "جب دوسرے کی محبت دیکھنی ہو تو یہ دیکھو کہ وہ اپنا دسترخوان تمہارے لیے کتنا وسیع کرتا ہے۔" اللہ نے عورتوں میں شاید کھلانے پلانے کی صفت زیادہ رکھی ہے، مگر مرد بھی تو سارے مہینے کی کمائی عورت کے ہاتھ پر رکھتا ہے، مگر!

مصباح کا شوہر کھانے پینے کی وافر چیزیں، پھل گھر لاتا، مگر وقتاً فوقتاً خود ہی کھا کر ختم کر دیتا۔ وہ خود لے لیتی تو لے لیتی۔

اور جب بچے ہو گئے تو بچوں کا بہت خیال رکھتا، بچوں کو پاس بٹھا کر کھلاتا، اسے نہ کہتا اور پھر یوں ہوا کہ وہ کچھ لیتی تو بار بار پوچھتا۔ "بچوں نے کھایا؟" اور اب تو حد ہونے لگی۔ وہ چائے بھی پیتی تو بار بار پوچھتا۔

"بچوں کو دودھ دیا۔ بچوں کو گلاس گلاس دودھ دیا

کرو۔" حالانکہ وہ روز ناشتے میں سب کے لیے دودھ پتی بناتی۔

وہ سوچتی کہ وہ بچوں کو کھلائے پلائے بنا کیسے کھا سکتی ہے۔

مصباح کے سسرال سے کوئی آتا تو ولی محمد کا بس نہ چلتا کہ وہ خود ہی کوکنگ شروع کردے۔ بازار سے کھانے پینے کی اشیا لاتا' میز سجاتا۔ کپ دھو کہ مصباح کو پکڑاتا اور جب مصباح کی فیملی سے کوئی آتا تو سستی سے بستر ہی نہ چھوڑتا۔ مصباح اٹھاتی تو کہتا۔

"یار! کوئی چائے والے بنالو۔ بچوں کو بھیج کر کچھ منگوالو۔"

وہ چپ چاپ خود ہی انتظام کرلیتی۔ شادی کے شروع دنوں سے وہ بچوں کو پڑھاتی تھی۔ وہ سارے پیسے گھر میں ہی خرچ کرتی۔ اپنی ذات کے لیے کچھ نہ سوچتی۔ اس کی پہلی ترجیح اس کا گھر' شوہر اور بچے تھے۔ وہ شادی سے پہلے اپنی سہیلیوں کو دیکھتی کہ شاپنگ کے لیے اتنا شوق رکھتی ہیں۔ وہ ہر نماز کے بعد اللہ سے دعا کرتی۔"

"اے اللہ مجھے دنیا سے بے رغبت ہی رکھنا۔ نہ دنیاوی نعمتوں سے رغبت ہو' نہ پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔"

اور اس پر اللہ کا خاص کرم تھا کہ جیسا مرضی فنکشن ہوا سے کوئی پریشانی نہ ہوتی۔

جیسا لباس میسر ہوتا پہن لیتی جو فیشن چل رہا ہو' اسے کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ نہ کھانے پینے میں اس کی کوئی خاص پسند تھی' مگر جو بھی ہو ذائقے دار ہو' یہ وہ چاہتی تھی۔ گھر بنانے کے لیے اس نے بہت محنت کی تھی۔

پیسہ پیسہ جوڑ کر اس نے اپنے گھر پر پلستر کروایا تھا۔ ہر موقع پر وہ اپنے شوہر کے شانہ بشانہ رہی' کبھی کوئی مطالبہ نہ کیا۔ اس کا شوہر جو لادیتا پہن لیتی۔ جیسا چاہتا پکا دیتی۔ بیمار بھی ہوتی تو اپنی دوائی خوراک کی فکر نہ کرتی۔ گھر میں دودھ آتا' مگر کم ہی ایک کپ چائے کا سوچتی۔

مگر اب وہ بیمار رہنے لگی تھی۔ اسے چائے کی طلب ہونے لگی۔ کھانے میں بھی مرضی کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ ماں رہی نہ تھیں کہ ان سے فرمائش کرتی۔

سسرالی گاؤں گئی تو واپسی پہ جٹھانی نے دودھ کا ڈول بھر دیا۔ صبح ہی ناشتے میں کھیر بنا کے شوہر کو دی۔ اپنے لیے ٹھنڈی ہونے رکھ دی۔ بچوں نے اسکول سے آکر خوب کھائی۔ رات کو شوہر کو دوبارہ دی اور جب خود کھانے لگی تو خاوند صاحب مشکوک سے بولے۔

"بچوں کو دی ہے نا؟"

وہ لاپروائی سے کھاتے ہوئے بولی۔ "ہاں اللہ کا شکر ہے' سب نے کھائی ہے۔"

اس نے شوہر کا رویہ محسوس ہی نہ کیا۔ اگلی صبح بچوں نے سویوں کی فرمائش کردی۔

خود اس نے رات کی بچی ہوئی روٹی گرم کرکے اچار سے کھائی۔ ایک کپ چائے بنالی۔ جوں ہی اس نے کپ خالی کیا' شوہر صاحب فرمانے لگے۔

"چائے نہ بنایا کرو۔ بچوں کو دودھ دیا کرو۔" وہ دنگ رہ گئی۔ کیا اپنی ذات کو ہمیشہ فراموش کرکر کے' کچھ نہ مانگ کر اپنے آپ کو ہمیشہ پچھلی لائن میں کھڑا کرکے وہ خود ایک کپ چائے کے قابل بھی نہ رہی تھی یا اس کے شوہر کو اس پر خرچ کرنے کی عادت ہی نہ رہی تھی۔ کل کی کھیر اور آج کی چائے نے اسے یہ بات اچھی طرح سمجھادی تھی۔

"خاوند کا کھاؤ ضرور' مگر اس کی طرف پشت کرکے۔"

بہت تکلیف سے ہی سہی' مگر اپنا ذہن اور گھر کا ماحول صحیح رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا۔

پھر اس نے بھی وہی کیا جو مصباح کی ٹیچر کے میاں کہا کرتے تھے۔

"عورتیں اپنے خاوندوں کو بھیج کر مرضی کے پکوان بنا بنا کر کھاتی ہیں۔" (سامنے تو خاوند برداشت نہیں کرتے) تو صحیح ہے نا یا تو خاوند بیوی کا خرچا پانی برداشت کریں یا پھر بھگتیں۔

بات کھانے پینے کی نہ تھی۔ بات تو محبت کے اس احساس کی تھی جو کہیں کھو گیا تھا۔ زندہ رہنے کے لیے کھانا پینا تو تھا ہی' سامنے یا چھپ کر' مگر وہ محبت کہاں سے لاتی جو وقت کی دھول میں دب گئی تھی۔

نفیسہ سعید

دل اے کے بعد

لگا۔

"تم نے اس عورت کے گھر سے آیا کھانا میرے کچن میں کیسے رکھا' جب کہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ اٹھاؤ اس کھانے کو اور باہر پھینکو۔" مالکن کی تیز آواز سنتے ہی ثریا نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔

"سارا محلہ جانتا ہے کہ وہ کس ٹائپ کی عورت ہے۔

سارا دن غیر مردوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اس کے گھر پر' میاں کا کوئی اتا پتا نہیں' اوپر سے حلیہ دیکھا ہے ان ماں بیٹیوں کا' ان کے گھر سے آیا حرام کا رزق تم میری اور میرے بچوں کی رگوں میں اتارنا چاہتی ہو۔"

"مگر باجی جی! آج تو ان کے گھر میلاد تھا۔ اور یہ کھانا میلاد کا ہے حرام کیسے ہو گیا؟" کم عقل ثریا' زنیو کی بات سمجھ نہ سکی اس لیے صفائی دیتے ہوئے بولی۔

"میں نے تم سے جو کہا ہے وہ کرو۔ حلال اور حرام

"یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟" کچن میں داخل ہوتے ہی بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو نے فوراً" ہی زنیو کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔

"وہ جی سامنے والی آنٹی ہیں نا کیا نام ہے ان کا؟" برتن دھوتی ثریا نے اپنے ہاتھ روک کر ایک پل کو سوچا۔

"گلنار آنٹی' ان کا ملازم دے کر گیا ہے۔"

"واٹ؟" ثریا کی بات سنتے ہی زنیو کو جیسے کرنٹ

کا فرق مت سمجھاؤ اور اٹھاؤ یہ کھانا باہر کوڑے دان میں ڈال کر آؤ۔"

اچھا جی۔" ثریا کا جواب سنتے ہی زنیو کچن سے باہر نکل گئی۔ اس کے باہر جاتے ہی ثریا نے جلدی سے چاولوں کی ڈش اٹھا کر شاپر میں انڈیلی۔ اور شاپر اپنے سامان میں چھپا دیا تاکہ گھر واپسی میں وہ یہ کھانا اپنے بچوں کے لیے لے جاسکے، کیوں کہ وہ ایک غریب عورت تھی جس کی سارے دن کی محنت کا مقصد محض اپنے بچوں کا پیٹ پالنا تھا جو وہ حلال و حرام کے چکر میں الجھے بنا کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آنٹی گلنار دو سال قبل ہی ان کے محلے میں شفٹ ہوئی تھیں اور انہوں نے زنیو کے گھر کے بالکل سامنے والا گھر خریدا تھا۔ یہی وجہ تھی جو اکثر ٹیرس پر بیٹھی زنیو ان کے گھر کا نظارہ کرتی رہتی۔ کون آرہا ہے اور کون جارہا ہے۔ نادانستہ طور پر اس کی نظر اس سارے امر پر رہتی۔ شروع دن سے وہ جانتی تھی کہ گلنار کا شوہر پاکستان سے باہر رہتا ہے اور یہ بات اسے آنٹی نے ایک دن خود بھی بتائی تھی جب وہ اتفاق سے پارک میں چہل قدمی کے دوران مل گئی تھیں، ساتھ یہ بھی بتایا کہ ان کی صرف دو بیٹیاں ہیں جب کہ اولاد نرینہ سے وہ محروم ہیں۔ شروع شروع میں تو زنیو ان سے بات کرلیا کرتی، مگر پھر اسے آنٹی کے گھر ہر دم مردوں کا آنا جانا کچھ عجیب لگنے لگا۔ اوپر سے اس عمر میں ان کا جینز اور کرتا پہن کر بنا دوپٹے کے پھرنا گہرا میک اپ غرض بہت ساری ایسی باتیں تھیں جو آہستہ آہستہ زنیو کو ناگوار گزرنے لگیں۔

اور ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ سردیوں کی رات تھی جب وہ عشا کی نماز کے بعد حسب عادت ٹیرس پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی سامنے چھائے گہرے اندھیرے میں ایک کار آنٹی کے گھر کے سامنے آکر رکی۔ جس میں سے ان کی بڑی بیٹی شہنیل برآمد ہوئی بغیر آستینوں کی مختصر سی قمیص کے ساتھ بنا دوپٹا وہ کسی نوجوان کے ہمراہ تھی، جو اسے گیٹ پر اتار کر چلتا بنا۔

بس اس دن سے زنیو ہر پل آنٹی کی کھوج میں رہنے لگی۔ یہ جانے بنا کہ ہمارے مذہب میں دوسروں کے گھر اس طرح تانکا جھانکی کرنا بھی منع ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس نے آنٹی گلنار سے قطع تعلقی اختیار کرلی۔ اب اگر کبھی وہ اسے گلی میں کہیں مل جاتیں تو زنیو انہیں بالکل نظر انداز کردیتی۔ شروع شروع میں ان کی دونوں بیٹیاں زنیو کو سلام کرلیا کرتی تھیں، پھر وہ بھی اسے دیکھ کر ایسے ہوجاتیں جیسے دیکھا ہی نہ ہو، سونے پر سہاگہ زنیو نے دو ماہ قبل ایک دینی مدرسے میں داخلہ لے لیا تھا، جہاں معلمہ باجی نے حلال اور حرام کے بارے میں اتنا اچھا درس دیا جو سمجھو زنیو کی رگوں میں اتر گیا۔ وہ جان گئی کہ حرام کا ایک لقمہ بھی اولاد کے حلق سے اتر جائے تو وہ ہر اچھائی برائی بھول جاتی ہے بس پھر کیا تھا۔ اب وہ ہر ممکن کوشش کرتی کہ اس کے بچوں کا حلق حرام کے لقمے سے تر نہ ہو۔ یہی وجہ تھی جو آنٹی کے گھر سے آئی بریانی نے اسے اس قدر سلگا دیا کہ وہ بنا سوچے سمجھے ثریا کو بے نقط سناگئی جب کہ اس سارے معاملے میں اس بے چاری کا کوئی قصور نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ابھی ابھی درس لے کر گھر لوٹی تھی۔ آج کا درس بچوں کی تربیت سے متعلق تھا۔ آہستہ آہستہ وہ جان چکی تھی کہ نیک اولاد جو والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہوتی ہے اسے نیک بنانا بھی ایک اچھے ماں باپ کی ذمہ داری ہے اور اسے خوشی تھی کہ وہ اور جواد اپنی اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی پورا کررہے تھے۔ عبایہ اتار کر اس نے ٹیبل پر موجود جگ کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی، جگ واپس رکھ کر اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! ہمیں مسز جواد سے بات کرنی ہے۔" دوسری طرف سے ابھرنے والی اجنبی آواز میں

کچھ ایسا تھا جو وہ ایک پل کے لیے گھبرا گئی۔ فوراً سامنے موجود وال کلاک پر نظر ڈالی جو شام کے پانچ بجا رہی تھی اور ابھی تک جواد گھر نہ آیا تھا۔ ورنہ عام طور پر وہ تین بجے ہی گھر آجاتا تھا۔

"جی فرمائیں' میں مسز جواد ہی بات کررہی ہوں۔"

"محترمہ! میں اے ایس آئی نیب خواجہ علی نواز ہوں۔ آپ کے شوہر جواد صاحب میرے ہمراہ ہیں۔ جنہیں کچھ ضروری تفتیش کے لیے ہم اپنے آفس لے جارہے ہیں' ان شاءاللہ جیسے ہی ہمارا کام مکمل ہوا جواد صاحب بخیروعافیت گھر پہنچ جائیں گے۔"

بنا اس کا جواب سنے دوسری جانب سے کھٹاک کرکے فون بند کردیا گیا۔ جواد اور نیب وہ یک دم ہی گھبرا اٹھی۔ اسے اپنے شوہر کی ایمان داری پر پورا بھروسا تھا۔

ویسے بھی جواد کا تعلق جس حکومتی محکمہ سے تھا' وہ آج کل نیب کے زیر عتاب تھا اور یہ بات اسے جواد نے خود بتائی تھی کہ آئے دن نیب والوں کے چھاپے ان کے کام کو کس قدر متاثر کررہے ہیں۔ یہ ہی وجہ تھی جو پچھلے کچھ دنوں سے جواد پریشان تھا' مگر پھر بھی اس کے دل کو یقین تھا کہ اس ساری کارروائی میں جواد بے گناہ ثابت ہوگا اور ان شاءاللہ جلد ہی گھر واپس آجائے گا۔ یہ سوچ کر اس نے جلدی جلدی کھانا بنایا۔ بچوں کو ہوم ورک کرواکر کھانا کھلاکر' کچن سمیٹتے سمیٹتے اسے آٹھ بج گئے' مگر جواد گھر واپس نہ آیا جب کہ اس کا سیل فون بھی مسلسل بند جارہا تھا۔ وہ اس شہر میں بالکل تنہا تھی۔ جواد کے دونوں بھائی سعودیہ میں رہتے تھے اور زنیرہ کی فیملی اندرون پنجاب میں آباد تھی' چونکہ جواد کی ملازمت کراچی میں تھی اس لیے وہ دونوں کئی سالوں سے یہاں آباد تھے' جہاں انہیں کبھی اپنی تنہائی کا احساس نہ ہوا تھا سوائے آج کے' جب رات کے بڑھتے سائے نے اسے احساس دلایا کہ عزیز اور رشتہ دار جیسے بھی ہوں' کم از کم مصیبت کی گھڑی میں ساتھ ضرور ہوتے ہیں۔ اب وہ کہاں جاتی اور کس سے جاکر جواد کے بارے میں معلوم کرتی۔ اسی سوچ میں گھرے آدھی رات گزر گئی۔ دونوں بچے سوگئے جب کہ اس نے خود ساری رات جواد کے انتظار میں بتادی مگر وہ نہ آیا۔ صبح نو بجتے ہی وہ جواد کے آفس جا پہنچی جہاں ہر کام روزمرہ کے مطابق ہورہا تھا۔ آفس میں داخل ہوتے ہی اس کی ملاقات فصیح احمد سے ہوگئی جن سے وہ جواد کے حوالے سے پہلے بھی مل چکی تھی۔

"السلام علیکم۔۔۔۔ بھابھی خیریت' آپ یہاں کیسے؟"

برقعہ میں ملبوس' زنیرہ کو اپنے سامنے دیکھ کر فصیح حیرت زدہ رہ گیا اور جواباً" زنیرہ نے اسے جواد کی گمشدگی اور اس حوالے سے آنے والے فون کا بتادیا جو کسی نیب کے آفیسر کا تھا۔

"اوہ تو وہ ہی ہوا جس کا ڈر تھا۔" فصیح کے ہونٹوں پر لہرانے والی طنزیہ مسکراہٹ زنیرہ کو کچھ عجیب سی محسوس ہوئی۔

"مجھے تو پہلے ہی خدشہ تھا کہ ایسا ہوگا' معاف کرنا بھابھی' میں جواد کو ہمیشہ منع کرتا رہا کہ وہ رشوت لینے سے گریز کرے' مگر کیا کہوں اس نے میری ایک نہ سنی اور آج وہ آخر نیب کے شکنجے میں پھنس ہی گیا۔"

"جواد اور رشوت! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟" حیرت کے شدید جھٹکے نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔

"کیوں؟ کیا آپ نہیں جانتیں کہ جواد کا خرچا اس کی ماہانہ تنخواہ سے کہیں زیادہ تھا۔" فصیح نے زنیرہ کو دیکھتے ہوئے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا اور زنیرہ جو سارے زمانے کی خبر رکھتی تھی' اپنے شوہر کی آمدنی اور خرچ کا حساب بھی نہ رکھ سکی۔ اسی سوچ نے اسے جی بھر کے شرمندہ کیا۔

"مگر جواد نے تو کہا تھا کہ نیب کی یہ کارروائی محکمہ جاتی ہے۔" فصیح کے سوال کو قدرے نظرانداز کرکے وہ دھیمی آواز میں بڑبڑائی۔

"ظاہر ہے' رشوت وہ محکمہ کے ملازم کی حیثیت سے لیتا تھا تو کارروائی بھی محکمہ جاتی ہی ہوگی۔"

اب کوئی سوال کرنا بے کار تھا۔ وہ وہیں سے واپس پلٹ آئی۔ تھکے تھکے قدموں سے مین روڈ تک پہنچی اور جانے کیسے رکشہ لے کر گھر آئی۔ آفس سے گھر تک واپسی کا سفر اس نے روتے ہوئے طے کیا اور جیسے

ہی رکشہ گھر کے گیٹ کے سامنے رکا‘ ایک دم ہی آنٹی گلنار اس کے سامنے آگئیں۔

”ہیلو زنیرہ! ہاؤ آر یو....“ زنیرہ کے جواب کا انتظار کیے بنا انہوں نے خیریت بھی دریافت کرلی‘ کیوں کہ وہ ایسی ہی تھیں‘ جب ملتیں زنیرہ کے سرد رویے کو نظرانداز کردیتیں۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ جواب کے ساتھ بھل بھل آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے اور پھر کب آنٹی اسے اپنے گھر لے کر گئیں۔ اسے علم ہی نہ ہوسکا‘ کیوں کہ اس پل اسے رونے کے لیے کسی ہمدرد کندھے کی ضرورت تھی اور وہ کندھا آنٹی گلنار نے اسے مہیا کردیا۔ اپنا دل ہلکا کرنے کے لیے اس نے جواد کے حوالے سے ساری بات انہیں بتادی کیوں کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جانتی تھی کہ ایسی خبریں زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہتیں اور جلد ہی سارے محلے کو جواد کی گرفتاری کا علم ہونے والا تھا۔

”میں کوشش کرتی ہوں شاید تمہارے کسی کام آسکوں۔ ویسے میرا شوہر غیرملکی سفارت خانے میں ہوتا ہے۔ ممکن ہے اگر وہ پاکستان ہوتا تو تمہارے کسی کام آجاتا‘ مگر چونکہ پچھلے دو سالوں سے ہمارے درمیان مکمل علیحدگی ہوچکی ہے‘ اس لیے اس وقت میں اسے کال کر کے تمہاری کوئی بات ڈسکس نہیں کرسکتی۔“ آنٹی نے مسکراتے ہوئے زنیرہ کی جانب دیکھا۔

”اس عمر میں جوان بیٹیوں کے ہوتے ہوئے آپ کے شوہر نے آپ کو چھوڑ دیا۔ حیرت ہے؟“ اپنا دکھ بھول کر وہ گلنار کے دکھ میں شریک ہوگئی۔

”ہاں ڈیئر! اسے عشق ہوگیا تھا‘ وہ بھی اپنی بیٹی کی دوست سے‘ جس سے شادی کر کے وہ غیرملک جابسا۔“

”اوہ....“ اس انکشاف نے زنیرہ کو حیران کردیا۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو رشتوں کا تقدس نبھانا نہیں جانتے۔ ایک ہی پل میں اسے اپنے سامنے بیٹھی عورت دنیا کی مظلوم ترین عورت محسوس ہوئی‘ جس کے شوہر نے اس سے عمر میں کم از کم بیس بائیس سال چھوٹی لڑکی کو اس کی سوتن کے عہدہ پر فائز کردیا۔

”وہ تو چاہتا تھا کہ ہم دونوں ساتھ رہ لیں‘ مگر میری انا نے یہ گوارہ نہ کیا اور میں اسے چھوڑ کر علیحدہ ہوگئی۔“

”پھر آپ اپنے گھر کا خرچ وغیرہ کیسے پورا کرتی ہیں؟“ تو یہ وجوہات تھیں جنہوں نے آنٹی کو غلط راہ پر لگا دیا۔ جس میں سراسر سارا قصور ان کے شوہر کا تھا۔ زنیرہ کے دل میں موجود بدگمانی‘ آنٹی کے اگلے جملے نے ہی دور کردی۔

”میں پراپرٹی کا کام کرتی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ کیٹرنگ بھی کرتی ہوں۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ والا کمرہ میرا آفس ہے۔“ آنٹی بدستور مسکرا رہی تھیں‘ ایسے جیسے وہ زنیرہ کے دل کے حال سے بخوبی واقف ہوں۔

”چونکہ میری بچیاں گھر میں تنہا ہوتی ہیں‘ اس لیے سارا دن گھر سے باہر رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا لہٰذا جو بھی کوئی کام ہوتا ہے‘ میں گھر سے ہی کرتی ہوں اور آج کل تو میں نے انٹیریئر ڈیکوریشن کا کام بھی شروع کردیا ہے۔ دعا کرو اللہ مجھے اس میں بھی کامیاب کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ مردوں کے ساتھ رہ رہ کر میں خود بھی مرد بن گئی ہوں۔ عورتوں والی خصلت تو جانے کہاں جا چھپی ہے۔ گھر میں بھی چھ بھائی ہیں‘ بہن کوئی نہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ سارے بھائی وقتاً فوقتاً میری خبرگیری کے لیے آتے رہتے ہیں۔ شہنیل کا نکاح بھی میرے بھائی کے بیٹے سے ہوچکا ہے جو اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے‘ اسی لیے اس کے پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری بھی وہ ہی پوری کرتا ہے۔“

ایک کے بعد ایک بات کھلتی چلی گئی۔ زنیرہ کے دماغ میں موجود ساری گرہیں کھل کر واضح ہوگئیں۔ جیسا وہ سمجھ رہی تھی ویسا نہ تھا اور جو اسے پتا نہ تھا وہ کھل کر سامنے آگیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی اس کی رگوں میں اتر گیا کہ دوسروں کے گھر کی ٹوہ میں وہ خود اپنے گھر سے اسی طرح بے خبر ہوئی کہ کب حرام اس کی اولاد کے حلق سے نیچے اترا‘ اسے علم ہی نہ ہوسکا اور جب وہ دوپہر ڈھلے گھر واپس آئی تو ایک بدلی ہوئی زنیرہ تھی جو آنٹی کے گھر سے کھانا بھی کھا آئی تھی کیوں کہ وہ جان چکی تھی کہ دلوں کے بھید صرف وہ ہی جانتا ہے جو سب کا مالک و مختار ہے۔ ☆

سائرہ رضا

حسن آراء ہے اور....

دنیا ختم کردی گئی تھی۔ ہر شے اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ اب بس یہی دو جان دار باقی تھے۔ ایک آگ اگلتا، ہاتھ کی اونچائی جتنا بلند سورج اور تپتی ریت پر چاروں شانے چت وہ......

اس کی یادداشت جواب دے چکی تھی۔ بھوک، پیاس، چھاؤں، سکون، ٹھنڈک، ہوا وہ ان چیزوں کو بھول چکا تھا۔

اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ اسی کے ساتھ کیوں؟ یہ سوال بھی ذہن سے محو ہو گیا۔ اسے اپنا نام بھول چکا تھا، مقام، عہدہ، شخصیت، رشتے، محبت، نفرت......

اس کے جسم میں پانی کی شدید ترین کمی بلکہ اختتام ہو چکا تھا۔ اب جسم کے کسی بھی حصے میں نمی کا شائبہ بھی نہ تھا، مگر پلکوں کی چپ چپاہٹ ایک مزہ دے رہی تھی۔ خود اذیتی۔ اس کا جسم پھوڑوں اور پھنسیوں سے بھرا تھا اور آنکھیں اتنی سوجی جیسے کیچی کے دو سرخ ٹکڑے، آنکھ کے پاس ہی کوئی پھنسی پھوٹی تھی۔ مکھیاں اس کے اوپر بھن بھن کرتی گردش کر رہی تھیں، وہ اس کے پھوڑوں پر چپکی ہوئی تھیں اور اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ ہاتھ مار دیتا یا پھر خود کو ہلکی سی حرکت دے پاتا کہ مکھیاں بس پل بھر ہی کو اڑان

بھر لیں۔

اور ساری دنیا اپنے معمولات خوشیوں، غموں مصروفیت کے ہمراہ رواں دواں ہوگی کسے خبر کہ اس نے کس کسمپرسی کے عالم میں جان دی۔

کوئی اس کا مددگار نہیں۔۔۔

کسی کو اس کی خبر نہیں۔۔۔

موت بے کسی، اور بے بسی ہی ہے، مگر اتنی بھیانک شکل اور اس کی اس حالت کے لیے دنیا کی کسی زبان میں کوئی مثال نہیں ہوگی۔

موت مقرر ہے نہ ایک منٹ پیشتر نہ پیچھے۔۔۔ کاش وہ اپنی جان لے سکتا، مگر اس میں کسی بھی عمل کی جرات نہیں تھی۔

دہکتے آگ کے گولے کو دیکھنا ناممکن تھا۔ اس نے پلکیں سختی سے بند کر رکھی تھیں اور بند آنکھوں کے پیچھے ایک چہرہ تھا اور حیرت تھی وہ سب بھول کر بھی اس چہرہ کو نہیں بھول پایا تھا۔ اس سے اس کا کیا رشتہ تھا؟ اور امید و بیم سے تکتا ایک اور چہرہ وہ کس کا تھا، پتا نہیں۔۔۔ لیکن اس کے الفاظ من و عن یاد تھے۔

وہ اس وقت انہیں نہیں سمجھا تھا، پھر اب اچانک حسب حال کیوں لگنے لگے۔

"مجھے لگا" میں نے زندگی بھر پھول چُنے۔ کپاس کے پھول۔ یہ چمکیلے سفید بڑے پھول پھولے پھولے چاندی جیسے، میری پشت پر ٹنگا جھولا بھر گیا، پر گھر پہنچتے پہنچتے بارش پڑ گئی میرے کندھے کا وزن تو سوچو۔۔۔

اور میرے پھول، نہ رکھنے کے قابل، نہ جلانے کے لیے، نہ چھپانے کے لیے۔"

اسے ان آخری پلوں میں کسی کے جملے یاد آئے حسب حال لگے۔

اور اللہ اسے کیوں بچائے۔ اس نے اللہ کے لیے کیا کیا تھا کب۔۔۔ کبھی۔۔۔ ایک پل کے لیے، ایک جنبش اور اللہ تو انہیں بھی واپس بلا لیتا ہے۔ جو اس کے لیے اس کی مخلوق کے لیے باعث خیر ہوتے ہیں تو پھر

مکمل ناول

اس کے پاس؟ اگر اسے زندگی دے دی جائے تو کیا کرے گا تم کیا اس کے پاس ایسا کوئی عمل ہے جس کے بدلے وہ رحم مانگ لے وہ زندگی مانگ لے۔

لیکن اس نے پچھلی زندگی کا کیا؟ جو اللہ اسے کیوں زندگی دے....؟

زندگی ایسے تو نہیں گزارتے جیسے اس نے گزاری... اچھا تو پھر کیسے گزارنی چاہیے... پتا نہیں۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں۔

اور اللہ اگر تو مجھے بچالے تو... وہ چیخنا چاہتا تھا، مگر یہ بھی ایک خواب تھا کہ وہ ہونٹ بھی ہلا سکے گا۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک کی تمام زندگی اور اس کا ہر پل اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ تمام چہرے تمام لوگ... تمام اعمال...

کہتے ہیں۔ مرنے سے چند لمحے پہلے پوری زندگی کسی فلم کی طرح نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے تو کیا... وہ مرنے والا ہے؟ اتنی گمنامی کی موت... نہ کفن... نہ قبر... دنیا جہان کی تھاں خوب مزے سے دوڑ رہی ہے۔ "نہیں... نہیں... اے اللہ... اے اللہ... مجھے بچالے..." وہ اللہ جانے کیسے حلق کے بل چلایا تھا۔ "اے اللہ مجھے بخش دے... مجھے معاف کردے... اے اللہ مجھے بچالے۔" وہ بے دم ہو گیا تھا۔

اس نے باقی دونوں سے داد چاہی اور پھر ان تینوں کو ہنستا دیکھ کر حلیمہ بھی ہنس پڑی۔

"میں نے اس تاریخ کا پوچھا ہے۔ یہ ہمارا سبجیکٹ، ہسٹری۔" حلیمہ نے کتاب لہرائی۔

"ہاں ہاں، ہسٹری یہی ہسٹری اور میں اس جواب کو تمہیں اردو، انگلش، سندھی اور پنجابی میں بھی بتا سکتی ہوں۔" ماہ رو چنے کی چاٹ میں سے چن چن کر پیاز الگ کرتے ہوئے مزے سے بولی۔

"اتنی بہت سی زبانیں...؟" اریبہ کی آنکھوں میں ستائش اتر آئی۔ وہ فوراً "متاثر ہو گئی تھی بلکہ نہیں ماہ رو کی ہر حرکت ان تینوں کو ہر بار نئے سرے سے حیران کرتی تھی۔

"کیسے بھلا! تمہیں کب آئیں اتنی زبانیں۔ بتاؤ ذرا..." حسنل کو ان دونوں کی مرعوبیت ایک آنکھ نہ بھائی۔

"ویری سمپل یار!" ماہ رو نے گردن ہلائی۔ "اردو قومی اور مادری، پنجابی فادری زبان ہے۔"

"سندھی کیسے؟" حلیمہ نے بات کاٹی۔

"سندھی قاعدی زبان ہے یار! تیسری جماعت میں پڑھنی شروع کی۔ ھی پوترو آھی۔ ھی... نانتھ کے بورڈ کا پیپر تھا یار میں تو چھ بجے والا "ناٹک رنگ" بھی دیکھ لیتی تھی قسم سے۔"

اس کا انداز سب کو مزہ دے رہا تھا۔

"اور انگلش کون سی زبان ہے؟"

☼ ☼ ☼

وہ چاروں بڑی فرصت اور بے فکری سے کینٹین کے باہر بنے چبوترے پر براجمان تھیں۔ حلیمہ نئی خریدی ہوئی کورس کی کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ باقی تینوں کا دھیان کھانے پینے پر تھا۔

"اچھا تو پھر تاریخ کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس بار تو تمام "عباسیوں" کو..."

"آج نو تاریخ ہے۔ آٹھ گزر چکی اور کل دس آجائے گی۔ ہاہاہا۔" ماہ رو نے لاپروا انداز سے سر ہلایا پھر

"وہ پادری کی زبان ہے یار..."

"ہاہ..." حلیمہ کو کرنٹ لگا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے ماہ رو کا چہرہ دیکھنے لگی۔ چاٹ کی مشترکہ پلیٹ میں چمچ کرنٹ کھائے انداز میں چھوڑ دیا تھا۔ باقی دونوں کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں (دو سال میں پہلے تو کبھی)

"چچ... پاگل ہو تم لوگ، ہمارے پڑوسی ہیں اور پڑوسی کے حقوق سے کیسے انکار۔" ماہ رو کی آنکھیں

سرخ ہونے لگی تھیں۔ گلا بے حد بھاری۔
"تو تم ان سے ملتی ہو؟" حلیمہ بمشکل بولی۔
"ہاں تو کیا حرج ہے ملتی ہوں نا، قسم سے کیا آدمی ہیں زبردست... چاکلیٹ دیتے ہیں ہمیشہ سے..."
"اور تم لے لیتی ہو؟" حلیمہ مذہبی معاملات میں کسی حد تک انتہا پسند تھی۔
"ہاں تو اور کیا۔ کوئی چاکلیٹ کو منع کرتا ہے۔ کتنا گناہ ملتا ہے پتا ہے۔"
"اور وہ اتنے کالے ہیں... اتنے کالے... جیسے جیسے سنگھاڑے، جیسے الٹا توا... لیکن میں نے آج تک کسی سیدھے توے کو بھی گورا نہیں دیکھا۔ تم لوگوں نے دیکھا؟ خیر جانے دو... اور آگے سنو۔ ان سے چار ہاتھ آگے کالے ان کے بیٹے، مگر شکر ہے، وہ یہاں نہیں ہوتے۔ نقص امن کا خدشہ یار!" اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔
"اب اتنا کالا بھی کوئی کیسے ہو سکتا ہے۔" حسنل کی دلچسپی تو عروج پر تھی۔ نروٹھے پن سے کہا۔ "نقص امن ہو نہہ!"

"اوہو نقص امن کالے ہونے کی وجہ سے تھوڑی کہا وہ تو ہیں ٹال، ڈارک اینڈ ہینڈسم بلکہ اگر اس حلیمہ کی توبہ تلانہ شروع ہو تو کہوں... بلکہ تم اس کے کانوں پر ہاتھ رکھو... چلو رکھو۔"
ماہ رو نے حکم دیا۔ اریبہ نے ترنت تعمیل کی، مگر بس دکھاوے کو، سنائی سب دے رہا تھا۔
"ان کو دیکھ کر تو دل کی دھڑکن رکنے لگتی ہے واہ۔"
"تمہیں کیا ہو گیا ہے ماہ رو آج...!" حلیمہ کو اچھو لگ گیا۔ ساری پیپسی بوچھاڑ کی صورت باہر نکلی۔ وہ ناقابل فہم نگاہوں سے چہرہ پونچھتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔
"انسان بنو ماہ رو...!" حلیمہ نے زچ ہو کر تاریخ اسلام کی موٹی کتاب اس کے سر پر دے ماری۔

☼ ☼ ☼
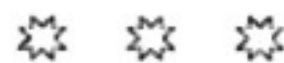
وہ اپنے پسینے سے تر چہرے بالوں اور گردن کو سفید تولیے سے رگڑتا دیوار گیر قد آدم آئینے کے پاس آکر ٹھہر گیا۔ پسینہ پلکوں پر ٹکا تھا آنکھوں میں چبھن دینے لگا۔ وہ واش روم میں گھسا اور فقط آنکھیں دھو کر دوبارہ آئینے کے سامنے ایستادہ ہو گیا۔
اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور چہرہ سرخ۔ دو گھنٹے جم میں گزارنے کے بعد تھکان تو تھی، مگر نڈھال ہرگز نہیں...
اس نے فریج سے پانی کی سیل لگی بوتل نکال کر منہ سے لگائی اور جدید میوزک سسٹم کو ریموٹ سے آن کیا۔ نصرت فتح علی کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔
وہ آرام دہ کرسی پر بہت پرسکون حالت میں نیم دراز ہو گیا۔ آنکھیں موندلیں۔ بائیں جانب شیشے کی چھت تک جڑی دیوار تھی اور دوسری جانب خوب صورت گیلری باہر جھاگ اڑاتا سمندر، لہریں ساحل سے لپٹ لپٹ واپس پلٹ رہی تھیں۔ وہ گیلری میں آگیا۔
سنہری ریلنگ پر دونوں ہاتھ ٹکا کر وہ بہت دور تک دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ ساحل الگ الگ شکل کے ہو سکتے ہیں، مگر سب سمندر ایک جیسے ہوتے ہیں۔

شوریدہ لہریں۔ ایک جیسا جھاگ، نمک، ریت اور واپسی کو تیار... ٹکتی نہیں... ساحل فقط اتنی اجازت دیتا ہے کہ اسے چھوؤ اور فوراً "پلٹ جاؤ۔" تو کیا اسے بھی واپس لوٹ جانا پڑے گا، لیکن اس نے کسی سے "لوٹ آنے" کا عہد نہیں کیا۔ یہ لہریں تو عہد پر کاربند رہنے پر مجبور ہیں، لیکن اس کی زندگی میں کوئی عہد نہیں، کوئی مجبوری نہیں۔ اس نے زندگی بنجاروں کی طرح گزاری۔

کیا ٹکنا اس کے نصیب میں نہیں۔

تمام زندگی اس کی نظروں میں گھوم گئی۔ شہر شہر، ملک ملک وہ کتنی جگہ گھوما، مگر کہیں دل نہیں لگا۔

دل لگانے کے ڈھیروں سامان بھی بس پل بھر کو خوشی دیتے، پھر وہ اکتا جاتا، بھاگ اٹھتا اور ہر بار نئی جگہ اسے نیا عزم دیتی کہ ہاں اسے یہیں آنا تھا یوں ہی رہنا ہوگا۔

مگر بس کچھ وقت بعد ہی... سمندر کی لہروں پر نظروں کے مسلسل ارتکاز نے اس کی آنکھوں میں جلن پیدا کردی۔ وہ خالی الذہنی کے عالم میں پلٹ آیا۔ وہ فریج کھول کر اندر جھانک رہا تھا۔ امپورٹڈ آئٹم سے ہر خانہ بھرا تھا۔ اس کے لیے انتخاب مشکل تھا پھر اس نے یوں ہی کوئی ڈبا اٹھالیا۔

چیز وہی تھی، مگر ذائقے میں کچھ فرق تھا، مگر پیٹ بھر رہا تھا۔

زندگی کے دن ایسے بھی پورے کیے جاسکتے ہیں کہ جیسے گزر جائیں گزار لو اس کے لیے نئی جگہ، نئے لوگوں، نئے کاموں میں مدغم ہونا کوئی دشوار نہیں تھا، لیکن مسئلہ اکتا جانے کا تھا۔ وہ ہر معاہدے کو بھول کر سامان باندھ لیتا تھا۔

کوئی ہو جو اسے کہیں بھی بس روک لے۔ وہ سفر کرکر کے تھک چکا ہے۔

فون کی گھنٹی بج رہی تھی اور وہ جانتا تھا کہ دوسری جانب کون ہوگا تو کیا وہ ان کی بات مان لے۔

"آزمانے میں کیا حرج ہے۔" دل و دماغ یک زبان بولے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس کی دنیا میں شناخت کا پہلا ذریعہ حسن و جمال تھا یا تو آپ کو خوب صورت ہونا چاہیے یا خوب صورت بن جانا... اس کے گردو پیش کا ہر چہرہ کسی نہ کسی حوالے سے سبحان اللہ کہنے کے لائق تھا۔

پر جیسا حسن آج نظروں کے سامنے آیا ویسا چہرہ... اس کے پورے وجود میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب نہ تھا۔ اسے لگتا تھا اس پر گہرے رنگ سجتے ہیں، مگر گہرے میرون کو کسی بھی مجسم پر اس طرح پہنا اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔

ان آنکھوں میں کاجل کی کوئی لکیر نہ تھی۔ سادہ خالی خالی مڑی پلکوں والی معصوم آنکھیں... بچوں جیسی معصومیت اور حیرانی... سنہری دوپٹے میں دمکتے کبوتر جیسے پیر... مخروطی انگلیاں بنا کسی آرائش کے دل کو شکنجے میں کس لینے کا ہنر جانتی تھیں۔

وہ اپنی سرتوڑ کوششوں کے آگے ہار گئی تھی۔ اس کی بے بسی نے اس کی آنکھوں کو ہر بار نم کیا تھا، لیکن اس نے سختی سے آنسو پونچھے تھے، مگر یہ سیل رواں کسی بند کے بس کی بات نہیں تھا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کا جسم ہچکیوں کی شدت سے لرز رہا تھا۔ وہ جھٹکے کھا کھا کر کسی بے بس بچے کی طرح روتی تھی۔

"میں نے زندگی میں کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا۔ (ہچکی) لوگ مجھے ضدی، ہٹ دھرم، کم عقل اور نجانے کیا کیا کہتے رہے، مگر کب میں نے کسی کی سنی تم سے مل کر میں موم بن گئی جیسے مرضی ڈھال لو (ہچکی)

جیسے تم چاہو، جیسے تم کہو، جو تمہاری مرضی، تم صحیح میں غلط... میں نے عہد کرلیا تھا تمہارے ساتھ رہنا ہے۔ تمہاری خوشی میں خوش اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ میں تمہیں کبھی پا نہیں سکتی، مگر اس طرح سے کھو دوں گی۔ ہونہہ ہونہہ!"

اس نے اپنا ہاتھ سر پر مارنا شروع کردیا۔ وہ صوفے

میں دھنسی تھی اور سامنے ڈریسنگ کے آئینے میں اس کا بکھرا تڑپتا وجود... کسی بھی دیکھنے والے کے دل کو مسل سکتا تھا۔

"پہلے بھی ایک کمپرومائز کیا تھا۔" وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر محو گفتگو تھی۔ "اور صحیح کیا' میرا فیصلہ درست تھا' میں اس راہ پر تمام زندگی چلنے کو راضی تھی خوش' مگر کبھی دھیان ہی نہ دیا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے یوں بھی ہوتا ہے۔ ساری عقل شعور' مکاری دھری کی دھری رہ گئی۔ قسمت سے بے وقوف جھگڑتا ہے۔ وہ بن جاتی بے وقوف... ہنسی خوشی کملی کہلوا لیتی' مگر لڑ پڑتی' منہ نوچ لیتی۔ اگر جو قسمت مجسم ہو جاتی۔"

اس نے لمبا سانس لیا۔ جیسے کمرے میں آکسیجن کم ہو گئی ہو اور سانس لینے میں سخت دشواری کا سامنا ہو۔ وہ تیزی سے اٹھی اور میرون دبیز پردے جیسے نوچ کر کھڑکی سے ہٹا دیے وہ پٹ کھول کر اپنے پھیپھڑوں کو ہوا سے بھر لینا چاہتی تھی' مگر اس سے پہلے ہی نظر پردوں کے رنگ پر ٹھہر گئی۔ میرون پردے جن میں مدھم سا سنہرا تار تھا۔

میرون رنگ... اس کا پسندیدہ رنگ تھا۔ اس کمرے کی ہر چیز میں نمایاں تھا' مگر اس نے بھی تو میرون لباس زیب تن کر رکھا تھا نا۔ اس نے کبھی کسی پر اس رنگ کو ایسا سجتا نہ دیکھا تھا۔ اسے اس رنگ سے اب زندگی بھر کے لیے نفرت ہو گئی تھی۔

وہ پردے نوچ کر پھینک دیتی تو کارپٹ اور کشنز اور وہ بھاگ کر کامن روم میں نکل آئی۔ صوفے پر ڈھے گئی۔ کچھ افاقہ محسوس ہوا تب ہی نگاہ صوفے پر گئی۔ میرون سادہ مخمل اور میرون سیاہ و سنہرا وال پیپر۔

"اوہ... اللہ نہیں۔" اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر آنکھیں میچ لیں' مگر بند آنکھیں تو تصورات کو اور واضح کر دیتی ہیں نا۔

اس نے ایسے بدک کر آنکھیں کھولی تھیں جیسے پیر کے تلوے کو سانپ نے اپنی زبان سے چاٹ لیا ہو۔ اس نے پیر اوپر کر لیے پھر گھٹنوں میں سر دے کر لرزنے لگی۔

"وہ تمہارے بازوؤں میں اس نازک وجود کو دیکھتا... آہ!" اس نے زور زور سے اپنے گال پیٹنے شروع کر دیے۔

وہ بین ڈال رہی تھی۔ عجب ناقابل فہم الفاظ کے ساتھ...

وہاں سے بھاگ کر گھر تک نجانے کیسے صحیح سلامت پہنچ گئی تھی کہ گھر جائے پناہ ہوتا ہے۔ اب گھر سے بھاگ کر کہاں جائے۔

☼ ☼ ☼

قد اتنا چھوٹا نہیں تھا' مگر اب اس عمر میں بڑھاپے اور موٹاپے کے باعث چھوٹا محسوس ہونے لگا تھا۔ کالر کے بغیر' سفید کھلے بازوؤں کا کرتا دونوں پہلوؤں میں جیبیں' سفید اونچی شلوار۔ پیروں میں شوگر کے مریضوں کی دانے دار ہوائی چپل' سر پر ٹکی ٹوپی اور اس پر سفید ریش۔

وہ جاگنگ ٹریک پر بھاگ رہے تھے' مگر ان کا بھاگنا یوں تھا جیسے پیچھے کوئی خون خوار جانور لگ گیا ہو' جیسے وہ کسی سے بھاگ رہے ہوں۔ جیسے ان کا پیچھا کیا جا رہا ہو۔

"تیز تیز چلنا ہوتا ہے... ارد گرد کے مناظر سے محظوظ ہوتے ہوئے بھاگا نہیں جاتا۔ جناب تو باقاعدہ خوف زدہ لگ رہے ہیں۔"

محی الدین سہگل ایک دم ان کے سامنے آ رکے۔ وہ بمشکل رکے۔ ہلکا سا چونکے پھر پرسکون ہو گئے آج بہت دنوں بعد انہیں دیکھا تھا۔

محی الدین حسب معمول بے حد اسمارٹ' لمبے گورے اور فریش تھے۔ وہ سرخ رنگ کے ٹریک سوٹ میں ملبوس تھے۔ بال گرے تھے' مگر سفیدی کی جانب رواں۔ ٹھوڑی پر ٹکی فرنچ کٹ ان پر سجتی تھی۔ آنکھوں پر سنہری فریم کی نازک عینک تھی۔

وہ دونوں اب ایک ساتھ چلنا شروع ہوئے تھے اور پھولتی سانسوں کے درمیان وہ ماجرا بیان کرنے لگے۔

"میں ڈاکٹر کو قائل کر کر کے ہار گیا... وہ کہتا ہے...

روزانہ کھلی فضا میں کم از کم ایک گھنٹہ چلوں۔ شوگر بلڈ پریشر سب رفو چکر ہو جائے گا۔۔۔ اب تم۔۔۔ کہو۔۔۔ میرا تو خیال ہے۔۔۔ بلکہ خیال کیا یقین ہے کہ پانچ وقت نماز۔۔۔ پڑھنے والوں۔۔۔ کو اس واک۔۔۔ ورزش وغیرہ کی ضرورت۔۔۔ نہیں پڑ سکتی' مگر۔۔۔ وہ۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔" وہ چلتے رکتے۔۔۔ پھولتی ٹوٹتی سانسوں کے ساتھ اپنی رائے دے رہے تھے۔

"مولانا! اپنے معمولات کی تشہیر کرنا اچھا نہیں نماز آپ کا ذاتی فعل نہیں ہے؟" محی الدین نے انہیں چھیڑا۔

"میں تو جناب ہی سے کہہ رہا ہوں۔ تشہیر اب ہوئی تو آپ ہی کی جانب سے ہوگی۔" وہ دو ٹوک بولے۔ محی الدین نے جان دار قہقہہ لگایا۔

"مولانا! خفا لگتے ہیں' مگر کس سے۔۔۔؟"

"ہماری خفگی کے کیا معنی؟ دنیا اپنی روش سے کب ہٹتی ہے دنیا اپنے ہٹیلے پن میں کتے کی دم سے بدتر ہے۔"

وہ قریب جمی بینچ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے۔ محی الدین نے بھی تقلید کی۔

"یہ پانی پیجیے۔" انہوں نے اپنے ہاتھ کی بوتل بڑھائی۔

"اب آپ جیسے سے بات کریں گے تو وہ فوراً" ہمیں تنگ نظر' تعصب زدہ کہہ دے گا۔ آپ اسلام کو یا اللہ نبی کے پیغام کو پس پشت بھی ڈال دیں۔ نعوذباللہ۔ تب بھی بتائیے' یہ سب جو یہاں بلکہ ہر جگہ ہو رہا ہے۔ کیا انسانیت کو زیب دیتا ہے' اب اگر میرا پوائنٹ آف ویو لیں تو میں کہوں گا۔ ان لڑکیوں اور ان خواتین کا یہ حلیہ مجھے انسانیت کی بھی توہین لگتا ہے۔ اللہ نبی کی حکم عدولی بھی اور سچ کہوں تو کیا شرفا کے یہ طور ہوتے ہیں۔ کوئی بھی غیرت وحمیت والا انسان یہ حیا سوز نظارے برداشت کیسے کر سکتا ہے؟"

اندر ہی اندر ابل رہے تھے۔ اب دوست مل گیا تو کہہ کر دل ہلکا کر دیا۔ محی الدین نے چونک کر حیا سوز نظارے ڈھونڈنے چاہے۔

"اتنی صبح صبح کون انسانیت کی توہین کر رہا ہے؟" متعجب نگاہیں جب ناکام لوٹیں تو ان ہی سے پوچھ لیا۔

"تو کیا یہ سب انسانیت کو زیب دیتا ہے؟" مفتی عبیدالرحمٰن نے چمک کر ڈیلے گھمائے۔ ان کی نظروں کے تعاقب میں محی الدین نے جب چہار اطراف دیکھا تو پھر اگلے پل وہ سب سمجھ گئے۔ ٹریک پر دوڑتے مرد وزن ان کی نظروں کا خصوصی ہدف ناریل کے پیڑ کے نیچے تھا۔ ہلکے گلابی اور ہلکے نیلے ٹریک سوٹ میں پونی ٹیل باندھے کانوں میں واک مین۔۔۔ وہ لڑکیاں آمنے سامنے کھڑی ایکسر سائز کر رہی تھیں۔ گلابی سوٹ والی جب سیدھی کھڑی ہو کر دونوں بازو اوپر اٹھاتی اور پھر دھیرے دھیرے واپس لاتے ہوئے اپنی انگلیوں کے پنجے کو چھوتی تو شرٹ پیچھے سے کھنچ جاتی۔

اسے نئی باری کرنے سے پہلے شرٹ نیچے اور ٹراؤزر ذرا اچھل کر اوپر کرنا پڑتا تھا۔ دونوں لڑکیاں بے حد اسمارٹ ہلبی پتلی تھیں۔ نیلے سوٹ والی دونوں ہاتھ کمر پر جمائے کبھی دائیں ہوتی کبھی بائیں۔

"لاحول ولا۔" مفتی صاحب کی خوف زدہ جھرجھری لیے ہوئی آواز محی الدین کو چونکا گئی۔ توبہ کا محرک دیکھ محی الدین کے لبوں پر مسکراہٹ کوندی تو فوراً" اس کا گلا گھونٹ لیا۔

محی الدین نے زندگی کا بیشتر حصہ مختلف ممالک میں گزارا تھا اور "سب کچھ" دیکھ رکھا تھا۔ مفتی صاحب کے لیے یہ سب نیا تھا۔ وہ ملک کے مشہور عالم دین تھے ایک بہت بڑے مدرسے کے سربراہ۔ ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ شامت ان کی یوں آئی کہ بلڈ پریشر اور شوگر کے ساتھ وزن بڑھ رہا تھا۔ کوئی ہارمونز کا مسئلہ تھا۔ گھٹنوں میں شدید درد ان کی روز مرہ زندگی میں چلنا نہ ہونے کے برابر تھا۔ ڈاکٹر کو تین ماہ لگ گئے یہ سمجھانے میں کہ ان کے لیے واک بے حد ضروری ہے۔ وہ طوعا" کرہا" ڈاکٹر کی مانے تو چند روز ہی میں گھٹنے کچھ فعال لگے اور صحت بہتر محسوس ہوئی۔ درد اب بھی تھا' مگر اب سکون دیتا تھا۔ وہ اپنے اندر چستی محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کا گھر تو نارتھ

میں تھا' مگر مدرسے کی ایک نئی شاخ یہاں ڈی ایچ اے میں قائم کی گئی تھی۔ مدرسہ زیادہ توجہ کا متقاضی تھا۔ وہ ہفتے کی دو راتیں یہیں قیام کرتے تو اس طرح وہ صبح واک کرنے کے لیے قریبی پارک آجایا کرتے یہ پارک گھر کے قریب پارک سے زیادہ بڑا' زیادہ خوب صورت ہرا بھرا اور عوام الناس کے رش سے پُر تھا۔ یہاں وہ زیادہ سکون محسوس کرتے تھے' وہ ملک کی جانی مانی شخصیت تھے ایک بڑے مدرسے کے سربراہ' ایک اکثریتی فرقے کے عالم' ان کے ساتھ سیکورٹی کا مسئلہ بھی تھا یہاں وہ زیادہ پرسکون ہو کر بے فکری سے واک کرتے۔ باہر گن مین اور دو پولیس اہلکار کھڑے رہتے تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا' مگر یہاں آنے والے مرد و زن بالخصوص لڑکیاں اور عورتیں۔۔۔ جیسے ان کی نگاہوں کو گناہ گار کرنے والی مذکورہ خاتون۔۔۔ محی الدین صاحب نے خاتون کو اک گہری نگاہ سے دیکھا اور پھر مفتی صاحب کو۔

"ادھر سے منہ موڑوں تو ادھر یہ لڑکیاں ہیں پیچھے دیکھو تو سارے احمق بلاوجہ قہقہے لگا رہے ہیں۔ پتا نہیں کس پاگل نے تحقیق کر ڈالی کہ صبح صبح ہریالی میں منہ پھاڑ پھاڑ کے ہنسو گے تو اچھا ہو گا' کوئی تھراپی ورابی ہے ہم نے تو بچپن سے ہی سن اور سمجھ رکھا ہے کہ قہقہہ شیطان کی صفت ہے' دل کو مردہ کر دیتا ہے۔ تبسم دل کی راحت اور چہرے کی خوب صورتی ہے۔ تمہیں علم ہے محی الدین قہقہہ چہرے کے عضلات کو بگاڑ دیتا ہے ناک پھیل جاتی ہے۔ ساری بتیسی کسی بن مانس کی طرح نمایاں ہو جاتی ہے آنکھیں بند اور تبسم چہرے کو جو خوب صورتی دیتا ہے وہ کسی اور تاثر سے مل نہیں پاتی۔ پتا نہیں یہ کافر کم عقل سارے پیسے ان بے سروپا تحقیقوں میں کیوں ضائع کر دیتے ہیں۔"

ان کے لہجے میں تاسف گھل گیا۔ قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔ محی الدین نے گردن موڑنے سے پرہیز کیا' مبادا ان کی اپنی ہنسی نہ نکل جائے۔

"اس کا مطلب ہے' آج کی صبح نے مفتی صاحب

پر کوئی خوش گوار تاثر قائم نہیں کیا۔"

"گزری رات بھی کون سی خبر لائی تھی۔" ان کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔" ــــ جماعت کے ہمراہ ساحل سمندر پر گئے تھے۔ دعوت حق دینے مسجد کی طرف بلانے' چوبیس گھنٹوں میں ایک گھنٹہ نماز کا۔۔۔ وہاں استغفراللہ۔ وہ وہ بے ہودگی دیکھی کہ شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ پہلے نوجوان ذرا سا جھینپ کر بات سن لیتے تھے۔ کچھ وقتی طور پر جان چھڑانے کے لیے ساتھ چل پڑتے تھے۔ اب دبے قدموں غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی قابل برداشت ہے ایک منچلے نے کل کہہ دیا۔

"مفتی صاب! ہم نماز کے واسطے تیار ہے پر یہ پرابلم ہے کہ ون آور ایک بار ہی ہو جائے جس کو جب ٹائم ملے وہ اپنی ساری نمازیں پڑھ لے۔ ٹائمنگ کے ساتھ چلنا تو بہت مشکل۔۔۔"

وہ محی الدین کے اسکول کے زمانے کے دوست تھے آج ایک بے حد معتبر مقام پر 'مگر اس طرح لہجے کی نقل اور جلا بھنا انداز بمشکل مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟"

"جواب کیا دینا تھا ــــ!" ان کی آواز پست ہو گئی۔

"جہالت غلاظت کی مانند ہوتی ہے اس کے اندر ہاتھ ڈالو تو یہ دلدل کی طرح اپنے اندر کھینچ لیتی ہے 'مگر اس وقت تو خون ہی کھول گیا۔ جو جواب میں دینا چاہتا تھا۔ وہ مدرسے کے ایک ہونہار نے کہہ دیا۔

"صبح' دوپہر' شام کھانا کیوں کھاتے ہیں۔ تینوں ٹائم کا ایک ہی بار کیوں نہیں؟"

"وہ لڑکا کیا بولا؟" محی الدین کو دلچسپی پیدا ہوئی۔

"کہنا کیا تھا ناخلف' بدلحاظ۔۔۔ گڈ آنسر مولی صاب آئی تھنک ایاوٹ دس اور بے ہودہ سی موٹر بائیک پر کک لگا یہ جا وہ جا۔ وہاں سے لوٹے تو انٹیریر منسٹری سے فون آگیا۔" آپ اس طرح سے کھلے مقامات پر نہ نکلا کریں۔ سیکورٹی کا مسئلہ ہوتا ہے' لیکن محی الدین! تم سن لو۔ میں جان بچانے کے لیے گلی کوچوں میں تبلیغ سے باز نہیں آسکتا' میں نے ساری عمر اسی ایک کام کے لیے وقف کر رکھی ہے اور اللہ کے راستے پر بلاتے ہوئے کسی ناہنجار کی گولی لگے تو سبحان اللہ۔۔۔۔ میں اس متوقع قاتل کو پہلے ہی معافی دے چکا ہوں۔ جو آپ کو شہادت کا درجہ دلوا دے وہ برا کیسے؟"

ان کے سرخ و سفید چہرے کا رنگ شہادت کی خوشی کا سوچ کر ــــ دمکنے لگا۔ محی الدین نے یہ جملہ دوسری بار ان کے منہ سے سنا تھا۔ وہ صحیح تھے یا غلط' مگر جملہ سن کر جو تصور بنتا تھا' وہ بڑا ہی اثر آفرین سحر انگیز تھا۔

قہقہوں کی آواز ایک بار پھر صبح کے سناٹے میں گونجنے لگی۔ سرخ روش پر بھاگتی لڑکیاں اور ان سے کچھ قدم پیچھے باتوں میں مگن لڑکے پھر ان کے سامنے سے گزرے۔ ناگواری اور غصے کی ایک لہر آنکھوں میں ٹھہر گئی۔

"مجھے لگتا ہے۔ میں ان سب تماشوں ہی کی وجہ سے واک کرنا چھوڑ دوں گا۔ ان سب کی موجودگی سے مجھے شدید الجھن اور ناگواری کا احساس ہوتا ہے۔" مفتی عبیدالرحمٰن نے دل کی بات کہی۔ قہقہے کے بارے میں ان کے کچھ منٹ پہلے کے بیان کو بھولتے ہوئے محی الدین صاحب نے دل کھول کر قہقہہ لگایا۔ مفتی صاحب نے ناگواری سے "چراغ تلے اندھیرے" کو دیکھا۔

"تم بہت اچھا کرو گے میرے دوست۔۔۔۔ ان سب میں سے بھی بیشتر تمہارے بارے میں ایسی ہی رائے رکھتے ہوں گے بلکہ انہیں تمہاری موجودگی سے تم سے زیادہ الجھن ہوتی ہو گی۔ مجھے تو ڈر ہے کوئی انتظامیہ سے شکایت نہ کر دے کہ مفتی صاحب آکر "خلل" ڈال دیتے ہیں۔ ہاہاہا۔"

"لاحول ولاقوۃ!" مفتی عبیدالرحمٰن کا سر گھوم گیا۔

"مجھے ان کے تو نہیں البتہ تمہارے خیالات یہی لگ رہے ہیں۔ تم اچھے خاصے اسمارٹ آدمی پارک کیوں آتے ہو۔" مفتی صاحب اپنے عہدے' رتبے تعلیم سے قطع نظر اس وقت صرف اپنے "دوست" سے محو گفتگو تھے۔

"ارے بھائی!" محی الدین کو پھر ہنسی آنے لگی۔

"میری جوانی کی عادت ہے۔۔۔ میں پارک آنا نہیں چھوڑ سکتا۔ بھلے سے میرے گھر میں بہت بڑا لان ہے۔ جم بھی بنا رکھا ہے' مگر اس طرح صبح صبح لوگوں کو دیکھنا' خاموشی سے چہرے پڑھنا میری سارے دن کی تنہائی کے لیے ایک ٹانک بن جاتا ہے۔"

محی الدین کے چہرے پر ملال گھل گیا۔ مفتی عبدالرحمٰن نے بھی اندر کی بات کو جان لیا۔ دوست کی پشت تھپتھپانے لگے۔

☼ ☼ ☼

"اے اولاد یعقوب کی۔ تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی اور اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تم کو تمام جہان والوں پر (خاص برتاؤ میں) فوقیت دی تھی۔" (البقرہ 46)

"میری بہن کی اس طرح منگنی یا نکاح طے ہو تو میں تو سارے جہان میں ڈھنڈورا پیٹ ڈالوں۔ یہ تم ہی ہو سکتی ہو جو اتنے ڈھیلے انداز میں اطلاع دے رہی ہو جیسے ہمارے گھر گیس میٹر چیک کرنے والا ریڈر آئے گا ہونہہ۔"

ماہ رو کو پتنگے لگ گئے۔ اریبہ اس کی بات سے سو فیصد متفق تھی۔ حلیمہ کو بھی اس کا نفس انداز پسند نہیں آیا تھا' جب کہ وہ حسنل سے' اس کے گھر کے ماحول' سب سے پوری طرح واقف تھی۔

"ماہ رو بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔ میرے لیے میری زندگی کا سب سے خوش کن دن وہ ہوگا جب اپیا اور بجو کے رشتے طے ہوں گے۔ میں تو اتنی خوشیاں مناؤں گی کہ بیان سے باہر ہے' وہ دن ہمارے گھر کے لیے سم سم کی چابی جیسا ہوگا جیسے ہی اپیا' بجو کے رشتے طے ہوں گے امی' ماموں سے نیو اور پھپھو سے غزل کو مانگ لیں گی بھائی جان اور عذیر کے لیے۔۔۔ پھر پیچھے کون رہ جائے گا میں سبیلہ اور شہیر بس۔۔۔ تمہیں پتا ہے نا ابو کہتے ہیں ہم تین شادیاں کریں گے اکٹھی۔۔۔ اپیا بجو اور بھائی جان کی۔۔۔"

اریبہ تم کو بھی اور بہت دھیمی سی' مگر اس موضوع پر یک دم اچھل پڑتی۔ تیز تیز بولنا شروع کر دیتی' خوش کن تصور اس کے چہرے پر روشنی بکھیر دیتا۔

"تو پھر کرو اپیا اور بجو کے رشتے۔ دیر کس لیے؟"

حسنل کا انداز بے زار ہی تھا۔

"یہ ہمارے ہاتھ میں کب ہے؟ رشتے اتنی آسانی سے کب طے ہوتے ہیں۔ میری امی تو بے حد پریشان ہیں۔" اریبہ کے چہرے کی روشنیاں بجھ گئیں۔

"میں نے دیکھی ہیں تمہاری بہنیں۔ اتنی پیاری تو ہیں۔ رشتے میں کیا قباحت ہے۔" حلیمہ نے پوچھا۔

"یہ خبر ہو تو قباحت دور نہ کرلیں۔ کسی کو ہم پسند نہیں آتے اور کوئی ہمیں۔۔۔ آپی مجھ سے دس سال بڑی ہیں یعنی انتیس برس کی۔۔۔ پھر بجو اور پھر بھائی جان۔ انہیں نیو پسند ہے۔ وہ اچھا کماتے ہیں۔ اسی لیے ممانی خاموش ہیں۔ انتظار کر رہی ہیں۔ ورنہ کون رکتا ہے۔"

"تو بھائی جان کی کرو۔" حسنل نے حل پیش کیا۔

"اول بھائی نہیں کریں گے۔ دوم امی نہیں مانیں گی۔ سوم ممانی کیوں دیں گی اتنے جنجال میں لڑکی اور نیو ابھی صرف ایف اے کی ہے۔"

"یعنی تمہاری ہم عمر تقریباً"۔۔۔ ماہ رو چیخی۔

"ہاں' لیکن وہ مجھے ایک چھوٹی بچی کی طرح ٹریٹ کرتی ہے اچھا ہے' ابھی شادی نہیں ہو رہی ہے ورنہ وہ ہماری زندگی کو مشکل ہی بنائے گی' مگر چھوڑو۔۔۔ بھائی جان کی زندگی تو خوشی اور آسانی سے بھرپور ہوگی۔ مجھے اپنے بہن بھائیوں سے بہت پیار ہے۔"

اس کے جملوں کے تاثرات چہرے کی لائٹ کو ہلکا گہرا کر رہے تھے۔ اس نے مسکرا کر چہرہ روشن کر دیا۔

"ارے واہ اریبہ عاقل! تو سچ مچ کی عاقل و بالغ بن گئی۔" ماہ رو نے شریر انداز میں اسے چھیڑا' اس کا انداز اور جملے کی گہرائی "عاقل و بالغ" اریبہ نے اپنا موٹا جرنل اس کے سر پر دے مارا۔ حلیمہ اور حسنل بھی زور سے ہنس پڑیں۔

"جانے دو یار! تم پر عاقل و بالغ ہی جچتا ہے۔" حلیمہ نے دل لگی کی۔ اریبہ نے ہار مان لی۔ حسنل نے

گنگناتی ماہ رو کو دیکھا۔ ماہ رو سے دوستی کالج میں آکر ہی ہوئی تھی۔ وہ پہلے ہی دن ٹیچرز کی نگاہوں میں اپنی جگہ بنا چکی تھی۔ ٹیچر نے حاضری رجسٹر اسے دیا کہ حروف تہجی کے اعتبار سے نام ترتیب سے لکھ کر دو۔ ماہ رو نے اگلے دن بلیک بورڈ پر خانے بنا دیے۔

"ارم نام کی پانچ لڑکیاں ہیں۔ صدف نام کی تین اور فائزہ نام کی چار... سب کھڑی ہو جاؤ۔"

اب لڑکیاں ساری تیز طرار تھیں، مگر اسکول سے نکلی جھجکتی ماہ رو کی خود اعتمادی کے آگے زیر۔ ماہ رو روسٹرم سے ایک قدم باہر نکلی سب کو گہری نگاہ سے جانچا۔ اگلے جملے کے لیے شعوری وقفہ دیا۔ "تم سب کے لیے میری پہلی اور آخری ہدایت۔"

اس کا لہجہ دبنگ اور چہرہ حد درجہ سنجیدہ... لڑکیاں متاثر... الرٹ... اب کیا کہے گی۔ کون سی ہدایت...

"اپنے باپوں کے نام یاد رکھو۔" اس نے روسٹرم پر زوردار ہتھیلی ماری۔ قہقہے چھت سے چپک گئے۔

"ایک اور لڑکی کھڑی ہو اور میرا دعوا ہے، وہ اپنے نام کا الٹ ہوگی۔ سنجیدہ کمال... ہے کلاس میں؟"

انتہائی اونگے بونگے حلیے والی چیونگ گم چباتی ڈھیلے مٹکاتی چھوٹے قد کی سلونی لڑکی... اس کے حلیے سے اندازہ ہوا وہ کس قدر "سنجیدہ" ہو سکتی ہے ایک اور ہنسی کا طوفان... (سنجیدہ کمال کی ماہ رو اور بعد میں اس سارے گروپ سے چڑ اور بے زاری رہی)

"بیٹھ جاؤ۔ اب پنی کھڑی ہو، مگر کھڑے ہونے سے پہلے اس کے بارے میں سن لیا جائے۔ یہ ممی ڈیڈی ٹائپ کوئی لڑکی ہوگی اور غالب گمان ہے یا تو اکلوتی ہے یا چھوٹی... چلو اسٹینڈ اپ!"

ساری کلاس کو سانپ سونگھ گیا۔ کیا ماہ رو ناموں سے شخصیت پہچانتی ہے؟ کیا یہ کوئی علم جانتی ہے؟

پنی ناک بھوں چڑھاتی کھڑی ہوئی۔ کلاس لوٹ پوٹ ہو گئی۔ وہ ہائے اوئی اف ٹائپ کی نخریلی نک چڑھی، نازک اندام حسینہ تھی اور اکلوتی تھی اور تین بھائیوں سے چھوٹی تھی۔ آدھی کلاس نے ماہ رو کے ہاتھوں بیعت کا سوچ لیا۔

"اب وہ لڑکی کھڑی ہوگی جس کا نام بے حد، بے پناہ خوب صورت ہے۔ میں نے ایسا نام اپنی پوری لائف میں کبھی نہ سنا، نہ دیکھا، نہ پڑھا اور میرا خیال ہے، جتنا اچھوتا یہ نام ہے اس کی مالکہ بھی اتنی ہی منفرد ہوگی ہاں تو... اب کھڑی ہوں... گی۔"

"میں کھڑی ہو چکی ہوں۔" ماہ رو کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ گڑیا جیسی گلابی اپنے نام جیسی اچھوتی لڑکی آخری ڈیسک سے کھڑی ہو چکی تھی۔

"آر یو شیور کہ میں نے تمہارا نام ہی لینا تھا؟" ماہ رو کی آنکھوں میں تحیر پھیلا۔ اس کی بولتی پہلی بار بند ہوئی تھی۔

"تم چیک کر لو۔" حسن پر ادائے بے نیازی۔ ماہ رو نے ہار مان لی۔

"حسن المآب!" ماہ رو بولی۔

"ولد عبدالمنان۔" حسنل نے والد کا نام بتا کر جملہ مکمل کیا اور سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ماہ رو نے سر دائیں بائیں ہلایا۔

"حسن بے پناہ کا جادو ہے یار! میں تو چاروں شانے چت۔" اس نے اپنا سر روسٹرم پر ٹکا دیا۔ کلاس پھر لوٹ پوٹ... "بھئی میں نے ہار مانی۔" وہ ہنسی۔

"اب جو نام پہلا ہے، وہ سن لے کہ کلاس میں ٹائم پر پہنچے۔"

"اریبہ عاقل۔" اس نے خوش خطی سے بلیک بورڈ پر لکھا۔ "اب قصہ کچھ یوں ہے۔" وہ بڑے نکتہ دان کی طرح کلاس کی سمت گھومی۔ لڑکیاں یوں ہمہ تن گوش تھیں جیسے کوئی پروفیسر کوئی بہت اہم پریڈ لے رہا ہو۔ "یہ نام اس طرح ہونا چاہیے۔ اریبہ عاقل و بالغ... پس اب سوال یہ بنتا ہے بچیو! (اریبہ اپنا نام سن کر جھینپی سی کھڑی تھی) اریبہ بی بی! آپ... ؟ عاقل تو آپ پیدا ہوتے ہی ہو گئیں البتہ بالغ..."

جملے کے اختتام پر اس کی ہنسی چھوٹ گئی دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ کے ہنستے ہوئے دہری ہو گئی۔ کلاس کی مشترکہ "اوہ" اریبہ کا چہرہ سرخ ماہ رو کو اچانک اریبہ کی پلکیں بھیگتی محسوس ہوئیں۔

"ارے یار....! تم تو سیریس ہو گئیں۔" اس نے اریبہ کے گرد بازو پھیلایا۔ "جسٹ جوک۔ یہ کوئی رونے کی بات ہے؟ تم تو یار عاقل ہو اب مجھے دیکھو۔ مجھ پر نام کا قطعا" اثر نہیں۔ نام ہے۔ ماہ رو فیاض اور ابھی ہماری دوستی کی خوشی میں کینٹن میں سموسے تم کھلا رہی ہو کیسا؟"

اس کے انداز پر اریبہ بے ساختہ ہنس دی۔

"کیا تم ہمیں جوائن کرو گی؟" اس نے حسنل کو مخاطب کیا تھا۔ بیگ کندھے پر ٹکاتی حسنل نے ایک پل سوچا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی ہم زاد۔

اور یہ ماہ رو فیاض تھی۔ بے پناہ پُرکشش لڑکی تھی۔ کالج آکر دوستی ہوئی تھی۔

وہ دبلی پتلی، ہلکی گندمی رنگت اس کے بال براؤن تھے جنہیں سنہرا کروا رکھا تھا۔ اس کا دوپٹہ ہمیشہ بائیں کندھے پر ٹکا ہوتا کانوں میں مختلف ایئر رنگز، ہاتھوں میں موٹے شوخ رنگ کڑے اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی بے حد خوب صورت بڑی سیاہ آنکھیں تھیں، اس پر اعتماد اور شوخی کا رنگ.... اس کے لیے کچھ ناممکن نہیں تھا۔

اریبہ عاقل.... سلونا روپ ذہانت سے بھرپور چمکیلی آنکھیں سیدھی ناک وہ وی کی طرح دوپٹہ لیتی کبھی ایک پلو سر پر ٹکا لیا۔ اس کا بیگ ہمیشہ کتابوں سے بھرا رہتا۔ سینے سے ہر پل کتابیں فائل چپکی۔ وہ شرمیلی مگر قابل لڑکی تھی۔ اس کے نوٹس کی تعریف کرو یا رزلٹ کی فورا" جھینپ جاتی، خوب محنتی تھی۔ دیکھنے میں بے حد سادہ مگر وہ ان سب سے زیادہ لائق اور پڑھی لکھی تھی۔

حلیمہ حسنل کی دوست تھی۔ وہ ان چاروں میں بڑی باجی کی طرح دکھائی دیتی، سمجھ دار کم گو ہر پہلو پر نظر رکھنے والی۔ پڑھاکو.... سادہ چہرہ یونیفارم نماز کے انداز میں سفید دوپٹے کی بکل اس کا سر ہمہ وقت ڈھکا رہتا۔

ان کے گروپ میں سب سے نمایاں حسن المآب ولد عبدالمنان تھی۔

ناراضی اکتاہٹ اور مغرور تاثر.... مگر کوئی بھی تاثر اس کے چہرے کی خوب صورتی کو ختم نہیں کر سکتا تھا وہ جس روپ کو اوڑھ لیتی سج جاتی۔ اس کے بال اور آنکھوں کا رنگ شہد جیسا تھا اور شہد ڈھیروں پھولوں سے رس لے کر بنتا ہے اور اس کے وجود سے خوشبوئیں پھوٹتی تھیں وہ رات کی رانی تھی مگر دن میں بھی مہکتی تھی اس کے ہونٹوں اور جلد کے رنگ کا شیڈ کسی بھی میک اپ برانڈ میں نہیں ملتا تھا۔

وہ مصر سے نہیں تھی اور حور بھی نہیں مگر گردن سے گزرتا پانی نظر آجاتا اس نے دوپٹا چہرے کے گرد کسا ہوتا تھا۔ ایک پکو آگے ایک پیچھے اس کے کانوں میں گول بالیاں تھیں جن میں ننھے کالے موتی تھے۔

اور ان ہی موتیوں کے سائز کا تل اس کے ہونٹ کی سیدھ میں گال پر تھا اور وہ تل بولتا تھا اس کے اندر کی تمام کیفیات جیسے ظاہر کر دیتا۔ ہنستی تو ڈمپل میں چھپ جاتا۔ ناراضی کے اظہار کے لیے ہونٹ بھینچتی تو تل اپنے سائز سے چھوٹا ہو جاتا۔ خفگی کے ابھار کے لیے جیسے منہ بسور لیتا۔

وہ ایک گڑیا کی مانند تھی۔ جس کے چہرے کی واحد بد نما چیز اس پر چھائی خفگی اور بے زاری تھی اور یہ تاثر ہر شے پر حاوی تھا۔ اس کا حسن اس کی سفارش تھا پتا نہیں وہ ذہین تھی۔ محنتی تھی.... کہ نہیں اس کے پاس حسن تھا۔ خوب صورتی تھی جو ہر جائز سوال کو بھی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

☆ ☆ ☆

اس قدر رومانٹک موسم میں کوئی پاگل پریڈ لیتا ہے۔ ماہ رو نڈھال سا چلتی تھی۔ پینتالیس منٹ کی ہسٹری کی کلاس میں مسز رابعہ خاتون کے تیز تیز لیکچر دینے اور اس سے زیادہ تیز لکھنے کا خیال ہی سوہان روح تھا۔

وہ کسی رجسٹر، نوٹ بک، جرنل، کتاب کے بغیر ایک ہاتھ میں چابیوں کا گچھا دوسرے میں مٹھی بھر کے چاک اسٹاف روم سے نکلتیں اور بقول ان کے صحرائے گوبی (گراؤنڈ) کو پار کرتی بالآخر ان کے کلاس روم تک

پہنچ ہی جاتیں۔

"ہاں بھئی۔ آج کہاں سے شروع کرنا ہے۔"

کوئی بھی لڑکی کھڑے ہو کر کل جہاں تک وہ پڑھا چکی ہوتیں۔ اس کا بتاتی۔ وہ پل بھر کر سر جھکا کر خاموش کھڑی رہتیں پھر اپنی ذہین آنکھیں اٹھا کر ساری کلاس کو دیکھتیں۔

"اچھا چلو اب آگے لکھو۔"

ٹاپک شروع کرنے سے پہلے دو تین روز تک ڈسکشن ہوتی۔ اسلامی حکومت کا نقشہ بناتیں۔ حکمرانوں کا پورا شجرہ بلیک بورڈ پر تشکیل دیتیں ان کا انداز اس قدر دلچسپ و معلومات سے بھرپور اور رواں ہوتا کہ لڑکیاں کبھی کلاس چھوڑنے کا سوچتی بھی نہیں۔

حلیمہ اور اریبہ کی وہ پسندیدہ ٹیچر تھیں۔ مضمون بھی پسندیدہ سو وہ کلاس چھوڑنے کا سوچتی ہی نہیں تھیں۔ سو ماہ رو کی بہانے بازیوں اور تاویلوں نے کوئی اثر نہ دکھایا۔ حلیمہ اور اریبہ اس کے ڈھیلے پن کو نظر انداز کرتی تیز قدموں سے صحرائے گوبی پار کر رہی تھیں۔

حسنل خاموش تھی۔ وہ سب سے آخر میں چل رہی تھی۔

"اللہ کرے وہ آج غیر حاضر ہوں۔" ماہ رو نے حلیمہ سے مایوس ہو کر اللہ سے رجوع کیا۔

"جی نہیں..... وہ آئی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے۔" اریبہ نے رک کر بطور خاص بتایا۔ "بلکہ وہ دیکھو..... وہ جا رہی ہیں۔ اور اس بار ان کی دونوں مٹھیوں میں چاک ہیں۔ یعنی وہ فل موڈ میں ہیں۔"

"نہیں....." ماہ رو نے اپنا سارا بوجھ حسنل کے کندھے پر ڈال کر شہاب الدین ہلاک کی طرف نگاہ کی مسز رابعہ کاریڈور میں داخل ہو چکی تھیں۔

"بھاگو..... بھاگو..... مس سے پہلے کلاس میں پہنچنا ہے۔" حلیمہ نے نا صرف کہا بلکہ دوڑ لگا بھی دی۔ اریبہ نے بھی تقلید کی۔ مڑ کر ماہ رو کو دیکھا۔ وہ مزید ڈھیلی ہو گئی تھی۔

"تم لوگ بھاگو..... میں تو ایسے ہی آؤں گی۔ پینتالیس منٹ بعد کیا یہ موسم ایسا رہے گا۔ یہ کراچی کی بارش ہے۔ کوئی سنگاپور کی نہیں۔ دیکھ لینا ہم ان عباسیوں کے لتے لے کر باہر آئیں گے تو یہ بدلیاں یہ گھٹائیں ہوائیں سب غائب ہوں گی اور وہ مسٹنڈا آفتاب کھڑا منہ چڑائے گا۔"

وہ بیچ راستے میں رک کر حسنل سے مخاطب تھی۔ کمر پر ہاتھ ٹکا تھا حسنل نے چاروں اطراف نگاہ دوڑائی۔

کالے سیاہ بادل کن من بوندیں درخت جھوم رہے تھے۔ پتے چمکنے شروع ہو گئے تھے۔ مٹی کی سوندھی خوشبو روح تک کو سرشار کر رہی تھی۔

ماہ رو کاریڈور کے باہر لگے پودوں کے پاس رک گئی۔ اس نے ننھے ننھے سفید پھول توڑے اور انہیں اپنی پونی میں اٹکا لیا۔ دو تین کو جیب میں رکھ لیا۔ پھر ایک کچھاڑی سے مٹھی میں بند کر لیا۔

"اب آ بھی چکو ماہ رو! لیکچر شروع ہو جائے گا۔ مس کلاس روم میں داخل ہو چکی ہیں۔" حسنل دور دیکھ رہی تھی۔ ماہ رو کی طمانیت میں فرق نہیں آیا۔

مالن بگیا سے پھول چن رہی تھی۔

"میں آج کلاس ہونے نہیں دوں گی۔" اس نے سینہ تان کر دعویٰ کیا۔

حسنل کی آنکھیں پھیلیں۔

"مجھے تو..... تم جانتی ہو ناں۔" اس نے آنکھ میچی۔

حسنل دیکھ کر رہ گئی۔

"مے آئی کم ان ٹیچر۔" دونوں ہم آواز ہو کر بولیں۔ مس رابعہ نے سر سے پیر تک بغور دیکھا اور سر اثبات میں ہلا دیا۔ حلیمہ اور اریبہ جرنل کھولے پین پکڑے چوکنا بیٹھی تھیں کڑے تیوروں سے گھورا۔

"ہاں تو آج کہاں سے شروع کرنا ہے۔" ٹیچر نے کلاس کو دیکھا۔

"مس یہ آپ کے لیے....." ماہ رو نے حنا کو دانت پیس کر اور مس کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے اپنی مٹھی مس کی ہتھیلی پر کھول دی۔

"شکریہ بیٹا۔" ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

"تحفہ تو اچھا ہے مگر تم نے کالج سے پھول توڑے؟"

"مس کھلنے والے پھول کو کیا خبر' اسے سیج ملے گی یا قبر۔" ماہ رو فوراً" اداس ہو گئی۔

"ہائیں!" مس رابعہ نے ماہ رو کی صورت دیکھی ساری کلاس بھی بھونچکی رہ گئی تھی۔

"اس مثال کا کیا مقصد؟" مس نے فوراً" استانی بن کر ماہ رو کو گھورا۔

"دراصل میں نے ان پھولوں کو ٹینشن فری کر دیا ہے۔ نہ ہی سیج نہ قبر۔ ہماری ٹیچر کے بابرکت مشفق ہاتھوں سے بہتر کون سا مقام ہو سکتا ہے۔ کیوں گرلز ایم آئی رائٹ؟"

سب کے سر بلا ارادہ اثبات میں ہلے۔

"آپ کا کلاس لینے کا ارادہ نہیں ہے؟" ان کا لہجہ صاف اور سنجیدہ ہو گیا۔

"جی جی... بالکل ٹیچر...!" ماہ رو کھل کے مسکرائی۔ "آپ رئیلی جینئس ہیں' کیسے دل کا حال جان لیتی ہیں۔ آج موڈ نہیں ہے۔"

"لیکن میں کلاس لینے کے موڈ میں ہوں۔ چلیے جگہ سنبھالیے۔"

"ہیں..." ساری کلاس ہنس پڑی۔ ماہ رو پیر پٹختی ڈیسک پر جانے لگی۔

"اور آپ نے بالوں میں بھی پھول لگا رکھے ہیں۔" ٹیچر کی نگاہیں۔ اس کے بالوں پر ٹکیں "کیوں؟"

"اکچوئلی پھول سفید ہیں یونی فارم سے میچ ہو رہے تھے اور دوسرے بالوں میں اس لیے کہ میرے کانوں کے سوراخ چھوٹے ہیں۔"

توبہ اب ماہ رو کی خیر نہیں۔" مس رابعہ خاتون کے بجائے مس رابعہ جلال بن جائیں گی۔ لڑکیاں منہ دبا کر ہنسیں۔

مس نہ ہو گئیں سہیلی ہو گئیں۔ جو منہ میں آیا بول دیا۔ مگر یہ کیا ہوا مس زور سے ہنس دیں۔ انہوں نے مٹھی میں بھرے چاک ٹیبل پر پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے ماہ رو کو دیکھا۔

"تو آپ کیا چاہتی ہیں ماہ رو فیاض؟"

"یہ تو آپ اپنے دل سے پوچھیں کہ اگر آپ میری جگہ تو کیا چاہتیں۔ ایسے موسم میں صرف شعر پڑھے جاتے ہیں ٹیچر... غزلیں سنی جاتی ہیں۔ اور..."

"میں آپ کی جگہ پر نہیں ہوں' اس لیے اپنی جگہ پر رہتے ہوئے آپ کو حکم دیتی ہوں' جائیے اپنی سیٹ پر۔" ان کا لہجہ متبسم مگر انداز قطعی تھا۔ ماہ رو کو بڑھنا ہی پڑا۔ حسنل کو ماہ رو کی ناکامی کا یقین نہیں تھا۔ اس کا موڈ آف ہو گیا۔

اوکے کل ہم کہاں رکے تھے؟" ٹیچر نے چاک کو دیوار پر مار کے دو ٹکڑے کرتے ہوئے استفسار کیا۔

پہلی رو سے سنجیدہ کلام کھڑی ہوئی۔ وہ کل کے نوٹس کے آخری پیراگراف کو پڑھنے لگی۔

"ہم بس... اس کا مطلب ہوا متوکل کی مذہبی پالیسی کے بعد معتصم باللہ اور مستنصر باللہ... ٹھیک تو اب وہ رہ جاتا ہے۔"

"اب صرف کالا بلا رہ جاتا ہے ٹیچر..." یہ خفاشی خود کلامی تھی' جس نے پہلے سب کو چونکایا اور پھر گویا کلاس میں زعفران کا کھیت اگ آیا۔

"کون... کون رہتا ہے؟" ٹیچر کے لیے بھی بے ساختہ ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا "بلکہ یہ کون بولا ہے۔" ان کی نظریں ماہ رو پر گئیں۔ اس کا سر زور زور سے دائیں بائیں ہلا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں نے کچھ نہیں کہا..."

"تو پھر کون... تمہارے علاوہ اور کون..."

"یہ حسن المآب کا کام ہے۔" وہ اس کی ٹانگ پر زبان بندی کے لیے چٹکیاں کاٹ رہی تھی۔ چٹکی ماہ رو کی برداشت کی حد سے گزر گئی تو اس کے منہ سے سچ ابل پڑا۔

"یوں ہی منہ سے نکل گیا۔" وہ ہکلاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"باللہ کا مطلب ہوتا ہے۔ منجانب اللہ... اور تم نے کہا کالا بلا ہیچ ہیچ..."

اسے سچ مچ دکھ اور خوف محسوس ہوا تھا۔ ویسے بھی اسے ہر بات پر ڈر لگ جاتا تھا۔ حسنل نے پوری

کلاس کو گھورا۔۔۔ سب اسے سخت ملامتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ٹیچر کا چہرہ بے تاثر مگر سوالیہ سا تھا۔

"تو کیا کالا بلا اللہ نے نہیں بنایا۔ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ یا پھر وہ کسی مشین سے بناتے ہیں۔ خواہ مخواہ۔ یا کالی اون کے گولے سے سلائیوں پر بن لیا جاتا ہے ہونہہ!" اسے کہاں عادت تھی اتنی دیر تک کچھ بھی سننے کی۔۔۔ سب بھول بھال گئی۔ کہاں کھڑی تھی کہ کیا کہنا ہے کیا نہیں کہنا ہے۔

"اوکے گرلز۔۔۔ میرا خیال ہے آج پڑھائی نہیں ہو سکے گی۔" (باہر بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی)

ماہ رو نے تالی پیٹی۔ "یس ٹیچر! یہی بات تو میں آپ کو سمجھانا چاہ رہی تھی۔"

ٹیچر کلاس روم سے چلی گئیں۔ ماہ رو ڈیسک پر کھڑی ہو گئی۔ سب لڑکیاں اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ ماہ رو نے اپنی خدمات پر ایک تفصیلی رپورٹ دی۔ اپنی صلاحیتوں کے ڈنکے پیٹے۔۔۔ وہ تمام اپنے احسانات گنوا رہی تھی جو اس نے اس کلاس نامی قوم پر کیے تھے۔

حلیمہ دانت پیس کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اریبہ کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ ماہ رو نے نیا شوشا چھوڑا تھا۔

"اور میری یہ تمام خدمات و کوششیں بلا معاوضہ ہیں مگر آج۔۔۔ آج میں چاہتی ہوں کہ آپ سب ایک روپیہ' فقط ایک روپیہ عنایت فرمائیں بلکہ آٹھ آنے بھی چلیں گے۔ پلیز۔" اس نے قمیص کا دامن دونوں چٹکیوں میں پکڑ ڈیسک ڈیسک گھومنا شروع کر دیا۔

"صرف ایک روپیہ۔" کچھ نے ناک بھوں چڑھائی۔ مگر پھر ایک کے بعد ایک لڑکیاں نوٹ ڈالتی گئیں۔ حلیمہ ڈیسک پر بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگی۔ ایک ہاتھ گال پر ٹکا تھا۔ آنکھوں میں سخت تاسف تھا۔ اف یہ ماہ رو۔

"خیر سے میری گود بھر گئی۔" اس نے اعلان کیا۔

کلاس خالی ہو گئی۔ تب ماہ رو نے ٹیبل پر دامن الٹ دیا۔

کلاس میں 130 سے زیادہ لڑکیاں تھیں۔ بعض نے آٹھ آنے بھی دیے تھے۔

"چلیں۔۔۔" ماہ رو نے جھک کر اپنے جوگرز کا فیتہ باندھا۔

"اے حسنل! آؤ تم کیوں تصویر ہو گئیں۔" اریبہ نے پکارا۔

"تم لوگ جاؤ' مجھے نہیں آنا۔" تینوں ٹھٹکیں۔

حسنل جھٹکے سے بیگ اٹھاتی کھڑی ہوئی۔ کمرے سے نکلنا چاہتی تھی۔ ماہ رو نے دامن پکڑ لیا۔ "نہ چھڑا سکو گے دامن۔"

پھر گھوم کر سامنے آ گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"بنتی کروں ہوں مہاراج۔"

حسنل نکلنے کے لیے بے قرار ماہ رو چوکی۔۔۔ پھر لپٹ گئی۔

حسنل نے پہلے تو چھڑانے کی کوشش کی پھر یک دم اسے دھکا دے دیا۔ ماہ رو کا سر زور سے دیوار سے جا ٹکرایا۔

اسے تکلیف کم ہوئی حیرت زیادہ۔۔۔ حسنل کو بھی احساس ہوا پر یہ کیا وہ شرمندہ ہونے کے بجائے بیٹھ کر خود رونا شروع ہو گئی تھی۔

"یہ ہمیشہ میرے ساتھ ایسا ہی کرتی ہے۔"

"ہمیشہ۔۔۔؟" تینوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ بات ہی حیرت کی تھی۔

"ہمیشہ کب حسنل؟" اریبہ نے پوچھا۔

ماہ رو نے خاموشی سے اپنی کتابیں سمیٹنی شروع کر دیں۔

"بولو حسنل، ہمیشہ کب؟" حلیمہ' حسنل کی بچپن کی دوست تھی مگر اسے ماہ رو کے لیے برا محسوس ہو رہا تھا۔

حسنل کو اتنی تفتیش کی امید نہیں تھی۔ وہ آگے بڑھنے لگی۔ پر حلیمہ سامنے تھی۔

"تم تو یوں بن رہی ہو جیسے جانتی نہیں۔ ہر بار اٹینڈنس ٹائم پر میرے منہ پر ہاتھ کون رکھتا ہے۔"

اسے جواب سوجھ ہی گیا اور اریبہ تو اریبہ' حلیمہ کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ کچھ اداس دکھائی دیتی' ماہ رو نے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بھی دھپ سے ڈیسک پر بیٹھ کر اپنی ٹھوڑی مٹھی پر ٹکالی۔

"کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟"

حاضری کے رجسٹر میں نام حروف تہجی کے اعتبار سے لکھے جاتے تھے۔ سوشیالوجی کی پروفیسر عذرا جمیل..... وہ کبھی کلاس کے آخر میں حاضری لیتیں۔ کبھی درمیان میں اور کبھی آخر کے پانچ منٹ میں۔

ماہ رو بہت سنجیدگی سے کچھ لکھنے پڑھنے میں مصروف ہوتی۔ پروفیسر جیسے ہی ایچ کے حرف پر پہنچتیں۔ وہ ہشیار ہوجاتی۔ اب حسن المآب کا نام آنا ہے کہ وہ پریزنٹ کہے 'ماہ رو جو تاک میں بیٹھی ہوتی کسی لحیم شحیم اغوا کار کی طرح اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔ اب حسنل لاکھ 'پھڑپھڑائے' ہاتھ اٹھائے۔ بے سود۔

نام گزر جاتا۔ تو وہ ہاتھ ہٹا کر دوبارہ سے پڑھنے لکھنے' میں مصروف ہوجاتی۔ وقت گزرنے کے بعد اپنی حاضری لکھوانے کے لیے پروفیسر کو پکارنا شامت بلانے کے مترادف ہوتا۔ وہ کچھ سنے بغیر شروع ہوجاتیں۔ "اپنے نام کی پکار پر کیا سو رہی تھیں۔ میں نہیں لگاؤں گی حاضری۔"

"دوسرے 'دوستی میں بھلا کوئی شکایتیں لگاتا ہے بھلا۔"

اگلی بار وہ چوکنا رہتی۔ لیکن ماہ رو سے زیادہ چوکنا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ تب وار کرتی جب اگلے کے سان و گمان میں بھی نہ ہو۔ اور صرف حسنل تھوڑی جو بھی ہاتھ لگ جائے۔ اریبہ کی شامت کم آتی تھی۔ رجسٹر میں پہلا نام اس کا تھا۔ پھر عموما" پہلے ڈیسک پر بیٹھتی تھی۔ حلیمہ سے ماہ رو کو ڈر لگتا تھا۔ اس نے منہ پر جسے ہاتھ پر دانتوں سے کاٹ لیا تھا۔ (ہی ہی ہی)

"وہ تو شرارت ہے حسنل.....!"

"مجھے نہیں پسند۔" اس نے تیوری چڑھائی۔

"تم کبھی کبھی اتنی زود رنج کیوں ہوجاتی ہو؟" ماہ رو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ آبیٹھی۔

"اور جب ٹیچر کچھ پوچھنے کے لیے کھڑا کرتی ہیں تب بری بری شکلیں بنا کر ہنسانے کی کوشش کرتی ہے۔ ہے ناں۔" اریبہ دونوں کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"اور گدگدی بھی کرتی ہے۔ ایک دن اس نے میری بغل میں پین گھونپ دیا تھا۔" حلیمہ کو بھی یاد آگیا۔

"پین نہیں..... وہ چمچ تھا۔ میں منہ نیچے کرکے اپنے ساتھ لایا مٹر پلاؤ کھا رہی تھی۔" ماہ رو نے تصحیح کی۔

ماہ رو نے ان دونوں پر سے نگاہیں ہٹا کر حسنل کو دیکھا۔ اشارے سے ارادہ پوچھا پھر آنکھ میچی..... مگر آگے بھی حسن المآب تھی۔ اس کا بگڑا موڈ پچاس روپے کی دولت اڑا کر بھی درست نہ ہوا۔

"اتنے سارے پیسے تھے۔ کل کے لیے بھی بچالیے۔" اپنے کارناموں پر نازاں و فرحاں ماہ رو فیاض.....!

حلیمہ کی نگاہیں اس کے پرکشش چہرے پر مرتکز تھیں۔

"بے فکری کتنی بڑی نعمت ہے۔ وہ اپنے گھر کے مسائل کو ہر وقت سوچتی تھی۔ اسے کتنی ہی بار ماں کی دل داری کرنی پڑتی۔ بڑی بہنوں کو سمجھانا پڑتا تھا۔ ابو کے سخت مذہبی خیالات کے باعث خاندان کی باتوں کو سننا بعض اوقات جواب دینا اور بعض اوقات چپ رہنا بڑا ہی مشکل کام تھا۔

دوسری طرف اریبہ کے ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے اس کے ماں باپ کو بیٹیوں کے رشتوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ اس کی گفتگو میں گھوم پھر کے بات باجیوں کے رشتوں پر آکر رکتی تھی۔

"باجیوں کا ہو نہیں رہا۔ بھائی جلے پیر کے بلے کی طرح رہتے ہیں بات بے بات خفا ہوتے ہیں' امی کہتی ہیں' جوان کماؤ بیٹا برتن پٹخ پٹخ کر رکھے اور کاٹ کھانے کو دوڑے تو اندھا بھی بوجھ لے جو وہ مانگتا ہے۔ عمر میں اتنی بڑی بہنوں کے ہوتے بہو کیسے لاسکتی ہوں۔" کوئی ایک فکر..... ان کی کلاس کی کئی لڑکیاں منگنی شدہ تھیں۔ اریبہ نے کبھی ایسی کوئی بات نہ کی..... ہاں بس

باجیاں۔۔۔ ان کا ہو جائے کس طرح۔۔۔ لمبی کہانی تھی۔

دوسرے طرف حسنل۔۔۔ اس کے مسائل خود ساختہ تھے یا حلیمہ انہیں درخور اعتنا نہ جانتی تھی۔ مگر ایک الجھی شخصیت کا سا انداز۔۔۔ بڑی مشکل سے مسکراتی تھی۔ ہنسنا تو معجزہ سمجھو۔ اور خوشی محض خیال۔۔۔ وہ چلتی پھرتی بے زاری تھی۔

تو پھر ان چاروں میں سے ایک ماہ رو فیاض ہی بچتی تھی ناں۔ خوش باش، بس ہنسنا مسکرانا پڑھنا پڑھانا۔ کیسی سیدھی سادی طمانیت بھری زندگی تھی اس کی اور مطمئن لوگ، اطمینان ہی بانٹتے ہیں۔ ہنسنے کے شائق، ہی ہنساتے ہیں۔

بہت ان مول ہوتے ہیں وہ لوگ جن کی موجودگی میں آپ اپنے غم بھول جائیں دکھ۔۔۔ دکھ نہ لگے۔ کسک فراموش کر دی جائے۔ بے فکر تتلی جیسی ماہ رو فیاض۔۔۔ تو اگر کوئی خوش ہے تو اللہ کرے خوش ہی رہے۔

دنیا میں خوش باش لوگ پہلے ہی کتنے کم ہیں تو اگر کوئی خوش ہے تو۔۔۔۔

☼ ☼ ☼

دسمبر کی اس خنک شام میں چرچ کی سیڑھیاں چڑھتی میری بہت پُرجوش تھی۔ اس نے سر اٹھا کر عمارت کے بیچ میں ایستادہ صلیب کے نشان کو دیکھا۔ اس نے عقیدت و احترام سے سر اور نگاہ کو جھکایا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنی اتھل پتھل سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ہال کا مرکزی دروازہ بند تھا مگر کھڑکیوں اور درزوں سے جھانکتی روشنی اور آرکسٹرا کی آوازیں صاف بتا رہی تھیں کہ سب پہنچ چکے ہیں۔

"بس دلہن نہ پہنچی ہو، باقی سب خیر ہے۔"

"برائیڈ نہیں آئی نا۔۔۔" کوئی باہر نکلا تھا، اس نے عجلت سے اسی سے پوچھا۔

"آنے والی ہے۔" جواب سے بھی عجلت نمایاں تھی۔

"او خدا! شکر۔" اس نے آسمان کی جانب دیکھا۔

"اتنی فکر تھی تو جلدی آتیں ناں۔۔۔!" یہ اس کی خالہ کی آواز تھی۔ وہ تیزی سے گھومی۔ خالہ کچھ شاپرز بمشکل سنبھالے ہوئے تھیں۔ وہ دو قدم نیچے آئی۔ ان کے ہاتھ سے کچھ شاپرز لیے اور وہ ان کے گلے لگ گئی۔

"کوئی فنکشن اٹینڈ نہیں کیا تم نے۔۔۔ اگر تم آج بھی نہ آتیں نا، تو میں نے ناراض ہو جانا تھا۔"

"مجھے پتا تھا، اسی لیے تو آئی ہوں۔" وہ ان کے ساتھ اندر جانے کے لیے گھومی۔

"ماں کدھر ہے تمہاری؟" خالہ کو دھیان آیا۔

"وہ فلاور شاپ پر رک گئیں۔ میں نے ڈرائیور سے کہا، مجھے چھوڑ آؤ، تم ایسا نہ ہو؟"

"دلہن آجائے۔" خالہ نے جملہ مکمل کیا۔

"وہ آگئیں، ماما!" اسے ماما، میگی اور بھائی نظر آگئے۔

خالہ کی نگاہیں بھی اسی جانب اٹھیں۔

"میں اندر جا رہی ہوں خالہ۔" ہال کا دروازہ کھلا تھا۔ آرکسٹرا کی تیز آواز نے اسے بے چین کر دیا تھا۔

"ہاں ہاں۔۔۔ یہ شاپرز سنبھال کر رکھنا میں آرہی ہوں۔"

"جی جی!" اس نے تیزی سے ہامی بھری اور بھاگتے ہوئے کھڑی کے وزنی دروازے کو کندھے کے زور سے دھکیلتے اندر داخل ہو گئی۔

نگاہ کی حد پر ناک کی سیدھ میں اسٹیج تھا۔ لکڑی سے بنی اور سامنے گڑی صلیب پر عیسیٰ کی شبیہہ تھی۔

ہر بار یہاں آنے پر اس کی پہلی نگاہ یہیں پڑتی تھی اور جم جاتی تھی۔ اسے مسیح کی پیدائش سے لے کر۔۔۔ ان کے اٹھائے جانے تک کے واقعات ایک ترتیب سے یاد آنے لگتے تھے۔ وہ جیسے اس زمانے میں پہنچ جاتی تھی۔ سلیمانی ٹوپی پہنا ہوا ایک نادیدہ وجود بن جاتی تھی۔ اور ہر جگہ گھس کر بیٹھ جاتی تھی۔

پاک مریم جب پیدا ہوئیں تو زوجہ عمران کی مایوسی انہوں نے منت مانی تھی وہ پیدا ہونے والے کو خانقاہ

کے لیے وقف کریں گی۔ مگر لڑکی کو کیسے وقف کیا جاسکتا ہے۔ پھر خدا نے بتایا... عبادت و خدمت جنس سے مشروط نہیں۔

پھر مریم کے پاس سے ملنے والے بے موسمی پھل۔ اور زکریا کا حیران انداز۔ "اے مریم یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں۔"

اور مریم کا سادہ سا لاجواب کر دینے والا جواب۔

"اللہ تعالیٰ کے پاس سے آئیں' بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔"

اور پھر جب عیسیٰ کی نوید ملی۔ اس پر مریم کی حیرت...

"فرشتے نے کہا میں تمہارے رب کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں۔ تاکہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔ وہ تعجب سے کہنے لگیں کہ بھلا میرے لڑکا کس طرح ہو جائے گا۔ حالانکہ مجھ کو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اور نہ میں بدکار ہوں۔ فرشتے نے کہا یوں ہی اولاد ہو جائے گی۔ تمہارے رب نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ بات مجھ کو آسان ہے۔

(سورۃ مریم 20-19)

"پھر وہ عیسیٰ کو گود میں لیے اپنی قوم کے پاس آئیں۔ لوگوں نے کہا۔ "اے مریم تم نے بڑے غضب کا کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن! تمہارے باپ برے آدمی نہ تھے۔ اور نہ تمہاری ماں بدکار تھیں۔" پس مریم نے اس (بچہ) کی طرف اشارہ کر دیا۔ اور پھر عیسیٰ اپنی ماں کی پاک بازی بیان کرنے کے لیے خود بول اٹھے۔" (مریم) (28-27-26)

ایسا کہ پھر کوئی اور بول نہ سکا۔

اور واقعات پر واقعات... مسیح کے معجزے' اور پھر مسیح مصلوب ہوئے اور اٹھا لیے گئے اور...

"اوہ' میری! بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ مگر ایسے مجسمہ بن کر کیوں کھڑی ہو۔ آج تو لوگ تمہیں دیکھ کر مجسم بنیں گے ہم نہیں۔" یہ اس کی کزنز تھیں۔ جو کچھ رشک و حسد سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

اس نے مریم کی شبیہ سے نگاہ ہٹائی۔ وہ تو مولود عیسیٰ کو گود میں لیے اس پر نظریں ٹکائے بیٹھی تھیں۔

ارتکاز ٹوٹ گیا تھا۔ وہ جیسے قبل مسیح کے زمانے سے واپس لوٹی تھی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش میں لمبا سانس لیا تو سارے وجود پر تھکن کا احساس غالب ہو گیا۔

"تم سب بھی بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

"ہاں مگر تم سے کم۔"

اس نے شانے اچکا دیے۔ "یہ کچھ سامان ہے۔ خالہ نے دیا تھا۔ اسے کہاں رکھوں۔"

"لاؤ مجھے دو۔" خالہ کی بیٹی نے شاپرز لے لیے۔

"میگی کہاں ہے؟" وہ سب کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

"آرہی ہے۔" اس نے دروازے کی سمت دیکھا۔ ماما۔ خالہ اور میگی اندر آچکی تھیں۔ وہ سب سے ملنے لگی۔ سب کی نگاہوں میں اس کے لیے ستائش تھی۔

سفید اور سلور کے امتزاج سے سجا ایڑی کو چھوتا فراک بہت ساری چوڑیاں بہت بڑے چاندی کے نازک سے بالے جن میں سفید بڑا سا موتی ٹنکا تھا۔

میگی کا لباس اس سے مختلف تھا۔ وہ پیازی میکسی میں ملبوس تھی۔ دیگر تمام لڑکیوں کی طرح... لڑکے سیاہ پینٹ کوٹ میں بو کے ساتھ بہت اسمارٹ لگ رہے تھے۔ لڑکیوں نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا تھا۔ مگر میری کے آگے سب کو اپنا آپ پھیکا لگنے لگا۔ سب ایک دوسرے سے محو گفتگو تھیں۔

ہال کی سجاوٹ میں رنگوں روشنیوں کا بہت خوب صورت امتزاج تھا۔ دیواروں پر فرمودات عیسیٰ... وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

یہ سب اسے زبانی یاد تھا مگر پڑھتے وقت ایک اسرار سا جو ذہن میں ابھرتا تھا۔ وہ اسے بہت پسند تھا۔

"ادھر آؤ ہم کیا آرکیٹکٹ ہو۔ اینٹ کی موٹائی ناپنی ہے۔" اس کی کزنز کا گروپ اس کے گروپ کھڑا ہو گیا تھا۔

"نہیں... ویسے ہی..." وہ خجل ہوگئی۔ تابڑتوڑ جواب دینے میں اس کا ثانی نہیں تھا۔ مگر یہاں آکر اس چھت کے نیچے خاص طور پر اس کی زبان جیسے گنگ ہو جاتی تھی۔

"تم نے سارے مزے کے فنکشنز مس کردیے۔ اسپیشلی کل کی مہندی۔ اف اتنا مزہ آیا۔ اتنا مزہ کہ بتا نہیں سکتی۔" کیتھی نے دونوں انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر شدت بتانا چاہی۔

"تو پھر مت بتاؤ۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ کیتھی کا چہرا اتر گیا۔ وہ اسے احساس زیاں میں مبتلا کرنا چاہتی تھی۔ مگر وہ سننے پر ہی راضی نہ ہوئی... خیر وہ نہ بول سکی۔ تو لبنیٰ بولنے لگی۔ کہ کل کتنا مزہ آیا اور کیوں...؟

"یوحنا اور ٹینا نے اتنا اچھا ڈانس کیا۔ پورے سوا گھنٹے تک وہ دونوں ناچتے رہے۔ اور بعد میں جب باقی سب بھی ہینو زمیں ناچے پھر تو مزے کی حد آسمان کو چھو گئی۔ نانا... نانی تک نے ڈانس کیا۔"

"اور پتا ہے..."

وہ سب بس اسے پچھتاووں میں گھرا دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ اور میری کسی کی خواہش پر چلے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے دل و دماغ پر پوری دسترس رکھتی تھی۔

"دلہن کی گاڑی آگئی ہے۔" کوئی چلایا تھا۔ سب سرپٹ دوڑیں۔

میری بھی ساتھ تھی۔ وہ کھڑکی میں ٹک گئی۔ یہاں سے باہر کا منظر واضح تھا۔ لڑکیاں دیکھنے کے شوق میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ اسے اتنے سکون سے کھڑا دیکھ کر سب کے چہروں پر طیش آمیز حسد ابھر آیا۔

میری نے اس چیز کو محسوس کرلیا تھا۔ اس نے قصداً" منہ موڑ لیا۔ مبادا دل کا حال عیاں ہو۔ اسے واقعی دکھ تھا کہ وہ مہندی وغیرہ کے فنکشن میں شریک نہ ہو سکی۔ مگر کیا کرتی' دادی کو اس کا ننھیال سے ملنا سخت ناپسند تھا۔ بلکہ ننھیال کے ذکر سے ہی وہ یوں بدکتی تھیں۔ جیسے کوئی کفریہ کلمہ بک دیا ہو۔

آج بھی کتنی مشکل سے اپنے دل پر جبر کرکے گویا اسے یہاں آنے کی اجازت دی۔ جانتی تھیں۔ اسے کتنا شوق ہے شادی میں شرکت کا۔ دلہن کو وائٹ گاؤن میں دیکھنے کا... سو وہ آج یہاں تھی۔ دوسری طرف میگی... اف' وہ اپنے دل کی مانتی تھی۔ نہ دادی نہ ماں نہ باپ... اس کے مزاج میں سرکشی تھی مگر یہ خدا کا شکر تھا کہ اس کی راہیں سیدھی تھیں۔ اپنی پڑھائی لکھائی سے دلچسپی تھی۔ ورنہ اگر... دادی آگے سوچتی نہیں جھرجھری لیتیں۔

میری مسکرانے لگی۔ میگی سارے کزنز کے ہمراہ دلہن کو گاڑی سے نکالنے میں مدد دے رہی تھی۔ اس کی شوخیاں اور شرارتیں عروج پر تھیں۔ تب ہی میری کو اپنے وجود پر کسی کی نظروں کی چبھن محسوس ہونے لگی۔ اوہ... وہ یوحنا تھا یعنی بارات آچکی تھی۔ "حد ہے میری! اتنی دیر سے یہاں آئی ہو اور ایک بار دولہا کا نہیں سوچا۔" اس نے بہت لاڈ سے خود کو سرزنش کی۔ اسے یوحنا کے پاس جانا چاہیے۔ آخر کو اس کی بھی تو شادی ہو رہی ہے نا... اسے بھی مبارک باد دینی چاہیے۔

"اور دلہن..." اس نے کھڑکی سے جھانکا وہ ابھی تک گاڑی سے باہر تشریف ہی نہیں لائی تھی۔ وہ یوحنا کے قریب چلی آئی۔

اور یوحنا جو اس لمحے سے اسے نظروں کے حصار میں قید کیے ہوئے تھا۔ یک دم اجنبی ہو گیا۔ اس کے پکارنے پر بری طرح چونکا۔

"سوری... میرا دھیان صرف دلہن کی انٹری پر تھا۔" اس نے سچ کہا۔

یوحنا کھل کر مسکرایا۔ "میرا بھی سارا دھیان دلہن کی انٹری کی طرف ہے۔"

"اوہ...!" وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ دولہا کا سارا دھیان پلٹ گیا۔ زبان جھوٹ بولنے سے نہیں لڑکھڑائی تھی۔ مگر آنکھیں سچ کہنے لگیں۔ بے تاثر چہرے کے ساتھ وہ امتحان تھی۔ ہنسی سیدھی سیدھی آزمائش...

امتحان اور آزمائش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ امتحان کا

وقت تین گھنٹے میں ختم ہو جاتا ہے۔ آزمائش وقت کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ مستقل، مسلسل......

"کتنی پیاری لگ رہی ہے ٹینا۔" یوحنا نے اس کے چہرے پر بچوں جیسی خوشی اور جوش کو دیکھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا، ٹینا کا پتا نہیں، وہ اس طرح دونوں ہاتھ ٹھوڑی سے جوڑے اپنے پنجوں پر اچکی کسی اور ہی دنیا کی باسی لگ رہی ہے۔

"ہے نا؟" وہ یوحنا سے بھی "پیاری" کی تائید چاہتی تھی۔

یوحنا بری طرح چونکا۔ اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹانا مشکل تھا۔ مگر پھر بھی اس نے "پیاری" کو یعنی ٹینا اپنی دلہن کی سمت دیکھا۔

ہاں وہ واقعی بہت پیاری لگ رہی تھی۔ مگر میری سے کم، بہت کم..... اس نے میری کی جانب دیکھنا چاہا۔ مگر میری وہاں نہیں تھی اب۔ وہ دلہن کی سمت بھاگ پڑی تھی۔ وہ شدید اشتیاق، رشک، محبت اور خوشی سے بالکل قریب جا کر ٹینا کو دیکھ رہی تھی۔

سفید نیٹ کے گاؤن میں سج سج قدم اٹھاتی۔ وہ ریڈ کارپٹ پر آرہی تھی۔ مووی میکر کی ہدایت پر نظریں اٹھاتی تھی۔ پھر اس نے اپنے تئیں چپکے سے یوحنا کو دیکھا تھا۔ جو اپنی امی، ابو اور بہن بھائیوں کے جلو میں کھڑا تھا۔ وہ مسکرایا تھا۔ ٹینا کے لبوں پر شرمیلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ آگے نکل گئی۔ میری کی نگاہیں اس کے گاؤن کی چار گز لمبی ٹیل پر تھیں۔ وہ کسی اپسرا کی طرح جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی گزری تھی۔ سب نے نشستیں سنبھال لیں۔

سیاہ بریف کیس تھامے پادری صاحب تشریف لے آئے۔ ایک ہاتھ سے اپنی ٹائی درست کرتے انہوں نے سب کو مسکرا کر دیکھا تھا اور ہاتھ ہلایا تھا۔ سب نے جواباً ہاتھ ہلائے۔ سب مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔ مائیک سیٹ ہونے لگے۔ پادری صاحب نے اپنے بریف کیس میں سے مقدس بائبل اور دیگر کتب نکالیں۔

یوحنا اور ٹینا کو کرسیوں پر بٹھایا جا چکا تھا۔

پادری صاحب نے خداوند کے بابرکت نام اور یسوع کے ذکر سے آغاز کیا۔

میرا بدن روح القدس کا مقدس، چھڑایا ہوا صاف۔

اور مسیح یسوع کے خون سے دھلا ہوا۔

اور میرا بدن خدا کے لیے ہے۔

اور خداوند میرے بدن کے لیے ہے۔

پادری صاحب خاموش ہو گئے تھے۔ میری نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ بائبل کے اوراق پلٹ رہے تھے۔ پھر وہ بائبل کی کچھ آیات کا ترجمہ پڑھنے لگے۔

اب سب پادری صاحب کے ساتھ ہم آواز ہو کر گیت گانے لگے۔

تیرا نام پاک مانا جائے۔

تیری بادشاہی آئے۔

اور ہمیں آزمائش میں نہ لا۔

بلکہ برائی سے بچا۔

کیونکہ بادشاہی اور قدرت اور جلال ہمیشہ سے تیرے ہی ہیں۔

ماما اور میگی گیت کے بول سر ہلا ہلا کر دہرا رہی تھیں۔

میری سر جھکا کر سن رہی تھی۔ اس کی ساری توجہ یوحنا اور ٹینا پر تھی۔

"آج ہم سب یہاں یوحنا اور ٹینا کی شادی کے سلسلے میں اکٹھے ہوئے ہیں۔" پادری صاحب ان دونوں کے بیچ میں آکر کھڑے ہو گئے۔ اب وہ نکاح کی اہمیت و مقاصد پر روشنی ڈال رہے تھے۔

"اے مرد یوحنا! تو اس عورت ٹینا کو اپنے نکاح میں قبول کرتا ہے اور اے عورت ٹینا تو اس مرد یوحنا....."

دونوں کے سر اثبات میں ہلتے تھے اور حاضرین محفل کے چہرے کھلے تھے۔ خالہ کا..... جو ٹینا کی امی تھیں اور یوحنا کے امی، ابو..... جو میری کے ماموں، مامی تھے۔

"تم ایک دوسرے سے دکھ سکھ، بیماری، تنگ دستی کے ساتھی رہو گے اور ایک دوسرے سے ہمیشہ پیار کرو گے۔"

اب انگوٹھی پہنانے کا مرحلہ تھا۔ کنواری لڑکیوں کے چہرے جوش وجذبات سے سرخ ہونے لگے۔ وہ گردنیں سارس کی طرح لمبی کرکے پلکیں جھپکائے بغیر اس منظر کو دیکھ لینا چاہتی تھیں۔ دولہا' دلہن کے والدین نے انگوٹھی پادری صاحب کو بصد احترام پیش کی۔ پادری صاحب نے پہلے دولہا کو... اور پھر دلہن کو... خوشی اور ہنسی ماحول پر حاوی ہونے لگی۔ ایک رشتہ قائم ہوا چاہتا تھا۔ اک قسم کھائی جاچکی تھی۔ اک عہد نبھانے کے لیے عیسیٰ کی تعلیمات بھی نکاح کو ترویج دیتی تھیں۔ نکاح فطرت ہے۔ فطرت سچائی ہوتی ہے۔ سچائی کو شکست نہیں ہوتی۔ شکست شیطان کی ہوتی ہے۔ ازل سے ہورہی ہے۔ ابد تک ہوتی رہے گی۔ یوحنا اور ٹینا کے درمیان طے پاجانے والا عہد بھی ازل سے طے تھا اور یقیناً" ابد تک... بلکہ اس کے بعد بھی... لیکن عجیب بات ہوئی۔ بہت ہی عجیب... بلکہ خطرناک... شکر کسی نے نہیں نوٹ کیا... مگر... میری نے اور... ماما نے بھی؟ ٹینا سمیت سب یوحنا کو متوقع نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر یوحنا... اس نے انگوٹھی کو دیکھا تھا' پھر ٹینا کے آگے آتے ہوئے ہاتھ کو اور پھر... اوخدا... اس نے گردن گھما کر مجمع کو دیکھا تھا۔ وہ کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر اس کی نظریں میری پر آکر رک گئیں۔ پلک جھپکنے کے وقفے جتنی کہانی... مگر مکمل... بے عیب' واضح شکوے کی کہانی... دکھ کی کہانی... گلے کے رنگ...

"کتنا ظلم کیا تم نے مجھ پر... اور کتنی مطمئن ہو تم... دکھ کی بھی حد ہوتی ہے... ایسے بھی کوئی کرتا ہے بھلا...؟" میری کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ یوحنا کی آنکھوں سے جھانکتا تاثر وہ آنکھیں کہتی تھیں۔ اگر وہ اب بھی اس کے بڑھے ہاتھ کو تھام لے تو وہ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر مجمع کو چیرتا اس کی نشست کی سمت دوڑ لگا دے گا اور... اور... میری نے نظریں پھیرلیں۔ (اوہ میری... یہ وقت نظریں چرانے کا نہیں' ملانے کا ہے۔ اس نے خود کو تادیب کی۔)

اس نے بہت پیار سے مسکرا کر دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا کر ہانک لگائی۔

"پہناؤ پہناؤ۔ رک کیوں گئے۔ اب تو سوچنے سمجھنے کا وقت نکل گیا۔ ہے نا ٹینا؟" اس کی آواز میں چہکار تھی۔

سب جیسے ایسے ہی کسی اشارے کے منتظر تھے۔ اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔ پادری صاحب نے بھی انگوٹھی پہنا دینے کا اشارہ کیا۔

یوحنا کا ہاتھ مشینی انداز سے آگے ہوا اس نے ٹینا کا ہاتھ تھام لیا تھا' کیونکہ دراصل میری کی آواز میں انکار تھا۔ یوحنا کے لیے۔

اگلے پل ٹینا نے یوحنا کو انگوٹھی پہنا دی۔

پادری کے حکم پر یوحنا نے ٹینا کا جالی دار نقاب الٹ دیا۔

پادری ہی کی ہدایت پر دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔

پادری کچھ کہہ رہے تھے۔ میری سن نہ سکی' کیونکہ اس کا ہاتھ ماما نے دبوچ رکھا تھا۔ وہ دانت کچکچا کر اس سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ مدھم آواز... ہلکی سرگوشی... مگر شرربار لہجہ...

"میری بات مان لی ہوتی تو آج ٹینا کی جگہ تم ہوتیں۔ کتنی خواہش تھی یوحنا کی میرا سگا بھتیجا... اور تم نے... اوہ خدا... دیکھی یوحنا کی آنکھوں کی حسرت... اتنا ہینڈسم' اتنا اسٹیبلش لڑکا... تمہاری حماقت کے ہاتھوں... ہاتھ سے نکل گیا۔"

ماما نے ہاتھ مسلنے شروع کردیے۔

"دیکھو دیکھو... وہ ٹینا کو ڈائمنڈ سیٹ گفٹ کررہا ہے... اوہ..."

ماما کے پچھتاوے آسمان کو چھونے لگے۔ ایسا لگتا تھا یا تو وہ سیٹ چھین لیں' یا پھر میری کی پٹائی شروع کردیں۔ یا ٹینا کی جان لے لیں۔ پچھتاوا' غم وغصہ ان کے چہرے سے جھلکنے لگا اور صرف ماما نہیں تھیں جو یہ سوچ رہی تھی اور بہت سے لوگ' جو واقف حال تھے' نے جتاتے انداز سے ماں بیٹی کو دیکھا تھا۔

ماما کو بھی دفعتاً" خود پر پڑتی نگاہوں کا احساس ہوا۔

وہ جبراً" مسکرائیں' چہرے پر سے غم زدہ تاثرات مٹانے کی سعی کی۔

سب انہیں اسٹیج پر آنے کے اشارے کر رہے تھے۔ ماما طوعا" وکرہا" اٹھیں۔

"میری اولاد تھوڑی ہو کوئی تم لوگ... اپنے باپ اور دادی کے بچے ہو۔ اور دنیا کے لیے ماں کی نظر کا اشارہ بہت ہوتا ہے۔ جو ماں نے کہہ دیا... سو کہہ دیا... مگر ایک میری اولاد اور خاص طور پر تم میری... دادی کی چچی..." وہ واقعی بہت دکھی تھیں۔

میری جو لاپروائی کا مظاہرہ کرکے ٹال دینا چاہتی تھی۔ دادی کے ذکر پر سنجیدگی ورنجیدگی کا شکار ہو گئی۔ ماں... اور دادی نے ایک دوسرے پر الزام لگانے میں زندگی گزار دی۔ مگر یہ والا الزام... غلط فہمی تھی۔ میری نے مناسب سمجھا' فوری تردید کردی جائے۔

"دادی کا نام مت لیں ماما... ان کا کیا ذکر اور وہ مجھے کچھ کیوں کہیں گی۔ میں خود سوچتی ہوں' سب سمجھتی ہوں۔ یوحنا سے شادی نہ کرنا میرا اپنا فیصلہ ہے۔ دادی کو تو پتا بھی نہیں کہ..."

اس نے قصدا" جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ (ورنہ جو قیامت آتی... الامان الحفیظ)

"اور ویسے بھی میں یوحنا سے کیسے شادی کر سکتی ہوں۔ آپ کیوں بھول جاتی ہیں۔ میں ایک مسلمان لڑکی ہوں ماما... جبکہ وہ..."

"تو وہ تمہاری خاطر مسلمان ہونے کو بھی تیار تھا۔" ماما کا انداز و آواز مدھم ہو گئی۔ یہ بات تو طے تھی کہ... مگر بس... یوحنا جیسا لڑکا... شان دار' پھر لاڈلا بھتیجا۔

"رہنے دیں۔" میری نے خود کو تلخ جملہ کہنے سے باز رکھا اور کھڑی ہو گئی۔ "آئیں کیک کٹنے لگا ہے۔"

وہ ماما کو لیے آگے بڑھی۔ میگی پہلے سے موجود تھی اور دیگر کزنز کے ساتھ ہلا گلا کرنے میں سب سے بڑھ کر...

میری بھی سب کی خوشی میں شامل ہو گئی۔ ماما سب کے گلے لگ کر مبارک باد دینے لگیں۔ یوحنا کے بہن و بھائی کو... اور ٹینا کو بھی...

☆☆☆

لان میں لگے سفید فوارے کی صفائی کروا کے اسے چلایا گیا تو جیسے ہر شے مکمل ہو گئی۔ مالی کی ایک ہفتے کی محنت ہر شے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ سیاہ دیو ہیکل گیٹ کا اندرونی حصہ چھت والا تھا۔ نیچے چار گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ بائیں جانب چوکیدار کا چھوٹا روم اندرونی عمارت تک سفید ٹائلز کے بلاک تھے' چوکور ٹائل کے چاروں اطراف چار انگلی چوڑی جگہ خالی رکھی گئی تھی' جس میں گھاس لگی تھی۔ اس روش کے دائیں بائیں آخیر تک گملوں کی قطاریں... عمارت کا اصل رنگ سفید تھا۔ براؤن شیشے' مگر اوپر چڑھی بیلوں نے سفیدی کو غائب کر رکھا تھا۔ ہریالی' ہریالی اور تا حد نگاہ ہریالی... وہ سفید لان چیئرز پر ٹک گئے آرام وہ حالت میں...

"آج آپ پر تھکن کا شائبہ بھی نہیں۔" عقیلہ نے ان کے چہرے کی خوشی کو جانچا تھا۔

وہ منہ سے کچھ نہ بولے' عقیلہ نے تپائی سے جگ اٹھا کر پانی کا گلاس بھرا اور ان کے سامنے کیا۔

"شکریہ..." وہ گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے ایک طائرانہ نگاہ چہار اطراف دوڑا رہے تھے۔

"اتنا خوش تو آپ بدر کی پیدائش پر بھی نہ تھے۔" عقیلہ اپنے تجزیے میں درست تھیں۔ وہ کھو سے گئے۔

"وہ جدوجہد کا زمانہ تھا' میں اور تم بھی... بچہ اتنی جلدی کب چاہتے تھے' اچانک آگیا۔ تمہاری پڑھائی... سول سروس کا آغاز' میرے لیے وہ بہت ٹف ٹائم تھا۔ اس کی موجودگی غصہ نہیں دلاتی تھی۔ مگر الجھن' پیدا کرتی تھی۔ یہ ابھی کیوں آگیا' اسے کچھ عرصے بعد آنا چاہیے تھا۔ ہم اس پر توجہ ہی کب دے سکے۔ مگر... مگر ہماری ساری محنت اور وقت اس کے مستقبل کو محفوظ کرنے ہی کے لیے تو تھی۔"

انہیں اپنی غلطیاں یاد تھیں مگر تسلیم کی خو نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو اور بیوی کو بھی توجیہات سے بہلا

لیا کرتے تھے۔

"ہمیں خبر بھی نہ ہوئی اور وہ ہم سے اتنا دور ہو گیا' ہوتا ہی چلا گیا۔ بیٹا کو ہم نے پھر بھی زیادہ ٹائم اور محبت توجہ دی' مگر وہ بھی کوسوں دور۔ بیٹھی ہے۔ آسٹریلیا کوئی کوس بھر فاصلے پر تھوڑا ہے۔"

عقیلہ چپ سی ہو گئیں۔ وہ پھر چاروں جانب دیکھ رہے تھے۔ ہر شے کی خوب صورتی اپنی جگہ قائم تھی۔ مگر ماحول بوجھل سا ہو گیا۔

"ایک بات کہوں آپ سے....." ان کی آواز مدھم اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ وہ انہیں کبھی موردالزام نہیں ٹھہراتی تھیں۔ وہ ان کے ہر عمل میں شریک کار تھیں' مگر..... "یہ طعنہ نہیں ہے اور نہ ہی کچھ جتانا' مگر اس نے اولاد کے معاملے میں بے پروائی کی یہ خو' ہم سے ہی لی ہے۔ اس نے اپنی اولاد کو وہی سب دیا جو اپنے والدین سے پایا۔ آج اگر یہ اکیلا ہے' تنہا' تو بیج تو شاید ہمارا ہی بویا ہوا ہے۔ بدر تو اپنی زندگی میں مست ہے' بے فکر....."

"کچھ مت کہو عقیلہ! تمہارے جملوں کی دھار میں وہ تیزی نہیں جو میرے ضمیر کے کوڑوں کی فقط آواز میں ہے۔ میں ٹکٹکی سے بندھا ہوں' جلاد ہانپ رہا ہے' مگر سزا ختم نہیں ہوتی۔"

ان کے چہرے پر ملال' ملال اور ملال ہی تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ چاروں عظمت اللہ بلاک کے پیچھے ہری بھری گول چھتری کے اندر بینچوں پر براجمان تھیں۔ یہاں رش کم ہوتا تھا۔ اریبہ تیزی سے کتابیں کھول کھول انگلش کے نوٹس بنا رہی تھی۔ ماہ رو اور حلیمہ فیشن میگزین پر جھکی تھیں۔ حسنل حسب عادت بے زار بیگم تھی۔ حلیمہ' حسنل کے بچپن کی سہیلی تھی۔ بلاک کا پہلا گھر حسنل کا اور ساتواں حلیمہ کا تھا۔ وہ حسنل کے گھر' گھر والوں' گھر کے ماحول' ہر شے سے بخوبی واقف تھی۔

حسنل کے خاندان کی مذہبی خدمات' ترویج اسلام اور تبلیغ دین کا شہرہ چہار سو تھا۔ حلیمہ کے گھر والوں کی حیثیت مریدین جیسی تھی۔ حلیمہ کے والد اپنی نوجوانی کے زمانے ہی سے مذہبی رجحان والے تھے۔ عملی زندگی میں قدم رکھا تو پھر دوست احباب بھی اسی ٹائپ کے بنائے۔ آخر میں بیوی بھی حسب منشا مل گئیں۔ سرے جڑتے گئے۔ ان کے گھر کا ماحول اپنے باقی خاندان سے بالکل ہٹ کے تھا۔ پھر کٹ بھی گیا۔ خاندان کی روشن خیالی۔ اعتدال پسندی' میانہ روی' ہر شے کو ساتھ لے کر چلنا ان کے نزدیک۔ بے جا آزادی' بے حیائی' بے ہدایتی بن گئی۔ کٹتے کٹتے ان کی ڈیڑھ اینٹ کی اپنی مسجد بن گئی۔

وہ اپنی جگہ پر بہت اچھے انسان اور بہت اچھے مسلمان تھے۔ حلیہ' بول چال رہن سہن' کاروبار' حج و زکوٰۃ سب..... سب ٹھیک اور قابل ستائش تھا' مگر خرابی یہاں سے شروع ہوئی جب وہ بہنوں' بھائیوں' ان کے بچوں اور دیگر کو صریحاً "غلط ماننے لگے اور خود کو بہترین۔ دوست' خاندان والوں کے لیے ان کا تقویٰ اور پرہیزگاری قابل تعریف اور قابل تقلید یقیناً" تھی یا کہ ہوتی' اگر شعوری یا لاشعوری طور پر ان کے انداز میں تبدیلی نہ آتی۔

وہ مرنے' جینے پر بھی گھڑی بھر کو اکیلے یا کبھی کبھار بیگم کے ساتھ جایا کرتے' بچوں کے آنے جانے کا تو سوال ہی کیا؟ حلیمہ کی صرف بڑی بہن بہت مشکلوں سے بیاہی گئی تھی۔ داماد ڈھونڈنا ویسے ہی جوئے شیر لانے کے مترادف اور اس پر والد صاحب کی بے حد کڑی اور بے لچک شرائط..... حلیمہ سے بڑی بہن اور دو بھائی شادی کی عمر ہونے کے باوجود یوں ہی بیٹھے تھے۔ اتنی بے چینی اور آپا دھاپی کے زمانے میں جب اچھا لڑکا یا اچھی لڑکی ملنا ہی مشکل ترین ہے' تب تو بالکل ناممکن ہو جاتا ہے' جب اگلوں کے والدین کا حسب نسب' کام' حلقہ احباب بھی محدب عدسے سے ٹٹولا جائے' پولیس قطعاً" نہیں۔ انکم ٹیکس سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بینکر (سود خور! دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔) دین داری پہلی شرط اور صرف لڑکا لڑکی کے لیے نہیں' ان

کے گھر کام کرنے والی ماسی اور چوکیدار کے لیے بھی ضروری۔۔۔ گھر کے ماحول پر ان کی پوری دسترس تھی، کوئی خاص احتجاج یا عقل دینے کا سلسلہ نہیں تھا۔

حلیمہ اپنے ابا کا پرتو تھی۔ بڑا بھائی حسین البتہ کبھی کبھار کہہ دیتا تھا۔ "آنے والی کو اپنے ماحول میں ڈھال لیں گے۔"

"نہ۔۔۔ نہ خون، دودھ کا بہت اثر ہوتا ہے۔ وہ شوہر کا حکم اوپر سے مان لے، پر اندر سے "اڑی" رہی۔ تو یہ نسل خراب کرنے والی بات ہوئی نا۔" چھوٹا جھرجھری لیتا۔ حلیمہ کا تائیدی ہلتا سر۔۔۔

ابا کو حسنل کے خاندان سے اپنی دوستی پر بہت غرور سا تھا اور حسنل اور حلیمہ کی بچپن کی دوستی۔ حسنل کے گھر والوں کا ان کے خاندان پر اعتماد ان کے لیے قابل فخر تھا۔ دوسری جانب حسن المآب اپنے گھر کی سختیوں سے خائف۔۔۔ اپنے آپ میں مگن، اردگرد سے بے پروا جیسے جبرا" گھر کے اصول و قواعد کو مانتی تھی۔ مذہب اس کا صریحا" ذاتی معاملہ۔۔۔ وہ اپنی زندگی پر مذہب کو کس حد تک لاگو کرے گی۔ یہ فیصلہ اس کا ہونا چاہیے، اسے کیوں بتایا جائے کہ ایسے نہیں ایسے۔۔۔ اسے ہربات میں ڈرایا کیوں جاتا ہے، سمجھایا کیوں نہیں اور اگر غلطی سے نصیحت شروع کی جائے تو اتنی روکھی پھیکی، بے رونق، مشکل الفاظ و تسبیحات دعاؤں سے بھرپور کہ اس کے سر کے اوپر سے گزرتی جاتی۔

اسے خود سے سوچنے کیوں نہیں دیا جاتا۔ وہ بال لمبے رکھے یا چھوٹے۔۔۔ کسی کو کیا تکلیف، وہ خود کو چادر میں چھپائے یا نہ چھپائے۔ کسی کو کیا مسئلہ ہے۔ وہ لمبی قمیص رکھے یا چھوٹی، کھلی یا تنگ۔ یہ سب اس کی چوائس ہے۔ اس کے گھر میں ہم عمروں، بڑوں، چھوٹوں کا ڈھیر سا تھا۔ سب نیک، شریف بیبے بچے۔۔۔ سب بڑوں کے نقش پا پر چلتے ہوئے۔۔۔ وہی اپنی راہ چننا چاہتی تھی، پر کون سی۔۔۔ الگ سی۔۔۔ پر کوئی اشارہ تو ہو اور اسے اپنے بارے میں فیصلے کا اختیار کب تھا اور کون سا فیصلہ۔۔۔ کون سا۔۔۔ کوئی سا بھی۔۔۔ وہ اپنی بھڑاس حلیمہ کے سامنے نکالا کرتی۔

"تمہیں پتا ہے، سرسید احمد خان نے شاید ایک بار کہا تھا، اگر میں نام کی غلطی نہیں کررہی تو کہ مسلمان اس لیے نہیں ہوں کہ پیدا ہوا تھا۔ کان میں اذان دی گئی، میں مسلمان اس لیے ہوں کہ میں نے اس مذہب کو پڑھا، سوچا، سمجھا اور اس کو جی جان سے اپنایا ہے۔"

حسنل خالی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھتی۔

"اور میرے ساتھ تو یہ ہے کہ مجھے بتادیا گیا ہے کہ مسلمان ہوں اور ایسے کروں اور ویسے۔۔۔"

"تو تم کیا ہونا چاہتی تھیں؟" حلیمہ کا رنگ فق ہوجاتا، متوقع جملے کا سوچ کر۔

"کچھ نہیں۔" وہ صاف کہتی۔ "مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع کس نے دیا۔ میرے سر پر صبح شام ٹھونستے ہیں۔ مجھے متنفر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میں اپنی مرضی سے جانچنا چاہتی ہوں۔ مذہب اور اللہ کے نام پر ان سب کا جبر میری برداشت سے باہر ہے۔" اس کی تیوری چڑھ جاتی۔ "اگر یہی حال رہا تو میں۔۔۔ میں پتا نہیں کیا کر ڈالوں میں۔۔۔"

وہ جنونیوں کی طرح جیسے اپنے بال نوچ ڈالتی۔ اس کی باغیانہ سوچ آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ وہ بظاہر نیک بچی بنی چادر سر سے بدن تک لپیٹے رہتی۔ کالج کے پانچ گھنٹے جیسے پیرول پر رہائی کی طرح ہوتے۔

اسے ماہ رو اچھی لگتی تھی۔ خود اعتماد، بذلہ سنج ہنستی کھلکھلاتی آج کی لڑکی، ہر لمحے سے خوشی کشید کرتی، مزالوٹتی، شوخی، ذہانت عقل مند ایک نارمل لڑکی۔

2000ء کا سورج غروب ہونے کو تھا۔ نئی صدی کو ایسی ہی لڑکی کی ضرورت ہوگی، نہ کہ اس جیسی پابندی میں جکڑی، پھڑپھڑاتی لڑکی یا حلیمہ جیسی کنوئیں کی مینڈک لڑکی۔

اس نے ماہ رو کو دیکھا جو پنسل کی نوک ہونٹ میں دبائے میگزین چھانٹ رہی تھی۔ اسے حسنل کو بہن کے نکاح کی مناسبت سے ایک ڈریس بنا کر دینا تھا۔

حسنل کی رائے میں ماڈرن ہونا چاہیے، فیشن میں ان، حلیمہ کوالٹی اور ستر پوشی کو مد نظر رکھ رہی تھی۔ اریبہ بجٹ اور یہ سوٹ بکسے میں بند نہ ہو۔۔۔ بعد میں بھی استعمال کیا جاسکے۔ حسنل ان سب کی فکر مندی کو دیکھ رہی تھی، مگر پھر بھی اس کے چہرے پر بے زاری اور ناگواری کا تاثر گہرا ہوتا جارہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ لے لو۔" اس نے ماہ رو کے آگے شاپر رکھا۔ "دیکھ لو جیسا لے کر گئی تھی ویسا ہی واپس لائی ہوں۔"

ماہ رو نے شاپر گود میں الٹ لیا۔ فیروزی اور کریم کلر کی انار کلی فراک، چوڑی دار پاجامہ، ڈبکے کے کام سے بوجھل، چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔

"سب نے پسند کیا نا؟" وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ اریبہ بھی منتظر تھی۔

"ہاں بہت۔" حسنل بسورے انداز میں چاکلیٹ چپ کھانے لگی۔

"پھر بھی اتنا سڑا منہ بنایا ہوا ہے۔ تمہارے اس حسین چہرے پر مسکراہٹ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہی تو میں نے اپنی امی سے چھپ کر تمہیں ماہ رخ کی منگنی پر آیا سوٹ لا کر دیا کہ اس گلابی روشن رخ پر ہنسی کی سرخی دیکھوں مگر تم۔۔۔"

اریبہ کی زور سے ہنسی چھوٹ گئی۔ "تم ماہ رو ہو یا کوئی سڑک چھاپ لوفر جو لڑکی پٹاتا ہے۔"

حلیمہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ لپکی، پھر حسنل کو دیکھ کر وہ سنجیدہ ہوئی۔

"میں پہنتی تو پھرنا۔۔۔ جیسے شاپر میں لے کر گئی ویسے ہی لے آئی ہوں۔ ہاں ایک بار سب کو دکھانے کے لیے نکالا ضرور تھا۔"

"تو پہنا کیوں نہیں؟" ماہ رو نے سوٹ کو الٹ پلٹ کر جیسے خامی ڈھونڈنی چاہی۔ (حسنل خاموش تو رہتی تھی، مگر آج اس کے چہرے پر سناٹے کی کیفیت تھی۔)

"تم خود موازنہ کرو، جس کا نکاح ہے، وہ جارجٹ کا سرخ سوٹ پہن رہی ہے اور تم دلہن سے بڑھ کر تیار ہو گی۔ کتنا عجیب لگے گا نا اور دکھ اس بات کا ہے۔ دوست سے سوٹ مانگ لیا۔ الحمدللہ ہزاروں سے بہتر ہیں اور تمہیں تو منہ مانگے پیسے دیے تھے، پھر بھی۔۔۔"

امی کو غصہ تو بہت آیا تھا، مگر وہ اسے سمجھانے سے پہلے خود کو سمجھاتی رہی تھیں کہ دھیمی رہیں، شانت، اگنور کریں۔

"تو اتنے کم وقت میں کیسے کپڑا لاتی، پھر کڑھائی کے لیے، دو دو ماہ کا وقت۔۔۔ اور مجھے بازار کب جانے دیتے آپ لوگ۔۔۔ اسی لیے ماہ رو نے مجھے مسئلے کا حل پیش کیا تو میں لائی ہوں، ورنہ میں کیوں کسی کی اترن پہنوں گی۔"

"تو یہ کیا اس کی بہن نے اب تک پہنا نہیں ہے۔"

اس کی بڑی بہن انعمتہ جو ماموں کی بہو بھی تھی۔ خفگی سے پوچھنے لگی۔ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ چند لمحے ماں، بہن اور خاموشی سے سبزی بناتی مامی کو دیکھا اور چیل کی طرح شاپر جھپٹ، پیر پٹختی کمرے سے بھاگ گئی۔

"عقل کے ناخن لو حسنل! بچی نہیں ہو، کیا سوچیں گے سب لوگ اس طرح کے کپڑوں میں دیکھ کر۔"

"کیوں، کیا برائی ہے ان میں، اتنا بڑا دوپٹا، پوری آستین، سب کچھ تو۔۔۔"

"مگر مانگے کے۔" انعمتہ نے ٹکڑا لگایا۔ اس نے چند پل ماں، بہن کی صورت دیکھی اور پھر تکیے پر سر رکھ رونا شروع کر دیا۔

بعد میں شکر ہی کیا کہ اتنا اسٹائلش اور دیدہ زیب سوٹ زیب تن نہ کیا۔ کہ پہن کر سب سے الگ ہی نظر آتی۔ نکاح کا خالی شور تھا۔ نانا جان نے نکاح خود پڑھایا۔ انعمتہ کا میاں گواہ، چھوٹے ماموں کا بیٹا دولہا، بڑے ماموں کفیل، مبارک سلامت۔۔۔

"رخصتی کب کرنی ہے؟" ایک دو رشتے دار بھی آئی ہوئی تھیں۔

"حسنل کی چودہ ہو جائیں، اب چار سال تک کالج

گئی ہے‘ تو ڈگری مل ہی جائے۔ صبغہ اور حسنل کو ساتھ ہی رخصت کریں گے۔ اللہ نے عزت دی‘ مان رکھا۔ میرے بھائیوں کا دامن خوشیوں سے بھرا رہے۔ اللہ ان کا ہاتھ ہمیشہ اوپر رکھے۔ انعمتہ کو بڑے بھائی نے ڈھک دیا۔ صبغہ کو چھوٹے نے‘ حسنل کی بھی کوئی سبیل ہو جائے تو سکون ہو۔“ امی کا روم‘ روم اللہ کی عنایت اور بھائیوں کے لیے شکر گزاری سے لبریز تھا۔

”حسنل کے لیے کہاں ارادہ ہے؟“ یہ سودہ ممانی تھیں‘ امی کے خالہ زاد بھائی کی زوجیہ۔ انہیں حسنل اپنے بھائی کے لیے بے حد پسند تھی۔ مگر وہاں ہونا ناممکن۔ سب اس کے کردار و اخلاق سے واقف تھے۔ ”اب خاندان میں تو کوئی ہے نہیں۔“ وہ پرسکون سی ہو کر فکر مندی کا اظہار کر رہی تھیں۔

امی اور دونوں ممانیوں کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

”اللہ خاندان کو سلامت رکھے۔ مگر خاندان شرط نہیں‘ بس دین داری‘ شرافت و نجابت ضروری ہے۔ کردار و اخلاق سب سے اہم عنصر ہے‘ باقی سب نصیب... ابا جان کا حلقہ احباب بے حد وسیع‘ ماشاء اللہ عزت و مرتبہ‘ سبحان اللہ اور حسن المآب میں کس چیز کی کمی ہے؟ لاکھوں میں ایک ہے‘ شکل صورت‘ اخلاق و کردار‘ الحمدللہ....“

بڑی ممانی نے عاجزی سے کہا‘ مگر آنکھوں سے فخر جھلک مار رہا تھا۔ امی چپ رہیں‘ ان کا مقدمہ بھاوج لڑ جو رہی تھیں۔ ان کی خاموشی ہی بھلی تھی۔

”اور دوسرے خاندان میں کیوں نہیں۔“ چھوٹی ممانی نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ ارادے بڑوں کے دلوں میں تو تھے ہی‘ مگر اس طرح محفل میں کہہ دینے سے تقویت ملتی ہے۔ پکی مہر (اسٹیمپ)

”میرے بھائی کے بیٹے ہیں بھائی تو اللہ جوار رحمت میں جگہ دے۔ چھوٹے چھوٹے یتیم چھوڑ گئے‘ مگر یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے پھر وہی اللہ بندے بھیج دیتا ہے‘ ابا جان ہی کے ہاتھوں پلے ہیں دونوں.... میرے منہ سے کیوں نکلے کسی ایک کا نام‘ میرے لیے تو دونوں برابر ہیں کیا عبدالمتین کیا‘ عبدالمبین‘ میں نے تو فیصلے کا اختیار ابا جان کو دے رکھا ہے اور میری اتنی عقل کہاں جو ابا جان کی فراست کو پہنچے۔“

چھوٹی ممانی جان کی عقیدت سچ اور جھوٹ کا آمیزہ تھی۔ اپنی عاجزی اور کم فہمی بھی دکھادی اور مطلب کی بات بھی ابا جان کی لاڈلی بیٹی کی سب سے خوب صورت‘ حسن و جمال میں یکتا بیٹی ان کے بھائی کے گھر آتی‘ اس سے بڑھ کر اور کیا ملتا۔ انہیں باؤلے کتے نے کاٹا تھا جو بھائیوں کی جان‘ بہن سے عداوت پال کر سب کی نگاہوں میں بری بنتیں اور جب گھر سے اتنی اچھی لڑکیاں مل رہی ہوں‘ باہر کیوں جائیں؟

سودہ ممانی کا دھیان بارہا مریم ممانی کے ان چھوٹے بھائیوں کی طرف گیا تھا۔ جو ابا جان (یعنی تایا) کی سرپرستی میں پلے بڑھے تھے‘ مگر وہ ناک سے مکھی اڑاتیں‘ کہاں حسن المآب اور کہاں وہ عبدالمتین اور وہ دوسرا کیا نام ہے بھلا‘ ہاں عبدالمبین یہ پہلوئے حور میں لنگور والی بات ہوتی ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ گندمی (پیلے سے) لمبے (بانس جیسے) سوکھے (تنکے سے)

مریم ممانی بات مکمل کر کے گھٹنے کے گرد بازو لپیٹے ہولے ہولے ہل رہی تھیں۔ چہرے سے عاجزی عیاں‘ وہ حاضرین پر اپنی محبت اور بے غرضی ثابت کر چکی تھیں۔

حسن المآب کی امی دو زانو بیٹھی تھیں‘ سر جیسے گود میں گرنے کو تھا۔ ان کی آنکھوں میں تشکر کی نمی تھی۔ بیوگی کا یہ آخری امتحان اور کیا وہ سرخرو رہی تھیں؟ ابا جان کی محبت‘ بھائیوں کی محبت اور اللہ کی محبت ان کے دامن میں اتنی محبتوں کے لیے گنجائش تھی کیا؟ وہ بارہ سالہ اکلوتے بیٹے کو پیار سے تکنے لگیں۔ ابا جان کی سرپرستی میں اس نے بھی پار لگ جانا تھا۔ (ان شاء اللہ)

محفل میں سب اچھا تھا۔ سودہ ممانی اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں‘ ان کی نگاہیں حسنل کو ڈھونڈنے

لگیں۔

وہ مہمانوں کے ہاتھ دھلوانے کے بعد چلمچی لے کر لوٹ رہی تھی۔ اس کے قدم نپے تلے.... پانی چھلک نہ جائے۔ ہونٹ کا دایاں کونا دانت میں دبا تھا۔ بھنویں سکڑی ہوئی۔ وہ اس عالم میں بھی زرد قیامت لگ رہی تھی' زرد اور سرخ شلوار قمیص' سرخ ڈبل شیڈ دوپٹا۔

سو وہ ممانی کی نگاہوں نے کچن کے دروازے تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ پھر وہ محفل میں حاضر ہو گئیں' جہاں سب مریم ممانی' بڑی ممانی' اباجان کی مدح سرائی کر رہے تھے۔ امی کا سر عاجزی سے جھکا تھا اور اندر.... اندر قیامت پر قیامت بیت رہی تھی۔ کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیلا جاتا تو وہ شاید لحہ بھر میں جان سے گزر جاتی' مگر مریم ممانی کے کھولتے سیسے جیسے جملوں نے اسے مرغ بسمل کی طرح تڑپا دیا تھا۔

"اپنے ہاتھوں پالے' گھر کے نیک' شریف' متقی پرہیزگار لڑکے' آپ بہت قسمت والی ہیں عبیدہ بی بی" باہر امی پر باجماعت رشک کیا جا رہا تھا اور وہ اندر جان کنی کے ایسے پل سے گزر رہی تھی کہ اسے اپنے مرنے کا سبب بھی بھول رہا تھا۔

اس کے موی ہاتھ' جو یوں لگتا جیسے ہڈی کے بغیر بنے تھے' سلیب پر سخت پکڑ کے باعث رگوں کے نمایاں ہونے سے بدہیئت معلوم ہونے لگے تھے۔ اس کے دانت سختی سے ایک دوجے میں پیوست تھے' جیسے مرگی کے دورے کی کیفیت ہو' پھر اس کے اندر ابال اٹھا۔ بپھری شیرنی کی طرح یک دم اس نے پانی کو سنک میں اچھال دیا۔

اس کی سانس بحال ہو گئی' وہ تشنجی کیفیت سے باہر آ گئی۔ اس کے سن ہوتے ہاتھوں میں لہو دوبارہ دوڑنے لگا۔

یہ شاید دباؤ کی کیفیت تھی' وہ عالم برزخ میں تھی؟ اس نے اپنے چہرے کو چھوا جو بھی تھا وہ زندہ تھی۔ وہ زندہ ہے اور اسے زندہ رہنا ہے۔

☼ ☼ ☼

"اس" کے ان کی زندگی میں آنے سے اس وقت کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"اس" کے اب زندگی میں آنے سے زندگی بدل گئی تھی۔

وہ اپنی چھیاسٹھ سالہ زندگی کو یوں پاتے جیسے وہ آدھی ہو کر رہ گئی ہو' تینتیس برس.... اور چھبیس سال کے جوان کو چھ سالہ بچے کی طرح ٹریٹ کر کے خوشی سے نڈھال ہوتے۔

عقیلہ اپنے درد کو بھول اس کے لیے کچن میں گھس جاتیں۔ یہ وہ اور وہ.... مگر یہاں مسئلہ ہو گیا۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بہت نخریلا تھا' جیسے سونگھ سونگھ کر کھاتا۔ نمک کم' مرچیں کم' تیل کم' وہ پاکستانی مسالے دار کھانے سونگھ کر ہی چھینکیں مارتا۔ عقیلہ کا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ ساری زندگی سفارت خانے کی عہدے دار رہی تھیں۔ کچن سے دلچسپی کم تھی۔ گزارے لائق پاکستانی کھانے یا کچھ سلاد وغیرہ۔ ادھر اس کا ٹیسٹ ڈیولپ تھا' ذرا سی کمی بیشی کے بغیر' سوپ' جوس' سلاد' بڑا اور سب امپورٹڈ آئٹمز.... اور وہ دونوں اسے کسی بھی قسم کی پریشانی سے نبرد آزما نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سو اخبار میں اشتہار دے کر باقاعدہ اسے ٹیسٹ کروا کے ایک شیف کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔

وہ دونوں اس کے اندر اپنا عکس ڈھونڈتے۔ عقیلہ کو اس کی ناک اپنی ناک سے مشابہ لگتی۔ اس کا قد اور چوڑے شانے دادا جیسے تھے۔ اس کی بے حد گوری گلابی رنگت اور آنکھوں کا بے حد خوب صورت سبز مائل سنہرا رنگ ماں کی طرف سے تھا۔ اس کے دانت باپ' دادا کی طرح خوب صورت موتیوں جیسے صاف' چمک دار اور ہموار تھے۔ کلین شیو' بھنوؤں کی کمان اور ناک کی نوک اسے شہنشائی غرور عطا کرتی تھی۔ اس کی خوب صورتی خدا کی یاد دلاتی تھی۔ (بدصورتی بھی خدا داد ہوتی ہے۔)

اس کے بیڈ روم کو ان دونوں نے اپنی مرضی سے سیٹ کیا تھا۔ کھلا روشن' ہوادار سیکنڈ فلور کا ٹیرس والا کمرہ گلاس وال ٹیرس کو ہوم ڈیکور کے بندے نے سیٹ کیا اور اسے بھی یہاں آ کر یہ سب اچھا لگا' اس

نے سرخم کرتے ہوئے بہت ممنون ہوتے ہوئے قدرے جھک کر اظہار کیا۔ اس کا قد ان دونوں سے زیادہ تھا' یا پھر ان کے کندھے اب جھک گئے تھے' وہ قدرے خم ہو کر گفتگو کرتا' اس کے ہاتھ بڑے بھلے معلوم ہوتے' انگلیوں پر سیاہ بال ترشے ہوئے ناخن' کلائی میں ایک بریسلیٹ تھا' گھڑی در گھڑی۔۔۔۔

انہیں اس کی جوانی کا یہ دور' بہت زور دینے پر بھی یاد نہ آتا تھا۔ اب اس کی جوانی کو کر دیکھ نظریں چرا لیتے' کہیں اپنی نظر نہ لگ جائے۔ زندگی اچیومنٹس سے بھرپور تھی' جیت' کامیابی' نشہ' پھر یہ تمغہ؟ حق دار ہوں یا نہ ہوں' تمغہ پا کر خوشی اور غرور' امتیازی احساس تو ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"خاموش تو خیر تم ہمیشہ سے ہو۔ کم بولتی ہو' مگر اب تو جیسے تمہیں سانپ سونگھ گیا ہے۔"

ماہ رو نے حلیمہ اور اریبہ کو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھ ہی لیا۔ وہ چونک سی گئی۔ (اپنی پتا کس سے کہتی؟)

"نہیں' ایسا کچھ نہیں۔" وہ مکر گئی۔

"میری جان! ایسا ہی ہے' تین سال کم نہیں ہوتے' کسی کو جاننے کے لیے' کیوں دوستو؟" اس نے ہم نوائی کے لیے دونوں کو مخاطب کیا۔ دونوں کے سر اثبات میں ملے۔

"ایسا ویسا کچھ نہیں ہے۔" وہ مکر گئی۔ چہرے کے آگے کتاب سے پنکھا جھلنے لگی۔ ہونٹ سکیڑے اور ناک چڑھائی۔" اف' یہ حسن جہاں سوز اور اس پر یہ عشوہ گری' مجھے سنبھالو' میں مری۔"

ماہ رو نے دونوں ہاتھ لہرائے' جیسے پانی میں ڈوب رہی ہو۔

"او جولی! او مینا! اور انو' جمالو' کوئی ہم کو رو کو۔۔۔۔ کوئی تو سنبھالو' کہیں ہم گر نہ پڑیں۔"

ماہ رو کینٹین کے باہر چبوترے پر پھسکڑا مار کے بیٹھی تھی۔ حلیمہ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ اس نے جھٹک دیے۔ اریبہ کی تو خیر ہنسی بے قابو تھی۔ وہ پاس سے گزرتی لڑکیوں میں سے ایک کے پیروں سے لپٹ گئی۔ گانے کی تان اونچی تھی۔ مذکورہ لڑکی نے یک دم گھبرا کر اپنے پیر جھٹکے۔

"ارے معاف کرو۔" وہ پتا نہیں کیا سمجھی تھی۔ منہ سے بے ساختہ نکلا۔ چبوترے پر ٹین کی چھت تھی' لڑکیوں کے قہقہوں نے اس کے پیچ ڈھیلے کر دیے۔ حسنل کی بھی ہنسی نکل گئی۔ وہ دل کھول کر ہنسی۔ ہنستے ہنستے آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

ماہ رو ڈھیٹوں کی طرح زمین پر گھسٹنے کے بعد اب اپنا یونی فارم جھاڑ رہی تھی۔

"تمہاری اس کھلکھلاتی ہنسی کو دیکھنے کے لیے میری جان میں یہ سب کر بی ہوں' پر تم۔۔۔" وہ متاسف تھی۔ حسنل آنکھیں پونچھنے لگی۔

یار وہ کیا کہتے ہیں؟ وہ شاعر۔۔۔۔

لڑکیوں کے دکھ کتنے عجیب ہوتے ہیں
ہنس رہی ہیں اور کاجل پھیلتا ہے ساتھ ساتھ

"یہ تم نے شعر سنایا ہے یا۔۔۔" حلیمہ نے گویا سر پیٹ لیا۔

"نہیں' میں نے شعر کا تیا پانچا کیا ہے۔۔۔۔ ہاہاہا۔" جملہ مکمل ہونے سے پہلے وہ خود ہی لوٹ پوٹ ہو گئی۔" اریبہ نے حسب عادت اس کے سر پر اپنی کتاب دے ماری۔

اریبہ دل کھول کر ہنستی رہی۔ حسنل کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ تھی۔ ماہ رو نے حلیمہ کی ران پر زوردار ہاتھ مارا' وہ بلبلا کر سہلانے لگی۔ ماہ رو کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"دیکھ لو' میں کہہ رہی ہوں نا کوئی بات ہے؟ مجھے اپنے سینس آف ہیومر پر اندھا یقین ہے۔ میں منہ کھولتی ہوں تو یہ محترمہ پسلیاں پکڑ لیتی ہیں' میرا اتنا بڑا ایکٹ اور ایسی ودھوا بوڑھیوں جیسی پژمردہ مسکراہٹ۔۔۔۔ پوری دال کالی ہے۔ میری سنڈریلا! تم بجھی ہوئی ہو' اب دوستوں سے پردہ! کھولو کھولو اپنا منہ کھولو۔" وہ اس کی ٹھوڑی تھام کر چمکارنے لگی۔

حسن نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مار کے اسے پرے کیا۔ "کچھ بھی نہیں ہے۔ تم اور تمہاری قیاس آرائیاں۔۔۔ میں جارہی ہوں پوری' چنے تیار ہوگئے ہوں گے لاتی ہوں۔" وہ فوراً" اٹھ گئی۔

حسنل اندر لائن میں لگی تھی۔ وہ ایک بار پھر بجھ گئی تھی۔ سوچیں اور فکریں چہرے پر گم صم سا تاثر بکھیر گئی تھیں۔

وہ کس سے کہتی۔ کوئی تو ہوتا جو۔۔۔ جسے بتا سکتی۔ جو صائب مشورہ دیتا۔ اچھا مشورہ نہ دے۔ اسے سن لے۔ اس کے دل سے پہاڑ جتنا بوجھ کچھ تو سرکے۔ بس اتنا وہ سانس تو لے لے۔

وہ حلیمہ سے ذکر کرتی تو اس نے فوراً" مبارک باد دے دینی تھی۔ اریبہ بھی کم و بیش یہ ہی رد عمل دکھاتی' وہ حلیمہ کے سامنے تو کم از کم اپنی شدید ترین ناپسندیدگی بیان بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے عبدالمبین اور عبدالمتین کا کچھ بھی پسند نہیں تھا۔ نہ شکل' نہ قدبت' نہ پیشے نہ حلیے' نہ چال' نہ ڈھال' شدید ترین ناپسندیدگی جو نفرت میں بدل رہی تھی۔

وہ اپنے خدشات بتاتی تو حلیمہ اور اریبہ نے بھی نصیحتوں کا طومار باندھ دینا تھا۔ حلیمہ کے لیے عبدالمبین اور عبدالمتین کے حلیے یا شکل وصورت یا علم یا پیشے' کچھ بھی قابل اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان دونوں سے واقف تھی اور ان کے علمی قد سے متاثر بھی۔

دوسرے اریبہ' اپنی بہنوں کے رشتے کے حوالے سے بہت سی تلخ سچائیوں سے بہت کم عمری میں واقف ہونے کے بعد اس نے بھی مبارک باد دے دینی تھی۔
اریبہ کی حقیقت پسندی' حلیمہ کی علمیت اور اعتدال' اریبہ کی دور بینی سوچ' حلیمہ کی آگاہی۔ وہ ان دونوں کو کبھی تائل نہیں کر سکتی تھی کہ وہ ایک بار بھی اس نہج پر سوچ لیں۔ اریبہ تو پھر سن لیتی' لیکن وہ حلیمہ کی قطعیت سے بخوبی واقف تھی۔

رہ گئی ماہ رو۔۔۔۔۔
اس کی رائے کے لیے حسنل کو کوئی تردد نہ کرنا تھا' وہ جانتی تھی۔ حسنل کے گھر درس قرآن میں آئی تھی۔ اس نے عبدالمبین اور عبدالمتین کو دیکھا تو چھوٹتے ہی کہہ دیا یہ "جڑواں ہیں؟ (ہی ہی ہی) یا تمہاری ممانی نے بھائیوں کی جوڑی بنانے کے لیے ایک کو چیر کے دو کر دیا ہے۔" (ہاہاہا) ایسی مثال۔ اس وقت حسنل بھی اس کے ساتھ شریک ہوگئی۔ (ہاہاہا) پر اب حسنل کے لیے ماہ رو کا ہنستا بکا چہرہ دیکھنا ناقابل برداشت ہوتا' وہ کہتی۔

"تم تو اپسرا ہو' تمہارے لیے تو کوئی بہت خاص ہونا چاہیے۔ یونانی دیوتا۔ گھوڑے پر سوار شہزادہ' جو بے عیب ہو' جو مکمل ہو۔۔۔ وہ سوئٹر بننے والی سلائیوں کی جوڑی' شیخ چلی کے ولی عہد؟ تمہارا تو وہ حق ہے کہ تم کو سوئمبر رچانے کی اجازت ملنی چاہیے۔"

ماہ رو کے ارشادات سے قطع نظر اسے وہ سب نہیں چاہیے تھا۔ پر یہ سب۔۔۔ یہ وہ ہونے نہیں دے گی۔ زیادہ سے زیادہ مرنا پڑے گا۔۔۔۔ تو چلو

اس جیون سے مرنا بھلا۔

☼ ☼ ☼

کالج میں غیر نصابی سرگرمیوں کا ہفتہ منایا جارہا تھا۔ ماہ رو سب سے آگے' حلیمہ اس کے پیچھے پھر اریبہ۔ ان کا ساتھ دینے کو حسنل' مگر بس وہ ان کی پریکٹس کے دوران بیگ سنبھالتی' انہیں پانی اور چپس سموسے لا کر دیتی۔ حلیمہ اور اریبہ نے ذہنی آزمائش کے مقابلے کی تیاری کی' حسنل ڈل تھی۔ کچھ الجھی اور گھر سے اجازت کا تو سوال ہی نہیں۔ وہ دوستوں کی خوشی میں خوش' اپنے غموں سے کچھ دن کے لیے ریلیف ملا۔

ماہ رو نے کیٹ واک میں حصہ لیا۔ اسٹیج ڈرامے کا مرکزی کردار اسپیشل انعام' کیٹ واک میں فرسٹ پرائز اور تقریری مقابلے میں بھی فرسٹ' مگر اس کا حال سبحان اللہ' تقریر کا موضوع "لڑکیاں سراسر رحمت" ایک سے ایک دلائل۔۔۔ نکتہ پردازی' واہ' اسٹیج پر سحر

انصاری گرے تھری پیس میں میرون ٹائی۔ سلیقے سے بال جمائے' جاذب قریشی سفید کرتا پاجامہ' تھوڑی گردن سے لگی' پریشان کھچڑی بال' جناب پرنسپل' کوئی ایم این اے اور ایک سوشل ورکر۔

اس کی تقریر بے حد اچھی لکھی ہوئی تھی۔ الفاظ کا چناؤ' موضوع پر کمال دسترس' بلا کی خود اعتماد اس کا گندمی چہرہ سرخ کہ خون چھلکتا ہو۔ اس کی تقریر کے جملے دل و دماغ پر دستک دیتے تھے اور انداز بیان لہو کو گرماتا تھا۔

"جناب صدر! آپ ہی کچھ کہیے۔ آپ انصاف کریں۔ جناب صدر وہ.... جناب' یہ آپ ہی بتائیے۔"

جج صاحبان کے چہرے پر مجرمانہ تاثرات آرکے۔ (لڑکیوں پر سارے ظلم وہی تو کرتے رہے ہوں گے؟)

ماہ رو نے تو آج جواب ہی لے کر جانا ہے' ٹیچرز کے دل پہلی بار کانپے' ماہ رو کسی کا گریبان پکڑ کر نہ پوچھنے لگے۔

"تو لیے جج صاحب' جواب دیجیے۔ مگر یوں تو خیر نہ ہوا' لیکن...." (میرے وہ دس سال لوٹا دیں جج صاحب....)

روسٹرم پر ہاتھ مار مار کے ہتھیلیاں تو پہلے ہی لکڑی کرلیں آخر میں۔ مائیک نوچ کر وہ ہاتھ لہرایا کہ اسپیکر اور ڈیک زمین بوس ہوگئے۔ ٹکڑے ادھر ادھر اور شیر کی بچی نے مجال ہے جو مڑ کر دیکھا ہو' جملہ مکمل' یہ جا' وہ جا....

فرسٹ پرائز دیتے ہوتے جناب صدر نے پرنسپل سے مؤدبانہ گزارش کی۔ "بچی سے ہرجانہ طلب مت کیجیے گا۔ ہم آپ کے لیے نیا سامان بھیج دیں گے۔" پرنسپل سر جھکا کر سنتی رہیں۔ اللہ جانے دانت پیس رہی تھیں' ٹرافی بھی گئی' نقد پانچ سو روپے اور کتابیں (اور ڈیک سسٹم؟) کتنے کا ہوگا؟

لڑکیوں نے بعد میں ماہ رو کو کندھے پر اٹھانے کی کوشش میں ناکام ہو کر ڈنڈا ڈولی کر کے خوب خوشی کا اظہار کیا۔

خوشی کے رنگ میں بھنگ ملا کہ جب ہفتے کے آخر میں ہونے والے گرینڈ میوزیکل کنسرٹ کے بارے میں شہر میں مختلف آرا گردش کرنے لگیں۔ گرلز کالج میں غیر لڑکے' کنجر خانہ' مادر علمی ہے کہ اسٹیج' مولوی صاحبان کا ایک گروپ پرنسپل سے ملاقات کر گیا اور نقص امن کے خدشے کے تحت.... پرنسپل نے کنسرٹ کے لیے منع کر دیا۔ لڑکیاں مچل مچل گئیں۔ مسئلہ یہ بھی کھڑا ہوا کہ ٹکٹ بک چکے تھے۔ پیسے واپسی؟ اب کیا ہوگا؟

بڑے دنوں کی ردو کد کے بعد اعلان ہوگیا' کنسرٹ ہوگا' پر کالج کے باہر ایک میرج لان میں' ٹکٹ کے کچھ پیسے بڑھا دیے گئے۔ حلیمہ نے جو سکھ کا سانس لیا تھا۔ سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ وہ اس بے ہودگی کا حصہ نہیں بننا چاہتی تھی' اس کے پاس آزمودہ بہانے تھے۔ اریبہ بھی خوش تھی' اس نے بھی لائیو کنسرٹ نہیں دیکھا تھا۔ ماہ رو نے دیکھ رکھا تھا اور تجربہ بے حد خوش گوار رہا تھا۔ حسنل ڈری جھجکی تھی' مگر ایکسائٹڈ بھی.... حلیمہ کے بہانے دھرے رہے۔

ماہ رو نے نقد انعام سے ان دونوں کے ٹکٹ بھی لیے' اپنی بہن اور کزنز کے تو پہلے ہی لے چکی تھی۔

تین سالہ دوستی کا واسطہ' پکی کٹی کا ڈراوا' بس زندگی میں پہلی اور آخری بار یار' حسنل نے بھی منت کی۔ "پھر ہماری زندگیوں میں ایسے موقع کب آئیں گے۔ ایک یادگار' مان جاؤ۔" حسنل کا راستہ بھی حلیمہ کی ہاں سے کھلنا تھا۔ تینوں حلیمہ کے گوڈے گٹے پکڑے منتیں کرنے لگیں اور ماہ رو نے ہار تو سیکھی ہی نہیں تھی۔

حلیمہ راضی ہوگئی۔ (گھر والوں کو زیادہ تفصیل سے آگاہ نہ کیا تھا۔)

✵ ✵ ✵

حلیمہ گہرے نیلے جارجٹ کے ہم رنگ بیل سے سجے سوٹ میں' دوپٹا نماز اسٹائل میں لپیٹے' پیروں میں انگوٹھے والی چپل۔ اس نے ماہ رو کے لاکھ ٹوکنے پر بھی دوپٹا ڈھیلا نہ کیا۔ اریبہ عاقل لائٹ اور ڈارک براؤن کاٹن کے اسٹائلش ریڈی میڈ سوٹ میں بال کھلے چھوڑ

کر بالکل ہی بدلی لگ رہی تھی۔

ماہ رو لائٹ بلو جینز کے ساتھ سفید چھوٹے کرتے گلے میں اسکارف اس کے پیروں میں کھلے منہ کا کڑھا ہوا کھسہ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بڑے اسٹائلش طریقے سے پیش کیا تھا۔ حسن المآب سفید ڈاٹ والے سیاہ جارجٹ کے بڑے فراک چنٹوں والے بازو اور چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس تھی۔ اس نے ماہ رو کی فرمائش اور خود کی خواہش کے تحت لمبے سیدھے شہد رنگ بالوں کو ایک پونی میں کس کر کمر پر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ کانوں کے سیاہ موتی مل سے کچھ کم چمکتے تھے۔ اس نے دل کی شدید خواہش اور ماہ رو کے اکسانے کے باوجود ی کی طرح ـــ کے پلین سیاہ دوپٹے کو چہرے کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ ایک پلو آگے ایک پیچھے۔

وہ معصوم بچوں کی طرح آنکھیں حیرانی سے کھولے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کی زندگی کا پہلا دن تھا۔ گلوکار تو نہ جانے کب آتے، بڑے سے اسٹیج پر میوزک سسٹم سیٹ کیا جا رہا تھا۔ چیک کرتے ہوئے جب دھمک یک دم اٹھتی تو دل اچھل پتھل ہو جاتا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ عام سیدھے سیدھے حلیوں والی لڑکیوں کا حال بھی دیکھنے والا تھا۔ اپنے دل کے سارے ارمان آج نکالنے کا موقع تھا شاید آخری... معین اختر، علی حیدر، شہزاد رائے، حسن جہانگیر، جنید جمشید اور دیگر کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنے کے لیے کچھ کی امائیں بھی آگئی تھیں۔

حسنل نے میوزک ریڈیو پر چھپ کریا پھر ماہ رو کے واک مین میں سن رکھا تھا۔ لائیو ڈرمنگ اور گٹار، دف چھنکنا اسے اپنی سماعتوں پر اپنی قسمت پر یقین نہیں آیا تھا کہ وہ... کہاں وہ اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ...

لڑکیوں کے بے حد شور و غوغا میں وہ اپنے بونگے اور پہلے پہلے تاثرات مٹانے میں کامیاب رہی تھی۔ جلد ہی وہ ان سب میں اس طرح گھل مل گئی جیسے ازل سے ہی یہی سب کرتی آئی ہو۔ نوے فیصد لڑکیوں کے لیے یہ ان کی زندگی کا پہلا کنسرٹ تھا، من پسند فن کاروں کو زندہ سامنے دیکھنے کا ناقابل یقین منظر... اف...

پہلے ہلکی تالیاں، پھر گلوکاروں کے حکم کے موجب ہاتھ اوپر پھر بھنگڑا لڑکیاں مست ہو گئیں۔ وہاں تعینات لیڈی پولیس خود علی حیدر سے فرمائش کر کے "پشاور سے میری خاطر دنداسہ لانا" پر بے خود ہو کر جھومنے لگیں۔

حسنل کے لیے یہ دنیا کا پہلا دن تھا اس کے لیے دنیا آج ہی تخلیق ہوئی تھی۔ وہ حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثر سے سب دیکھتی تھی۔

علی حیدر کا "پرانی جینز" جنید جمشید کا "سانولی سلونی محبوبہ اور پھر گورے رنگ کا زمانہ" شہزاد رائے کا ڈھولنا اور حسن جہانگیر کا ایور گرین "ہوا ہوا اے ہوا خوشبو لٹا دے" لڑکیاں حال سے بے حال ہو گئیں۔

کولڈ ڈرنک کی خالی بوتلیں اپنے سر کے اوپر ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا ڈھیروں توڑیں۔ ہونٹوں کے گرد دائرے کی صورت دونوں ہاتھ ٹکا کر جب رو کی آواز نکلتی تو میوزک دب جاتا۔

حسنل اور حلیمہ بھی ڈری، شرمائی جھجکی پانی میں نمک گھل جانے کی طرح مدغم ہو گئیں۔ ان کے لیے تو سب کچھ نیا کسی اور ہی دنیا کا تھا۔ باقیوں نے ٹی وی، اخباروں میں ان سب گلوکاروں کو دیکھ ضرور رکھا تھا۔ وہ واقف تھیں، تعلیم کتنی ہے، لاہور کا ہے کہ کراچی کا... میرڈ یا ان میرڈ، کتنے البم آچکے ہیں، کون نمبرون ہے، کون ٹو پر ان دونوں کے لیے ہر شے انجان اور نئی تھی۔

لیکن پھر اسٹیج پر ایک نیا فن کار آیا۔ اس کی ایک ہی البم آئی تھی اور وہ بھی انڈین میوزک کمپنی کی ریلیز، جن لڑکیوں کے ہاں ڈش انٹینا تھا۔ وہ اس کی صورت سے آشنا تھیں۔ بے حد خوشی کا اظہار کیا گیا۔ اس نے اپنی البم کے تین مشہور گانوں سے آغاز کیا، وہ گٹار بھی بجا لیتا تھا، لیکن اس وقت مائیک ہاتھ میں لے کر اچھل رہا تھا۔ گانوں کا میوزک بے حد لبھاتا ہوا اور آواز بہت خوب صورت پختہ نغمگی سے بھرپور مردانہ بھاری

آواز اس کی شاعری چھوٹی بحر اور بہت ہلکی پھلکی قطرے جیسی... وہ قطرہ جو سوکھی چٹخی زمین پر پڑے تو زمین انگڑائی لے کر کیسی سوندھی مہک چھوڑتی ہے۔

لڑکیاں اس گانے پر ہاتھوں میں ہاتھ دے کر دائیں بائیں جیسے ڈول رہی تھیں۔

اس کے تعارف میں بتایا گیا۔ وہ کراچی میں پیدا ہوا۔ دبئی میں پلا بڑھا۔ انڈین میوزک اسکول سے کچھ گیان لیا اور پہلا البم وہیں سے ریلیز کیا۔ مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ اب پاکستان آگیا تھا اور اسے یہیں رہنا تھا۔

گانے کا موڈ بہت لائٹ تھا۔ اس کی آواز بے حد اچھی تھی۔ دل پر پڑنے والی دستک کی طرح اس کا رنگ سب سے زیادہ چمکیلا تھا۔ اس کے دانت بہت خوب صورت تھے۔ وہ گاتے گاتے مسکراتا تو...

مائیک ہونٹوں سے جوڑ جب اس نے گردن پیچھے ڈھلکائی تو اس کے شیو کی نیلاہٹیں اس کی آنکھیں اور کمان دار بھنویں۔

نیا گانا بے حد جوشیلا اور اچھل کود سے بھرپور تھا۔ لڑکیوں کی اچھل کود (پنڈال میں جیسے کوئی جانور گھس آیا تھا۔)

تمام فن کار جانے پہچانے اور اعلان شدہ تھے۔ یہ اچانک آکر محفل لوٹ رہا تھا اور اتنے خوب صورت مرد کو بالکل سامنے دیکھنا ناقابل بیان تھا۔

اور ایسے مرد کو جو آپ کے تصورات کے عین مطابق ہو۔ نوعمر لڑکیاں دل پکڑ کر بیٹھی تھیں۔ (حفظ ماتقدم) پر ایک کے ہاتھ سے دل نکل گیا اور اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ تصورات میں گھڑی شبیہہ حقیقت میں تھی۔ سچ مچ اس کا وجود تھا؟

یہ ہو بہو وہی تھا۔ رنگ، جسم، قد، آواز اس کے ہاتھ مرد کے خوب صورت ہاتھ؟ ساری دنیا سے چھپا کر رکھا خیالی پیکر مجسم ہو کر سامنے آجائے۔ تو... تو اس کا مطلب آپ کی دعائیں مستجاب ہو گئیں... تو کیا اللہ نے اسے آپ ہی کے لیے بھیج دیا۔

تصور سے صرف وہ لوگ واقف ہوتے ہیں، ایک بندہ اور ایک اس کا اللہ... تو گیا۔ اس اتنے شور اور رش میں حسن المآب حق دق کھڑی تھی۔ اس کے پیر جیسے برف کی سل میں جما دیے گئے تھے۔

گانے کا جوش گانے والے اور سننے والے پر حاوی ہو گیا۔ اس نے ایڑیوں کے بل گھومتے گھومتے یک دم اپنی جیکٹ اتار کر ہوا میں گھمائی، لڑکیوں کی ہاہاکار۔ وہ بے قابو ہو کر ہاتھ اوپر کر رہی تھیں۔

فقط ایک کے ہاتھ نیچے تھے۔ جیکٹ ہوا میں اڑی اور سب کی کوششوں سے بچتی حسن المآب کے سر پر آکر گری۔ پیچھے کی لڑکیاں جھپٹ لینا چاہتی تھیں۔ پر ماہ رو نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اس کے سر کو تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے لڑکیوں کو دھکیل دیا۔ لڑنے رکنے کا ٹائم کہاں تھا، وہ سب پھر اچھلنے لگیں۔

ایک بہت دل فریب سی۔ عجیب سا احساس جگاتی۔ ناقابل فہم سا سرور دیتی خوشبو حسن المآب کے نتھنوں میں گھس گئی۔ اسے دل فریب سا نشہ محسوس ہوا۔ اس نے اپنے بال ہاتھوں سے سنوارے جیکٹ سینے سے لگالی تھی۔ ماہ رو ایک بار پھر تالیاں پیٹ رہی تھی۔ اریبہ اور اس کا انداز فاتحانہ تھا۔

وہ اسٹیج سے بہت دور چوتھی رو میں تھیں۔ مگر موسیٰ کی گہری نگاہ نے ہراساں لڑکی کو ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ اس کا ہراساں چہرہ، تحیر سے بھری آنکھیں، وہ گاتا ہوا دوبارہ اسٹیج کے درمیان چلا گیا۔

مگر حسن المآب کی نگاہیں موسیٰ کی نگاہوں سے چار ہو چکی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ)

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- انمول
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی ---------- موسیٰ رضا

نمرہ احمد

"ایدس مارزیئے' ابھی بیتے نہیں!"

ایک دن جب آیا۔ جولیس سیزر اپنی رعایا کے
سامنے!
تو اسے پکار کے بولا ایک نجومی....
"اے سیزر' خبردار رہنا' ایدس مارزیئے سے۔"
پوچھا سیزر نے مصاحبوں سے
"کیا کہتا ہے یہ آدمی؟"

بتایا کسی نے۔ "یہ کہتا ہے کہ خبردار رہیے۔"
مارچ کی درمیانی تاریخ (ایدس مارزیئے) سے
جب آئی مارچ کی پندرہ تاریخ
اور داخل ہوا سیزر اپنے دربار میں
تو نظر آیا اسے وہ نجومی۔
اس کو دیکھ کر بولا سیزر اطمینان سے مسکرا کے
"ایدس مارزیئے تو آچکے ہیں۔"

مکمل ناول

اس پہ کہانجومی نے سر جھکا کر۔

"بجا فرمایا سیزر۔"

وسط مارچ کے دن شروع ہو چکے ہیں۔

مگر ابھی ختم نہیں ہوئے۔

(ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے "جولیس سیزر" سے ماخوذ)

(اور پھر اسی دن ایڈس مارزیئے یعنی مارچ کی پندرہ تاریخ کو ہی سیزر کو بروٹس اور دوسرے باغیوں نے قتل کیا تھا۔)

رات کا اندھیرا ہر شے کو سالم نگل کر سادگی سے دنیا والوں کو دیکھ رہا تھا۔ سرونٹ کوارٹر میں اس کا بستر خالی تھا اور وہ گھر کی پچھلی طرف لگے درخت پہ چڑھ کر دیوار کے پار اتر رہی تھی۔ جیسے ہی وہ زمین پہ اتری' سرخ مفلر والا آدمی کسی کونے سے نکل کر سامنے آکھڑا ہوا۔

وہ جھنجلائی ہوئی سی سیدھی ہوئی۔

"اس درخت پہ چڑھتے اترتے میرے جسم پہ دس بار زخم آئے ہیں۔ کیا تم مجھ سے کسی اور طرح سے نہیں مل سکتے؟"

"بات سنو لڑکی!" وہ اندھیرے میں کھڑا تھا اور اس کے چہرے کے خدوخال نظر نہیں آتے تھے۔

"تمہارے نام کا مطلب ہوتا ہے' پری چہرہ لڑکی۔ سپید جلد والی حسین لڑکی۔ تمہیں اپنے مالکوں سے غداری کے بدلے میں تمہیں جتنے پیسے میں دے رہا ہوں' ان سے تم اپنے نام کی طرح خوب صورت زندگی گزارو گی۔"

اس بات پہ اس کی آنکھیں چمکیں اور لبوں پہ مسکراہٹ در آئی۔

"تمہاری یہ ہی باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔" پھر

۳۰

تیسویں اور آخری قسط

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

گردن اکڑا کر بولی۔ "بتاؤ' اب مجھے کیا کرنا ہے۔"

☆ ☆ ☆

دشت ہستی میں شب غم کی سحر کرنے کو
ہجر والوں نے لیا رخت سفر سناٹا

فارس ابھی ابھی لاؤنج میں داخل ہوا تھا اور بغیر تمہید کے اس نے وہ تکلیف دہ خبر سنادی تھی۔
لاؤنج میں سناٹا طاری ہوگیا۔ سب شل سے اسے دیکھے گئے۔ وہ اسی طرح کھڑا رہا۔
"ہاشم نے اپنی ماں پہ....؟" زمر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ حنین سے کچھ بولا نہیں گیا۔ ندرت نے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔
"اس کو حیا نہیں آئی؟ وہ اس کی ماں تھی۔" ان کا دل کانپا۔
"کوئی اپنی ماں کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟" بڑے ابا انگشت بدنداں تھے۔
"کیونکہ اس کی ماں نے اسے یہ ہی سکھایا ہے۔" سعدی نے افسوس سے سر جھٹکا تھا۔ "میں اسی لیے ان کی اصلیت ہاشم کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا' وہ ان کو مار ڈالے گا۔"
"مارا ہی تو نہیں ہے اس نے ان کو۔" فارس سپاٹ سے انداز میں کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ زمر اٹھ کے اس کے پیچھے آئی۔ وہ کمرے میں آکر چپ چاپ صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔
"تمہیں افسوس نہیں ہوا؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔
فارس نے وہی بے تاثر نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "ایک انسان ہونے کی حیثیت سے' ہاں ہوا ہے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی ماں کو خود سزا دے۔ وہ دونوں میرے بھائی اور بیوی کے قتل میں شریک جرم تھے۔ البتہ میں اس سے اتنی سفاکی کی توقع نہیں کر رہا تھا' مگر یہ وہ عورت ہے جس نے نوشیرواں کی ایسی تربیت کی کہ وہ سعدی کو گولیاں مار کے چلا گیا۔ جس نے ہاشم کی ایسی تربیت کی کہ وہ ہماری زندگیاں اجاڑتا رہا۔ جس نے سعدی کے قتل کا حکم نامہ جاری کیا۔ تمہاری صحت کے ساتھ کھیلتی رہی۔ اس لیے سچ پوچھو تو مجھے کوئی زیادہ افسوس نہیں ہے۔ میں نے کئی برس جن دنوں کا انتظار کیا تھا' بالآخر وہ دن آگئے ہیں۔" اس کی آواز سرد ہوگئی تھی۔
زمر اداسی سے اسے دیکھتی رہی۔ "کیا انتقام لے کر سکون ملتا ہے فارس؟"
وہ زخمی سا مسکرایا۔ "تم نے وہ تین قدیم چینی بددعائیں سن رکھی ہیں؟ خدا کرے تم جیو دلچسپ زمانوں میں.... خدا کرے تمہیں اعلا عہدوں پہ فائز لوگ پہچاننے لگیں.... اور تیسری....." اس نے گہری سانس بھری۔ "خدا کرے تمہیں وہ مل جائے جس کی تمہیں تلاش تھی۔"
"یہ بددعائیں ہیں؟"
"پتا نہیں' مگر مجھے لگتا ہے میری طرف آتی ساری بددعاؤں کی قبولیت کا وقت آپہنچا ہے۔" اور وہ اٹھ گیا۔
"کتنا شوق تھا مسز کاردار کو پلاسٹک سرجریز کروانے کا۔" باہر بیٹھی حنین خلا میں دیکھتی کہہ رہی تھی۔ "اب ان کو ساری زندگی جانے کتنی سرجریز کروانی پڑیں گی۔"
"ہاشم ایسا تو نہیں تھا۔" سعدی افسوس سے بولا تو سب نے اسے دیکھا' آنکھیں نکال کر۔ ابھی زمر کو لفٹ میں ڈبونے والے واقعے کو دن ہی کتنے ہوئے تھے؟
"میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ جب میں اس کی قید میں تھا' تب وہ پچھتاتا تھا۔ اس کا دل ایسا نہیں تھا۔ اب وہ ہر حد پار کرتا جا رہا ہے۔" وہ ترحم سے کہہ رہا تھا۔ حنین کے دل کے اندر.... کچھ آج بھی ڈوبتا تھا۔ شاید وہ یادیں تھیں' شاید کچھ اور.....
"وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا بیٹا۔" بڑے ابا نے تلخی

سے مسکرا کے کہا۔ "تم یہ نہ سمجھو کہ وہ شروع میں اچھا تھا' یاد کرو' تب اس نے وارث کو قتل کروایا تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تب وہ پچھتانے والی باتیں کر کے تمہاری ہمدردی سمیٹ لیتا تھا۔ تمہیں لگتا تھا وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ مگر اب اس نے سچ بولنا شروع کر دیا ہے۔ وہ کبھی نہیں بدلے گا۔"

سعدی خاموش ہو گیا۔ شیشے کی دیواروں والی قصر کاردار کی لائبریری یوں ہی یاد آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

جنہیں غرور تھا اپنی ستم گری پہ بہت
ستم تو یہ ہے کہ وہ بھی ستم رسیدہ ہوئے

"ایک ہفتے بعد۔"

ہسپتال کے اس پرتعیش کمرے میں جابجا پھول رکھے تھے۔ کوئی عزیز رشتے دار ایسا نہ تھا جس نے پھول نہ بھجوائے ہوں۔ وہ جیسے خوشی کے پھول تھے۔ اب ملنے کوئی نہیں آ رہا تھا۔ پہلے دو دن جو لوگ آئے' سو آئے۔ اب سکوت تھا۔

جواہرات کے بیڈ کے آگے پردے گرے تھے۔

نوشیرواں اس طرف کھڑا تھا۔ سینے پہ بازو لپیٹے' وہ ان پھڑپھڑاتے پردوں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی کسی درز سے وہ لیٹی ہوئی نظر آ جاتی۔ آنکھیں چھت پہ جمی تھیں اور چہرہ پٹیوں میں جکڑا تھا۔ اس کا صرف دایاں گال اور کان بچ پائے تھے۔ باقی چہرہ بائیں طرف اور سامنے سے جل گیا تھا۔ چل پھر سکتی تھی' کام کر سکتی تھی' مگر بینائی پہ اثر پڑا تھا۔ ناک غائب ہو گئی تھی۔

"ان کو گھر کب لے جا سکتے ہیں؟" شیرو نے دھیمی آواز میں پیچھے کھڑی میری سے پوچھا۔

"بہت جلد۔"

"کیا جو نقصان ہوا ہے' وہ ٹھیک ہو سکے گا؟"

"نہیں سر! سرجریز سے تھوڑا بہت فرق پڑے گا۔ باقی میڈم کو اب ان زخموں کے ساتھ ہی رہنا ہو گا۔" وہ ٹھنڈے انداز میں بتا رہی تھی۔

"کیا کوئی بات کی انہوں نے تم سے؟" شیرو کی نظریں پردوں پہ جمی تھیں۔

"وہ صرف ہاشم کا نام لیتی ہیں۔ ان کو پکارتی ہیں۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ یہ وقتی صدمہ ہے۔ وہ جلد شاک سے نکل آئیں گی۔" شیرو نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"تم جانتی تھیں' انہوں نے میرے باپ کو مارا' پھر بھی ہمیں نہیں بتایا؟" اس کی آواز میں دبا دبا غصہ اور کرب در آیا۔

"ہاشم مجھ سے یہ بات پوچھ چکے ہیں اور میں بتا چکی ہوں۔ میں ایک وفادار ملازمہ ہوں اور جیسے کورٹ میں آپ کے اور ہاشم کے راز کی حفاظت کی' اسی طرح میڈم کے راز کی بھی حفاظت کی۔ اس تیزاب والے واقعے کے بعد جب سب ملازم استعفیٰ دے رہے ہیں' میں اسی لیے یہاں موجود ہوں' کیونکہ میں اب بھی مسز کاردار کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ اسے چند لمحے دیکھے گیا۔ کمرے میں پھولوں کی خوشبو میں کافور کی بو گھلنے لگی تھی۔

"بھائی نے بہت ظلم کیا۔ مگر میں بھی ممی کو معاف نہیں کر سکتا۔ اگر ڈیڈ مجھے عاق کر رہے تھے' تب بھی ان کو ڈیڈ کو..... میرے ڈیڈ کو قتل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ سن رہی ہیں آپ ممی۔" اس نے چہرہ پھڑپھڑاتے پردوں کی طرف موڑا۔ "ڈیڈ اس حالت میں مرے کہ وہ مجھ سے ناراض تھے۔ میں ان سے معافی نہیں مانگ سکا۔ میں ساری عمر اس گلٹ میں رہوں گا کہ میرا باپ مجھ سے ناراض تھا۔"

وہ گیلی آنکھوں کے ساتھ الٹے قدم پیچھے ہٹنے لگا۔

"اب عدالت مجھے جیل میں ڈال دے یا سولی چڑھا دے' میں دوبارہ آپ سے ملنے نہیں آ سکوں گا۔ باپ تو وہ میرا تھا' مگر منہ پہ آپ کے اب بھی ہاشم کا نام ہے۔ شیرو تو آپ کو یاد ہی نہیں۔" وہ اب پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔

اور بستر پہ پٹیوں میں جکڑا وجود اسی طرح چھت کو تک رہا تھا۔ ہونٹوں سے صرف ایک آواز نکل رہی تھی۔ "کوئی ہاشم کو بلائے..... میرے ہاشم کو۔"

شیرو کے جانے کے بعد میری کاؤچ پہ بیٹھ گئی اور اطمینان سے میگزین کھول لیا۔

☆ ☆ ☆

جن پر ستم تمام قفس کی فضا کے تھے
مجرم وہ لوگ اپنی شکست انا کے تھے

ہاشم کے بیڈ روم کی ساری بتیاں روشن تھیں اور وہ آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑا رئیس کہہ رہا تھا۔

"نیا اسٹاف آج سے کام شروع کردے گا۔ چھوڑ جانے والے ملازموں کو میں نے سنبھال لیا ہے۔ یہ صرف گیس ہیٹر کا حادثہ تھا اور ہر جگہ یہ ہی بتایا گیا ہے اور سر..." وہ رکا۔ "آپ کی مدر کے علاج کے لیے ڈاکٹرز نے..." ہاشم نے جھٹکے سے ٹائی کی آخری گرہ کھینچی۔

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرے باپ اور اورنگزیب کاردار کی بیوی کے علاج کے لیے تمام رقم کمپنی ادا کرے گی۔ اب مزید میں اس معاملے پہ کچھ نہیں سننا چاہتا۔" اس نے درشتی سے کہتے ہوئے کالر سیدھے کیے۔ رئیس خاموش ہو گیا۔

"اس غیر شناسا نمبر سے پھر میسج آیا سر؟"

"دو روز پہلے آیا تھا۔ وہ سعدی کو دہشت گرد ثابت کرنے کے لیے ہماری کوششوں پہ خوش تھا۔ میں نہیں جانتا وہ لوگ سعدی کو دہشت گرد کیوں ثابت کروانا چاہتے ہیں، لیکن اتنا یقین ہے کہ وہ ہماری قابلیت جانچ رہے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ کام کرنے کا خواہش مند لگتا ہے۔"

"سر! میں نے کوٹ روم والے آدمی کا... وہ چشمے والا آدمی... اس کا پیچھا کیا تھا، مگر وہ ہر دفعہ چکمہ دے کر نکل جاتا ہے۔ آپ کو یقین ہے کہ یہ پیغام بھیجنے والا اور سعدی کا پاسپورٹ دینے والا اور اصل وہی آدمی ہے۔"

"ظاہر ہے، کیونکہ وہ ہمارے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے۔ میں نے سعدی پہ تمام الزامات لگا کر اس کا اعتماد خرید لیا ہے۔ یہاں تمام عسکری گروپ اسی طرح اپنے سہولت کاروں کا اعتماد جانچتے ہیں اور پھر پارٹنر شپ شروع کرتے ہیں۔ جرائم کے سفر کا آغاز ہمیشہ ایک چھوٹے سے فیور سے شروع ہوتا ہے۔"

"سعدی کو دہشت گرد ثابت کرکے ان کو کیا ملے گا؟"

"اس سے میری کریڈیبلٹی بڑھے گی۔ جج اسے دہشت گرد مان نہیں لے گا، لیکن لوگ مجھے دہشت گردوں کا مخالف سمجھیں گے اور کوئی بھی عسکری تنظیم ایسے سہولت کار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ ہمیں بہت جلد نئے بزنس پارٹنرز ملنے والے ہیں۔"

اب وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کمرے سے نکل رہے تھے۔

لاؤنج میں فینونا کھڑی صفائی کررہی تھی۔ میری اور وہ... بس دو ملازم رہ گئے تھے۔ ہاشم جب سیڑھیوں سے اترتا ہوا اس کے سامنے سے گزرا تو وہ بولی۔

"سر... میں نیکسٹ منتھ سے چلی جاؤں گی۔"

اس کی آواز میں تذبذب تھا۔

"جو چاہے کرو۔" وہ نخوت سے کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

باہر صبح تازہ اور خوب صورت تھی۔ مگر قصر اداس لگتا تھا۔ وہ موسم سے بے نیاز کار کے قریب آیا ہی تھا کہ...

"کاردار صاحب۔" بے چین سی نسوانی آواز پہ وہ ٹھٹکا اور مڑا۔ ڈاکٹر ایمن چند گارڈز کے ہمراہ چلی آرہی تھی۔ ہاشم کے ماتھے پہ بل پڑے۔

"بی بی! میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

"میں نے اور میرے شوہر نے ان جج صاحب اور کرنل خاور کے کہنے پہ آپ کے لیے اتنا کچھ کیا۔" وہ تیز تیز چلتی قریب آئی اور غصے سے انگلی اٹھا کر بولنے لگی۔ "اور اب جب ہم کنگال ہو چکے ہیں، تو آپ ہماری مدد بھی نہیں کرسکتے۔"

ہاشم نے تندی سے اسے گھورا۔ "کیا چاہتی ہو

تم؟"

"مجھ سے کوئی نیا کام لیں یا ہمیں مالی طور پہ سپورٹ کریں، ہمیں.... ہمارا.... ریوارڈ چاہیے۔ آپ اپنے سہولت کاروں سے یوں منہ نہیں موڑ سکتے۔"

ہاشم چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر تاثرات نرم ہوئے۔ آگے آیا اور نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"آئی ایم سوری، میں کچھ پریشان ہوں آج کل۔ بس کچھ روز میں.... یہ کیس ختم ہو جائے۔ میں آپ سب کو نوازوں گا۔ میں مدد کرنے والوں کو بھولا نہیں کرتا۔ مگر تب تک آپ کو خاموشی سے انتظار کرنا ہو گا۔"

ڈاکٹر ایمن کے تنے تاثرات ڈھیلے پڑے۔ اس نے سر ہلا دیا، مگر ابھی تک اضطراری انداز میں انگلی میں پہنی نوکیلے ہیرے والی انگوٹھی موڑ رہی تھی۔

"کیا آپ مجھے زبان دے رہے ہیں؟"

"بالکل...." وہ چند لمحے نرمی سے اس کی تسلی کراتا رہا، پھر اس کے جانے کے بعد.... وہ رئیس سے آہستہ سے بولا تھا۔

"ان سب کا بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ یہ تو میری جان کو آرہے ہیں۔"

✲ ✲ ✲

اک خواب ہے کہ بار دگر دیکھتے ہیں ہم
اک آشنا سی روشنی سارے مکاں میں ہے

مور چال پہ گہری رات چھائی تھی۔ گرمی اور حبس دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ لاؤنج نیم روشن تھا۔ فارس ابھی ابھی آیا تھا اور چابیاں کھونٹی پہ لٹکا رہا تھا جب دیکھا، ندرت تن فن کرتی کچن سے نکلی ہیں اور دھاڑ سے سیم کے کمرے کا دروازہ کھولا ہے، جو اندھیرے میں ڈوبا تھا اور حنین اور اسامہ اپنے اپنے بستر پر لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔

"کوئی انسانیت ہے تم لوگوں میں؟" وہ حلق کے بل چلائیں۔ "میں نے کہا تھا آدھے گھنٹے بعد دودھ کا چولہا بند کر دینا مگر جب تک دودھ کی آبشار نہ بہہ جائے، تم لوگوں کی تسلی نہیں ہوتی۔"

"آیا!" وہ اکتا کر ان کے قریب آیا۔ "وہ سو رہے ہیں، ان کے سر پہ آپ کیوں چلا رہی ہیں؟"

ندرت نے اتنے ہی غصے سے مڑ کر اسے دیکھا۔

"بس کرو۔ بڑے سو رہے ہیں۔ ان بے غیرتوں کا واٹس ایپ کا لاسٹ سین تو تین منٹ پہلے کا نظر آرہا ہے۔ بس ماں کو دیکھ کر فرعون کی ممیاں بن جاتے ہیں۔ ہونہہ۔" وہ غصے سے بولتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

فارس نے بے اختیار ان دونوں کے پلنگ دیکھے جن میں جنبش تک نہ ہوئی تھی۔ وہ سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"یار حنہ!" سیم نے جھٹ منہ نکال کر اسے پکارا۔ وہ بھی فوراً اٹھ بیٹھی۔

"ہاں ہاں میں بھی وہی سوچ رہی ہوں جو تم سوچ رہے ہو۔ امی کا انٹرنیٹ بند کرنا پڑے گا۔ یہ تو بگڑتی جا رہی ہیں۔"

"بالکل۔ ماں باپ کو اتنی آزادی دینا اچھی بات نہیں ہے۔ آج کل کے زمانے کا کوئی بھروسا نہیں۔" دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

فارس اپنے کمرے میں آیا تو وہ ہمیشہ کی طرح بہت سی فائلز کے درمیان بیٹھی نظر آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر سر اٹھایا اور مسکرائی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

"کام ہو رہا ہے؟" آدمی گھر آئے اور بیوی مسکراتی ہوئی ملے تو....

"ظاہر ہے، اب کسی بے روزگار کو کیا پتا جاب کے بکھیڑے۔ خیر کھانا لاؤں یا کسی پرانی دوست کے ساتھ کھا آئے ہو؟"

اور فارس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ "بہت مہربانی۔ کھا چکا ہوں۔" اور اس کے سامنے بیڈ پہ بیٹھا۔

زمر نے مسکراہٹ دبالی۔ "مجھے پتا ہے میں تمہاری ویسی خاطر مدارت نہیں کرتی جیسی کسی بیوی کو کرنی چاہیے۔ بس یہ کیس ختم ہو جائے۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم مجھے جیل بھیج سکتی ہو' میرے خلاف بیان دے سکتی ہو مگر تم مجھے کھانا نہیں پوچھ سکتیں۔"

وہ اب جھک کر جوتوں کے تسمے کھول رہا تھا۔ زمر بے اختیار ہنس دی۔ گھنگریالے بال آدھے باندھے' آدھے سامنے کو جھول رہے تھے۔ وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ ناک کی لونگ' انگلی کی نیلے نگ والی انگوٹھی اسے مزید حسین بناتی تھی۔

"تم ہمیشہ سے اتنے ہی ظالم تھے یا اب ہوئے ہو؟"

"آپ کی صحبت کا اثر ہے مادام! ورنہ میں تو چند ماہ پہلے تک ایک شریف آدمی تھا۔ ویسے...." وہ اس کے سامنے نیم دراز ہو گیا۔ "اس چڑیا گھر سے ہم کب نکل رہے ہیں۔"

"نکلنا کیوں چاہتے ہو یہاں سے؟"

"میں چاہتا ہوں ہمارا اپنا علیحدہ گھر ہو۔ جہاں ہم دو نارمل انسانوں کی طرح رہیں۔"

"ابھی ہم نارمل نہیں ہیں کیا؟"

"آپ کے بارے میں تو شک ہے بی بی!" اس کے سامنے' کہنی کے بل لیٹے' کان تلے ہاتھ کا سہارا دیے وہ مسکرا کے اسے دیکھتے بولا تھا۔

"اور نئے گھر میں جا کر تم کوئی نوکری شروع کرو گے یا نہیں؟"

"آپ مجھے اپنا ذاتی خدمت گار رکھ لیجیے گا۔ اس سے بڑی نوکری کیا ہو گی؟ ماشاء اللہ وکیل ہیں آپ' لوگوں کی کھال کھینچ کر پیسے لیتی ہیں۔ مجھے بھی تنخواہ تو اچھی دیں گی۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ اور وہ ہنستے جا رہی تھی۔

"ہمیشہ جاب کی بات ٹال دیتے ہو۔ مگر میں بھی ہار ماننے والی نہیں ہوں۔ پیچھے پڑی رہوں گی۔" قلم سے تنبیہہ کرتے وہ دو ٹوک بولی اور پھر سے لکھنے لگی۔ پھر سر اٹھا کر بولی۔

"اگر فارس' ہمارے پاس وارث غازی کی فائلز ہوتیں' یا حنین کا میموری کارڈ ہوتا جس میں کاردار ز کے خلاف کچھ مواد تھا' تو ہم یہ کیس بہت آسانی سے جیت لیتے۔"

"ہمارے پاس ایک انتہائی قابل وکیل ہے' جو بے شک انتہائی بے مروت اور سفاک واقع ہوئی ہے' مگر میں اچھی امید رکھتا ہوں۔"

اور اب بہت ہو چکا تھا۔ زمر نے فائل اٹھا کر اسے دے ماری تھی۔

"کیا کہا تھا میں نے ابھی؟ سفاک اور بے مروت وکیل۔" فارس نے فائل پکڑ کر سامنے سے ہٹائی اور افسوس سے سر جھٹکا۔ وہ ہنس کر سر جھٹکتی دوبارہ سے کام کرنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

آسمانوں سے فرشتے جو اتارے جائیں
وہ بھی اس دور میں سچ بولیں تو مارے جائیں

کمرۂ عدالت میں ہمیشہ سے زیادہ گھٹن تھی۔ مگر کم از کم آج کے دن موسم ثانوی شے بن کر رہ گیا تھا۔ کیا بادلوں کی سیاہی اور کیا درختوں کا سبزہ' سب بے اثر تھا۔ لوگ آ رہے تھے۔ نشستیں بھرتی جا رہی تھیں۔ آوازیں' شور' حرکت۔

دفاع کی کرسیوں پہ رش کم تھا۔ چند ایک کاروباری دوستوں کے ہمراہ ہاشم اور نوشیرواں موجود تھے۔ شیرو سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا اور چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ ہاشم البتہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے اطمینان سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ طنزیہ سرد مسکراہٹ۔

فارس جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا' مسکرا کے ساتھ کھڑی سارہ کی بات سن رہا تھا' جو سر پہ سفید دوپٹہ اوڑھے' ہری آنکھوں سے مسکراتی ہوئی اپنی بیٹیوں کی کوئی بات بتا رہی تھی۔

زمر کرسی پہ بیٹھی' گھنگھریالے بال آدھے باندھے' بدستور فائلوں پہ جھکی تھی اور سیاہ ڈریس شرٹ میں ملبوس سعدی اس کے کندھے پہ جھکا' اس کے ساتھ ہی کاغذات پڑھنے میں لگا تھا۔ شاید کوئی نکتہ مل جائے جو کیس کو لمبا کر سکے۔ کچھ وقت گواہ ڈھونڈنے کا اور مل

جائے۔ ندرت ایک کرسی پہ بیٹھی، تسبیح کے دانے گراتی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ایسے میں حنین اور اسامہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

"حنہ... اگر ہم ہار گئے تو؟"

"اور اگر ہم جیت گئے تو؟" وہ چہک کر بولی تھی۔

پچھلی نشستوں پہ موجود تماشائی اور رپورٹرز مرعوب اور کچھ تنقیدی نگاہوں سے اس خاندان کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سب ایک ساتھ کھڑے، ایک جتھے کی صورت ... دور بیٹھے، قیمتی ملبوسات اور مصنوعی مسکراہٹوں والے "کاردارز" اور ان کے دوستوں سے زیادہ متاثر کن لگ رہے تھے۔ جنگیں لڑ کر آیا خاندان... زخموں کو اپنے ہاتھوں سے بغیر نشہ لیے سی کر آیا خاندان... پانی میں ڈوب کر ڈر اور خوف کو ختم کر کے آیا خاندان... ظالم کے خوف سے ایک دوسرے کو چپ کروا کے چھپ جانے کے بجائے انصاف اور انتقام کی ایک طویل جنگ لڑ کر آیا خاندان... وہ یوں کھڑے تھے، اٹھی گردنوں اور فاتحانہ مطمئن مسکراہٹوں کے ساتھ کہ لگتا تھا آج وہ انصاف سے کم کسی شے پہ راضی نہیں ہوں گے... وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ایک دوسرے سے ہزار اختلاف رکھتے تھے مگر وہ ظلم کے خلاف کھڑے ہو کر ایک اونچی دیوار لگنے لگے تھے۔

"کیا استغاثہ کے پاس کوئی مزید گواہ ہے؟" جج صاحب کی آمد کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی اور انہوں نے پہلا سوال یہی پوچھا۔ زمر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یور آنر، ہمارا گواہ ملک سے باہر ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں ایک تاریخ اور دی جائے۔"

"سیریسلی مسز زمر!" جج صاحب نے تحیر سے اسے دیکھا۔

"Delaying Tactics!" (دیر کرنے کے طریقے) ہاشم نے بلند سا تبصرہ کیا۔

"مسز زمر!" جج صاحب کی آواز میں سرزنش تھی۔ "آپ کے پاس ابھی گواہ ہے یا نہیں؟"

"یور آنر، کاردار صاحب نے گواہوں کو غائب کروا دیا ہے، مگر..."

"آبجیکشن یور آنر، مسز زمر بغیر ثبوت کے الزام لگا کر خود ہی testify (شہادت دینا) کر رہی ہیں۔" وہ بیٹھے بیٹھے بولا تھا۔

"آپ کے پاس گواہ ہے یا نہیں؟" جج صاحب نے زور دے کر پوچھا۔

"نہیں یور آنر، لیکن اگر عدالت وزارت داخلہ کو حکم دے تو ہمیں گواہ کو ڈھونڈنے میں مدد مل سکتی ہے اور..."

"مسز زمر! عدالت اپنی حدود میں رہ کر کام کرتی ہے، ثبوت لانا جج کا نہیں استغاثہ کا کام ہوتا ہے۔ اگر آپ کے پاس کچھ پیش کرنے کو نہیں ہے تو ہم آج اس کیس کا فیصلہ کر دیں گے۔" وہ قدرے ناگواری سے کہہ رہے تھے۔ سب خاموشی سے دم سادھے کبھی زمر کو دیکھتے، کبھی جج صاحب کو۔

"یور آنر، اگر آپ ہمیں ایک موقع اور دیں تو..."

"آپ عدالت کا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ آپ تمام ثبوت اور گواہ پیش کر چکی ہیں، اب بہت ہو گیا۔" انہوں نے اب کے قدرے نرمی سے اسے اشارہ کیا اور فائل کھول لی۔ زمر نے گہری سانس لی۔ فیصلے کی گھڑی آ پہنچی تھی۔

"عدالت فیصلہ سنانے کے لیے تیار ہے۔" جج صاحب کا یہ کہنا تھا کہ سب نشستوں سے اٹھ گئے۔ دونوں فریق اب برابر کھڑے تھے۔ اور جج صاحب اوپر اونچے چبوترے پہ بیٹھے، عینک ناک پہ لگائے کاغذ سے پڑھ کر کہہ رہے تھے۔

"سرکار بنام نوشیرواں کاردار میں مدعی سعدی یوسف نے نوشیرواں کاردار ولد اورنگزیب کاردار... (ہاشم نے تھوک نگلا۔) کے اوپر اقدام قتل، تشدد، اغوا اور حبس بے جا میں قید رکھنے کا الزام لگایا تھا جو کہ تعزیرات پاکستان آرٹیکل 350، 365، 307 کے تحت آتے ہیں۔

فارس سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ سب کی طرح وہ بھی بھنویں بھینچے سانس روکے سن رہا تھا۔ البتہ گردن بھی گھما لیتا تھا۔ چشمے والا آج نہیں آیا تھا۔

"عدالت نے ان سنگین الزامات کو دیکھتے ہوئے ان کے اوپر کارروائی شروع کی اور دونوں فریقین کو اپنی اپنے ثبوت اور گواہ لانے کا حکم دیا۔" جج صاحب پڑھتے ہوئے گاہے بگاہے ان کو دیکھ بھی لیتے جو دم سادھے سن رہے تھے۔ (اسامہ بور ہو رہا تھا۔ ڈراموں میں تو ایک ہی فقرے میں فیصلہ کر دیتے ہیں' یہ اتنی لمبی تقریر کیوں کر رہے ہیں؟)

"استغاثہ نے ڈاکٹر سارہ غازی کو عدالت میں عینی شاہد کے طور پر پیش کیا۔" (سارہ نے نروس سے انداز میں کان کے پیچھے بال اڑسے۔) "سعدی یوسف کی بہن نے گواہی دی کہ ملزم کے بھائی نے ان کے سامنے اعتراف کیا تھا۔ مگر اسی واردات کے دوسرے مبینہ ملزم نیاز بیگ نے گواہی دی کہ اس نے سعدی کو گولی ماری ہے' البتہ اس کے بیانات میں تضادات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ قابل بھروسہ نہیں ہے۔ (سعدی نے بے چینی سے پہلو بدلا) ملزم کے ملازموں اور گھر والوں کے بیانات استغاثہ کے دعووں سے بالکل برعکس تھے اور وہ قابل اعتبار تھے یا نہیں' ہمیں یہاں فیصلہ یہ کرنا ہے کہ کیا عینی شاہد کا بیان قابل بھروسہ ہے۔"

سب کی سانسیں رک رک کر چل رہی تھیں۔ دل بندھے ہوئے تھے۔

"ڈاکٹر سارہ صرف اقدام قتل کی گواہ ہیں۔ اغوا اور حبس بے جا میں رکھنے کا استغاثہ نے کوئی گواہ پیش نہیں کیا۔ میری اینجیو کولمبو کی کسی جیل میں سعدی کے ساتھ تھی؟ جواہرات کاردار وہاں سعدی سے ملنے گئی تھیں' آبدار عبید کی وہاں سعدی سے ملاقات ہوئی تھی؟ ان باتوں کے حق میں کوئی گواہ یا ثبوت نہیں پیش کیا گیا۔ آلۂ واردات سے ملزم کے تعلق کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ اس لیے سارا کیس آخر میں عینی شاہد ڈاکٹر سارہ کی گواہی کے گرد آکھڑا ہوتا ہے۔"

وہ سانس لینے کو رکے۔ بہت سے حلق خشک ہو رہے تھے۔ ہاشم لب کاٹ رہا تھا۔ نوشیرواں کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ سعدی کو پسینے آ رہے تھے۔

"دفاع نے اپنی باری پہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سعدی یوسف ایک دہشت گرد ہے مگر اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں دیا گیا کہ یہ نو ماہ سعدی نے دہشت گردوں کے ساتھ گزارے۔ عدالت سعدی یوسف کے اس دعوے سے اتفاق کرتی ہے کہ اس کو واقعی اغوا کیا گیا اور حبس بے جا میں رکھا گیا' گو کہ سعدی یوسف کی واپسی کے بارے میں اور وہاں ہوئے چند واقعات جیسے دو افراد کا سیلف ڈیفنس میں قتل' خود سعدی یوسف کے کردار کو بھی مشکوک بناتا ہے مگر یہ باتیں اس کیس کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔ عدالت میں استغاثہ کا کام یہ ثابت کرنا تھا کہ اغوا کرنے والا اور گولی مارنے والا ایک شخص نوشیرواں کاردار تھا۔ استغاثہ ملزم کے گواہوں جیسے کاردار صاحب کی سیکرٹری حلیمہ یا ملازمہ میری اینجیو کو جھوٹا ثابت کر دے' تب بھی کیا نوشیرواں حملہ آور اور اغوا کار ثابت ہوتا ہے؟ اگر سعدی اکیس مئی کو ہاشم کاردار کے آفس گیا بھی تھا' تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کئی گھنٹے بعد اسے گولیاں نوشیرواں نے ہی ماریں۔ آفس میں تو نہیں مارا گیا تھا سعدی کو۔ گھوم پھر کے ہم واپس ڈاکٹر سارہ کی گواہی کی طرف آکر رک جاتے ہیں۔"

اب تو دل کی دھڑکنیں بھی رک گئی تھیں۔

"ڈاکٹر سارہ ایک طرف ایک پروفیشنل سائنس دان ہیں اور اعلیٰ عہدے پہ فائز ہیں' ایسے عہدے انسان کو باہمت اور بہادر بناتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک سال تک ایسا کوئی بیان نہیں دیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ عینی شاہد ہیں۔ ان کا بیان آخری وقت آیا اور اگر اس کو درست مان لیں تو یہ بات کہ وہ ذہنی سکون کے لیے دواؤں کا استعمال کرتی ہیں'

سائیکاٹرسٹ کے پاس زیر علاج ہیں اور سعدی کی نہ صرف باس بلکہ رشتے دار ہیں' یہ بات ان کی گواہی کو

جانب دار بنا دیتی ہے اور کیس میں شک پیدا ہو جاتا ہے اور قانون کہتا ہے کہ شک کا فائدہ ملزم کو دیا جائے اس لیے یہ عدالت.... آج نوشیرواں کاردار کو.... ان تمام الزامات سے جو سعدی یوسف نے ان پہ لگائے تھے.... باعزت بری کرتی ہے۔"

اور سارے میں ایسا سناٹا چھایا جیسے کسی کے مرنے پہ چھا جاتا ہے۔

چند لمحے کے لیے تو ہر شخص پھٹی پھٹی آنکھوں سے جج صاحب کو دیکھے گیا۔ خود ہاشم بھی۔ پھر ایک دم دفاع کی کرسیوں پہ شور سا بلند ہوا۔ "مبارک سلامت" کے نعرے۔ قہقہے۔ خوشی کی چھکار۔ سعدی نے سفید پڑتے چہرے کے ساتھ گردن موڑی تو دیکھا۔ ہاشم خوشی سے مسکراتے ہوئے نوشیرواں کو گلے لگا رہا تھا، جو شل کھڑا تھا۔ پیچھے سے سب مبارک بادیں دے رہے تھے۔

زمر سر جھٹکتی اپنے کاغذات سمیٹنے لگی۔ ندرت نے سر جھکا کر آنسو پونچھے۔ سیم نے آسمان کو دیکھا۔ فارس زخمی سا مسکرا دیا۔

"یہ سب میرا قصور ہے۔" سارہ نے رندھی آواز میں کہتے ہوئے سر جھکا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سارہ کا سر تھپکا۔

"آپ نے اپنی بساط سے بڑھ کر جدوجہد کی ہے۔ یہ انصاف کی عدالتیں نہیں ہیں، یہ قانون کی عدالتیں ہیں۔"

"ہم اپیل کریں گے۔ خیر ہے سعدی!" زمر نے باہر نکلتے ہوئے اسے تسلی دی جو شل سا تھا۔ فکرمند سی حنین نے بھی دوسری طرف سے پکارا۔ "ہاں بھائی، ہم اپیل کریں گے۔"

"فائدہ کیا ہوا اس سب کا پھر؟" سیم مایوسی سے بول اٹھا تھا۔ وہ اب راہداری میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ سعدی ابھی تک سن تھا۔ ششدر۔ جامد۔

"کاردار صاحب، مبارک ہو۔" ہاشم وکلا کے جھرمٹ میں مسکراتا ہوا، لوگوں سے ہاتھ ملاتا باہر نکل رہا تھا۔ نوشیرواں کے حواس بحال ہو رہے تھے، اور وہ اب وکیلوں کے بڑھے ہاتھوں کو تھام کر مصافحہ کر رہا تھا۔ ہر شخص فاتح وکیل سے ہاتھ ملانے اور مبارک باد دینے کا خواہاں تھا۔ سب چاہتے تھے کہ ہاشم ان کو یاد رکھے۔ وہ جو کچھ عرصے سے نیچے جا رہا تھا، آج اس کا گراف پوری شان و شوکت سے بلند ہو گیا تھا۔

دونوں گروہ ساتھ ساتھ احاطے سے باہر آئے تھے۔ رپورٹرز کے مائیک تیزی سے سب کے سامنے آئے تو زمر محض "ہم اپیل کریں گے" جیسے چند فقرے کہہ کر سعدی کا بازو تھامے آگے بڑھ گئی۔ فارس سمیت باقی گھر والے پارکنگ کی طرف جا رہے تھے مگر سعدی نے بازو چھڑا لیا اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ وہاں ہاشم اور شیرو کھڑے تھے۔ ان کی پشت پہ مجمع تھا، اور سامنے مائیکس۔ ہاشم دن کی روشنی میں کھڑا مسکرا کر بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ "آج انصاف اور قانون کی فتح ہوئی ہے۔ آج معزز عدالت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کوئی گولڈ ڈگر، مشکوک کردار کا مالک غریب لڑکا اٹھ کر کسی باعزت شہری کو اس کی امیری کی سزا نہیں دے سکتا۔" وہ فاتحانہ انداز میں اطراف میں نظریں دوڑاتا کہہ رہا تھا۔ کیمرے کلک کلک کرتے اس کی تصاویر اتار رہے تھے۔ ساتھ کھڑے شیرو کی نظر سعدی پہ پڑی تو وہ نظریں چرا گیا۔ وہ خود بھی اتنا ہی بے یقین تھا جتنا کہ سعدی۔

"سعدی یوسف نے کیس کے دوران متعدد بار ہم سے بھاری رقوم کا مطالبہ کیا مگر ہم جانتے تھے کہ عدالت میں فتح سچ اور حق کی ہی ہو گی۔ ہم ان وکلاء میں سے ہیں جنہوں نے چیف جسٹس کی بحالی اور عدلیہ تحریک کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ ہم نے اس ملک میں جمہوریت کی بقا کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ اب وہ زمانے چلے گئے جب لالچی لوگ اس طرح غریب کارڈ کھیلتے تھے۔ اب عدالتیں آزاد ہیں۔"

"سعدی چلو۔" زمر اسے کہنی سے کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس نے پھر سے بازو چھڑا لیا اور

پتلیاں سکیڑے ہاشم کو دیکھے گیا۔ فارس آدھے راستے سے مڑ کر واپس آیا اور برہمی سے اسے پکارنے لگا۔

"سعدی! کیا کر رہے ہو؟"

ادھر ہاشم کہہ رہا تھا۔ "میں اعلیٰ حکام سے درخواست کرتا ہوں کہ بھلے ہم نے سعدی یوسف کو معاف کر دیا ہو، مگر کیس کے دوران جو سعدی کے دہشت گردوں کی معاونت کے ثبوت اور گواہ سامنے آئے ہیں ' ان کے بارے میں مکمل تحقیقات ہونی چاہئیں۔"

"کاردار صاحب! آپ کے اپنے ہی بھائی نے آپ کی کمپنی کے خلاف پریس کانفرنس کی تھی اور پیپر شائع کیا تھا جس سے آپ کی کمپنی کو کافی نقصان ہوا۔ اس بارے میں کیا کہیں گے؟"

"اسی سے آپ اندازہ لگالیں کہ کیا اتنا سچا اور مخلص انسان کسی کو گولی مار سکتا ہے؟" وہ شیرو کی طرف اشارہ کر کے ترکی بہ ترکی بولا تھا۔

"کاردار صاحب! آپ اپنی والدہ کے حادثے کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

مگر وہ سوال مکمل ہونے سے پہلے ہی "ابھی کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" کہہ کر مسکراتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ رپورٹرز بکھرنے لگے اور وہ دونوں بھائی جھرمٹ میں راستہ بناتے چلتے ہوئے اس طرف آنے لگے۔

سعدی اسی طرح کھڑا تھا۔ اس کا تنفس تیز ہو رہا تھا' ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چہرہ دھوپ کی تمازت سے سرخ پڑ رہا تھا۔ وہ سامنے سے آتے فاتح ہجوم کو دیکھ کر چلایا تھا۔

"جھوٹ بول رہے ہو تم لوگ۔"

ہاشم نے دھوپ کے باعث ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا بنا کر مسکرا کے اسے دیکھا۔ رپورٹرز اب اس طرف گھوم گئے تھے۔

"اللہ قہر نازل کرے تم پہ۔ اللہ غارت کرے تمہیں۔" کیمرے دھڑا دھڑ سعدی کی تصاویر اتار رہے تھے' ویڈیو بنا رہے تھے۔

ہاشم مجمع کی طرف گھوما اور تبصرے کے سے انداز میں کہنے لگا۔ "شکست کے بعد بہت سے لوگوں کو نفسیاتی امراض کے ہسپتال میں داخلے کی ضرورت ہوتی ہے' مجھے افسوس ہے اس بچے کے لیے۔ لیکن میں نے اس کی جھوٹوں کے لیے اس کو معاف کیا۔"

ہاشم پھر سے چلنے لگا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ اسے آگے بڑھنے کے لیے سعدی کے پاس سے گزرنا تھا۔

اور سعدی مٹھی بھینچ کر آگے بڑھا کہ اس کے منہ پہ دے مارے' مگر فارس نے پیچھے سے اس کو کہنی اور بازو سے جکڑ لیا۔

"چلو یہاں سے۔" وہ دبی دبی سختی سے بولا تھا۔ "وہ تمہیں اکسا کر تماشا کرنا چاہتا ہے' چلو یہاں سے۔"

ہاشم اب مسکراتا ہوا قریب آ چکا تھا۔ آخری بات پہ بھی سعدی نہ رکتا' اگر فارس اسے زبردستی کھینچتا ہوا وہاں سے نہ لے جاتا۔ ساتھ ہی وہ اس کو ڈانٹ بھی رہا تھا۔ "کیا کر رہے تھے تم؟ اس کو مکا مارتے تو وہ اقدام قتل کا مقدمہ کر دیتا' اور اس کے پاس ثبوت بھی ہوتے اور گواہ بھی۔ وہ یہی تو چاہتا ہے۔"

سعدی لڑکھڑاتے قدموں سے چلنے لگا۔ چلتے چلتے کندھا جھٹک کر اس نے بازو چھڑا لیا۔ چہرہ سرخ تھا' آنکھوں میں پانی تھا۔ سب گھر والے کار پارکنگ میں رکے کھڑے تھے' اس نے کسی کو نہیں دیکھا..... کسی سے بات نہیں کی۔ بس آگے بڑھتا گیا..... بڑھتا گیا۔

نوشیرواں اور ہاشم کافی دیر بعد اپنی اپنی کار کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ مبارکبادوں اور تعریفوں کو سمیٹنے میں وقت لگا تھا۔ نوشیرواں اب سنبھل چکا تھا اور صرف سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ ہاشم نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولا۔

"تم آزاد ہو۔ آج سے نئی زندگی شروع کر سکتے ہو۔"

"آپ کو یقین تھا کہ ہم جیت جائیں گے؟"

"اگر میں شروع میں اسے نہیں لڑنا چاہتا تھا تو اس لیے کہ ہم بدنام ہوں گے' کاروبار کو نقصان پہنچے گا مگر مجھے معلوم تھا کہ یہ کیس وہ نہیں جیت سکتے۔ قتل کرنا آسان ہے شیرو! اسے ثابت کرنا بہت مشکل۔" اس نے مسکرا کے شیرو کا شانہ تھپکا۔ نوشیرواں جواباً" اس

کے گلے لگ گیا۔

"مجھے بچانے کا شکریہ بھائی۔" اس کے کان کے قریب شیرو بولا تھا۔ "مگر مجھے افسوس ہے کہ دوسروں کی طرح میں نے بھی آپ کو استعمال کیا۔ یہ جو ٹوٹی ہوئی ہینڈز فری میں آپ کی جیب میں ڈال رہا ہوں' یہ وہ ہے۔ جس کا ایئربڈ آبدار نے اس روز توڑ کر جھوٹ بولا تھا کہ وہ بگ ہے۔" ایک ہاتھ سے اس کی جیب میں ٹوٹے ہوئے تار ڈالتے' وہ دھیرے سے زہر اس کے کانوں میں انڈیل رہا تھا۔ "زمر کو اس نے نہیں' میں نے بچایا تھا۔ جس جرم کی آپ نے اس کو سزا دی' وہ اس نے کیا ہی نہیں تھا۔"

یہ کہہ کر وہ اس سے الگ ہوا تو دیکھا... ہاشم کی تلخ مسکراہٹ ویسی ہی قائم تھی۔

"میرے بے وقوف بھائی!" اس نے شیرو کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا تو سرد سی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی گئی۔ "تمہیں لگتا ہے مجھے یہ نہیں معلوم؟ تم ہمیشہ بے وقوف رہو گے شیرو۔ فارس کو لفٹ کا علم پہلے سے تھا' یہ دیکھ کر ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ تم نے کیا ہے۔ میں نے تم سے پوچھا بھی تھا' تم نے انکار کر دیا' لیکن میں تمہارے ساتھ وہ نہ کرتا جو آبی کے ساتھ کیا۔ میں نے اس کو اس لیے مارا کیونکہ وہ مجھے اکسا رہی تھی' وہ خود قتل ہونا چاہتی تھی۔ وہ پیپر نائف سے مجھے نہیں مار سکتی تھی' وہ صرف چاہتی تھی کہ میں اسے مار ڈالوں۔ میں نے اس کی خواہش پوری کی۔ میں نے اس پہ احسان کیا۔ اس کا جرم وہ تمام دھوکے تھے جو وہ مجھے اس سے پہلے دے چکی تھی۔ مجھے اب کسی بات کا کوئی پچھتاوا نہیں ہے اور میں تمہارا کیس تمہیں بچانے کے لیے نہیں لڑتا رہا۔ صرف اپنے نام کو کلیئر کرنے کے لیے لڑتا رہا ہوں۔"

نوشیرواں شل ہو گیا تھا۔ یہ عدالتی دھچکے سے زیادہ بڑا دھچکا تھا۔

"اگر وہ الزام اپنے سر نہ لیتی تو میرے... میرے ساتھ کیا کرتے آپ؟"

"وہی جواب کرنے جا رہا ہوں۔" وہ زخمی سا

مسکرایا۔ "ہم دونوں الگ الگ گاڑیوں میں واپس جائیں گے، الگ زندگیوں کی طرف۔ سونیا کے ساتھ میں قصر سے شفٹ ہو رہا ہوں۔ تم اور تمہاری ماں وہاں رہ سکتے ہو۔"

پھر ایک ملامتی مسکراہٹ کے ساتھ اسے چند لمحے دیکھتا رہا۔ "تم سب نے مجھے تباہی کی طرف دھکیلا ہے شیرو۔ تم... ممی... سعدی... شہرین... آبی تم سب سے محبت کی تھی میں نے۔ تم سب نے مجھے میری محبت کی سزا دی۔" کہہ کر اس نے سن گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے... ان کی سرخی اور نمی چھپالی اور کار میں بیٹھ گیا۔ کالا شیشہ بند ہو گیا تو شیرو اسے دیکھنے کے قابل بھی نہ رہا۔

چند لمحے بعد وہاں سے دو کاریں دو الگ راستوں پہ روانہ ہوئی تھیں۔ اور عدالت کی اونچی عمارت کی قدیم دیواریں، خاموشی سے اپنے جہنمی شور کو سنتی رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

دیکھا نہ کسی نے بھی مری سمت پلٹ کر
محسن میں بکھرتے ہوئے شیشوں کی صدا تھا

وہ کن قدموں سے گھر پہنچا اسے معلوم نہ تھا۔ سب خاموشی سے اندر آئے تھے صرف وہ تیزی سے آگے بھاگتا گیا تھا۔ کمرے میں آکر اس نے دروازہ مقفل کر دیا۔ پردے گرے تھے، اور دوپہر کے باوجود روشنی نہ تھی۔ اسٹڈی ٹیبل پہ قانون کی کتابیں رکھی تھیں۔ سعدی چند لمحے گلابی پڑتی آنکھوں سے ان کتابوں کو دیکھتا رہا۔

"میں سچ بول رہا تھا۔" اس نے موٹی کتاب اٹھا کر زور سے دیوار پہ دے ماری۔

"میں سچ بول رہا تھا۔" اس نے بوٹ کی ٹھوکر سے میز لڑھکا دی۔ اسٹڈی لیمپ نیچے آگرا۔ فرش سے ٹکرا کر بلب چکنا چور ہو گیا...

"میں سچ بول رہا تھا۔" وہ اب ریک میں رکھی کتابیں نکال نکال کر زمین پر پھینک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

"میں سچ بول رہا تھا۔" وہ روتے ہوئے گھٹنوں کے بل زمین پہ گرتا گیا۔ سر جھکائے، آنکھیں سختی سے میچے، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا پڑا تھا جن میں ہزاروں قوانین اور دستور درج تھے۔

"میں سچ بول رہا تھا۔" اس نے گیلی آنکھیں کھولیں۔ پھر غصے اور بے بسی سے ایک کتاب اٹھائی اور کھول کر صفحے پھاڑنے چاہے۔ مگر ہاتھ کانپ گئے۔ وہ یہ نہیں کر سکا...

"میں سچ بول رہا تھا۔" وہ سیاہ جلد والی سیاہ و سفید کی مالک کتابوں کے سامنے اکڑوں بیٹھا تھا اور سر گھٹنوں میں دیے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ "مگر کیا فائدہ ہوا سچ بولنے کا؟ سچ کے لیے لڑنے کا؟"

باہر سب خاموشی سے اس کی توڑ پھوڑ اور اب سسکیوں کی آوازیں سن رہے تھے مگر ایک دوسرے سے نظریں چرائے ہوئے تھے۔ بڑے ابا نے کسی سے کچھ نہ پوچھا تھا۔ چہرے بتا رہے تھے کہ جو انصاف مانگنے گئے تھے، وہ مصلحتوں میں لپٹے نظریۂ ضرورت جیسے فیصلے کو اٹھا لائے تھے۔

ادھر اپنے آفس کی راہداری میں تیز تیز چلتے ہاشم نے رئیس سے پوچھا تھا۔ "آخری کارڈ کھیلنے کا وقت آ گیا ہے۔ پارٹی کی تیاری مکمل ہے؟"

"جی سر۔ سب تیار ہے۔"

"اچھا۔ میں نیا گھر دیکھنے جا رہا ہوں۔ انٹیریئر ڈیزائنر نے آج کام ختم کر لینا تھا۔ کیا وہ ہو گیا؟" وہ سیل فون دیکھتے تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ زندگی کی مصروفیت پھر سے شروع ہو چکی تھی۔

"یس سر۔ آپ کیس کے سلسلے میں بزی تھے، میں نے اس کو سنبھال لیا تھا۔"

"تم نے نہیں۔" اس نے مسکرا کے ٹوکا۔ "میں نے... ہاشم نے سنبھالا ہے ہر شے کو۔" اور آگے بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

ناشناسائی کے موسم کا اثر تو دیکھو
آئینے کے خال و خد آئینہ گر کو ترسے

اس تپتی صبح لگتا تھا سارے شہر پہ سونے کا ملمع چڑھا دیا گیا ہے۔ شاید زمین کے اندر بڑے بڑے جہنم دہک رہے تھے، جس سے اوپر چلنے والے بے خبر تھے۔ ایسے میں ہسپتال کی مرمریں راہداری میں وہ دونوں چلتے جا رہے تھے۔ زمر سبز رنگ کے لباس میں ملبوس تھی اور سن گلاسز بالوں پہ ٹکا رکھے تھے۔ فارس سیاہ شرٹ پہنے، ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے، چلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم واقعی ان سے ملنا چاہتی ہو؟"

ایک دروازے کے سامنے وہ رک گئی اور مڑ کر اسے دیکھا۔ "تم اپنی آنٹی سے نہیں ملو گے؟"

"میرا دل تمہاری طرح نہیں ہے۔ میں ابھی کچھ نہیں بھولا۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر وہیں رک گیا۔ زمر گہری سانس لے کر آگے بڑھ گئی۔

زمر اندر آئی ہی تھی کہ اسے شہرین باہر آتی دکھائی دی۔ اس نے سونی کی انگلی پکڑ رکھی تھی اور میری انجیو تحکم سے اسے کہہ رہی تھی۔ "ہاشم کا حکم ہے کہ آپ آخری دفعہ سونی کو ساتھ لے جا رہی ہیں، ویک اینڈ پہ۔ جب آپ اسے چھوڑنے آئیں گی تو اس کے بعد....." زمر کو دیکھ کر وہ چپ ہوئی۔ شہری نے بھی دیکھا تو سر جھٹک کر سونی کو لیے آگے بڑھ گئی۔

میک اپ اور ڈائمنڈ جیولری پہنے کھڑی میری نے ملکہ کی شان سے گردن اکڑا کے اسے مخاطب کیا۔ "خوش آمدید مسز زمر۔ اندر آئیے۔ مسز کاردار آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

وہ اندر چلی آئی۔ آج کمرے میں کوئی پھول نہ تھا۔ پردے ہٹے تھے اور چمکیلی روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔ کھڑکی کے سامنے آرام کرسی پہ جواہرات بیٹھی تھی۔ رخ موڑ رکھا تھا اور سر پہ شال لے کر چہرہ ڈھک رکھا تھا۔ زمر کافی پیچھے بیٹھ گئی تاکہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔

"تم جاؤ میری!" جواہرات نے بیٹھی ہوئی آواز میں میری کو کہا، مگر میری زمر کے قریب صوفے پہ بیٹھ چکی تھی۔

"نہیں مسز کاردار، مجھے یہاں ہونا چاہیے۔" اس کی آواز میں تمکنت تھی، ایسی تمکنت جسے جواہرات رد نہ کر سکی۔ خاموش ہو گئی۔

"کیوں آئی ہو زمر؟" وہ باہر دیکھتے ہوئے آزردہ سی ہو کر پوچھنے لگی۔

"آپ کی خیریت پوچھنے آئی تھی۔" توقف کیا۔ "میں جانتی ہوں کہ میری ریورلس، میری صحت، میری زندگی کے ساتھ آپ کیسے کھیلتی رہی ہیں۔ شاید آپ مجھ سے حسد کرتی تھیں۔ حالانکہ میں آپ جیسی خوب صورت بھی نہ تھی، مگر آپ کو اپنے سامنے کسی کی تمکنت اچھی نہیں لگتی، بہر حال....." اس نے سر جھٹک کر گہری سانس لی۔ آنکھیں جواہرات کی پشت پہ جمی تھیں۔ "میں آپ کو معاف کرنے آئی ہوں، دل سے۔ ویسے ابھی تک بھولی کچھ بھی نہیں ہوں، مگر میں آپ کو معاف کرنا چاہتی ہوں۔ ہاشم کا معاملہ میں نے اللہ پہ چھوڑ دیا ہے۔"

ایک آنسو جواہرات کی آنکھ سے ٹپکا اور چہرے پہ پھسلتا گیا۔

"میں نے تم جیسے بہت سے لوگوں کو اُجاڑا ہے زمر! مجھے کون کون معاف کرے گا؟"

"آپ معافی مانگ لیں، یہ ہی اہم ہوتا ہے۔"

"ہاشم مجھے معاف نہیں کرے گا، شیرو مجھے معاف نہیں کرے گا۔ اب کچھ پہلے جیسا نہیں ہو گا۔ ہاشم سے کہو، مجھے معاف کر دے۔ مجھ سے ملنے آ جائے۔"

"میں یہ نہیں کر سکتی مسز کاردار، مگر میں آپ کو اپنے اوپر کیے گئے تمام مظالم کی قید سے آزاد کرتی ہوں۔ میرا اور میرے خاندان کا کوئی حساب اب آپ پہ ادھار نہیں ہے۔"

جواہرات اسی طرح باہر دیکھتی رہی۔ آنسو گر رہے تھے۔ "میں تم سب سے بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ میری مدد کرو۔ مجھے اکیلا مت چھوڑو۔ مجھے اپنے سارے گناہوں کا احساس ہے۔"

زمر زخمی سا مسکرائی، اور پرس کندھے پہ ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "نہیں مسز کاردار! آپ نہ شرمندہ ہیں، نہ آپ کو احساس ہے۔ آپ اب بھی مجھے استعمال کرنا چاہتی ہیں، ہاشم کو منانے کے لیے۔ اکثر انسان نہیں بدلتے۔" جواہرات بالکل چپ ہو گئی۔ آنسو بہنا رک گئے۔

"یعنی تم لوگ اب مجھے دشمنی کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔" پھر اس کے لبوں سے سرد آہ نکلی۔

"اللہ آپ کو صحت دے اور آپ پہ رحم کرے۔ میں چلتی ہوں۔" وہ باہر کی طرف بڑھ گئی۔

فارس راہ داری میں دیوار کے ساتھ کھڑا تھا، ہاتھ جیبوں میں ڈال رکھے تھے اور چھت کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ یوں ہی نگاہ پھیری تو سامنے سے شہری اور سونی آتی دکھائی دیں۔ شہرین نے اسے دیکھ کر فوراً" نظریں چرا لیں۔ فارس نے سونی کو دیکھا، وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھے گیا۔ انتہائی خوب صورت بچی تھی وہ۔ وہ نرمی سے مسکرایا۔ تو سونیا نے غصیلی آنکھوں کے ساتھ ہونٹوں کو بنا آواز کے ہلا کے کہا۔

"آئی ہیٹ یو۔" اور منہ موڑ کے آگے بڑھتی گئی۔

فارس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ آنکھوں میں اچنبھا ابھرا۔ کچھ دور اندر زخمی بھی ہوا تھا۔

پھر اس نے سر جھٹکا۔ چند لمحے بعد زمر آتی دکھائی دی تو وہ اس کی طرف بڑھ گیا، مگر دو سیاہ خوب صورت آنکھیں، ان کا یک ٹک اسے دیکھنا اور ہونٹوں کا ہلا کر بنا آواز کے تین الفاظ بولنا، وہ دماغ سے زیادہ دل کے اندر تک پیوست ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وقت رکتا ہی نہیں خواب ٹھہرتے ہی نہیں
پاؤں جمتے ہی نہیں بہتے ہوئے پانی پر

کتنی راتیں اتریں، کتنے دن ڈھلے، زندگی میں گھل جانے والی مایوسی سعدی کو ہر شے سے بے نیاز کر چکی تھی۔ وہ تمام گھر والوں سے نظریں چرا کے صبح جلدی نکل جاتا پھر یوں ہی سڑکوں پہ پھرتا رہتا۔ یا سارا سارا دن کمرے میں پڑا رہتا۔ اس روز سے اس کا جیسے دل ہی ٹوٹ گیا تھا۔ ملک، قانون، انصاف کے ادارے ہر شے سے اعتماد اٹھ گیا تھا۔ پاکستان کا کوئی مستقبل نہیں ہے، وہ جان گیا تھا۔

آج پھر وہ کمرے میں پڑا تھا۔ صوفے پہ لمبا لیٹا، موبائل پہ انگلی پھیرتا سوشل میڈیا دیکھ رہا تھا۔ "سیو سعدی یوسف پیج" کے علاوہ۔ وہاں تو شرمندگی سے وہ جاتا ہی نہیں تھا۔

باہر لاؤنج میں آؤ تو ٹی وی ہنوز غائب تھا، اور بڑے ابا، اسامہ اور حنین سے محو گفتگو دکھائی دیتے تھے۔ اسی اثنا میں ندرت سامنے والے صوفے پہ آ بیٹھیں اور میز پہ کبابوں کے کچے آمیزے کا برتن رکھا۔ ساتھ میں پانی کا پیالہ اور بڑی ٹرے جس میں ٹکیاں بنا بنا کر رکھنی تھیں۔ چند لمحے گزرے اور دونوں اولادیں ان کے دائیں بائیں آ بیٹھیں۔ آنکھوں میں زمانے بھر کا ندیدہ پن تھا۔

"امی، صبح جو آپ نے حلیم بنائی تھی وہ بہت مزے کی تھی۔"

ندرت نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا۔ "کسی کا ہاتھ کبابوں کے ایک فٹ بھی قریب آیا تو میں نے جوتے مار مار کر شکل بدل دینی ہے۔"

"یہ دھمکی اب پرانی ہو چکی مام ڈارلنگ!" حنہ نے دو انگلیوں سے مسالا اچک کر منہ میں رکھا۔ امی کی ناک کے نیچے سے کچے کبابوں کا آمیزہ کھانا... آہ... من و سلویٰ تھا یہ۔

ایک زور کا تھپڑ اس کے ہاتھ پہ آلگا۔ "ہزار دفعہ کہا ہے درمیان سے مت اچک لیا کرو۔ بے برکتی ہوتی ہے۔" مگر ان کو فرق نہیں پڑتا تھا۔

"ندرت!" ابا کو کچھ یاد آیا۔ "فارس کہہ رہا تھا، وہ لوگ نیا گھر لینا چاہ رہے ہیں۔"

"حالانکہ یہ اتنا بڑا گھر کافی ہے۔" ندرت کو بات پسند نہیں آئی تھی۔

"امی! آپ کیوں اسٹار پلس والی دادی بننا چاہ رہی

ہیں؟ ان کو رہنے دیں جہاں وہ جاتے ہیں۔" حنہ نے ناک سکیڑی تھی۔
"تو.... میں تو ایک بات کہہ رہی تھی۔"
"امی! آپ نا بھائی کی شادی کردیں۔ یوں رونق آجائے گی گھر میں...." اس نے چٹکی میں حل بتایا۔
ندرت نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کے سعدی کے کمرے کو دیکھا۔ (سیم نے آنکھ بچا کر ذرا سا آمیزہ اٹھا کر منہ میں رکھا۔ من و سلویٰ۔) "پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی میرے بیٹے کو۔"
"چلو جی...." حنہ نے منہ بنایا۔ "ساری دنیا کے لوگوں کو مسئلے ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے پیش آتے ہیں' ایک ہم پاکستانیوں کو ہر بات میں یا تو نظر لگتی ہے یا جادو ہوتا ہے۔"
"نظر برحق ہے بیٹا۔" ابا نے تنبیہہ کی۔
"جی ابا! بالکل برحق ہے' یہ اونٹ کو ہانڈی اور انسان کو قبر تک پہنچا دیتی ہے' مگر جب قرآن میں اللہ تعالیٰ لوگوں پہ آنے والی مصیبتوں کا ذکر کرتا ہے تو فرماتا ہے کہ نمبر ایک' وہ ان کو ان کے اعمال کے سبب پہنچیں' نمبر دو' وہ لوح محفوظ میں اللہ نے ایسی ہی لکھ رکھی تھیں۔ مجھے لگتا ہے ابا کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم پاکستانی نظر اور جادو سے نکل آئیں اور اپنے مسئلوں اور اعمال کو OWN کرنا سیکھیں۔ نظر لگتی ہے اور جادو بھی ہوتا ہے' مگر ذرا ذرا سی باتوں میں نہیں ہوتا۔ رہا آپ کا بیٹا تو والدہ ماجدہ' ادب کے ساتھ' آپ کے بیٹے اور بھائیوں کے اعمال ہی ایسے تھے۔ انہوں نے برے لوگوں کے ساتھ پنگا لیا' گو کہ انہوں نے اچھا کیا تھا' مگر ہر اچھے کام کے نتیجے میں اچھائی تو نہیں ملتی نا۔"
سر پہ ندرت کا تھپڑ لگا تو وہ چپ ہوئی۔ "زیادہ بک بک نہ کرتی رہا کر ہر وقت۔ بس ماں کی غلطیاں نکالنے پہ لگتا ہے انعام ملنا ہوتا ہے تم لوگوں کو۔ اب جاؤ' بھائی کو بلا کر لاؤ' کھانے کا بتائے' کیا کھائے گا' میں وہی بناؤں۔"
"امی! یہ کباب فرائی کردیں۔" اسامہ چہکا۔

"یہ مہمانوں کے لیے ہیں۔ ہٹو اب۔"
اور اب جب حنین بھائی کے کمرے کی طرف جارہی تھی تو پیچھے سے سیم کے "مہمانوں" کی شان میں قصیدے سن سکتی تھی۔ (کسی کے گھر جاؤ تو نہیں کھانے دیتیں.... اور اپنے گھر میں ہر اچھی چیز مہمانوں کے لیے رکھ دیتی ہیں۔)
سعدی اندھیرا کیے صوفے پہ بیٹھا فون دیکھ رہا تھا۔
"بھائی۔" حنہ اس کے ساتھ آکھڑی ہوئی' پھر جھک کر دیکھا۔ وہ ہاشم کا ٹوئیٹر دیکھ رہا تھا۔ تصویر میں ہاشم تھا۔ اسسٹنٹ اس کے کوٹ کا کالر درست کررہا تھا' آگے پیچھے لوگ کام کرتے دکھائی دیتے تھے۔
"وکٹری پارٹی۔ کاردارز کالج۔ تھینک یو پاکستان۔ سرکار بنام نوشیرواں کاردار۔" یہ تمام الفاظ Hashtag کرکے لکھے گئے تھے۔
"اس کو مت دیکھا کریں بھائی۔ اب بس نکل چکے ہیں یہ لوگ ہماری زندگی سے۔"
"یہ مایا ہے.... ڈاکٹر مایا...." وہ تیزی سے بولا تو حنین سناٹے میں رہ گئی۔ "یہ جو لڑکی کونے میں نظر آرہی ہے' سائڈ پوز! " وہ زوم کرکے دیکھ رہا تھا۔ بے یقینی سے۔ حیرت سے۔ "یہ مایا ہی ہے۔ یہ ہے وہ گواہ جسے ہم ڈھونڈ رہے تھے۔" مگر حنہ نے اسکرین پہ ہاتھ رکھ دیا۔
"مگر اب کوئی فائدہ نہیں۔ اس کو بند کریں اور باہر آئیں۔ امی بلا رہی ہیں۔"
وہ کہہ کر خود آگئی' مگر جب کافی دیر گزرنے کے بعد سعدی نہ آیا تو حنہ دوبارہ اس کے کمرے میں گئی۔
کمرہ خالی تھا۔ بیرونی گیلری کو جاتا دروازہ کھلا تھا۔ الماری کے پٹ کھلے تھے۔ ہینگر بیڈ پر پڑا تھا۔ گویا اس نے لباس بدلا تھا۔ حنین دم بخود سی کھڑی رہ گئی پھر میز پر نظر پڑی جہاں سیاہ فون بک کھلی نظر آرہی تھی۔ وہ زمر کی تھی جس میں وہ عرصے سے وکلا اور ججز کے گھر کے پتے لکھ کر محفوظ کرتی تھی۔ حنہ نے صفحے پلٹے' ایج نکالا۔ ہاشم کاردار۔ اس کے دو تین پتے لکھے تھے۔ تیسرا کاردارز کالج کا تھا۔ اس کا فارم ہاؤس جو چک

شہزاد کی طرف تھا۔

وہ فوراً "باہر بھاگی۔ اس کا دل بری طرح سے کانپ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا اکیس مئی کی صبح پھر سے آن پہنچی ہے۔ وہ تب بھی تیار ہو کر۔۔۔ سوٹ پہن کر گھر سے گیا تھا۔۔۔ بغیر بتائے۔۔۔ نہیں۔۔۔ آج نہیں۔

☆ ☆ ☆

ذرا سی بارش ہوئی تھی مگر درخت اور پودے نہا کر سرسبز نکل آئے تھے۔ مٹی کی سوندھی خوشبو سارے میں رچ بس گئی تھی۔ زمر کار سے نیچے اتری اور گردن اٹھا کر دھلے دھلائے خوب صورت بنگلے کو دیکھا تو ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ سن گلاسز آنکھوں سے اوپر لے جا کر ماتھے پہ ٹکائے۔ فارس اپنی طرف کا دروازہ بند کر کے باہر نکلا اور مسکراتا اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔

"کیسا لگا ممکنہ طور پہ ہمارا اپنا گھر؟"

"اچھا ہے۔" اس نے مسکرا کے سراہا۔ وہ دونوں اب کار کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے بنگلے کو دیکھ رہے تھے۔

"اس چڑیا گھر سے تو بہت ہی اچھا ہے۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

زمر نے خفگی سے آنکھیں گھما کر اسے دیکھا۔ "میرے گھر والوں کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہو؟"

"کیونکہ بی بی! آپ سے زیادہ وہ میرے گھر والے ہیں۔"

"مس کرو گے خود ہی ان کو۔" زمر نے واپس گھر کی طرف چہرہ موڑ لیا۔

"میں ان شاء اللہ تعالیٰ کسی کو بھی مس نہیں کروں گا۔" وہ جھرجھری لے کر بولا تھا۔

"مگر میں ان کے بغیر رہوں گی کیسے؟" وہ مصنوعی اداسی سے بولی۔

فارس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ "جی جی۔۔۔ آپ تو جیسے بڑی خدمت گزار بہو ہیں۔ دن میں چھ قسم کے کھانے بناتی ہیں اور بڑا لگاؤ ہے آپ کو جوائنٹ فیملی سے۔"

"یہ تم ہمیشہ سے اتنے ہی طنز کرتے تھے کیا؟" وہ اب سچ مچ برا مان گئی تھی۔

"آپ کی صحبت کا اثر ہے۔"

"ہم گھر دیکھنے آئے ہیں یا لڑنے؟"

"جو آپ کا موڈ ہو' آپ بتا دیں۔"

"ہونہہ۔۔۔" ناک سکیڑ کر اس نے سر جھٹکا اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ آگے گئی تو فارس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر آئی' مگر جلدی سے سنجیدہ چہرہ بناتا اس کے پیچھے لپکا۔

"تم خوش ہو؟" اس کے ساتھ اندر جاتے اس نے پھر سے اسے چھیڑا۔

"ہم کیس ہار گئے۔ مجھے خوش ہونا چاہیے؟" وہ واقعی اداس ہوئی۔

"جیت کر کیا ہوتا۔ وہ اپیل کرتے اور شیرو بری ہو جاتا یا ہاشم اسے جیل سے غائب کروا دیتا اور ملک سے باہر بھجوا دیتا۔ سب کا وقت بچ گیا۔ اب نئی زندگی کا سوچو۔" وہ اس نئے تعمیر شدہ مکان کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ وہ آگے تھی اور وہ پیچھے چل رہا تھا۔

"نئی زندگی میں تم اچھے اور شریف ہو جاؤ گے کیا؟" وہ مڑ کر سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

"استغفر اللہ۔" وہ بڑبڑایا۔ دو چار فقرے زبان تک آئے تھے' مگر فون کی گھنٹی۔۔۔ اس نے بگڑے موڈ سے موبائل نکال کر دیکھا۔ "حنین کالنگ" اس کا دماغ گویا بھنا اٹھا۔

"حنین! تم آخر پیدا کیوں ہوئی تھیں ہمارے گھر؟ کیا تم پہ لازم ہے کہ جب آدمی مصروف ہو' تم کوئی نہ کوئی کال کر کے ضرور دماغ خراب کرو گی۔"

وہ واقعی غصے سے بول رہا تھا' مگر دوسری طرف کے الفاظ سن کر اس کے ماتھے کے بل ڈھیلے پڑے۔ چہرہ پھیکا پڑا۔

"کب گیا ہے وہ؟ ہم آ رہے ہیں۔" ساتھ ہی فون بند کرتے زمر کو دیکھا جو چونک کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"سعدی۔۔۔" بولتے ہی وہ نیچے دوڑا۔ وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔ ایک دم سے سب کچھ بدل گیا تھا۔

✲ ✲ ✲

یہ اہل ہجر کی بستی ہے احتیاط سے چل!
مصیبتوں کی یہاں انتہا گزرتی ہے

کاروارز کاٹیج چھوٹا سا تھا مگر اس کے چاروں اطراف کھلے سبزہ زار بکھرے تھے۔ کاٹیج کی چار دیواری لکڑی اور شیشوں کی بنی تھی۔ دروازے کھڑکیاں۔۔۔ سب اونچے شیشوں سے مرصع تھے۔ دعوت شروع ہو چکی تھی اور ایئر کنڈیشنڈ لاؤنج میں کھڑے مہمانوں کو شیشے کی کھڑکیوں سے اطراف میں پھیلا سبزہ زار صاف دکھائی دیتا تھا۔ اندر میوزک کا شور تھا۔ لوگ ہاتھوں میں گلاس لیے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ کاٹیج کے کچن میں آؤ تو اس کے ساتھ ایک اور کمرہ بنا تھا۔ اس میں دیوار گیر آئینہ لگا تھا اور سامنے کھڑا ہاشم ٹائی کی گرہ لگا رہا تھا۔

"سب ٹھیک جا رہا ہے؟" اس نے اپنے عکس کے پیچھے نظر آتے رئیس کو دیکھ کر پوچھا۔

"یس سر! آپ کے ٹوئیٹر پہ وہ فوٹو شاپڈ پکچر لگا دی ہے۔ سعدی دیکھے گا تو سمجھے گا کہ یہ ڈاکٹر مایا ہے وہ دیکھنے ضرور آئے گا۔"

پن اسٹرائپ کوٹ پہنتے ہوئے وہ آئینے میں خود کو دیکھ کر مسکرایا۔ "میک شیور کہ اسے آرام سے اندر داخل ہونے دیا جائے۔ وہ مایا کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا جو یہاں ہے ہی نہیں۔" وہ اب دھیمی آواز میں مزید ہدایات دے رہا تھا۔

فارس جس وقت دھاڑ سے دروازہ کھول کر مور چال کے لاؤنج میں داخل ہوا حنین بے چینی سے دائیں بائیں ٹہل رہی تھی اور پیچھے ابا ندرت اور سیم پریشان سے بیٹھے تھے۔

"کون سی ڈائری ہے دکھاؤ۔" وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ راستے میں جتنا سن چکا تھا وہ بہت تھا۔ آگے بڑھا حنہ سے ڈائری خود ہی جھپٹ لی اور صفحے پلٹائے۔ بار بار بالوں میں انگلیاں چلاتا آستین سے پیشانی پونچھتا۔

"اس کا فون کیوں آف ہے؟" پیچھے پریشان سی زمر فون کان سے لگائے اندر آ رہی تھی۔ وہ سارا راستہ اسے کال کرتی رہی تھی۔

"مجھے نہیں پتا۔" حنہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ "میرے بھائی کو واپس لائیں۔"

"فارس۔۔۔ وہ کیا کرنے گیا ہے ادھر۔" ندرت نے کچھ کہنا چاہا مگر گلا رندھ گیا۔ انہوں نے سر پکڑ لیا۔ مگر وہ کسی کو نہیں سن رہا تھا۔ اس نے بس ڈائری سے ایک صفحہ پھاڑا اور باہر کو بھاگا۔

"میرے آنے تک کوئی گھر سے نہیں نکلے گا۔ میں اس کو لے کر آتا ہوں۔"

جاتے جاتے ایک نظر زمر پہ ڈالی۔ "میں آ رہا ہوں۔ بس اس کو لے کر۔"

کوئی وعدہ تھا جو اس نے کیا۔ ایسا ہی ایک وعدہ ندرت کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر بائیس مئی کی صبح بھی کیا تھا۔ وہ سب پرامید آنکھوں سے اسے دیکھے گئے اور وہ کسی الوداع کسی سلام کے بغیر باہر نکل گیا۔

"اوہ سعدی۔۔۔ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟" زمر سر ہاتھوں میں لیے صوفے پہ بیٹھتی چلی گئی۔

✲ ✲ ✲

پتھر ہو تو کیوں خوف شب غم سے ہو لرزاں؟
انساں ہو تو جینے کی ادا کیوں نہیں آتی

وہ خوب صورت سا بنگلہ شام کے اس پہر تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ سعدی ملازم کی معیت میں اندر داخل ہو رہا تھا۔ کوٹ کے نیچے سفید شرٹ پہنے بال بنائے وہ کافی سنجیدہ اور سوبر دکھائی دے رہا تھا۔ ملازم اسے اسٹڈی روم کے دروازے تک لے آیا اور پھر رخصت ہو گیا۔ اس نے گہری سانس لے کر دروازہ دھکیلا۔

اندر میز کے پیچھے جج صاحب عابد آغا بیٹھے تھے۔ دونوں ہاتھ باہم ملائے وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہے

تھے۔

"مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا تمہارا یہاں آنا کیونکہ میں عدالت میں فیصلہ دے چکا ہوں۔ تمہارا مجھ سے ملنا ہر طرح سے غلط ہے۔ لیکن تم نے درخواست کی تھی' اس لیے میں نرمی برت رہا ہوں' بیٹھو۔" وہ سنجیدگی سے بولے تھے۔

سعدی دروازہ بند کرکے ان کے سامنے آکر بیٹھا۔ کمرے میں پھر سے خاموشی چھا گئی۔ شیلف میں رکھی موٹی موٹی قانون کی کتابیں بوریت سے اس خاموشی کو سننے لگیں۔

"آج ہاشم کاردار وکٹری پارٹی دے رہا ہے یور آنر۔ اور اس میں وہ گواہ بھی شامل ہے جس کو میں ڈھونڈ رہا تھا۔" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "پہلے میں نے سوچا کہ وہیں جاؤں۔ زمر کی ڈائری کھولی' تاکہ اس کے کاٹیج کا ایڈریس دیکھوں' مگر وہاں آپ کا نام دیکھا تو یہیں چلا آیا۔" وہ غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"میں یہاں آپ سے کچھ پوچھنے آیا ہوں یور آنر! کیا میں واقعی ساری دنیا کو جھوٹا لگتا ہوں؟"

"سعدی!" ہاتھ باہم پھنسائے جج صاحب نے گہری سانس لی۔ اسٹڈی میں پھیلی مدھم روشنی نے ماحول کے تناؤ کو بڑھا دیا تھا۔ "جس وقت تم لوگ.... پہلے دن.... میرے کورٹ روم میں داخل ہوئے تھے۔ میں کیا' کچہری کا ہر ریڈر' رپورٹر' ہر وکیل' جج' حتیٰ کہ خاکروب اور جو باہر فوٹو کاپی کرنے والے بیٹھے ہوتے ہیں' وہ بھی یہ جانتے تھے کہ تمہیں کس بھائی نے گولیاں ماریں اور کس بھائی نے اغوا کرکے سری لنکا بھیجا۔ سب کو پہلے دن سے معلوم تھا کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔"

سعدی دم سادھے بیٹھا رہا۔ "آپ سب جانتے تھے؟"

"آج تمہیں ایک بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا ہوگا۔" وہ قدرے آگے کو جھکے۔ "عدالت میں دو طرح کے مقدمے ہوتے ہیں۔ یعنی جرائم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کرمنل کیسز اور کرپشن کیسز' کرمنل کیسز جیسے قتل' چوری' اغوا وغیرہ کے مقدمے اور کرپشن کیسز جیسے کسی سیاست دان یا سرکاری افسر نے اپنے عہدے کا فائدہ اٹھا کر ملک کی ترقی کے لیے جو فنڈز ہوتے ہیں ان میں سے رقم ہیر پھیر کرکے اپنے اکاؤنٹس میں بھری ہو۔ جب کسی پہ کرپشن کا الزام لگتا ہے تو ساری دنیا میں قانون یہ ہی ہے کہ بار ثبوت ملزم پہ ہوتا ہے' یعنی جس سیاست دان پہ الزام لگا ہے' اس کو خود ثبوت دے کر اپنے پیسے کو حلال کا پیسہ ثابت کرنا ہے۔ کرپشن کیسز میں الزام لگانے والا ثبوت نہیں دیتا' سمجھ میں آگیا؟"

سعدی کا سر اثبات میں ہلا۔

"اسی طرح پوری دنیا میں.... جب کرمنل کیس چلتا ہے۔ قتل' چوری' اغوا وغیرہ کے مقدمے.... تو ثبوت الزام لگانے والے کو دینا ہوتا ہے۔ کرپشن کیس کے برعکس' ٹھیک؟"

"ٹھیک!" وہ جانتا تھا مگر سر کو خم دیے سنے گیا۔

"تمہارے کیس میں سب کو معلوم تھا کہ تم سچے ہو' وہ جھوٹے ہیں' مگر سعدی یوسف خان! تمہارے پاس ثبوت نہیں تھے۔ میں نے سنا ہے تمہارے پاس کوئی ویڈیو بھی تھی ہاشم کے دفتر کی' مگر تم نے اور ہاشم نے ڈیلنگ کرکے اس کو دبا دیا' کیونکہ اس میں تمہاری بہن پہ انگلی اٹھنے کا خطرہ تھا۔ یہ باتیں کچہری میں کبھی نہیں چھپتیں۔ سب کو سب پتا ہوتا ہے۔ پاکستان میں ہر سو میں سے ننانوے قتل جب ہوتے ہیں تو چوبیس گھنٹوں میں سب کو قاتل کا پتا چل جاتا ہے۔ مگر سزا اس لیے نہیں ملتی' کیونکہ قانون کمزور ہے۔ یہ قانون ججز نے نہیں بنائے' یہ جن کو تم ووٹ دے کر اسمبلیوں میں بھیجتے ہو' انہوں نے بناتے ہیں قانون۔ ہم نے اس قانون کو مدنظر رکھ کر فیصلے کرتے ہیں اور قانون کہتا ہے کیس میں۔

Reasonable doubt

(معمولی سا شک) تک نہ آئے' مگر تمارے کیس میں شک تھا۔ جج انتظار کرتا ہے کہ ثبوت لاؤ' ثبوت

لاؤ' گواہ لاؤ۔ تم لوگ گواہ اور ثبوت نہیں لاتے تو جج کا کیا قصور؟ ڈاکٹر سارہ اسٹینڈ پہ کھڑے ہو کر ہاشم سے کہتی ہیں کہ تم میرے شوہر کے قاتل ہو۔ مگر تم لوگ ہاشم کے خلاف کوئی کیس پرسو ہی نہیں کر رہے تھے۔ تمہارا سارا زور نوشیرواں پہ تھا اور میں جانتا ہوں کہ وہ مجرم تھا۔ Accompile (شریک جرم) تھا۔ لیکن اگر تم اسی کیس کو ہاشم کے خلاف لڑتے تو شاید ثبوت مل جاتے۔ میرا کام اپنی معلومات' اپنے دل کی گواہی اور سنی سنائی باتوں پہ فیصلے کرنا نہیں ہے۔ مجھے ان چیزوں کو دیکھنا ہے۔ جو تم لائے ہو' وہ کمزور تھیں اور پھر مجھے مجبوراً "ملزم کو فائدہ دینا پڑا۔"

"بھلے آپ کو اندر سے معلوم ہو کہ وہ مجرم ہے؟"

"بھلے مجھے معلوم ہو کہ وہ مجرم ہے' مجھے فیصلہ اپنے اندر کی گواہیوں پہ نہیں کرنا۔ تم نے دو قتل کیے' تمہارے خلاف کارروائی کیوں نہیں ہوئی؟ کیونکہ قانون شہادت تمہیں پروٹیکٹ کرتا ہے۔ اگر ملزم قانون کی محبوب اولاد نہ ہو تو فارس غازی جیسے بے گناہ بھی کبھی جیلوں سے نہ نکل سکیں۔ یہ "شک کے فائدے" کا قانون جہاں نوشیرواں جیسے لوگوں کو بچا لیتا ہے' وہاں فارس غازی جیسوں کو بھی بچاتا ہے۔ اب پوچھو اور کیا پوچھنا ہے۔"

"یور آنر۔" وہ ہلکا سا مسکرایا اور آگے کو ہوا۔ آنکھیں ان کی آنکھوں میں ڈالے' اس نے بات کا آغاز کیا۔

"آپ نے واللہ بہت اچھی تقریر کی' چند لمحوں کے لیے تو میں بھی کنوینس ہو گیا' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں ہوں اکیسویں صدی کا پاکستانی نوجوان۔ آپ میں اور مجھ میں فرق ہے۔ آپ کے زمانے کی یوتھ نے اس ملک کو لوٹ کھایا تھا' ہماری یوتھ ویسی نہیں ہے۔ اس لیے اب میری بات تحمل سے سنیں اور سمجھیں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ آگے جا کر اپنے تمام ججز کو بھی بتا دیں اور جو میں کہنے جا رہا ہوں اس کے کسی لفظ پہ توہین عدالت لاگو نہیں ہوتی۔ اب وہ وقت آ گیا ہے جب ججز کو توہین عدالت کے پیچھے چھپنے کے بجائے اپنے اوپر ہونے والی تنقید برداشت کرنی چاہیے۔ آپ کہتے ہیں' بار ثبوت میرے اوپر تھا۔ ٹھیک۔ مگر میں ثبوت لایا تھا۔ میں گواہ لایا تھا۔ جانتے ہیں سب سے بڑا گواہ کون تھا؟ میں تھا۔ میں سعدی یوسف سب سے بڑا گواہ تھا۔ ڈاکٹر سارہ اگر نفسیاتی مریض تھیں تو اتنے بڑے عہدے پہ کیسے کام کر رہی تھیں۔ پھر بھی' اگر وہ کریڈیبل نہیں تھیں' تو میں تو تھا نا۔ میری گواہی کا کیا ہوا سر؟ مجھ پہ تو دو قتل ثابت بھی نہیں ہوئے تھے۔ مجھ پہ دہشت گردی ثابت بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہاشم نے تو صرف الزام لگائے' اس نے کوئی ثبوت تو نہیں دیا میرے خلاف۔ اس کے گواہ بھی کریڈیبل نہیں تھے' پھر میں کیسے ڈس کریڈٹ ہو گیا سر؟ آپ کی جگہ اگر یہ کیس کسی امریکی یا مغربی عدالت میں لڑا جاتا تو میری گواہی پہ فیصلہ ہو جاتا۔ لیکن میرے ملک کے ججز جو "ثبوت" سے کہتے ہیں کہ خود کو ثابت کرو' کیا یہ ججز بچے ہیں؟ کیا اس ملک میں اندھے قانون' بہرے جج اور گونگے ملزموں کا ہی راج رہے گا؟ اندھا قانون جو دیکھ نہیں سکتا کہ کون کریڈیبل ہے اور کون نہیں۔ بہرہ جج جو مدعی کی بات نہیں سنتا۔۔۔ اور ملزم جو اپنا خاموشی کا حق انجوائے کرتے ہوئے گونگا بنا رہتا ہے۔ یور آنر! آپ بے شک ایک ایمان دار جج ہیں' لیکن سارا مسئلہ یہ ہی ہے کہ میرے ملک کو صرف ایمان دار ججز کی نہیں' بہادر ججز کی ضرورت ہے۔ ججز قانون نہیں بناتے' ٹھیک۔۔۔ قانون سیاست دان بناتے ہیں' ٹھیک۔ مگر جج مثال تو قائم کر سکتے ہیں نا۔ ججز کے فیصلے قانون بن جاتے ہیں' اگر اس ملک کو بہادر جج مل جائیں اور وہ فیصلے کرنے پہ آ جائیں تو ان ہی فیصلوں کی بنیاد پہ کمزور ثبوت کے باوجود آئندہ فیصلے درست دیے جائیں گے۔ ہمارے ملک میں ایمان دار ججز بہت زیادہ' مگر بہادر ججز بہت کم ہیں سر۔

مجھے آج یہ کہہ لینے دیجیے یور آنر' بہت ادب سے' کہ ججز کا کام بینچ پہ بیٹھ کر گھمنڈ ظاہر کرنا یا مزاحیہ ریمارکس دے کر کے ہیڈ لائن بننا نہیں ہوتا۔ یہ اینکرز اور سیاست دانوں کا کام ہوتا ہے۔ آپ کا کام

ہے آخر میں درست فیصلہ کرنا۔ انصاف نہیں کرنا' بلکہ عدل کرنا۔ عدل اور انصاف میں فرق ہوتا ہے یور آنر۔ انصاف کہتا ہے کہ دو لوگ ہوں اور روٹیاں تین تو دونوں کو ڈیڑھ ڈیڑھ روٹی دو' مگر عدل کہتا ہے کہ دونوں آدمیوں پہ غور کرو۔ جو کئی دن سے بھوکا ہے' اس کو دو روٹیاں دو اور جو پہلے ہی سیر ہے اس کو ایک دو۔ انصاف کہتا ہے چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹو' مگر عدل کہتا ہے' جو قانون روٹی نہیں دے سکتا وہ ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ انصاف کہتا ہے سعدی یوسف قاتل ہے' عدل کہتا ہے' سعدی یوسف کو اس راستے پہ نہ چلنا پڑتا' اگر قانون فارس غازی کو چار سال تک لٹکا نہ رکھتا۔ ہمیں منصف جج نہیں چاہئیں۔ ہمیں عادل ججز چاہئیں۔ اگر ہارون عبید جیسے سیاست دان' ہاشم جیسے وکیل اور جواہرات کاردار جیسے کاروباری لوگ کرپٹ ہیں تو آپ ججز ان سے زیادہ کرپٹ ہیں' کیونکہ آپ کی ذمہ داری دہری تھی۔ آپ کہتے ہیں ہر ملزم کو شک کا فائدہ دیا جاتا ہے' درست' مگر یہ ہی فائدہ غریب ملزم کو کیوں نہیں دیا جاتا؟ امیر ملزم کی ضمانت کیوں منظور ہو جاتی ہے؟ فارس غازی کی چار سال تک کیوں منظور نہیں ہوئی تھی؟ آپ نے جو فیصلہ دیا' بالکل قانون کے مطابق دیا' میں مانتا ہوں' مگر یہ انصاف کیا آپ ججز قانون کے لیے کرتے ہیں یا اس لیے کہ ٹی وی پہ اینکرز نکتے نہ اٹھائیں؟

سر! میں تب اٹھارہ سال کا تھا جب ججز کی بحالی کی تحریک چلی تھی۔ میں تب انگلینڈ نہیں گیا تھا۔ اور جتنا ہو سکا' میں اس تحریک میں شامل رہا تھا۔ مجھے آج بھی اپنے کردار پر فخر ہے' کیونکہ ہم نے عدلیہ کے لیے تحریک چلائی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ سابق چیف جسٹس اپنے الگ ایجنڈے پہ چل پڑے' لیکن آج مجھے یہ کہہ لینے دیجیے کہ عدلیہ تو آزاد نہیں ہوئی' مگر دو چیزیں دیں ہمیں اس تحریک نے۔ دو باقیات۔" اس نے انگلیوں کی وی بنا کر دکھائی۔ "متکبر جج اور متشدد وکلا!"

اسٹڈی میں ایسا گہرا سناٹا چھا گیا کہ سوئی گرنے سے بھی آواز پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ جج صاحب سنجیدہ چہرے سے اسے دیکھے گئے۔ وہ کٹری کی وی دکھا کر کہہ رہا تھا۔

"متکبر اور متشدد۔ یہ بنا دیا ہے اس تحریک نے آپ ججوں اور وکیلوں کو۔ آپ لوگ تو جانتے ہیں کہ اس ملک میں ثبوت اور گواہ کیسے غائب کر دیے جاتے ہیں' پھر کیوں آپ کی ناک پہ ممکنہ ثبوت نہیں ٹکتے؟ کیوں ناممکن ثبوت مانگتے ہیں آپ ملزموں کو سزا دینے کے لیے؟"

جج صاحب نے گہری سانس لی اور ٹھنڈے انداز میں کہا۔ "تم اگر جج ہوتے تو قانونی پیچیدگیاں اور باریکیاں زیادہ سمجھ سکتے۔ میں مجبور تھا۔"

"اگر میری جگہ آپ کا بیٹا ہوتا اور وہ اپنے اوپر ہوتے ظلم کی داستان سناتا اور اپنے زخم دکھاتا' کیا تب بھی آپ اس کو کریڈیبل گواہ تصور نہ کرتے؟"

اور وہ کتنی ہی دیر کچھ بول نہ سکے۔ لب کھولے' پھر بند کیے۔ سارے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ سعدی نے ایک آخری ملامتی نظر ان پہ ڈالی' دو الفاظ بولے۔ "متکبر جج اور متشدد وکلا! یہ الفاظ آپ سب ججز اور وکلا کو یاد رکھنے چاہئیں۔"

جب وہ گاڑی میں آکر بیٹھا تو چند لمحے گہرے سانس لے کر خود کو ٹھنڈا کیا۔ جج صاحب کو اتنا سب سنا کر بھی ایک سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ پایا تھا وہ۔ آخر فائدہ کیا ہوا اس سب کا؟ اتنی جدوجہد' اتنی خواری' عدالتوں کے دھکوں کے بعد ہار جانے کا؟ شاید یہ سب واقعی بے کار تھا' جیسے فارس کہتا تھا۔ اس نے فون اٹھایا اور ایئر پلین موڈ آف کیا۔ جو اس نے عادتاً" لگا دیا تھا کہ کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ فون کی جان واپس آئی تو فوراً" چیخنے لگا۔

"جی زمر!" اس نے آواز کو ہموار کر کے فون کان سے لگایا۔

"اوہ شکر سعدی۔۔۔ تم۔۔۔" وہ پہلے خوشی اور نڈھال انداز میں بولی' پھر آواز میں غصہ در آیا۔ "تم کیوں جا رہے ہو ادھر؟ فوراً" واپس آؤ۔"

"کدھر کہاں جا رہا ہوں میں؟" وہ حیرت سے بولا۔

"تم ہاشم کی پارٹی میں جا رہے ہو نا؟ جھوٹ مت بولنا مجھ سے۔ فوراً" واپس آؤ۔"

"میں ادھر نہیں گیا۔" آواز دھیمی ہوئی۔ "میں جج صاحب سے ملنے گیا تھا۔ گھر واپس آرہا ہوں۔ ہاشم کی طرف جا کر کیا کروں گا میں۔"

ادھر زمر نے فون بند کیا تو سب خوشی اور فکر مندی کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"وہ ٹھیک ہے۔ واپس آرہا ہے۔" وہ تھک کر صوفے پہ بیٹھ گئی۔ "شکر" لاؤنج میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور ابھی وہ ٹھیک سے پرسکون بھی نہ ہو پائی تھی جب... "فارس کو کال کرو۔ اسے کہو کہ وہ واپس آئے۔" بڑے ابا کی آواز نے اس کے کانوں میں صور پھونکا۔ وہ کرنٹ کھا کر سیدھی ہوئی اور جلدی جلدی نمبر ملایا۔

"کچھ پتا چلا؟" وہ گاڑی چلا رہا تھا۔

"وہ آرہا ہے۔ میری ڈائری سے جج صاحب کا پتا لے کر گیا تھا۔ تم واپس آجاؤ۔"

"اچھا۔" وہ اب کار روک چکا تھا اور باہر دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ کاردارز کا محل سامنے تھا۔

"فارس! تم فوراً" واپس آؤ۔ ہاشم سے کچھ بعید نہیں ہے۔" وہ پریشانی سے بولی۔

"میں.... آرہا ہوں۔" اس نے فون بند کیا اور اسے سائیلنٹ کر کے جیب میں ڈال دیا۔ چند لمحے اسٹیئرنگ کو دیکھتا رہا۔ واپس جائے یا... نگاہیں دور نظر آتے گیٹ اور مہمانوں کی گاڑیوں کی طرف اٹھائیں.... آخر وہ کرنا کیا چاہتا ہے؟ ڈاکٹر مایا کی تصویر پوسٹ کرنے کا مقصد سعدی کو مدعو کرنا تھا۔ وہ عموماً" ہاشم کے پلان دیر سے سمجھا کرتا تھا۔ آج جلدی سمجھ گیا تھا۔ تو کیا وہ واپس مڑ جائے؟

ایک فیصلہ کر کے وہ باہر نکل آیا۔

بالائی منزل پہ کھڑے رئیس نے کوٹ کی آستین چہرے کے قریب لے جا کر کہا۔ "سر! فارس آیا ہے۔"

اندر مہمانوں کے درمیان کھڑے ہاشم نے کان میں لگا آلہ دبایا۔ "خیر ہے۔ ایک ہی بات ہے۔ سعدی نہیں تو فارس سہی۔ اسے اندر آنے دو۔"

"راجر باس!" وہ مسکرایا۔

☼ ☼ ☼

میں نہ کہتا تھا کہ سانپوں سے اٹے ہیں رستے
گھر سے نکلے تھے تو ہاتھوں میں عصار رکھنا تھا

گیٹ پہ مستعد کھڑے گارڈز غیر معمولی طور پہ کسی کا دعوت نامہ چیک نہیں کر رہے تھے۔ جو آرہا تھا اس کو اندر جانے دے رہے تھے۔ اسے بھی کسی نے نہیں روکا۔ ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ پھیلی۔

(سو ہاشم چاہتا ہے کہ میں اندر آؤں؟ انٹرسٹنگ۔ اتنے لوگوں کے سامنے گولی تو مار نہیں سکتے یہ مجھے۔ کیا کرلیں گے زیادہ سے زیادہ۔)

کچھ دلچسپی تھی، کچھ تجسس تھا' وہ اسی طرح چلتا پتھریلی روش پہ آگے بڑھتا گیا۔ آنکھیں سکیڑ کر ساری اطراف کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ سبزہ زار خالی تھا۔ اندر شیشے اور لکڑی کے کانچ میں مہمان ہی مہمان بھرے تھے۔ آخر کیا ہونے جا رہا ہے پارٹی میں؟ اچنبھا سا اچنبھا تھا۔

وہ کانچ کے شیشے کے دروازے کے باہر آکھڑا ہوا۔ اندر نہیں گیا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا' جس کے باعث چمکتا ہوا لاؤنج صاف نظر آرہا تھا۔ جابجا لوگ ٹولیوں کی صورت کھڑے تھے۔ ویٹرز ٹرے اٹھائے سرو کر رہے تھے۔ تب ہی ہاشم برآمدے کی سیڑھیاں اتر کے باہر آتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر بھی مسکراہٹ چہرے سے جدا نہیں ہوئی۔

"تم کیسے آئے؟" ہلکے سے طنز سے فارس کے قریب آکر بولا۔

"میں ڈاکٹر مایا کو ڈھونڈنے آیا ہوں۔ تم نے ہی کھلم کھلا دعوت نامہ دیا تھا نا کزن!" وہ بھی ہلکا سا مسکرایا۔

ہاشم آگے بڑھا' اس کا کندھا تھپتھپایا' کان کے قریب جا کر "ہیپی سرچنگ" کہا اور واپس مڑ گیا۔

فارس نے نگاہ اٹھا کر اوپر فضا میں اڑتے ڈرون

کیمرے کو دیکھا جو کسی بڑی مکڑی کی طرح اس کے آس پاس چکر کاٹ رہا تھا۔ دور ایک سیکیورٹی کا نوجوان ڈرون کا ریموٹ اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ بھی فارس کو دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں ملنے پہ دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

(یہ میری فلم بنا کر مجھے پھر سے فریم کرنے جارہا ہے' ہوں' گڈ۔) وہ ہلکا سا محظوظ اور اندر داخل ہو گیا۔ آنکھیں متلاشی انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ خوش باش مہمان۔ مصنوعی قہقہے۔ خوب صورت سجاوٹ' باربی کیو کی خوشبو۔ سب نارمل تھا۔

"واٹ اے سرپرائز!" شناسا آواز پہ وہ پلٹا اور منجمد ہو گیا۔ ڈاکٹر ایمن مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ انگلی کا ہیرا ہمیشہ کی طرح دمک رہا تھا۔

"آپ؟ ادھر؟" وہ حیرت چھپا نہ سکا۔

"بالآخر ہاشم کاردار نے وفاداری کا صلہ دینے کے لیے ہمیں بلا ہی لیا۔ تم بھی یہاں ہو گے' امید نہیں تھی۔ انجوائے دی پارٹی!"

جتا کر کہتے ہوئے اس نے جاتے جاتے اس کی کہنی کو ہلکا سا چھوا۔ نوکیلی انگوٹھی اسے چبھی تھی اور اس کی چبھن نے اس کے دماغ کی ساری گرہیں کھول دی تھیں۔ سحر زدہ سی کیفیت میں اس نے چہرہ مشرق' مغرب' شمال' جنوب۔ چاروں سمت میں گھمایا۔

سب نارمل تھا۔ سوائے مہمانوں کے۔ ان میں شناسا چہرے بھی تھے۔ بہت ہی شناسا۔ وہ الیاس فاطمی تھا جو کونے میں کھڑا' کافی کمزور سا لگ رہا تھا اور سر ہلاتے ہوئے کسی مہمان سے بات کر رہا تھا۔ وہ نیاز بیگ تھا جو ایک طرف کھڑا مشروب پی رہا تھا۔ (وہ ضمانت پہ رہا ہو چکا تھا۔) ڈاکٹر ایمن اور اس کا شوہر... سیکرٹری حلیمہ... پراسیکیوٹر بصیرت... جس کی وکالت نے چار سال فارس کو جیل سے نہیں نکلنے دیا تھا۔ وہ مزید گھوما... جسٹس سکندر... چند پولیس افسران جن کا سعدی کی گمشدگی سے تعلق رہا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب... پوسٹ مارٹم کا ماہر۔ کرنل خاور' اس کا بیٹا جو بجھا بجھا سا باپ کی وہیل چیئر کے ساتھ کھڑا تھا۔ اعمال اور فارس کی دی گئی سزاؤں کے بعد بھی وہ زندہ سلامت کھڑے تھے۔ اجڑے اجڑے مگر زندہ تھے۔ ان کے علاوہ چند مہمان اور بھی تھے' مگر یہ شناسا چہرے... وہ سناٹے میں رہ گیا۔

وہ واقعی وکٹری پارٹی تھی۔ وہ ان کو... اپنے مددگاروں کو اکٹھا کر کے انعام سے نوازنا چاہتا تھا' مگر وہ فارس کو ان کے درمیان گھومنے سے روک بھی نہیں پا رہا تھا۔ اس کی چھٹی اور ساتویں' آٹھویں حس' سب نے سرخ بتی دکھانا شروع کی۔ یہاں مایا نہیں تھی' اگر ہو بھی تو اس کو ڈھونڈنا بے سود تھا۔ اسے یہاں سے فوراً "نکل جانا چاہیے۔

وہ آگے بڑھا۔ داخلی دروازہ لاؤنج سے وہ دور آخری کنارے پہ تھا۔ وہ دروازے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا' راستے میں بہت لوگ تھے۔ گھٹن' پھنس جانے کا احساس... کن انکھیوں سے نظر آیا' ایک ویٹر باری باری مخصوص لوگوں کے پاس جا رہا تھا۔ ان کے کان میں کچھ کہتا اور وہ سر ہلا کر ایک طرف چلے جاتے۔ یہ مخصوص لوگ وہی شناسا مجرم تھے۔ فارس آگے بڑھتا گیا۔

ڈاکٹر ایمن اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ تب ہی ویٹر ادھر آٹپکا اور سرگوشی کی۔

"کاردار صاحب... بلا رہے ہیں۔"

ایمن نے زخمی سا مسکرا کر سر ہلایا اور ویٹر کی معیت میں ایک طرف بڑھ گئی۔ وہ نظر انداز کر کے آگے بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا' دروازہ قریب تھا۔ اس نے جھپٹ کر کھولا اور باہر نکلا۔ گویا سانس میں سانس آئی۔

باہر تاریکی تھی۔ وہ کاٹیج کی کھڑکیوں کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ لاؤنج گزر گیا تو وہ کچن کی کھڑکی پہ رکا۔ کچن روشن تھا۔ فارس نے چہرہ جھکا کر جھانکا۔

وہاں بڑے بڑے کریٹ پڑے تھے اور ان میں غیر ملکی الکحل کی بوتلیں رکھی تھیں۔ ان کے منہ کھلے تھے اور سر پہ کھڑا ایک گارڈ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا اور دوسرا بوتلوں کے گرد ڈوری سی لپیٹ رہا تھا۔ ایک گارڈ کی نظریں فارس پہ پڑیں' مگر اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ سر جھکا کر کام کرتا رہا۔ فارس کی نگاہیں کچن

کی دیوار تک اٹھیں۔ وہ ایک دروازہ تھا جو آگے ایک اور کمرے میں کھلتا تھا۔

وہ کانچ کی دیوار کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ اب اگلا کمرہ نظر آیا۔ اونچی شیشے کی کھڑکیوں سے سارا کمرہ روشن نظر آتا تھا۔ وہاں ہاشم ان تمام شناسا چہروں کو اکٹھا کیے کھڑا تھا اور مسکرا کر ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ شیشے ساؤنڈ پروف تھے۔ وہ آوازیں نہیں سن سکتا تھا۔ مگر جس طرح وہ فائلز ان میں تقسیم کر رہا تھا' جس طرح ان کے چہرے دمکنے لگے تھے' وہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ اس کی ہاؤسنگ اسکیم کی فائلز تھیں۔ پلاٹس' گھر' وہ تحفے بانٹ رہا تھا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ لاؤنج کو جاتی گیلری میں کھلتا تھا اور دوسرا کچن میں۔

ہاشم کا فون بجا تو وہ اسے نکال کر دیکھنے لگا۔ پھر مسکرا کر مہمانوں سے معذرت کی اور کچن کے دروازے کی طرف باہر چلا آیا۔ اب وہ کچن میں تنہا کھڑا تھا۔ اس نے لائٹر اٹھایا اور انگوٹھے سے دبا کر شعلہ جلایا۔ پھر وہ کھڑکی کی طرف گھوما۔ باہر کھڑے فارس کو دیکھا اور مسکرایا۔ پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے لائٹر ڈوری کے قریب لے کر گیا۔ فارس کا سانس تھم گیا۔ دل رک گیا۔ ہاشم نے ڈوری کو آنچ دکھائی تو اس نے شعلہ پکڑ لیا اور وہ شعلہ ڈوری کو کھاتے بوتلوں کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہاشم نے ایک انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"You did this!"

(یہ تم نے کیا ہے) آواز نہ سنائی دیتی تھی' مگر ہلتے لب بتا رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر اس نے لائٹر جیب میں ڈالا اور لاؤنج میں کھلتے دروازے سے باہر نکل گیا۔

بس لمحے بھر کا عمل تھا اور سارا کھیل اس کی سمجھ میں آگیا۔

وہ تقسیم انعامات نہیں تھی۔ وہ ثبوت مٹانے کی کوشش تھی۔ وہ تمام گواہوں کو ایک کمرے میں جمع کر کے ان کو آگ لگا کر مارنا چاہتا تھا۔ کچن کے دروازے بند تھے۔ الکحل کی بوتلیں باری باری آگ پکڑ رہی تھیں۔ (الکحل مٹی کے پیٹرول کی طرح آگ پکڑتی ہے۔) کچن کے اوپر روشن دان تھا' جو شناسا مجرموں کے کمرے میں کھلتا تھا جہاں وہ ہاشم کا انتظار کر رہے تھے۔ کچن میں دھواں بھرنے لگا۔ اب دھواں روشن دان سے اس کمرے میں جائے گا' اور وہ مر جائیں گے۔ دم گھٹنے سے' جبکہ لاؤنج کے مہمان سلامت رہیں گے۔ چند مہمانوں کے مرنے سے شک نہیں ہوگا کسی کو اور الزام؟ فارس غازی وہاں موجود تھا' اس کی فوٹیج تھی یہاں وہاں ٹہلنے کی۔

"خدا کا قہر نازل ہو تم پہ ہاشم!" وہ ہکا بکا سا چند قدم پیچھے ہٹا۔ پھر الٹے قدموں سبزہ زار کی طرف دوڑا۔ اسے وہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا۔ جلد از جلد اسے وہاں سے نکلنا تھا۔ وہ چند قدم ہی چل سکا اور پھر مڑ کر دیکھا۔ لاؤنج میں میوزک تیز تھا۔ اب مزید تیز ہو گیا تھا۔ چند افراد شیشے کی کھڑکیوں کو پیٹ رہے تھے۔ مگر وہ ان بریک ایبل گلاس کی بنی تھیں۔ فارس کی جیب میں اس کا فون تھرا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ زمر ہوگی' وہ اسے واپس بلا رہی ہوگی' مگر اسے سب بھول گیا۔ وہ تیزی سے اس دھواں بھرتے کمرے کی طرف لپکا۔ اسے ان لوگوں کو وہاں سے نکالنا تھا۔

اور تب اس نے دیکھا۔ گھاس پہ اس کے سامنے ایک سایہ سا کھڑا ہوا۔ سفید سایہ۔ عینک لگائے اس کا بھائی... وارث... وہ سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم گھر جاؤ فارس... وہاں کہاں جا رہے ہو؟ یہ گناہ گار لوگ ہیں۔ ان کو مرنے دو۔ کیا تم بھول گئے کس طرح انہوں نے مجھے پنکھے سے لٹکایا تھا؟" وہ ملامتی انداز میں بولا تھا۔ فارس کے قدم لڑکھڑائے۔ سانس تیز تیز چلنے لگی۔ اس نے آگے بڑھنا چاہا تو ایک اور سایہ سامنے نمودار ہوا۔

"آپ نے کہا تھا آپ میرے لیے لڑیں گے۔" وہ سفید سی زرتاشہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں گلہ تھا۔ "ان لوگوں کو ان کا بدلہ ملنے والا ہے۔ انہوں نے عدالت میں میرے اوپر کیچڑ اچھالا۔ میرے کردار کو اخباروں کی زینت بنایا۔ مجھے گولیاں ماریں۔ ان کو

مرنے دیں، میرا سوچیں۔"
اس نے سر جھٹکا، مگر سائے غائب نہیں ہوئے۔ ان دونوں کے درمیان سعدی چلتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ سفید سایہ۔۔۔ ہیولہ سا۔

"یہ میرے گناہ گار ہیں۔ آپ ان کی فکر کیوں کر رہے ہیں۔ جائیں، اپنی جان بچائیں، بھاگیں۔"
اس نے چہرا موڑا۔ ایک احمر کا سایہ بھی ساتھ آکھڑا ہوا تھا۔

"انہوں نے میرا خاندان تباہ کر دیا غازی، ان کو ان کے حال پہ چھوڑ دو۔ تم ان کو نہیں بچا سکتے۔ جاؤ، نئی زندگی شروع کرو، نئے گھر میں۔"
اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔ بھاری بھاری بیڑیوں سے کس دیے گئے تھے۔ وہ کسی طرف نہیں مڑ پا رہا تھا۔ وہ پتھر کا ہو گیا تھا۔

"چلے جاؤ فارس۔"

"ان کو مرنے دو غازی۔"

وہ سارے سائے ایک ساتھ بولنے لگے تھے۔ چیخنے لگے تھے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ تیز ہوتے تنفس سے ان سب کو دیکھا۔

"ہاں، یہ سب۔۔۔ گناہ گار ہیں، قاتل ہیں۔" اس کی آواز کپکپائی۔ آنکھیں سرخ پڑ کے بھیگ رہی تھیں۔
"ہاں یہ میرے دشمن ہیں۔ برے لوگ ہیں۔" وہ ٹھہرا۔ پھر گردن تان کر ان سایوں کو دیکھا۔ "مگر میں۔۔۔ میں ان جیسا نہیں ہوں۔" اور وہ اس کمرے کی طرف سرپٹ دوڑا تھا۔ سائے فضا میں تحلیل ہو گئے۔ ایسے جیسے خدا کا نام لینے پہ آسیب بھاگ جاتے ہیں۔

اب اسے کچھ یاد نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ انسان تھے اور وہ مشکل میں تھے۔ سارے انتقام، سارے زخم سارے جرائم۔۔۔ وہ سب بھول گیا تھا۔ وہ انسان تھے اور وہ مصیبت میں تھے۔

ہاشم تیز چلتا۔۔۔ راہ داری عبور کرتا کاٹیج کے آخری کمرے میں آپہنچا تھا۔ دونوں گارڈز اس کے ہمراہ تھے اور رئیس اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔
"کتنے منٹ ہیں ہمارے پاس؟" اس نے آتے ساتھ ہی اپنی ٹائی کھینچی۔

"زیادہ نہیں ہیں۔ جس وقت دوسرے مہمان اور فائر بریگیڈ کا عملہ جل جانے والے افراد کو نکالنے آئے گا، آپ کو ہم ان کے درمیان پہنچا دیں گے، یہ ادھر۔۔۔" وہ اب ہاشم کی شرٹ کا گریبان پھاڑ رہا تھا۔ دوسرے لڑکے نے کمال مہارت سے اس کے ماتھے کی کھال کو چاقو سے چیرنا شروع کیا، جس سے بھل بھل خون بہنے لگا۔

"اس کو اسٹرلائز کیا تھا۔" اس نے درد کی شدت سے آنکھیں بند کر کے پوچھا۔

"یس سر!" وہ فرماں داری سے کہتا، اسے تیار کر رہا تھا۔ حادثے والے کمرے کے واحد بقا کی جدوجہد کرنے والے بندے کو اچھا خاصا زخمی لگنا چاہیے تھا۔ وہ شناسا سا مجرم مر جائیں گے تو کون بتائے گا کہ ہاشم اس وقت کمرے میں نہیں تھا؟ اور چونکہ لاؤنج کے مہمانوں کو بچ جانا تھا، اس لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہاشم واحد بچنے والا انسان تھا۔ کوئی اس پہ شک نہ کرتا اور وہ ہیرو بننے جا رہا تھا۔

کمرے میں دھواں بھر رہا تھا۔ درمیانی دروازے کو آگ نے پکڑ لیا تھا اور وہ جل رہا تھا۔۔۔ لوگ کھانس رہے تھے۔ اوندھے منہ گر رہے تھے۔ دھکم پیل مچی تھی۔ کوئی کھڑکیوں کو کھٹکھٹا رہا تھا، کوئی مقفل دروازہ پیٹ رہا تھا۔ مگر وہ دونوں توڑے نہیں جا سکتے تھے۔

فارس تیزی سے دوڑتا ہوا کھڑکی تک آیا۔ حلیمہ کھانستی ہوئی اس کے ساتھ کھڑی شیشے کو زور زور سے تھپڑ مار رہی تھی۔ فارس نے ایک گملا اٹھایا اور زور سے کھڑکی پہ دے مارا۔ چند خراشیں آئیں، مگر بے سود۔ گملا ہاتھ سے چھوٹ گیا، اس کا اپنا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ وہ پروا کیے بنا آگے کو دوڑا۔ کاٹیج کی دیوار کے ساتھ بھاگتا ہوا مرکزی دروازے تک آیا۔ لاؤنج کی شیشے کی کھڑکیوں سے اندر مگن، خوش باش ٹہلتے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ میوزک بہت تیز تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس نے شیشے کا دروازہ زور، زور سے بجایا۔

"دروازہ کھولو۔ اندر آگ لگ گئی ہے' کھولو۔" مگر دروازے کے اندر کھڑے گارڈ نے مسکرا کر اسے دیکھا اور ریموٹ ہوا میں بلند کر کے بٹن دبا دیا۔ تمام شیشوں کے اوپر لگے بلائنڈز کھل کر نیچے گرنے لگے۔ وہ آگے دوڑا۔ چند مہمانوں کے قریب موجود کھڑکی کو زور' زور سے پیٹا مگر وہ متوجہ نہ ہوئے' باتیں کرتے رہے' یہاں تک کہ بلاک آؤٹ بلائنڈز بالکل نیچے گر گئے اور اب وہ اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"اللہ کا قہر ہو تم پہ ہاشم۔" وہ غصے سے چلایا اور واپس اس جلتے ہوئے کچن کی طرف بھاگا۔ اس کو پسینہ آرہا تھا اور سانس بے ترتیب تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آج وہ لفٹ والے دن کی طرح لوگوں کو اکٹھا نہیں کر سکتا تھا۔ آج اسے خود کچھ کرنا تھا۔

کچن کے سامنے رک کر اس نے چند گہرے سانس لیے اور سوچنے کی کوشش کی۔ جلتے کمرے میں لوگ ابھی تک چیخ چلا رہے تھے' مگر مدد نہیں آرہی تھی۔ دونوں دروازے بند تھے' اور کھڑکیاں توڑی نہیں جا سکتی تھیں۔

مگر وہ کھولی تو جا سکتی تھیں۔ وہ تیزی سے آگے آیا۔ کھڑکی کے فریم کو ہاتھ سے ٹٹولا' وہ اندر سے مقفل تھیں اور افرا تفری کے عالم میں آگے پیچھے بھاگتے بھاگتے لوگ کالے دھوئیں کی زیادتی کے باعث انہیں کھول نہیں پا رہے تھے۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کھڑکی کہاں سے کھلتی ہے۔ اسے معلوم تھا۔ وہ اس کاٹیج میں نوجوانی کے دنوں میں آتا رہا تھا۔ اورنگ زیب لائے تھے اسے ایک دفعہ۔ یہ عام سلائیڈنگ ونڈو تھی' مگر یہ اندر سے کھلتی تھی۔ اور اس جلتے کمرے کو جاتے دونوں دروازے بند تھے۔ تیسرا دروازہ جل رہا تھا۔

تیسرا دروازہ۔ وہ چونکا' پھر کچن کی کھڑکی تک آیا۔ یہ بند تھی' مگر مقفل نہیں تھی۔ ہر منصوبے میں جھول ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی جلتے کچن کے راستے بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ کوئی باہر سے یہاں آسکتا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر اس کے شیشے کو دائیں طرف دھکیلا۔ وہ سرکنے لگا۔ اندر سے بہت سا دھواں باہر نکلنے لگا۔

محفوظ کمرے میں بیٹھے رئیس نے ٹیب اسکرین دیکھ کر ہاشم کو مخاطب کیا۔ "وہ کچن کی کھڑکی سے اندر جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم نے اسے بند کیوں نہیں کیا؟" اس نے دونوں گارڈز کو گھورا۔

"جانے دو۔ اسے بھی ان کے ساتھ جلنے دو۔" وہ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے بے نیازی سے بولا تھا۔

کھڑکی آدھی کھل گئی تھی' وہ منڈیر پر چڑھ کر اندر پھلانگ گیا۔ فوراً" سے کھانسی آئی۔ دھواں۔۔۔ مرغولے۔۔۔ کالک۔۔۔ وہ جھک کر ذرا سا کھانسا۔۔۔ پھر گہرے گہرے سانس لیے' اِدھر اُدھر دیکھا۔ دروازہ جل رہا تھا۔ شعلے درمیان میں حائل تھے۔ کاؤنٹر سے دروازے تک سب جل رہا تھا۔ وہ کیا کرے؟ وقت نہیں تھا۔۔۔ اوہ خدایا! وہ کیا کرے؟

چولہے کے قریب سلنڈر پڑے تھے۔ اس نے جلدی سے ایک سلنڈر اٹھایا۔ وہ اندر سے غالباً" خالی تھا۔ تب ہی ہلکا تھا۔ وہ لوگ دھماکے افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ کچن کی گیس بھی کٹی ہوئی تھی۔ اسے زور کی کھانسی آئی' مگر بدقت سلنڈر کو اٹھا کر اس نے پوری قوت سے دروازے پہ دے مارا۔ سلنڈر مارتے مارتے وہ خود بھی نیچے گر گیا۔ شاید ماتھے پہ چوٹ بھی آئی تھی' مگر جب بمشکل ہتھیلیوں کے بل اٹھا تو دیکھا۔ سلنڈر دروازے سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا واپس آرہا تھا۔ دروازے کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ اف۔۔۔!! اس نے سلنڈر کے قریب آتے ہی اس کو واپس دھکیلا۔ اب کی بار وہ دروازے کے قریب سے ہی واپس پلٹ گیا۔ مگر تب تک فارس اٹھ چکا تھا۔ ہاتھ جھاڑتے وہ کھڑا ہوا اور جیسے ہی سلنڈر قریب آیا' اس نے پوری قوت سے' کسی گیند کی طرح اس کو دروازے کی جانب لڑھکا دیا۔

وہ تیزی سے آگے گیا اور دروازے سے ٹکرایا اور پھر۔۔۔ جلتا ہوا دروازہ۔۔۔ درمیان سے ٹوٹ کر نیچے آن گرا۔ ٹکڑے' چنگاریاں اسے بھی آکر لگی تھیں۔ تکلیف ہوئی تھی۔۔۔ مگر۔۔۔ اب چوکھٹ خالی تھی' وہ

دیکھ سکتا تھا۔۔۔ اس پار۔۔۔ جلتا ہوا کمرہ۔۔۔ جس میں دھواں بھرا تھا اور لوگ چیخ چلا رہے تھے۔

اس نے شرٹ اتار کر ناک کے گرد لپیٹی اور تیزی سے دوڑا۔۔۔ لکڑی کے جلتے شہتیر پھلانگتے' شعلوں کے اوپر سے گزرتا' وہ دھوئیں سے بھرے کمرے میں دوڑتا گیا۔ لوگ کچن سے کافی دور کونے میں جمع تھے' ایک دوسرے کو پرے ہٹا رہے تھے۔ دعائیں پڑھ رہے تھے۔ وہ تیزی سے کھڑکیوں کی طرف لپکا۔ شرٹ کہیں گر گئی۔ ناک میں پھر سے دھواں اندر جانے لگا' مگر اس کو پروا نہ تھی۔ وہ فریم کے کنارے ٹٹولنے لگا۔

یہیں کہیں تھیں۔ یہیں کہیں۔

اس کے ہاتھوں نے کھڑکی کے کنڈے کو چھوا۔ اندر تالا لگا ہوا تھا۔ مضبوطی سے بند تالا۔ ڈیم اٹ! اسے پھر سے کھانسی آنے لگی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی بھاری چیز مل جائے جس کو وہ تالے پہ دے مارے۔ ساتھ کھڑی حلیمہ روتے ہوئے ابھی تک کھڑکی کا شیشہ پیٹ رہی تھی۔ چند افراد بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ آگ اب کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔

اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا۔ اس میں ایک پِک بھی تھی جسے کئی سالوں سے وہ جاب کے حصے کے طور پہ ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے تیزی سے وہ تالے میں گھسائی۔ تار نیا تھا اور غالباً "پولیس کے آنے سے پہلے گارڈز نے اتار لینا تھا۔ دھوئیں کے باعث وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا' مگر آنکھیں بند کر کے اس نے محسوس کرنا چاہا۔ چھ پنیں۔۔۔ ون ٹو تھری۔۔۔ وہ باری باری پک کی مدد سے سب کو چھو رہا تھا۔۔۔ فور فائیو' سکس۔

"کلک!" اس کے لبوں سے نکلا تالا کھل گیا۔ اس نے وحشیانہ انداز میں تالا نوچ کر اتارا اور شیشہ زور سے پرے دھکیلا۔

کھڑکی کھلتی گئی۔ حلیمہ توازن برقرار نہ رکھ سکی اور نیچے کو لٹک گئی مگر وہ لپک کر آگے آیا اور اسے کھینچ کر باہر نکال لایا۔ وہ فرنچ ونڈوز تھیں۔ پوری دیوار کی جگہ پہ حائل تھیں۔ اس کو لا کر باہر گھاس پہ ڈالتے ساتھ وہ اندر کی طرف لپکا۔

"اس طرف آؤ۔۔۔ کھڑکی کی طرف آؤ۔" اب وہ چلا چلا کر دھوئیں میں پھنسے لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ وہ سب اس کے دشمن تھے۔۔۔ وہ سب اس کے مجرم تھے۔ وہ سب اس کے گناہ گار تھے مگر وہ ان جیسا نہیں تھا۔۔۔ وہ ان کو پکڑ کر' گھسیٹ کر شیشے کی کھلی دیوار سے باہر لا رہا تھا۔

کچھ نے کھلا روزن دیکھ لیا۔۔۔ کچھ نے نہیں دیکھا۔ دھکم پیل پھر سے مچ گئی تھی۔۔۔ بے ہوش ہوئے لوگوں کو اٹھانا اور کھینچنا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ آگ کمرے میں داخل ہو چکی تھی اور فرنیچر کو پکڑ چکی تھی۔ وہ درمیان میں ایک دفعہ گرا بھی تھا' کہیں درد بھی ہو رہا تھا مگر اسے پروا نہیں تھی۔ وہ بے ہوش ہوئے فاطمی کو کندھوں سے گھسیٹ کر باہر لا رہا تھا۔

لاؤنج کے مہمانوں میں سے کوئی کچن کی طرف آیا تھا۔۔۔ جلتا بند دروازہ دیکھا تو شور مچا دیا۔۔۔ لاؤنج کا میوزک تھم گیا۔۔۔ لوگ دیوانوں کی طرح باہر لان میں بھاگے۔۔۔

محفوظ کمرے میں بیٹھے ہاشم کو رئیس نے تسلی دی۔ "لوگ بچ جائیں یا مر جائیں' الزام فارس پہ ہی آئے گا۔"

مگر ہاشم کی تیوریاں چڑھ رہی تھیں اور وہ شدید برہم نظر آتا اسکرین پہ لائیو فوٹیج دیکھ رہا تھا۔ "اس کو یوں کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔"

فرنیچر کو شعلے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ بہت سے لوگ باہر نکل چکے تھے اور اب سبزہ زار پہ گرتے ہوئے بھاگتے آگے جا رہے تھے۔۔۔ وہ بدقت الیاس فاطمی کو کھینچ کر باہر لایا' پھر اسے گھاس پہ ڈالا اور وہیں گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے جھکے جھکے گہرے گہرے سانس لیے۔ تمام شناسا مجرم باہر آ چکے تھے۔۔۔ لاؤنج کے محفوظ مہمان وہاں سے نکل کر اس طرف نہیں آئے تھے۔ وہ پارکنگ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اپنی جان بچانے اپنی گاڑی کی طرف عجب قیامت کا عالم تھا۔

افراتفری' دھکم پیل۔

کمرہ جل رہا تھا۔ دھوئیں کے مرغولے اٹھ کر فضا میں گم ہو رہے تھے۔ ایسے میں وہ اب اس دہکتے جہنم کے سامنے کھڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ نڈھال۔ زخمی۔ مگر اس کے اندر اطمینان بھر رہا تھا۔ اس نے ان کو بچا لیا تھا۔ سب ٹھیک ہو گیا تھا۔

"ابا' ابا...." اور تب اس نے وہ حلق پھاڑ کر چیخنے کی آواز سنی۔ شناسا سا آواز۔ اس نے گردن موڑی۔ لاؤنج کے بھاگتے مہمانوں میں سے صرف ایک مہمان دوڑتا ہوا اس طرف آرہا تھا۔ نوجوان لڑکا' جو اپنے باپ کو پکار رہا تھا.... خاور کا بیٹا۔

فارس غازی کا سانس تک رک گیا۔

"میرے ابو کہاں ہیں۔" وہ دوڑ دوڑ کر ایک ایک شخص کے پاس بھاگ رہا تھا۔ کسی خواب کی سی کیفیت میں فارس نے گردن گھمائی۔ لوگ بھاگ رہے تھے نجات کی طرف' بچاؤ کی طرف' وہاں کوئی وہیل چیئر نہ تھی۔ وہاں کوئی خاور نہ تھا۔ وہ تیزی سے لڑکے کی طرف بھاگا۔

"خاور کہاں ہے؟" وہ شور کے باعث چلا کر' لڑکے کو کندھوں سے جھنجھوڑ کر پوچھ رہا تھا۔

"ابو کو کاردار صاحب نے اس کمرے میں بلوایا تھا' مجھے نہیں جانے دیا' میرے ابو اندر ہیں' میرے ابو کو نکالو۔" وہ اونچا اونچا رو رہا تھا۔ ہاتھ پیر مار رہا تھا "میرے ابو چل نہیں سکتے' میرے ابو چیخ نہیں سکتے۔"

اور اس نے مزید کچھ نہیں سنا' وہ پلٹا اور جلتے کمرے کی طرف دوڑا۔ کسی نے آواز لگا کر اسے روکا۔ منع کیا شاید وہ ڈاکٹر ایمن تھی۔ وہ اسے کہہ رہی تھی کہ سب آچکے ہیں۔ ایک شخص کے پیچھے وہ اندر نہ کودے' وہ شخص شاید مر چکا ہو' وہ واپس آجائے مگر اس نے کچھ نہیں سنا۔ وہ دھوئیں سے بھرے کمرے میں بھاگتا چلا گیا۔

"خاور' خاور۔" وہ چلا رہا تھا' جانتا تھا وہ آواز نہیں دے سکتا' مگر پھر بھی ادھر ادھر دوڑتا' چلا رہا تھا شروع میں کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ مزید آگے بڑھا اور تب اسے دھوئیں کی گھنی چادر میں وہیل چیئر نظر آئی۔ وہ کونے میں تھا۔ بالکل کونے میں' فارس اس کی طرف دوڑا چھت سے لکڑی کے ٹکڑے جل جل کر نیچے گر رہے تھے مگر اس نے پرواہ نہیں کی وہ جلتے فرنیچر کو ٹھوکریں مارتے دوڑتے ہوئے وہیل چیئر کے قریب آیا۔ خاور کا چہرہ سرخ' پسینے میں بھیگا تھا۔ آکسیجن ماسک منہ پہ لگا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

وہ سفید سائے ایک دفعہ پھر سے آگے پیچھے نظر آنے لگے تھے۔ وہ اسے ملامتی نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر دل کی سفیدی سارے کالے دھوئیں پہ حاوی ہو گئی۔ اس نے وہیل چیئر کو زور سے آگے دھکیلا۔ وہ آگے دوڑتی گئی۔ خاور کا بیٹا دھوئیں کی چادر کے پار کھڑا تھا۔ اس نے بھاگ کر وہیل چیئر کو تھاما اور باہر نکالتا لے گیا۔ فارس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک گہری کالی سانس لی اور اسی پل....

اسی پل پیچھے سے کسی نے اسے ٹھوکر ماری تھی۔ وہ لڑکھڑا کے آگے کو گرا۔ حملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ سنبھل نہ پایا۔ بدقت اٹھنے کی کوشش کرتے گردن موڑی.... پیچھے زخمی' سیاہ کالک چہرے پہ لگائے' پھٹے جلے کپڑوں والا ہاشم کھڑا تھا اس کے عقب میں راہداری میں کھلتا دروازہ اب کھلا تھا۔ (غالباً" وہ ابھی اندر آیا تھا۔) فارس کے بازوؤں میں ایک دم قوت سی بھر گئی' وہ اٹھا اور زور سے ہاشم کا گریبان پکڑا۔

"گھٹیا آدمی۔" مکا مارنا چاہا مگر نہیں مار سکا۔

"نکلو یہاں سے' اس سے پہلے کہ تم جل جاؤ۔" اس نے ہاشم کو کھلی کھڑکی کی طرف دھکیلا۔ گریبان ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چھت سے لکڑی کا بڑا سا جلتا ہوا ٹکڑا دھماکے سے نیچے کی طرف آیا۔ ہاشم نے دیکھ لیا تھا' وہ فوراً" دائیں طرف کو لپک گیا۔ فارس نے وہ نہیں دیکھا تھا' وہ بھاگ نہیں سکا جلتا ہوا' تارہ شہاب ثاقب کی طرح اس کے اوپر آن گرا۔

ساری ہمت ساری طاقت دم توڑ گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ گرا اور پھر منہ کے بل فرش پہ آن لگا۔ ساری دنیا اندھیر ہوتی گئی۔ ساری آوازیں' سارے رنگ' ساری روشنیاں دم توڑ گئیں۔

سفید سائے اور کالا دھواں' سب ختم ہو گیا۔

☼ ☼ ☼
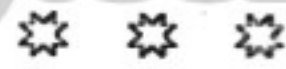
اب اپنا دل بھی شہر خموشاں سے کم نہیں
سُن ہو گئے ہیں کان صدا پر دھرے دھرے

مور چال رات کے اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ لاؤنج میں سب [illegible] تھے۔ بے چین' فکر مند۔ منتظر۔ سعدی بار بار فارس کو کال ملا رہا تھا اور زمر مسلسل دائیں بائیں ٹہل رہی تھی۔ اس کی رنگت زرد پڑ رہی تھی اور اب دل گھبرا رہا تھا۔ لگتا تھا ابھی سینہ توڑ کر باہر آ گرے گا۔

"وہ کیوں نہیں آیا؟ وہ کہاں رہ گیا ہے؟" وہ مسلسل آگے پیچھے چلتے کہے جا رہی تھی۔

"زمر! بیٹھ جاؤ۔ وہ آ جائے گا۔" ابا نے اسے تسلی دینی چاہی۔

"ماموں نے وعدہ کیا تھا' وہ واپس آئیں گے۔" حنہ گھٹنوں پہ سر رکھے بیٹھی عجیب سے انداز میں بولی۔

"مجھے نہیں پتا۔ سعدی' چلو ہم وہاں چلتے ہیں۔" زمر نے ایک دم اسے کہنی سے پکڑا اور آگے لے جانے لگی۔

"میں تو کب سے جانا چاہ رہا ہوں' آپ مجھے جانے نہیں دے رہیں۔ اب آپ اِدھر بیٹھیں' میں خود جاتا ہوں۔" وہ تیزی سے کہنی چھڑاتا اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ نہیں رکی۔ وہ اسی طرح آگے دوڑتی گئی۔ سعدی اس کے پیچھے لپکا۔ ابا نے آواز دی۔ ندرت نے منع کیا۔ مگر اس پہ کوئی وحشت طاری تھی۔ کوئی جنون سوار تھا۔ اب نہ گئی تو شاید دل پھٹ جائے گا۔ یہیں کھڑی رہی تو پیروں سے خون بہنے لگے گا۔ اب نہ گئی تو...

شہرین کے گھر آؤ تو ٹی وی لاؤنج کی ایل سی ڈی اسکرین خوب شور مچاتی' روشن نظر آ رہی تھی۔ سامنے صوفے پہ سونی لیٹے ہوئے اپنے ٹیب پہ بٹن دبا رہی تھی جب کانوں میں آواز گونجی۔ ہاشم کاردار۔ کسی نے اس کے باپ کا نام لیا تھا۔ اس نے چونک کر گردن موڑی۔ اسکرین کو دیکھا۔ چند لمحے کو اس کی سانس تھم گئی اور پھر وہ ٹیب پھینک کر چیخ مارتی اٹھی۔

"ماما' ماما۔" اب وہ روتے ہوئے زور زور سے چلا رہی تھی۔ شہرین جو اپنے کمرے میں سیل فون پہ لگی تھی' ہڑبڑا کر اٹھی اور بھاگتی ہوئی باہر آئی۔

"ماما... میرے بابا... میرے بابا۔" بچی روتے ہوئے اسکرین کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور جب شہرین نے اس طرف دیکھا تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"کاردارز کا میج میں آتشزدگی۔ ہاشم کاردار کو شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ بارہ افراد زخمی ایک شخص جاں بحق۔"

"میرے بابا... میرے بابا۔" سونیا اب زور زور سے رو رہی تھی۔

سعدی گاڑی چلا رہا تھا' اور زمر ساتھ بیٹھی' مسلسل انگلیاں اضطرابی انداز میں مروڑ رہی تھی۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ بھی رہی تھی مگر ہر شے بار بار دھندلی ہو جاتی۔ پھر منظر صاف ہوتا۔ پھر کالے دھوئیں جیسی دھند چھا جاتی۔ آنسو بس آنکھوں کے کنارے پہ ٹھہرے تھے۔ گرنے کو بس ایک دھکا چاہیے تھا۔

سعدی کا فون بجا تو اس نے تیزی سے کان سے لگایا۔ "ہاں حنہ۔" بات سنتے ہوئے وہ چونک کر زمر کو دیکھنے لگا۔ رفتار آہستہ کی۔ زمر نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے فون بند کیا اور اسٹیئرنگ گھمایا۔

"کیا کہہ رہی تھی حنین؟" وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔

"وہ... کہہ رہی تھی کہ... ہم ذرا ابھی..."

"مجھے چکر مت دو... میں ایک فٹ کے فاصلے پہ بیٹھی ہوں۔ مجھے تمہارے فون کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کیا دکھا رہے ہیں نیوز میں؟ کہاں لگی ہے آگ؟" آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر چہرے پر گرنے لگے۔

"کچھ پتا نہیں زمر۔ آگ لگی ہے اور زخمیوں کو قریبی ہسپتال میں شفٹ کیا گیا ہے۔ میں اے ایس پی

صاحب کو کال کرتا ہوں۔ ہسپتال کا پوچھتا ہوں۔" وہ پریشانی سے حواس باختہ ہو کر نمبر ملانے لگا۔

"جلدی کرو۔" اس نے کہنے کے ساتھ لبوں پہ ہاتھ رکھ لیا۔ آنکھوں کو میچ لیا۔ گرم گرم پانی گالوں پہ بہنے لگا۔

سرکاری ہسپتال میں پولیس اور میڈیا کے نمائندوں کا جم غفیر تھا.... شہری' سونیا کی انگلی پکڑے پریشانی سے بھیڑ کو چیرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ سونی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ خاموش سسکیوں اور ہچکیوں کے باعث اس کا بدن آہستہ آہستہ ہچکولے لیتا تھا۔

زمر اور سعدی دوڑتے ہوئے ہسپتال کی عمارت میں داخل ہوئے تھے۔ زمر نے آنسو صاف کر لیے تھے اور اب وہ ہراساں انداز میں ادھر ادھر گردن گھماتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس یونٹ میں عجیب افراتفری کا عالم میں تھا۔ رپورٹرز' کیمرے' پولیس.... رش ہی رش جانے سعدی نے کس کو دیکھ کر کچھ پوچھا تھا۔ اس نے نسوانی آواز کو کہتے سنا۔ "آپ ادھر آئیں۔" وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بس سعدی کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ کوئی عجیب وحشت زدہ سی سمت تھی جو طے کر رہی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" ایک کمرے کے سامنے رک کر اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔ شور بہت تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ اس کی طرف مڑا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا' مگر بظاہر خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

"وہ کہہ رہے ہیں کہ ایک باڈی ہے' پہلے اسے دیکھ لیں' پھر ہم زخمیوں کو...."

"نہیں۔" وہ بدک کر پیچھے ہوئی اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "اس کو ایمرجنسی میں ڈھونڈو.... ادھر کیوں...؟ نہیں۔"

"ہاں ہاں۔ وہ کوئی اور ہو گا۔" وہ اس کو کندھوں سے تھام کر تسلی دینے لگا۔ "مگر اس کے لواحقین نہیں آئے اور ان کو اس کی شناخت کرنی ہے' اس لیے میں

ایک دفعہ دیکھ لوں۔" وہ ٹوٹی پھوٹی امید سے کہتا آگے بڑھنے لگا' مگر زمر نے زور سے اس کی کہنی دبوچی۔

"نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ آنسو بھل بھل بہنے لگے تھے۔ "میں کہہ رہی ہوں' وہ فارس نہیں ہو گا۔ اس کو کہیں اور ڈھونڈتے ہیں۔"

"میں آتا ہوں۔" اس نے بمشکل اپنا بازو چھڑایا۔ زمر نے پیچھے جانے کو قدم اٹھائے مگر پیر لڑکھڑا گئے۔ اس نے دیوار کا سہارا لیتے خود کو سنبھالا۔ پھر دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑی ہو گئی۔ آنکھیں بند کیے گہرے گہرے سانس لینے لگی.... مگر سارا مسئلہ یہی تھا کہ آنکھیں بند کرنے پہ وہ فوراً" آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔

"زمر بی بی آپ۔" وہ مسکراتے ہوئے کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ نئے گھر کی باتیں' چڑیا گھر میں نہ رہنے کی باتیں یونیورسٹی کی دو لڑکیاں جو اس کو پسند تھیں۔ ان کی باتیں' اس نے آنکھیں کھولیں۔ یہاں بھی قیامت سی قیامت تھی۔ وہ کہاں جائے؟

سعدی دروازہ کھول کر باہر نکلا تو وہ ہل بھی نہیں سکی۔ آواز نہیں نکال سکی۔ آنسو نہیں روک سکی۔ وہ اس کے قریب آیا۔ زمر نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ.... وہ فارس نہیں تھا' نا مجھے مت بتاؤ' مجھے کچھ نہیں سننا۔" وہ اسے کچھ بھی کہنے سے روکنا چاہتی تھی مگر وہ آگے آیا اور اسے گلے لگایا۔ زمر کا سانس تھم گیا۔ پھر اس کا سر تھپکتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔

"مرنے والا نیاز بیگ تھا.... وہ فارس غازی نہیں تھا۔"

وہ کرنٹ کھا کر اس سے علیحدہ ہوئی بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"وہ فارس نہیں تھا تو فارس کہاں ہے؟"

"آئیں' ان کو وارڈ میں ڈھونڈتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے آگے چلنے لگا۔ اسے لگا وہ پانی پہ چل رہی ہے۔ جسم' دماغ' ہر شے سن ہو گئی تھی آنسو بہنا رک گئے تھے۔

"مسز زمر؟" وہ آگے جاتے جاتے پلٹی۔ راہداری

کے اختتام پہ ڈاکٹر ایمن کھڑی نظر آرہی تھی۔ شال لپیٹے، ویران چہرہ لیے جیسے ابھی بستر سے اٹھی ہو۔

"فارس کہاں...." الفاظ ٹوٹ گئے۔

"وہ زخمی ہے، مگر ٹھیک ہے۔ اس کو میں نے منع بھی کیا تھا، مگر وہ...." وہ قریب آتے ہوئے تلخی سے ہنسی۔ "مگر وہ خاور کو بچانے کے لیے آگ میں کود پڑا۔"

"وہ ٹھیک ہے؟" زمر دوڑ کر اس کے پاس گئی۔ وہ سخت ہراساں تھی۔

"ہاں، اس کی کمر اور ٹانگ پہ زخم آئے ہیں، اس کے اوپر لوہے کا ٹکڑا آکر لگا تھا۔ تھیں کہیں سے جلا بھی ہے مگر اسی وقت چھت پہ لگے آگ بجھانے والے شاور، پانی گرانے لگے، جو پہلے بالکل کام نہیں کر رہے تھے تو اس کی بہت بچت ہو گئی۔" زمر نے گہری سانس لی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" سعدی نے رسماً پوچھ لیا۔

"میں؟" وہ زخمی پن سے مسکرائی۔ "میں ہر آگ میں سروائیو کر جاتی ہوں، ٹھیک ہوں۔ آپ فارس کو وارڈز میں ڈھونڈیے۔" وہ دونوں پوری بات سنے بغیر آگے کو بھاگے۔ ایمن اسی زخمی مسکراہٹ سے ان کو بھاگتے دیکھتی رہی، پھر وہ مڑی تو کسی پہ نگاہ پڑی۔ زخمی مسکراہٹ، خوشی بھری مسکراہٹ میں ڈھل گئی.... اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو اپنے پاس بلایا۔

"ادھر آؤ۔"

☼ ☼ ☼

مجھ سے کیا پوچھتے ہو شہر وفا کیسا ہے
ایسا لگتا ہے صلیبوں سے اتر کر آیا

وارڈ میں کسی نے کسی طرف اشارہ کیا، کسی نے کسی طرف۔ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے آگے بڑھتے گئے۔ بیڈز کی طویل قطار میں جا بجا پردے لگے تھے۔ سعدی نے ایک پردہ ہٹایا تو وہ بستر پہ لیٹا نظر آیا۔ آنکھیں بند تھیں۔ غالباً "نشہ آور ادویات کے زیر اثر تھا۔ چہرے پہ زخموں کے نشان تھے۔ دو نرسز سرپہ موجود تھیں۔ سعدی نے گہری سانس لی اور مڑ کے دیکھا۔ زمر پیچھے آرہی تھی۔ اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ تیزی سے آگے آئی۔ فارس کو دیکھ کر قدم زنجیر ہو گئے۔ بے جان۔ پتھر کا بت۔ آنکھوں میں ڈھیر سارا دکھ اترا۔ اسے کبھی بیمار، کبھی یوں بے ہوش نہ دیکھا تھا اور آج پتا چلا تھا کہ ایسے دیکھنے میں کتنی اذیت تھی۔

"فارس...." وہ لپک کر اس کے قریب آئی، پھر اضطراری انداز میں سرپہ کھڑی نرسز سے بولی۔ "یہ ٹھیک ہے نا؟ اور ٹھیک ہو جائے گا نا؟"

"آہستہ بولیں۔ مریض کے سرپہ شور نہ کریں۔" نرس نے بے زاری سے کہا تھا۔ "وہ ہوش میں آرہا تھا مگر تکلیف میں تھا۔ اسے انجکشن لگایا ہے۔" زمر کچھ دیر بھیگی نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر آنسو رگڑ کر صاف کیے اور غصے سے سعدی کی طرف گھومی۔

"کیا کہا تھا میں نے تمہیں؟ ہاں؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کے سینے پہ زور دے کر اسے پرے دھکیلا۔ "کیا کہہ رہی تھی میں؟ اس کو زخمیوں میں ڈھونڈو، مگر تم، تم.... پہلے ادھر ڈیڈ باڈی کے پاس چلے گئے۔ تمہیں شرم نہیں آئی؟ ہاں؟ تمہیں کوئی احساس نہیں ہوا؟" وہ اب غصے اور بے بسی سے اس کے سینے کو تھپڑوں اور مٹھیوں سے مار رہی تھی۔ آنسو پھر سے بہنے لگے تھے۔

"اچھا.... اچھا.... اب تو ٹھیک ہیں ناوہ۔" وہ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے اسے بہلانے والے انداز میں بولا۔

"آپ کو انہیں میرے پیچھے جانے ہی نہیں دینا چاہیے تھا۔"

"کیسے نہ جانے دیتی، ہاں؟ تم "ہمارے سعدی" ہو۔ ہمیں ہمیشہ تمہاری حفاظت کرنی ہوتی ہے۔" اور ساتھ ہی زور سے اس کے کندھے پہ تھپڑ مار کر اسے پرے ہٹایا۔ سعدی نے برا سا منہ بنایا۔

"واہ.... یہ صاحب تو آپ کو زہر لگا کرتے تھے۔"

"اب بھی لگتا ہے۔" آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے ناک سڑک کر سانس اندر کھینچی۔ "مگر تم نے مجھے اتنا ڈرا دیا۔ اوہ سعدی! میں اتنی ڈر گئی تھی۔" وہ

اب نڈھال سی بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ وہ تکان سے مسکرایا۔

"چلیں آپ بیٹھیں' میں ان کو روم میں شفٹ کروانے کا بندوبست کرتا ہوں اور گھر فون کرتا ہوں۔"

زمر نے تیزی سے سر اٹھایا۔ "سب کو مت بتانا کہ یہ زخمی ہے۔ یوں ہی وہ سب پریشان ہوں گے۔"

"زمر!" وہ اسی طرح مسکرایا۔ "ہمیں ایک دوسرے سے اب کچھ نہیں چھپانا۔ میں اگر کاردارز کا نیج بھی جاتا تو بتا کر جاتا۔ آپ بیٹھیں' میں آتا ہوں۔" اسے تسلی دیتا وہ باہر نکل گیا' اور وہ گردن موڑے فکرمندی سے فارس کو دیکھنے لگی۔ جو آنکھیں بند کیے غنودگی کے عالم میں تھا۔

"آئی ہیٹ یو فارس غازی۔ آئی رئیلی رئیلی ہیٹ یو۔" وہ بے بسی بھرے دکھ سے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولی تھی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کیسے ہیں لوگ ان کی تمہیں کیا مثال دوں
جا کر مجسّمے کہیں پتھر کے دیکھ لو

اسی ہسپتال کے پُرتعیش اور نفاست سے سجے ایک پرائیوٹ روم میں ہاشم کاردار صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے براجمان تھا۔ ہسپتال کی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس' وہ بظاہر زخمی دکھائی دیتا تھا۔ ہاتھ پہ پٹی بھی بندھی تھی' ماتھے اور سر پہ بینڈیج بھی تھی مگر چہرے پہ سکون تھا اور دلچسپی سے دیوار پہ لگی ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔

"وہ لوگ بچ گئے مگر کام زبردست ہوا ہے۔ ہے نا؟" مسکرا کے ساتھ ہاتھ باندھے کھڑے رئیس کو دیکھا۔

"جی سر... مگر انہوں نے آپ کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا تھا۔" اسے خیال آیا۔

"اتنی افراتفری میں کسے یاد رہنا ہے کہ میں کمرے میں تھا یا نہیں۔ ٹی وی چینلز کو دیکھو۔ وہ مجھے پروموٹ

کر رہے ہیں۔"

"یس سر!" رئیس جوش سے بتانے لگا۔ "ہمارے پاس غازی کی فوٹیج ہے۔ وہ بھی وہاں موجود تھا' الزام اس کے سر ڈال دیں گے یا اس کو حادثہ کہیں گے۔ آپ پہ کوئی شک نہیں کرے گا۔ میڈیا آپ کو ہیرو بنا کر پیش کر رہا ہے۔ اینکرز بار بار گلا پھاڑ کر کہہ رہے ہیں کہ ہاشم کاردار نے ابھی چند دن پہلے عدالت میں اپنے خاندان کی بے گناہی ثابت کی تھی۔"

"ویری گڈ۔" وہ محظوظ ہو کر اسکرین کو دیکھ رہا تھا۔

"ہم ہر کرائسز سے نکل آئے۔" رک کر تصحیح کی۔ "میں ہر کرائسز سے نکل آیا۔ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ نہ عدالت' نہ قانون' نہ میری ماں.... میں نے ہر شے کو سروائیو کر لیا۔ میں رئیس! سب سے بڑا سروائیور ہوں۔ فیصلے کی گھڑی آبھی گئی مگر میں اپنے قدموں پہ کھڑا ہوں۔" وہ گردن اکڑاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اور اب ہم نئی شروعات کرنے جا رہے ہیں۔ ہم نئے کاروباری دوست بنانے جا رہے ہیں۔ نئے پارٹنرز' نئے مواقع.... نیا گھر!" وہ طمانیت سے بولا تھا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ "کتنی دیر ہے؟"

"بس سر' میڈیا کو آپ کا انتظار کروا رہا ہوں۔ گھنٹے بعد آپ باہر نکلیں گے اور میڈیا کے سامنے الاعلان کہیں گے کہ یہ سب فارس غازی نے عدالتی شکست کا بدلہ لینے کے لیے کیا ہے اور چونکہ فی الحال عوام کو آپ سے ہمدردی ہے' میڈیا کو آپ سے ہمدردی ہے تو سب آپ کا یقین کریں گے۔"

"زبردست!" وہ مسکرا کے ٹی وی کو دیکھنے لگا۔

"It did work after all!" "یہ ہوا ہے کام۔"

فیصلے کی گھڑی آچکی تھی۔ مگر ابھی بیتی نہیں تھی۔

✲ ✲ ✲

جو نفس تھا خار گلو بنا' جو اٹھے تو ہاتھ لہو ہوئے
وہ نشاط آہ سحر گئی وہ وقار دست دعا گیا

بالائی منزل پہ نوشیرواں کے کمرے کی بتی روشن تھی۔ بیڈ پہ بیگ کھلا پڑا تھا اور وہ اس میں کپڑے رکھ رہا تھا۔ پاسپورٹ' سفری دستاویزات' لیپ ٹاپ سب بکھرا پڑا تھا۔ صبح اس کی فلائیٹ تھی اور وہ جلد از جلد تیاری مکمل کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایک منٹ بھی اس گھر میں مزید رہنا منظور نہ تھا۔ دستک ہوئی تو اس نے بے زار سا یس کہا اور خود کپڑے تہ کرتا رہا۔

"سر۔" فیونا اندر داخل ہوئی۔ "کاردار صاحب ہسپتال میں ہیں۔" اس نے اطلاع دی۔

"معلوم ہے۔ سارا شہر جانتا ہے۔ میرے بھائی کا کوئی نیا ڈراما۔"

"فارس کو بھی زخم آئے ہیں' نیوز میں بتا رہے تھے۔"

"مجھے ان سب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" اس نے بے زاری سے بیگ کا ڈھکن دے مارنے والے انداز میں بند کیا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" وہ حیران ہوئی۔

"مجھے امریکہ میں نوکری مل گئی ہے۔ اب زیادہ سوال نہ کرو اور جاؤ یہاں سے۔" اس نے ہاتھ جھلا کر اسے اشارہ کیا۔ وہ فوراً" سر جھکا کر باہر نکل گئی۔ اب وہ جھک کر سفری دستاویزات اٹھا اٹھا کر دستی بیگ میں ڈال رہا تھا۔ آخر میں چونکا۔ بیگ کے اندر اس کا ایک گلاک پستول رکھا تھا۔ یہ وہ نہیں تھا جس سے اس نے سعدی کو مارا تھا۔ یہ اس کی کلیکشن میں سے ایک اور تھا۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا' پھر اسے نکالا اور سائیڈ ٹیبل کے دراز میں ڈال کر مقفل کر دیا۔ پھر ہاتھ صاف کیے۔ جیسے بہت سا ان دیکھا مائع صاف کیا ہو۔

نئی زندگی میں اس کی جگہ نہیں تھی.... ہرگز نہیں۔

ورنہ یہ تیز دھوپ تو چبھتی ہمیں بھی ہے
ہم چپ کھڑے ہوئے ہیں کہ تو سائباں میں ہے

فارس نے آنکھیں کھولیں تو سفید دیواریں خوب روشن نظر آرہی تھیں۔ اس نے نقاہت سے پلکیں جھپکیں۔ منظر واضح ہوا۔ ہسپتال کا کمرہ... اس نے

کہنی کے بل اٹھ کر بیٹھنا چاہا تو۔۔۔

"ایزی۔۔۔ ایزی!" سعدی اس کے سرہانے کھڑا دونوں ہاتھ اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ فارس نے بدقت اسے دیکھا' پھر گردن موڑی۔ ندرت' حنین' زمر' سیم۔۔۔ سب کمرے میں موجود تھے۔ اونچی آواز میں خوش گپیاں جاری تھیں۔ وہ اٹھ نہیں سکا۔ کمر اور ٹانگ میں درد کی لہریں اٹھی تھیں۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اس نے واپس سر تکیے پہ رکھ دیا۔

"تھوڑی بہت مکافات عمل والی فیلنگ آرہی ہے؟" سعدی اس کے قریب جھکا مسکراہٹ دبائے پوچھنے لگا۔ "وہ جو میرے ساتھ کینڈی میں کیا تھا' یاد ہیں وہ زخم جو مجھے دیے تھے۔"

"زیادہ بک بک مت کرو۔" فارس نے ناگواری سے کہہ کر آنکھیں شدت ضبط سے میچ لیں۔

سعدی مسکرا کر سیدھا ہوا۔ "اسی لیے کہتے ہیں کسی معصوم کی بددعا نہیں لیتے۔"

"فارس!" زمر اسے جاگتے دیکھ کر صوفے سے اٹھ کر سامنے آئی۔ گھنگریالے بال آدھے کیچر میں بندھے تھے اور ناک گلابی پڑ رہی تھی۔ البتہ اب وہ خوش اور ہشاش بشاش نظر آرہی تھی۔

"کیسا محسوس کر رہے ہو؟ جیسے جیل میں دوبارہ پہنچ گئے ہو' ہوں؟"

ندرت نے خفگی سے بڑبڑا کے اسے ٹوکا تھا مگر ان چاروں کے تیور بدلے ہوئے تھے۔

فارس نے بھنویں بھینچ لیں اور ادھر ادھر دیکھا۔

"بلاؤ کسی ڈاکٹر کو۔"

"ڈاکٹر والی بریفنگ ہم دے دیتے ہیں نا۔" حنین پیکٹ سے چپس نکال نکال کر منہ میں رکھتی سامنے آتے ہوئے بولی۔ "آپ کو چند زخم آئے ہیں۔ زیادہ گہرے نہیں ہیں۔ بے ہوش آپ دھوئیں کی وجہ سے ہوئے تھے۔ اس لیے ہم سے خاطر کی توقع مت رکھیے گا۔"

"اور یہ سارے پھل ہم اپنا ٹائم پاس کرنے کے لیے لائے ہیں۔" سیم چہکا۔

"ہٹو یار!" وہ بے زاری سے ہاتھ جھلا کر کہتا پھر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ سعدی فوراً" آگے بڑھا اور اسے سہارا دیتے ہوئے تکیے پیچھے جوڑے' پھر لیور کی مدد سے بیڈ کو سرہانے سے اوپر اٹھایا۔ وہ اب ٹیک لگا کر بیٹھا تو شدید تکلیف میں لگ رہا تھا۔ کندھے کا زخم درد کرنے لگا تھا جس سے چہرے پہ شدید اذیت اتر آئی تھی۔

"اور باقی لوگ۔۔۔ وہ ٹھیک ہیں؟" اس نے پھر ندرت کو مخاطب کیا مگر جواب میں حنین چمک کر بولی۔

"ارے واہ۔ ان لوگوں کا کتنا خیال ہے آپ کو۔ کیا آگ میں کودتے وقت تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنی ایک بہن' ایک بیوی' ایک بھانجی اور۔۔۔" سعدی اور سیم کو دیکھا۔ "اور ڈیڑھ بھانجوں کا خیال نہیں آیا تھا' ہاں؟"

"یار! تم لوگ اپنا چڑیا گھر لے کر میرے سر سے چلے کیوں نہیں جاتے۔" وہ کروٹ لینے کی کوشش میں شدید بے زار ہو رہا تھا مگر سعدی کے بدلے ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔

"واہ ماموں! مجھے تو خوب لیکچر دیتے تھے' میری کے بیٹے کو بچانے کے لیے کیوں خطرے میں کود پڑے۔ اپنی دفعہ تو کوئی خود غرضی یاد نہیں آئی۔"

اب کے فارس نے صرف غصیلی آنکھوں سے اسے دیکھا تو وہ فوراً" مصالحتی انداز میں ہاتھ اٹھائے قدم قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ "جا رہا ہوں۔۔۔ جا رہا ہوں۔"

ندرت اب ان تینوں کو گھرک رہی تھیں۔ پھر بڑے ابا کو فون کرنے اٹھ گئیں۔ "کمرے میں سگنل اچھے نہیں آتے۔" باری باری سب باہر کھسک گئے۔ اب وہ دونوں تنہا رہ گئے۔ وہ اس کے قریب کھڑی گلاس میں چمچ ہلاتی کچھ مکس کر رہی تھی۔ ساتھ ہی مسکرا کے اسے دیکھ بھی رہی تھی۔

"باقی سب۔۔۔" وہ قدرے پرسکون ہوا تو نقاہت زدہ نظروں سے اسے دیکھا' دھیمی آواز میں پوچھنے لگا۔

"نیاز بیگ ایکسپائرڈ ہو گیا۔ دم گھٹنے کی وجہ سے۔ باقی سب ٹھیک ہیں۔" پھر گہری سانس لی۔ "ہاشم ہیرو بن چکا ہے۔ جو بھی زخمی ہو جائے' عوام کی ہمدردی سمیٹ لیتا ہے۔"

"اور یقیناً" سارا الزام میرے سر ڈال چکا ہو گا۔"

"ابھی دیر کتنی ہوئی ہے حادثے کو۔ ابھی تو وہ باہر بھی نہیں نکلا۔ اور وہ ڈال بھی دے تو بھی کیا۔۔۔ وہاں سب نے تمہیں لوگوں کو نکالتے اور بچاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"واٹ ایور!" اس نے سر جھٹکا۔

وہ گلاس پکڑے اس کے قریب آئی۔ اور اس کے کندھے کو چھوا۔ "گڈ جاب غازی!"

وہ کراہا۔ "یہ بات آپ تندرست کندھے کو بھی تھپک کر کہہ سکتی تھیں۔"

"اوہ سوری۔ مجھے تو بھول گیا تھا۔" وہ تپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

"مجھے پتا ہے تم ناراض ہو۔ کب نہیں ہوتیں۔ خیر میں وہاں سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔ میں ایسا نہیں ہوں۔" وہ گردن موڑ کر دوسری دیوار کو دیکھنے لگا تھا۔

"اور اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی؟" اس کی آنکھیں پھر سے بھیگیں۔

"اچھا!! تم پریشان ہوئیں؟" فارس نے چونک کر اسے دیکھا' پھر مسکرایا۔ تنے اعصاب پہلی دفعہ جیسے سکون میں آنے لگے۔

"پریشان؟ ہونہہ۔" اس نے خفگی سے سر جھٹکا۔

"بس اتنا اندازہ ہوا کہ نفرت کتنی کرتی ہوں تم سے۔"

"اچھا۔۔۔ کتنی کرتی ہو؟" اس نے سر پیچھے کو ٹکا لیا اور دلچسپی سے زمر کو دیکھا۔

"اتنی کہ میں ہاشم کی جان لے لیتی۔"

"کیا فائدہ ہوتا؟ میں تو نہ واپس آتا۔"

"جو کہنا ہے کہہ لو۔ میں سچ میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔" اس نے اعتراف کیا تھا۔

"اچھا گاس کر۔"

"بہت برے ہو تم۔"

"کیوں میں نے کیا کیا ہے؟ کم از کم ہسپتال کے بیڈ پہ تم سے قانون شہادت کے آرٹیکلز تو نہیں پوچھ رہا۔"

اور اس بات پہ وہ بے اختیار ہنستی چلی گئی۔

"وہ' وہ تو۔" پھر چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "خیر میں نہیں بتا رہی کہ وہ کیوں پوچھا تھا میں نے۔ بس اتنا جان لو کہ میں تمہیں جانتی ہوں۔"

"صرف جاننا کافی ہے یا کوئی خدمت بھی کرو گی؟"

"کیا خدمت کروں۔"

"کیا کرتے ہیں ایسی سچویشنز میں؟" وہ یاد کرنے لگا۔ "یہ سوپ پلاؤ نا مجھے اپنے ہاتھوں سے۔"

"شیور۔" اس نے تپائی پہ دھرا گلاس اٹھایا' اس میں چمچ ہلایا اور پھر چمچ باہر نکال کر رکھتے ہوئے بولی۔ "میں ضرور تمہیں سوپ پلاتی مگر یہ سوپ نہیں ہے۔"

گلاس سامنے کیا تو اس نے دیکھا' اندر نارنجی جوس تھا۔ "یہ انسٹنٹ ڈرنک ہے جو میں نے تمہارے لیے ہلکان ہو کر اپنی ضائع شدہ توانائی کو بحال کرنے کے لیے بنایا ہے۔ سوری فارس! یہ میرا ڈرنک ہے۔" سادگی سے کندھے اچکا کر وہ اس کے عین سامنے گھونٹ گھونٹ جوس پینے لگی اور وہ خفگی سے اسے دیکھے گیا۔

"میں سمجھا تھا' موت کے منہ سے واپس آنے کے بعد میری عزت میں شاید کوئی اضافہ ہوا ہو مگر۔۔۔" اور ناگواری سے سر جھٹک دیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بے ساختہ ہنس دی تھی۔ وہ ایسی گھڑیاں تھیں جب آنسو اور ہنسی ایک ساتھ نکلنے کو بے تاب لگ رہے تھے۔

اور تب ہی باہر عجیب سا شور بلند ہوا۔ وہ دونوں چونک کر دیکھنے لگے۔ پھر زمر نے سر جھٹک دیا۔ "اب باہر چاہے قیامت بھی آ گئی ہو' وہ فارس کو چھوڑ کے کہیں نہیں جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جب ظلم و ستم کے کوہ گراں
روئی کی طرح اڑ جائیں گے

ہاشم کاردار... اسی ہسپتال کے بہترین پرائیوٹ روم میں لگژری کاؤچ پہ بیٹھا تھا اور مسکرا کے موبائل پہ سوشل میڈیا پہ برپا طوفان دیکھ رہا تھا۔ اس کی زخمی حالت کی تصویر وائرل ہو چکی تھی۔ دعائیں، نیک تمنائیں، محبت بھرے سندیسے ہی سندیسے موصول ہو رہے تھے۔ دروازے پہ آوازیں سنائی دیں تو کونے میں کھڑا رئیس فوراً باہر گیا۔ چند لمحے چوکھٹ پہ تکرار ہوتی رہی، یہاں تک کہ بے زاری سے ہاشم نے پکارا۔

"کون ہے یار؟"

"سر، شہرین میڈم ہیں۔ میں بتا رہا ہوں کہ آپ ابھی مل نہیں سکتے، لیکن...."

"اچھا بھیج دو۔" اس نے ہاتھ جھلا کر کہا اور سر جھکا کر موبائل دیکھنے لگا۔ رئیس چلا گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ہیل کی آواز سے مانوس تھا، آج وہ آواز نہیں سنائی دی تھی۔ اس کی نگاہیں شہری کے قدموں تک گئیں تو منجمد ہو گئیں۔ وہ ننگے پیر تھی۔ ہاشم نے نظریں اٹھائیں۔ وہ پریشان سی آنکھوں میں آنسو لیے کھڑی تھی۔

"واؤ.... تم میرے لیے اتنی پریشان؟ یا یہ کوئی اسٹنٹ ہے؟" وہ تلخی سے مسکرایا تھا۔

"ہاشم!" اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ "ہم نے تمہیں ٹی وی پہ دیکھا، تم زخمی تھے۔ سونی رونے لگ گئی تھی۔"

"او یار! تمہیں سونی کو نہیں دکھانے تھے وہ منظر۔ اچھا اب گھر جاؤ، آرام کرو۔ میں صبح تک آجاؤں گا۔ سونی سے کہو میں ٹھیک ہوں۔"

"ہاشم...." اس کی رندھی آواز کپکپائی۔ "میں اور سونی ایک ساتھ آئے تھے۔ میڈ بھی ساتھ تھی.... مجھے نہیں پتا کیا ہوا۔"

سیل فون ہاشم کاردار کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ کرنٹ کھا کے کھڑا ہوا۔ "کیا ہوا سونیا کو؟"

"ہاشم...." شہری نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "سونی نہیں ہے۔ سونی ہسپتال میں کھو گئی ہے۔"

کیا تم نے کبھی روح نکلنے کی آواز سنی ہے؟
وہ چیخوں سے زیادہ دلدوز ہوتی ہے۔
وہ بے اختیار آگے بھاگا۔

"کہاں ہے سونیا؟ کہاں ہے میری بیٹی؟" وہ حواس باختہ سا باہر آکر چیخا تھا۔

"وہ ابھی میرے ساتھ تھی۔ رش بہت تھا۔ میں کال کرنے رکی، میڈ اس کے ساتھ تھی۔ میں کوریڈور میں آگے نکل گئی، وہ پیچھے رہ گئیں.... میڈ سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ میں نے پولیس کو بتایا ہے وہ اسے ڈھونڈ رہے ہیں مگر وہ نہیں مل رہی۔ وہ کہہ رہے ہیں، اس ہسپتال سے ایک ماہ میں تین بچے پہلے بھی اغوا ہو چکے ہیں۔ سی سی ٹی وی بھی خراب۔"

مگر وہ سن نہیں رہا تھا وہ بھاگ رہا تھا۔ سفید چہرہ لیے سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ کوریڈور میں چلاتے ہوئے بھاگ رہا تھا۔

"میری بیٹی مسنگ ہے.... اسے ڈھونڈ کر لاؤ رئیس۔"

اور رئیس کو بھی ابھی خبر ملی تھی۔ راہداری میں ہاشم کے گارڈز آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ پولیس کے افسران اسی طرف آرہے تھے۔ ہر چہرے پہ مایوسی تھی شکستگی تھی۔ نفی میں ہلتی گردنیں، جھکی آنکھیں، وہ کچھ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ اسپتال کی گرین شرٹ میں ملبوس راہداری میں آگے بھاگتا جا رہا تھا دل تھا کہ ڈوب ڈوب رہا تھا۔ گردن بار بار بے یقینی سے نفی میں ہلتی تھی.... روح قبض ہو رہی تھی۔ جان نکل رہی تھی۔

"سونیا کہاں ہے؟" وہ ایک ایک شخص کو روک کر پوچھ رہا تھا۔ چیخ رہا تھا۔ راہداری سے گزرتے ہر بچے کا منہ موڑ کر دیکھتا۔ سونی نہیں تھی۔ کہیں نہیں تھی۔

"وہ کہاں جا سکتی ہے؟ وہ اتنی جلدی کہاں جا سکتی ہے۔ میری بیٹی کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ تم باہر دیکھو، تم اس طرف جاؤ۔" وہ ڈھیروں لوگوں کے درمیان کھڑا چلا چلا

کربدایات دے رہا تھا۔ پسینے سے تر چہرہ۔۔۔ اس پہ اڑتی ہوائیاں' آنکھوں میں جلتی بجھتی امید۔۔۔ وہ ایک دفعہ پھر سے آگے کو دوڑنے لگا تھا۔

رپورٹرز اسی طرف آگئے تھے۔ کیمرے دھڑا دھڑ اس کی تصاویر اور فلم بنا رہے تھے۔۔۔ اور وہ ایک ایک کو روک کر پوچھ رہا تھا۔ "میری بیٹی' وہ سات سال کی ہے۔" وہ ہاتھ سے اپنے گھٹنے تک اشارہ کرتے اس کا قد بتاتا۔ "کیا آپ نے اسے دیکھا ہے؟" وہ امید اور خوف سے ہر دروازہ کھول کر اندر دیکھتا' پھر آگے کو دوڑتا' لوگ ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہے تھے۔

"کس نے اٹھایا ہے میری بیٹی کو' بتاؤ مجھے۔ کہاں جا سکتی ہے وہ۔" راستے میں اسے پولیس کا اعلا افسر نظر آیا تو وہ تیر کی طرح اس پہ جھپٹا اور اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "کس لیے ہو تم لوگ' تمہارے ہوتے ہوئے وہ کیسے غائب ہو سکتی ہے؟"

وہ ویٹنگ لاؤنج کے وسط میں کھڑا تھا اور پولیس آفیسر کا گریبان جھنجوڑ کر پوچھ رہا تھا۔ پولیس آفیسر نے ندامت اور افسوس سے نظریں جھکائیں۔ "سر! ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کو قرار واقعی سزا دلوائیں گے۔"

"سزا مائی فٹ!" وہ اس کو پرے دھکیل کر چلایا تھا۔ "مجھے میری بیٹی چاہیے۔ میری بیٹی کو لے کر آؤ۔ ایسے کیسے وہ کہیں جا سکتی ہے؟" وہ چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھ رہا تھا۔ لوگ ہجوم کی صورت وہاں کھڑے خاموشی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں ندرت بھی تھیں اور سعدی' حنین' اسامہ ان کے ساتھ کھڑے شل سے نظر آرہے تھے۔

ہاشم کو اپنا سر گول گول گھومتا محسوس ہو رہا تھا۔۔۔ رئیس پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بھاگتا ہوا آرہا تھا۔ "سر! سی سی ٹی وی کیمرے بھی عرصے سے خراب پڑے ہیں' ہسپتال سے باہر جانے کے بہت سے راستے ہیں' شاید وہ اب تک بچی کو لے کر نکل لیے ہوں گے۔" ہاشم تیزی سے آگے بڑھا اور پوری قوت سے ایک مکا اس کے منہ پہ دے مارا۔ رئیس تیورا کے پیچھے کو گرا۔

"مجھے میری بیٹی چاہیے۔۔۔ مجھے میری بیٹی لا کر دو۔" وہ سرخ بھبھوکا چہرے کے ساتھ چلایا تھا۔ دو سپاہیوں نے اسے "آرام سے سر آرام سے" کہتے کندھوں سے تھام کر روکا' ورنہ وہ شاید رئیس کے ٹکڑے کر دیتا۔

"کون لے کر گیا ہے میری بیٹی کو۔۔۔" چاروں طرف دیکھ کر اب پریشانی اور صدمے سے شکست خوردہ سے انداز میں چلا رہا تھا۔۔۔ "ایسے کون کرتا ہے؟ ہسپتال سے کسی کا بچہ کون غائب کراتا ہے؟"

اور ندرت ذوالفقار یوسف نے آنکھیں بند کر کے ایسی کرب میں ڈوبی آہ بھری تھی کہ ان کے تینوں بچوں نے ان کے کندھوں اور بازوؤں سے خود کو لگا لیا تھا۔ ان سب کی آنکھوں میں ترحم تھا' خوف تھا' ہاشم کے اعمال کے نتائج کے لیے۔

"ایسے کون کرتا ہے؟" ہاشم سرخ گیلی آنکھوں سے ایک ایک کا چہرہ دیکھ کر' ٹوٹے دل سے پوچھ رہا تھا۔ اس کو ابھی تک سپاہیوں نے تھام رکھا تھا۔ اس کے گارڈز ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ فون ملا رہے تھے۔

"کسی کا بچہ ایسے کون اٹھاتا ہے۔ بچوں سے کون دشمنی کرتا ہے؟" وہ نڈھال سا ایک کرسی پہ گر گیا تھا۔ آنسو اس کے چہرے پہ گر رہے تھے اور صدمے سے چور آنکھیں اب بھی ہر طرف دیکھتی تھیں۔ رپورٹرز اس سے پوچھ رہے تھے کہ آگ والے واقعے کا ذمہ دار کون ہے' مگر ہاشم نے سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔ اسے معلوم تھا اغوا ہوئے بچے واپس نہیں ملتے اور یہی جان کر وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے' ٹوٹا بکھرا سا رونے لگ گیا تھا۔

"Sonia was all i had!"
(میرا سب کچھ سونیا تھی) ایسے کون کرتا ہے۔" وہ یہی دو فقرے دہرا رہا تھا۔

ندرت کے تینوں بچے ان کے مزید قریب ان سے تقریباً" لپٹ گئے تھے اور شہر کی ایک سنسان خاموش سڑک پہ ڈرائیو کرتی ایمن فون پہ کسی سے کہہ رہی

تھی۔

"آپ کی مدد کا شکریہ۔ آج ہاشم سے ہم نے تمام انتقام لے لیے ہیں۔ اب آگے...." فون پکڑے اس کے ہاتھ میں اب وہ ہیرے کی انگوٹھی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

ہم محکوموں کے پاؤں تلے
یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی

زمر نے کھڑکی کے سامنے سے پردے ہٹائے تو گرم چمکیلی دھوپ چھن کر کمرے میں گرنے لگی۔ باہر ایک روشن خوب صورت صبح دکھائی دے رہی تھی۔ وہ مسکرا کے گھومی اور فارس کو دیکھا جو آئینے کے سامنے کھڑا ڈریس شرٹ کے بٹن بند کر رہا تھا۔ گیلے بال برش کیے وہ باہر جانے کے لیے تیار لگ رہا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" وہ اس کی طرف آئی.... پھر اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی شرٹ کے کھڑے کالر درست کرنے لگی۔

"جاب ڈھونڈنے۔"

زمر نے مسکراہٹ دبا کر مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"پانچ دن بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوئے ہو تو باہر جانے کا اچھا بہانہ ڈھونڈا ہے۔"

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں' اس خدمت کے طفیل جو آپ نے میری بالکل نہیں کی۔"

"اچھا تائی نہیں باندھو گے؟"

"اونہوں!" اس نے بے نیازی سے کندھے جھٹکے۔ آئینے میں دیکھ کر بال دوبارہ درست کیے پھر چابی اٹھاتے ہوئے اس کی طرف مڑا اور مسکرایا۔ "اچھی لگ رہی ہو۔"

"تم بھی۔"

"میں کب نہیں لگتا؟" بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"اچھا مجھ سے وعدہ کرو' جب ہم نئے گھر' نئی زندگی میں سیٹل ہو جائیں گے' تو تم مجھے ڈنر پہ لے کر جاؤ گے۔ عرصے سے وہ ڈنر ادھار ہے تم پہ۔"

"کتنی ندیدی ہو تم!" افسوس سے سر جھٹکتا وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے جاتے دیکھتی رہی۔ زندگی نارمل ہو گئی تھی' مگر وہ دونوں کبھی نارمل نہیں ہو سکتے تھے' یہ طے تھا۔

وہ پورچ میں آیا تو گھنٹی بجی۔ گاڑی کی طرف جانے کے بجائے وہ گیٹ تک آیا اور اسے کھولا۔ پھر سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھ کر گہری سانس لی۔ کالے دھوئیں والا کمرہ.... آگ کے شعلے.... سب ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔

وہ خاور کا بیٹا تھا اور ملتجی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔"

اندر واپس جاؤ تو سعدی کچن کی گول میز پہ موجود ناشتہ کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ فارس کو رخصت کر کے زمر ادھر آئی تو اس کے پاس ٹھہر گئی۔

"سعدی!" نرمی سے پکارا تو اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا' ہلکا سا مسکرایا۔ "جی!"

"تم کیسے ہو؟"

"میں؟" اس نے گہری سانس لے کر شانے اچکائے۔ "پہلے غصہ تھا' پھر ڈپریشن' پھر میں نے عدالتی شکست کے ساتھ سمجھوتا کر لیا۔ انسان کے ہاتھ میں صرف کوشش کرنا ہے' کامیابی تو اللہ دیتا ہے۔"

"پھر میری بات مان لو۔ سیو سعدی یوسف پیج کے کچھ ممبرز تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان سے مل لو۔" وہ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھے نرمی سے اسے سمجھا رہی تھی۔ مگر سعدی نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں ان لوگوں کو کیسے فیس کروں گا جنہوں نے اتنے مہینے اپنے جذبات اور آوازیں میری جدوجہد میں انویسٹ کیں؟ میں ہار گیا ہوں۔ یہ کیسے ایکسپلین (وضاحت) کروں گا؟"

"تم جاؤ تو سہی! ملنے اور بات کرنے سے بہت کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یاد ہے' میں اور تم.... ایک زمانے میں بات کرنا چھوڑ چکے تھے' مگر ہم ٹھیک تب ہوئے

جب بات کرنا شروع کی۔" پھر رک کر بولی۔" آئی ایم سوری... ان چار سالوں کے لیے۔"

"نہیں زمر!" اس نے نفی میں سرہلایا اور اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا۔" خونی رشتوں کی لڑائیوں اور کٹ آف میں غلطیاں مشترکہ ہوتی ہیں۔" وہ آزردگی سے مسکرادی۔

★ ★ ★

باہر لان میں واپس آؤ تو وہ دونوں ابھی تک پورچ میں کھڑے تھے۔ نہ فارس نے اسے بیٹھنے کو کہا' نہ وہ اتنا وقت لے کر آیا تھا۔

"کاردار صاحب کی بیٹی کا کچھ پتا چلا؟ پانچ روز ہو چکے ہیں۔"

"نہیں!" فارس جیبوں میں ہاتھ ڈالے ' سر جھکائے ' جوتے سے گھاس کو مسلتے ہوئے بولا تھا۔ "میں نے اپنے تمام اسٹریٹ کانٹیکٹس کو متحرک کیا ہے مگر ڈاکٹر ایمن' اس کا خاندان اور سونیا تینوں اب تک اس ملک سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔ میں اب بھی کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح ہم سونی کو ڈھونڈ لیں۔"

"وہ لوگ تو آپ کے دشمن ہیں۔"

"مگر بیٹیاں سب کی برابر ہوتی ہیں۔" فارس اس لڑکے کو دیکھ کر زخمی سا مسکرایا۔" خیر' تم کیسے آئے؟ والد صاحب ٹھیک ہیں تمہارے؟" لڑکا چپ ہو گیا۔ پھر سر جھکا لیا۔

"میں چاہتا ہوں ' آپ میرے ابو کو معاف کر دیں۔"

"معاف!" فارس نے ایک سرد سانس دھیرے سے خارج کی۔" میں لوگوں کو جسمانی اذیت دے کر انتقام لینے کو بُرا سمجھتا ہوں۔ خاور کے ساتھ یہ سب میں نے نہیں کیا تھا۔ خاور نے میرے بھائی ' میری بیوی ' زمر... سب کو جسمانی اذیت دی' مگر میں نے اتنا کیا کہ سعدی سے کہا ' وہ خاور کو ہاشم سے الگ کر دے۔ اس نے خاور کی نوکری ختم کروادی اور اسے ہاشم کے زیرِ عتاب لے آیا۔ اس وقت میرا انتقام پورا ہو گیا تھا۔ اب معافی کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔"

"پھر بھی..."

"میں دل صاف کرنے کی کوشش کروں گا' لیکن وعدہ کروں تو یہ جھوٹ ہو گا۔ میں اپنے بھائی اور بیوی کی لاشیں نہیں بھول سکتا۔" اس نے لڑکے کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ یہ ملاقات ختم ہونے کا عندیہ تھا۔

✡ ✡ ✡

مورچال کی بالائی منزل تک جاؤ تو اپنے کمرے میں حنین اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی تھی۔ یہاں کھڑکی سے نیچے لان میں کھڑا فارس دکھائی دے رہا تھا' مگر وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی عزیز کتاب کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ کافی دن بعد حنین کو وہ بھاری آبنوسی دروازہ دکھائی دیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

سامنے تاحدِ نگاہ سنہری صحرا تھا' مگر جس جگہ وہ کھڑی تھی' وہاں اونچے گھنے کھجور کے درخت ہی درخت تھے نخلستان نے صحرا کی گرمی اور تپش کو شکست دے دی تھی۔

بوڑھے استاد ایک درخت تلے بیٹھا دکھائی دے رہے تھے۔ سامنے چند تختیاں رکھی تھیں جن کے اوپر وہ قلم کو سیاہی میں ڈبو ڈبو کر لکھ رہے تھے۔ وہ قدم قدم اس طرف بڑھنے لگی تو انہوں نے سر اٹھائے' بنا مسکرا کر کہا۔ "بہت دن بعد آئی ہو۔"

"مگر میں نے یہ دن بے کار نہیں گزارے ' شیخ!" وہ ان کے سامنے آبیٹھی۔ دوزانو ہو کر۔

وہ سر جھکائے لکھتے رہے۔ "کیا کیا تم نے ان دنوں میں۔"

"میں نے جو آپ کی کتاب سے سیکھا تھا' اسے اپنی زندگی پہ اپلائی کیا۔ جس علم کو اپلائی ہی نہ کیا جائے وہ تو ایسے ہی ہے جیسے گدھے پہ کتابیں لاد دی گئی ہوں۔ ایسا علم بوجھ بن جاتا ہے۔ جنابِ شیخ! میں نے آپ کی کتاب ختم کرلی اور میں اب اس کے آخری باب کے متعلق بات کرنے آئی ہوں۔"

کھجور کے درختوں کے بیچ سرسراتی ہوئی ٹھنڈی ہوا

نے ماحول کو مزید خوشگوار بنا دیا تھا۔ ایسے میں جہاں ہر طرف سیاہ سفید منظر نامہ تھا' وہ رنگین دکھائی دیتی تھی۔

"پھر... کیا سیکھا تم نے میری کتاب سے؟"

"میں نے یہ سیکھا کہ ہر انسان vulnerable (کمزور) ہے۔ اس کے اردگرد کا موسم ایک سا نہیں رہتا۔ کبھی موسم بدلتا ہے تو ہوا میں گردش کرتے مختلف وائرس اسے آکر جکڑ لیتے ہیں۔ ایسے ہی ماحول بھی بدلتا رہتا ہے۔ نیا ماحول' نئی یونیورسٹی کالج' نیا موبائل فون' ان سب عناصر کے باعث اسے مرض عشق کا وائرس آن لگتا ہے۔ اس میں اس کا قصور نہیں ہوتا۔ پھر وہ کیا کرتا ہے' یہیں سے اس کا امتحان شروع ہوتا ہے۔"

"تو تمہارے خیال میں پھر اسے کیا کرنا چاہیے؟"

درس کا وقت ختم ہو چکا تھا اور امتحان شروع ہو چکا تھا۔ استاد نے تختیاں پرے ہٹا دیں اور پوری توجہ سے اس کا جواب سننے لگے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"اسے دو کام کرنے چاہئیں۔ پہلا غض بصر۔ نظر جھکانا۔ وہ شخص جس کی وجہ سے دل ڈسٹرب ہے' اس سے اگر کوئی حلال تعلق نہیں ہے تو اسے اپنی زندگی سے نکال باہر پھینکنا۔ سارے تعلق' سارے روابط کاٹ دینے چاہئیں۔ پھر اس کی یادوں' اس کی تصویروں' اس کے میسجز' ای میلز' کسی کو بھی دوبارہ نہ پڑھیں۔ یوں نظر محفوظ ہو گی تو دل بھی محفوظ ہو گا۔"

"اور دوسرا طریقہ؟"

"صرف نظر کی حفاظت کرنا کافی نہیں۔ دل کا دھیان بھی بٹانا ہو گا۔ عشق عشق کو کاٹتا ہے' محبت محبت کو کاٹتی ہے۔ آپ کی کتاب کا آخری باب کہتا ہے کہ اپنے دل میں سب سے بڑی محبت... اللہ کی محبت بسائی جائے' وہ ہمارے دل کو اتنا مضبوط کر دے گی کہ ہم اس شخص کی طرف نہیں لپکیں گے۔"

"کیا تمہیں اس بات سے اختلاف ہے؟"

"نہیں' ہرگز نہیں۔ لیکن مجھے ایک اعتراف بھی کرنا ہے۔ کئی سال پہلے علیشا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا مجھے خدا سے محبت ہے؟ میں نے کہا تھا' پتا نہیں۔ آج اتنی ٹھوکریں کھا کر بھی میں نہیں جان سکی کہ اللہ سے محبت کسے کہتے ہیں۔ وہ کیسے کی جاتی ہے۔ میں نمازیں پڑھتی ہوں اور لوگوں کو دھوکا نہ دینے کی کوشش بھی کرتی ہوں' مگر ابھی تک میں اللہ تعالیٰ سے وہ محبت نہیں کر سکی جو کرنا چاہیے تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ آخر میں جا کر میں اس محبت کو سمجھ جاؤں گی مگر ایسا نہیں ہو سکا۔

اور میں یہی بتانا چاہتی ہوں آپ کو۔ اللہ کی طرف جاتا راستہ بہت طویل ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کے آخر تک پہنچ جائیں' اس کو پار کر لیں۔ ضروری صرف یہ ہے کہ جب ہمیں موت آئے تو ہم اسی راستے پہ ہوں' چاہے لڑکھڑا رہے ہوں' چاہے گر پڑ کر آگے بڑھ رہے ہوں' مگر اس سیدھے راستے پہ رہیں۔ اپنے گناہوں کو دلیلیں دے دے کر جسٹی فائی نہ کرتے پھریں۔ جب دل میں کچھ کھٹک رہا ہو توبہ کر کے اپنے اعمال درست کر لیں اور راستہ سیدھا کر لیں۔ ہمارا مستقبل کورا ہے' ماضی جیسا بھی داغدار ہو بھلے۔ مستقبل کو ہم اپنی مرضی سے لکھ سکتے ہیں۔"

"اور اللہ سے محبت؟" انہوں نے یاد دلایا۔ حنین نے گہری سانس لے کر... سر اٹھا کے دور تک پھیلے کھجور کے درختوں کو دیکھا۔

"وہ ویسی نہیں کر سکی جیسے کرنی چاہیے۔ مگر مجھے ان چیزوں سے محبت ہو گئی ہے جن سے اللہ کو محبت ہے۔ مجھے نماز اور قرآن سے محبت ہو گئی ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ سے بات کرنا' دعا مانگنا اچھا لگنے لگا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اللہ سے میری محبت' ولیوں اور نیک لوگوں جیسی نہ بھی ہو سکی' تب بھی میں ایسے اچھے کام کرتی رہوں گی جن سے کم از کم وہ تو مجھ سے محبت کرے گا نا۔" وہ مسکرا کر امید سے کہہ رہی تھی اور شیخ نے بھی اسی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیا تھا۔

کھجور کے درخت غائب ہو گئے۔ اس نے سر اٹھایا تو دیکھا کمرے میں بیٹھی تھی اور اسٹڈی ٹیبل پہ کتاب

کھلی رکھی تھی۔ اس نے صفحے پلٹے۔ پہلے صفحے پہ واپس آئی۔ وہاں آج بھی ہاشم کاردار کا نام لکھا تھا۔

کینسر رہے نہ رہے' وہ بھولتا کبھی نہیں ہے۔ اور بھولنا ضروری بھی نہیں ہے۔ اس نے گہری سانس لے کر کتاب بند کر دی۔ ایک سفر تمام ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اور اہل حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑکڑ کڑکے گی

قصر کاردار کا لاؤنج دوپہر کے باوجود اندھیرے میں ڈوبا لگتا تھا۔ کھڑکیوں کے آگے بلاک آؤٹ بلائنڈز گرے تھے۔ گویا روشنی کے سارے راستے کاٹ دیے گئے ہوں۔ وہ بڑے صوفے پہ لمبا لیٹا تھا۔ ملگجا سا ٹراؤزر اور آدھی آستین کی ٹی شرٹ پہنے۔ بڑھی شیو اور سرخ آنکھیں لیے' وہ چھت پہ جھلملاتے فانوس کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے قدموں کے قریب ہاتھ باندھے ایک اعلا پولیس آفیسر کھڑا تھا اور ساتھ رئیس۔

"وہ ملک سے فرار ہو چکے ہیں۔ مگر ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے۔ تاوان کے لیے کوئی کال بھی نہیں کی۔ ان کا مقصد آپ کو اذیت دینا تھا۔" پولیس افسر سر جھکائے ڈرتے ڈرتے اطلاع دے رہا تھا۔ "اور ہم یہ معاملہ فارس غازی پہ بھی نہیں ڈال سکتے کیونکہ وہ اس وقت زخمی حالت میں ہسپتال داخل تھا۔ اور......"

ہاشم نے بے زاری سے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ "وہ ایسے کام نہیں کرتا۔ بیٹیاں سب کی برابر ہوتی ہیں۔" سرخ آنکھوں سے اس نے پولیس والے کو گھورا تھا۔

"سر! آپ نے بہت غلطی کی۔ اتنے شاطر مجرموں کو ایک کمرے میں بند کر کے آگ لگانی چاہی' انہوں نے جوابی حملہ تو کرنا تھا۔"

"بکواس مت کرو میرے سامنے۔" وہ جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا۔ ننگے پیر زمین پہ اتارے۔

"میں ان میں سے ایک ایک کو دوبارہ اسی طرح جلا کر ماروں گا' اور اگر مجھے سونیا نہ ملی تو تم لوگوں کے بچے بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔" انگلی اٹھا کر وہ اسے تنبیہہ کر رہا تھا۔ "تم لوگوں کو بھی' جو زیادہ پیسہ دے اس کے ساتھ مل جاتے ہو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ پولیس کے ہوتے ہوئے ایک بچی کو وہاں سے نکال کر لے جائے اور کسی کو معلوم بھی نہ ہو۔ میں صرف سونی کے ملنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ پھر دیکھنا' میں تم سب کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔" اسے گھورتے ہوئے وہ جھٹکے سے اٹھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سیڑھیاں تاریک تھیں' ساری دنیا تاریک تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ کار کی چابیاں ڈھونڈنے لگا۔ روز کی طرح آج بھی اسے شہر کا کونا کونا چھان مارنے جانا تھا۔ میز سے چابیاں اٹھاتے ہوئے وہ رکا' وہاں ڈیجیٹل فوٹو فریم لگا تھا جس میں تصاویر کا سلائیڈ شو مدھم موسیقی کے ساتھ چل رہا تھا۔ ہاشم رک کر دیکھنے لگا۔ آنکھوں میں یاسیت سی اتر آئی۔

اس کے بچپن کی تصاویر...... وہ اور ڈیڈ...... اسٹین فورڈ کے دنوں کی تصاویر' اس کی ڈگری اور اس پہ بڑا بڑا سا "کاردار" لکھا...... ہر دوسری تصویر میں اورنگ زیب اس کے ساتھ تھے۔ اس کا شانہ تھپکتے' اس کو دیکھ کر مسکراتے...... وہ اسے کہا کرتے تھے' وہی ان جیسا ہے...... وہی ان کے کاروبار' ان کی وراثت کا اصل حقدار ہے۔ جواہرات بے اعتبار اور شیرو نکما تھا۔ علیشا کچھ تھی ہی نہیں' سب ہاشم تھا۔ ہاشم سنبھال لے گا اور اب آہستہ آہستہ یہ حقیقت اس کے اوپر عیاں ہو رہی تھی کہ اس کی ساری زندگی ایک جھوٹ کے سوا کچھ بھی نہ تھی' ہر وہ شے جس پہ اس نے فخر کیا تھا۔ جس سے اس نے محبت کی تھی۔ کچھ بھی اس کا نہ تھا کچھ بھی اس کا نہ رہا تھا اس نے آنکھیں بند کیں۔ گرم گرم آنسو گال پہ لڑھکنے لگے۔

پھر اس نے دراز کھولی۔ اندر اس کا پستول رکھا تھا۔ اس کی ہر شے کی طرح بیش قیمت اور برانڈڈ۔ اس نے پستول نکالا اور لوڈ کیا۔

تاریک لاؤنج میں رئیس اور پولیس آفیسر کھڑے دھیمی سرگوشیوں میں سونی کو ڈھونڈنے کے بارے میں بات کر رہے تھے' جب انہوں نے وہ ہولناک فائر سنا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

دونوں نے چونک کر سر اٹھایا۔
"ہاشم!" رئیس کے لبوں سے نکلا۔ وہ دونوں دیوانہ وار اوپر بھاگے۔۔۔ سیڑھیاں عبور کیں اور کمرے کا دروازہ دھاڑ سے کھولا۔
کمرے کے کونے میں رکھا ایکوریم (جو وہ کئی دن پہلے ادھر لے آیا تھا) چکنا چور ہوا پڑا تھا۔ پانی گر گیا تھا۔ سامنے ہاشم کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔
"سر! آپ ٹھیک ہیں؟" رئیس نے بدحواسی سے پوچھا۔ ہاشم کاردار نے ناگواری سے اسے دیکھا۔
"مجھے کیا ہونا ہے؟ اتنا کمزور نہیں ہوں کہ ہار مان لوں گا۔ میں صرف اپنے پچھتاووں کی آخری نشانی ختم کر رہا تھا۔ جو کیا' بالکل ٹھیک کیا۔ دس بار پھر کروں گا۔ ایک دفعہ مجھے سونی مل جائے' پھر میں سب کو بتاؤں گا کہ میری بیٹی کو ایذا دینے والوں کے ساتھ کیا ہونا چاہیے۔ اب چلو۔"
گن جیب میں اڑستے ہوئے' وہ آگے بڑھ گیا۔ رئیس نے بے اختیار سکون کا سانس لیا تھا۔ آج پھر انہیں شہر کا ہر کونا رات گئے تک چھاننا تھا۔۔۔ ایمن کے رشتے داروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے گھروں میں دھاوا بولنا تھا' ان کو ہراساں کرنا تھا۔۔۔ وہ کہاں جا سکتی ہے۔۔۔ کوئی تو بتا دے گا۔

☆ ☆ ☆

جب ارض خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے

ایئرپورٹ پہ مختلف اطلاعات کی آوازیں اسپیکرز پہ گونج رہی تھیں۔ رش بہت تھا۔ آوازیں۔ شور۔ ایسے میں وہاں وی آئی پی لاؤنج میں ایک صوفے پہ نوشیرواں بیٹھا تھا اور بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ سارے ۔۔ مجمع میں بھی اکیلا۔
قریب آتے قدموں کی آہٹ محسوس کی تو سامنے دیکھا۔ سعدی یوسف وہاں سے چلا آ رہا تھا۔ سفید شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک چڑھائے' وہ سنجیدہ چہرے اور چبھتی ہوئی نظروں کے ساتھ اس کے عین سامنے آ رکا۔ شیرو بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔
"پبلک پلیس پہ بلایا تم نے نوشیرواں' لیکن میں اس دفعہ گھر والوں کو بتا کر آیا ہوں۔ ورنہ سیکیورٹی سسٹم۔۔۔" نظر گھما کر سی ٹی وی کیمروں کو دیکھا "اور سیکیورٹی اہلکاروں پر بھروسا نہیں ہے مجھے۔" پھر اپنی گھڑی دیکھی۔ "میرے پاس صرف دس منٹ ہیں۔ جو بھی کہنا ہے' بغیر تمہید کے کہو۔"
نوشیرواں چند لمحے تذبذب سے اسے دیکھے گیا۔ سلک کی گرے شرٹ اور۔۔۔ سیاہ کوٹ پہنے' وہ بال چھوٹے کٹوا کر پہلے سے بہت مختلف نظر آ رہا تھا۔
"سونیا ابھی تک نہیں ملی۔"
"مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ ہم بھی تلاش کر رہے ہیں' اپنے طور پہ جتنا ہو سکا کریں گے۔ اور کچھ؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔
"سعدی! کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟" وہ ایک دم جذباتی سا ہو کر بولا۔ "کیا تم مجھے اس بوجھ سے آزاد نہیں کر سکتے؟ میں جیل گیا' میں عدالتوں کے چکر لگاتا رہا' ہمارا خاندان ٹوٹ گیا' اپنے سوشل سرکل میں میں مذاق بن کر رہ گیا۔ کیا تم میری سزا ختم نہیں کر سکتے؟"
اس کی آواز آخر میں گلوگیر ہو گئی تھی۔ سعدی نے ایک گہری سانس لی' صوفے پہ بیٹھا اور اسے اشارہ کیا۔
"بیٹھو۔"
وہ کسی معمول کی طرح سامنے بیٹھ گیا۔ دم سادھے۔ اب سعدی نے آگے جھکے' ہاتھ باہم پھنسائے' غور سے اسے دیکھتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔
"میں تمہارا کون تھا نوشیرواں؟"
نوشیرواں سے کچھ بولا نہیں گیا۔
"میں تمہارا دوست تھا۔ جس نے تمہاری جان بچائی تھی۔ جو یونیورسٹی میں تمہاری ہر طرح سے اخلاقی طور پر مدد کیا کرتا تھا مگر تم نے پہلے مجھ سے لڑائی کی' پھر مجھ سے حسد شروع کیا۔ کیا تھا اگر تم اس بات کو ایپری شیئٹ کر لیتے کہ ایک مڈل کلاس کا لڑکا اتنا پُراعتماد ہے مگر تم جلنے لگے۔ تم نے ہر موقع پہ مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ لوگ کہتے ہیں پہلا قتل عورت پہ ہوا

تھا۔ غلط کہتے ہیں۔ پہلا قتل حسد کی وجہ سے ہوا تھا۔ قابیل نے تب نہیں مارا ہابیل کو جب یہ فیصلہ ہوا کہ ہابیل اس لڑکی سے شادی کرے گا جس سے قابیل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے تب مارا اسے جب اللہ نے ہابیل کے حق میں فیصلہ دیا۔ پہلے اس کا ہابیل سے مقابلہ تھا۔ اب وہ ہابیل سے جیلس ہوا تھا۔ تم نے جب مجھے مارنا چاہا تو میں نے وہی کہا جو ہابیل نے اپنے بھائی سے کہا تھا کہ میں تم پہ ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ لیکن تم نے مجھے گولیاں ماریں، تم مجھے بوٹ مارے۔ کیا میں وہ بھول سکتا ہوں؟" شیرو کا چہرہ جھک گیا۔ کان لال پڑ رہے تھے۔

"جب میں قید سے رہا ہو کر آیا تو روز سوچتا تھا؟ کیا میں وہ بھول سکتا ہوں تمہیں معاف کر سکتا ہوں؟ پھر مجھے احساس ہوا کہ ہاں، میں یہ کر سکتا ہوں۔"

نوشیرواں نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ پُرتپش نگاہوں سے اسے دیکھتا کہہ رہا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ میں اتنا بے رحم اور انتقام میں اندھا ہو گیا تھا کہ ہر قیمت پہ تمہاری پھانسی چاہتا تھا؟ نہیں نوشیرواں! حالانکہ قصاص میرا حق تھا، مگر میں چاہتا تھا تم اپنی اصلاح کرو۔ تم نے زمر کو بھی بچایا، تم اپنی معافی، اپنی نجات، کہاں کہاں نہیں ڈھونڈتے رہے، مگر تم میرے پاس نہیں آئے۔ تم آتے بھی تو میں تمہیں معاف نہ کرتا۔ کیونکہ میں چاہتا تھا تم دنیا کے سامنے مانو، عدالت میں اعتراف کرو یا عدالت اس بات کو مانے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اگر تم اصلاح چاہتے تو مان لیتے، یا اپنے بھائی کو روکتے کہ مجھ پہ اور میرے خاندان پہ کیچڑ نہ اچھالتا رہے، مگر تم خاموش رہے۔ تم برادران یوسف کی طرح سمجھتے ہو کہ "اس گناہ کے بعد ہم نیکوکار ہو جائیں گے" والا طریقہ درست ہے۔ نہیں نوشیرواں! اصلاح کے سفر کی بنیاد جھوٹ پہ نہیں رکھی جاتی۔ سچ پہ رکھی جاتی ہے۔ عدالت میں جھوٹ کو بڑے جھوٹ سے بے شک ہرایا جائے مگر زندگی میں جھوٹ کو سچ سے ہی ہرانا چاہیے۔"

"میں اعتراف کرتا تو مجھے پھانسی ہو جاتی!" وہ دبا دبا سا چیخا تھا۔ آنکھیں پھر سے لال پڑنے لگی تھیں۔

"میں نے کہا نا، میں فیصلہ کر چکا تھا۔ اگر تم اعتراف کرتے یا اگر عدالت تمہیں مجرم مان لیتی تو میں بھی تمہیں معاف کر دیتا۔ مگر تم اصلاح والی زندگی نہیں چاہتے تھے۔ تم صرف زندگی چاہتے تھے۔ تم ایک دفعہ اعتراف کر کے تو دیکھتے۔ میں خود سارے الزام واپس لے لیتا۔ ایک دفعہ پھر تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی۔ میں صرف اس ملک میں ایک precednt (مثال) قائم کرنا چاہتا تھا کہ ہاں طاقت ور بھی قانون کے ہتھوڑے تلے آ سکتا ہے مگر تم بزدل نکلے۔" وہ سپاٹ انداز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس لیے میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گا۔ میں وہ تین گولیاں بھی بھول سکتا ہوں مگر تم نے ایک زخمی پڑے دوست کو بوٹ سے ٹھوکریں ماری تھیں۔ میں وہ نہیں بھول سکتا۔" پھر رک کر بولا۔

"ہابیل کو مارنے کے بعد قابیل کو پھانسی نہیں دی گئی تھی۔ مقدس کتابوں میں آتا ہے کہ اس کے ماتھے پہ خدا تعالیٰ نے ایک مہر لگا دی تھی اور بنی نوع انسان پہ اس کا قتل حرام کر دیا تھا۔ وہ ساری عمر اس نشان کو لیے بھٹکتا رہا، مگر لوگ اس کو اس نشان کے سبب پہچان لیتے اور اس کو قتل نہ کرتے۔ وہ سینکڑوں سال زندگی کی قید میں رہا۔ ہر قابیل کا مرنا ضروری نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں، تم بھی قابیل کی طرح بھٹکتے رہو۔ کیونکہ ہاشم پھر بھی اپنے پیاروں سے مخلص تو ہے۔ ان کو مار سکتا ہے، ان کو جلا سکتا ہے، قید کر سکتا ہے، مگر ان کو دھوکا نہیں دیتا ہے۔ تم نے تو ہاشم کو بھی صرف استعمال کیا۔ ہر قابیل کا مرنا ضروری نہیں ہوتا شیرو!" وہ رکا اور تصحیح کی۔ "مگر تمہارا نام نوشیرواں ہے!"

سعدی یوسف نے ایک ملامتی نظر اس پہ ڈالی اور مڑ گیا۔ نوشیرواں بھیگی آنکھوں سے اس کو دور جاتے دیکھتا رہا۔ اپنے ماتھے پہ لگی دہکتی مہر کو وہ ابھی سے محسوس کرنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہم اہل صفا مردود حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے

اور اسی وقت قصر کاردار میں بنے جواہرات کے پرتعیش کمرے میں کوئی اور بھی حساب کتاب کرنے بیٹھا تھا۔

وہ کھڑکی کی طرف رخ کیے بیٹھی، چیخنے کی صورت ہڈ سر پہ گرائے، درشتی سے پیچھے کرسی پہ بیٹھے ہارون سے کہہ رہی تھی۔ "کیوں آجاتے ہو ہر روز مجھے کچوکے لگانے؟"

"تمہاری ملازمہ مجھے آنے دیتی ہے۔ میں کیا کروں؟" وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، تھری پیس میں ملبوس تھے۔ اس بات پہ مسکرا کے شانے اچکاتے بولے تھے۔ "اور پھر مجھے اچھا لگتا ہے تمہارے ساتھ بیٹھ کر آبی کو یاد کرنا۔ ویسے کیا اب احساس ہوا ہاشم کو کہ کسی کی بیٹی کو چھیننا کیسا ہوتا ہے؟"

"ہونہہ۔۔۔" وہ تلخی سے ہنسی۔ "جیسے تمہیں اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔ ہرگز نہیں۔ کسی کو اپنی اولاد سے اتنی محبت نہیں ہو سکتی، جتنی مجھے اپنے بیٹوں سے ہے۔"

"ہر کسی کو اپنی اولاد پیاری ہوتی ہے جواہرات۔ مجھے بھی تھی۔" وہ درشتی سے بات کاٹ کر بولے تھے۔ "مگر میں ہاشم کی طرح دیوانہ وار ایک ایک کا گریبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میں تم لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں خود کو مزید طاقت ور بنانا چاہتا تھا، تاکہ کبھی تو تم سے انتقام لے سکوں۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا آبی کے ساتھ۔ ہاشم نے کیا جو بھی کیا۔"

"تم نے اور بہت کچھ کیا ہے۔ پہلے میری بیوی پہ الزام لگایا، اس کا اسکینڈل بنوایا، میں نے اسے قید میں ڈال دیا تو تم اس کو نکال کر لے گئیں۔ تم نے میری بیوی کو مروایا، اس کے زیور ہتھیا لیے۔ اینٹیک نادر جیولری۔۔۔ اس کی وجہ سے میری بیٹی تباہ ہو گئی۔" وہ کہہ رہے تھے اور ایک ایک لفظ میں درد سا بسا تھا۔ "میں اسے کبھی وقت نہیں دے سکا۔ وہ موت سے abbssessed (مغلوب) ہوتی گئی۔ میں نے اس کی حفاظت کرنا چاہی، اس کو باڈی گارڈ خرید کر دینا چاہا۔ مگر کوئی میرے اشارے پہ نہ چلا۔ نہ تم لوگ، نہ زمر اور فارس۔ یہاں تک کہ ہاشم نے اسے چھین لیا ہے۔"

"چلے جاؤ تم یہاں سے، میری۔۔۔ میری۔" وہ ہذیانی انداز میں چلانے لگی۔ "اس آدمی کو نکالو یہاں سے۔۔۔"

مگر وہ خود ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے بولے تھے۔ "ایک دفعہ پھر۔۔۔ تماری حالت پہ بہت افسوس ہوا جواہرات۔"

باہر آ کر کار میں بیٹھتے ہوئے ہارون عبید نے موبائل نکال کر ای میلز کھولیں تو تیسری میل دیکھ کر لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ انہوں نے اس میں موجود نمبر دیکھ کر اس کو کال ملائی۔ تھوڑی دیر بعد وہ فون پر کہہ رہے تھے۔

"آپ کو بقایا رقم، آسٹریلوی شہریت اور سفری دستاویزات آج مل جائیں گی ڈاکٹر ایمن۔ اس رات آپ نے مجھے کال کر کے اپنی زندگی کا سب سے بہترین فیصلہ کیا تھا۔" پھر رک کر سننے لگے۔

"بے فکر رہیں۔ بچی کہاں ہے، زندہ بھی ہے یا نہیں، یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ اس رات کے بعد سے میرا مسئلہ ہے۔" اور مسکرا کے فون بند کر دیا۔

سیاہ شیشوں والی کار تیزی سے سڑک پہ دوڑتی رہی اور وہ زخمی مسکراہٹ کے ساتھ باہر دیکھتے رہے۔

☆ ☆ ☆

سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے

رات گہری ہو رہی تھی اور شہر کی ایک پر رونق سڑک پہ ہاشم کی کار دوڑتی جا رہی تھی۔ وہ اگلی نشست پہ بیٹھا تھا اور کھڑکی سے باہر ویران نظروں سے دیکھ رہا

تھا۔ رئیس کار ڈرائیو کرتے ہوئے اس کو سونیا کے اغوا کی تفتیش کے بارے میں آگاہ کررہا تھا' مگر وہ بس دکھی نظروں سے باہر دیکھے جارہا تھا۔ شہر روشنیوں سے منور تھا' دنیا اس کی ذہنی حالت سے بے نیاز اپنی روش پہ چل رہی تھی' بہہ رہی تھی' چل رہی تھی اور وہ کتنا پیچھے رہ گیا تھا۔ زندگی میں ایک ہی سچ بچا تھا' سونیا... اور اس نے اسے بھی کھو دیا تھا۔ وہ کہاں جائے' وہ کیا کرے؟ وہ آنکھیں بند کرکے کنپٹیاں سہلانے لگا۔

کار رکی تو اس نے چونک کے سر اٹھایا۔

"سر! یہاں مارکیٹ میں ڈاکٹر ایمن کے بھائی کی شاپس ہیں۔ میں بندے لے جاکر ان سے ذرا بات کرتا ہوں۔ آپ بیٹھیں۔ مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

ہاشم نے محض سر ہلا دیا اور سر ہاتھوں میں گرا کے وہیں بیٹھا رہا۔ آگے پیچھے رکتی گاڑیوں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ پھر گارڈز کے دور جانے کی چاپ سنائی دیتی رہی۔ وہ آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔

"ٹھک ٹھک!" شیشہ بجا تھا۔ اس نے بے زاری سے آنکھیں کھولیں اور گردن موڑی۔ کھڑکی پہ ایک شخص جھکا ہوا تھا اور اسے باہر آنے کا کہہ رہا تھا۔ گول چشمے والا شخص... وہ اسے فوراً" پہچان گیا تھا۔ یہ وہی تھا جو ہر روز عدالت آیا کرتا تھا۔ ہاشم ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ پھر اچنبھے سے اس کے ساتھ کھڑے دو افراد کو دیکھا۔

"جی؟" خشک آواز میں پوچھا۔

"ہاشم کاردار... آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"آہاں... مگر کیوں؟" اس کا ماتھا ٹھنکا۔

"ہمیں آپ سے کچھ سوالات کرنے ہیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ آنا ہوگا۔" چشمے والا بے تاثر انداز میں کہہ رہا تھا۔ اندھیرے میں کار کے ساتھ کھڑے ان تینوں کو اس نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"کون ہو تم لوگ؟"

چشمے والے نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک بیج بمع کارڈ کے اس کے سامنے لہرایا۔ ہاشم کے جبڑے کی رگیں تن گئیں۔ اس نے تھوک نگلا۔

"خوب!" اس نے کمال ضبط سے سر کو دو تین دفعہ اثبات میں ہلایا۔ "مجھ سے کیا بات کرنی ہے۔"

"مسٹر کاردار! ہم جانتے ہیں کہ آپ اپنی بیٹی کے لیے کافی پریشان ہیں' مگر وہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمیں آپ کو یہاں سے لے جانا ہے۔"

"تم مجھے اس طرح نہیں لے جاسکتے۔" وہ انگلی اٹھا کر سختی سے تنبیہہ کرتے ہوئے بولا۔ "دوسرا... میں امریکی شہری ہوں' تم امریکی شہری کو ہاتھ لگانے کے نتائج جانتے ہو؟" کوئی مجھے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔"

"مسٹر کاردار!" چشمے والا دو قدم آگے آیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "ہمارے ہاں ملزم نہیں ہوتے' صرف مجرم ہوتے ہیں... اور ہم... مجرم کو... صفائی کا حق... نہیں دیا کرتے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ہاشم کو گریبان سے پکڑا' گاڑی سے لگایا' دوسرے شخص نے اس کا جبڑا" رخ موڑا' پھر اس کے بازو پیچھے لے جاکر زبردستی کلائیاں قریب لے کر آیا اور ان میں ہتھکڑی ڈال کر کلک کے ساتھ بند کی۔

"ہاشم کاردار..." اس نے ہاشم کے کان کے قریب جاکر کہا۔ "آج سے آپ ایک لاپتا ہیں۔" اور دوسرے نے اس کے منہ پہ سیاہ بیگ گرادیا۔ ساری دنیا جیسے بجھ گئی تھی... اندھیرا... تاریکی... ہر سو تاریکی...

کمرے میں چھت پہ ایک تیز... سورج جیسی تیز اور آگ جیسی جھلساتی روشنی والا بلب جھول رہا تھا۔ باقی کمرہ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ ایک میز بچھی تھی جس کے اوپر ہاشم بیٹھا تھا۔ کہنیاں میز پہ جمار کھی تھیں اور وہ چندھیائی ہوئی آنکھیں تل رہا تھا۔ سامنے چشمے والا شخص بیٹھا تھا' مگر اب اس نے چشمہ نہیں پہن رکھا تھا۔ کڑے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"تم نے ہاشم کاردار! کورٹ میں آن ریکارڈ ایسی معلومات دی ہیں' جو جینوئن ہیں۔ تم کو زبان نہیں کھولنا تھی۔"

ہاشم ٹیک لگا کر بیٹھا اور نفی میں سر ہلایا۔

"تم نے ایک جگہ کے نیچے واقع ٹریننگ سینٹر کا ذکر کیا تھا۔ وہ انتہائی حساس معلومات تم تک کیسے پہنچیں۔" پھر وہ آگے ہو کر طنز سے بولا۔ "کیا تم نے غلطی سے بول دیا تھا۔"

"Oops" ہاشم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شانے اچکائے۔ وہ بہت ڈھیٹ تھا۔ وہ شخص مسکرایا۔

"ہم شروع لائٹ ٹارچر سے کرتے ہیں۔" بلب کی طرف اشارہ کیا۔ (جس سے ہاشم کے سر میں درد ہونے لگا تھا، مگر وہ ضبط سے مضبوط اعصاب کا مظاہرہ کرتا بیٹھا نظر آرہا تھا۔) "پھر مختلف اقسام کے ٹارچرز اپلائی کرتے ہیں۔ کچھ نہیں بولو گے تو کسی بے نشان قبر میں دفنا آئیں گے۔ لیکن اب تم سورج نہیں دیکھ سکو گے کاردار۔"

"تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو، تم بہت پچھتاؤ گے۔ میں امریکی شہریت رکھتا ہوں۔"

"تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ تم نے کورٹ میں بہت کچھ بولا ہے۔ اپنے منہ سے تم نے اپنے لیے گڑھا کھودا ہے۔"

"تب میں ملزم نہیں تھا۔ اب ہوں۔ تب میرے پاس خاموشی کا حق نہیں تھا۔ اب ہے۔" ہاشم نے زور سے میز پہ ہاتھ مارا۔ "جب بھی کوئی انسان ملزم بنتا ہے تو یہ حق اس کو فوراً مل جاتا ہے اور....." وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ لب کھل گئے۔ آنکھوں میں شاک سا ابھرا۔ "انہوں نے مجھے میرا حق نہیں استعمال کرنے دیا، اسی لیے....." وہ چونکا تھا۔ ایک دم سے سارے معمے حل ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے سرونٹ کوارٹر سے خاموشی سے نکلی اور بلّی کی چال چلتی ہوئی گھر کی پچھلی سمت جانے لگی۔ آج اسے درخت پہ چڑھنے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف انیکسی کے عقب میں موجود پرانا چھوٹا دروازہ کھول دیا تو دیکھا۔ وہ سرخ مفلر اوڑھے سامنے کھڑا تھا اور جیبوں میں ہاتھ ڈال رکھے تھے۔

"میرے پیسے لائے ہو؟" ملازمہ نے اشتیاق اور دلچسپی سے پوچھا۔ اس نے پینٹ کی جیب سے خاکی لفافہ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ "گن لو، پورے ہیں۔"

وہ لفافہ تھامتے ہوئے مسکرائی۔ "مجھے تمہارا یقین ہے، فارس! تم میرے مالکوں جیسے نہیں ہو۔" اور یہ کہہ کر فینوتا نے گردن موڑ کر دور نظر آتے قصر کاردار کو دیکھا۔

سرخ مفلر والا شخص دو قدم قریب آیا تو اس کا چہرہ چاند کی روشنی میں واضح ہوا۔ وہ زخمی انداز میں مسکراتا ہوا فارس تھا۔

"تھینک یو فینوتا۔ تم نے میری بہت مدد کی۔ تم نہ ہوتیں تو میں سعدی کا پاسپورٹ ہاشم تک نہ پہنچا سکتا اور پھر، مجھے اس کے لاکر سے اس کے قیمتی کاروباری کاغذ کون لا کر دے سکتا تھا بھلا۔"

"میں نے یہ سب صرف پیسوں کے لیے کیا ہے فارس! میری کے ہوتے ہوئے میں یہاں راج نہیں کر سکتی تھی، میں نے جان لیا تھا اور اب....." اس نے لفافہ اٹھا کر دکھایا۔ "میں اپنے ملک واپس جا رہی ہوں اور وہ کیا کہا تھا تم نے، کیا ہے میرے نام کا مطلب؟"

"فینوتا..... یعنی گوری، خوب صورت لڑکی۔" وہ مسکرا کے بولا۔

"ہاں..... اب میں اپنے نام کی طرح خوب صورت زندگی گزاروں گی اور میں کوشش کروں گی کہ مسز کاردار کی طرح نہ بن جاؤں۔"

"پیسہ ختم ہو جاتا ہے فینوتا! اچھے کام باقی رہتے ہیں۔" پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ "میں چلتا ہوں، زمر نے نئے گھر میں سب کو ڈنر پہ مدعو کر رکھا ہے اور میں لیٹ نہیں ہونا چاہتا۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ بون وو ایج۔" مسکرا کے ہاتھ اٹھا کر الوداع کہتا وہ مڑ گیا۔ پھر اسی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے دور جاتا گیا۔ وہ مسکرا کے اسے دیکھے گئی۔ بالآخر وہ اب اس

اونچے محل اور اس کی سازشوں سے آزاد ہونے جارہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اور تفتیشی کمرے میں بیٹھا ہاشم جیسے کسی خواب سے جاگا تھا۔ ایک دم چونک کر اس شخص کو دیکھنے لگا۔

"انہوں نے مجھے میرا خاموشی کا حق استعمال نہیں کرنے دیا۔ میں مجرم تھا' سعدی کے اغوا کا' مگر انہوں نے مجھے نامزد نہیں کیا' کیونکہ جس لمحے میں ملزم بنتا' میں خاموش ہوجاتا۔" وہ خواب کی سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ "میں اپنا وکیل کرلیتا۔ مگر وہ چاہتے تھے... کہ میں بولتا رہوں۔" گویا کرنٹ کھا کر اسے دیکھا۔ "وہ تم نہیں تھے۔ تم نے مجھے سعدی کا پاسپورٹ نہیں دیا تھا۔ وہ گمنام میسجز کرنے والے... وہ تم نہیں تھے... وہ... وہ فارس تھا۔ ڈیم اٹ۔ اس نے مجھے سیٹ اپ کیا ہے۔" اس نے بے بسی بھرے غصے سے میز پہ ہاتھ مارا۔

"تم نے کورٹ میں سارے صحیح ٹھکانے بتائے' تم سارے خفیہ کوڈز بھی جانتے تھے۔" "میں صرف اپنے بھائی کو بچانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں کسی کوڈز کے بارے میں نہیں جانتا۔ اوہ ڈیم اٹ!" اس نے پیشانی انگلیوں سے دبائی۔ سر پہ جھولتا تیز بلب... اردگرد کا اندھیرا... اس کا سر پھٹنے کو تھا۔

"تم نے دہشت گردوں کے بارے میں جو باتیں کہیں' وہ سچ تھیں' مگر ہم جانتے ہیں کہ سعدی اس وقت سری لنکا میں تمہاری قید میں تھا۔ سارا ملک جانتا ہے' تو پھر وہ معلومات تمہیں کون دیتا رہا۔" وہ بے تاثر انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"وہ... وہ... سب جھوٹ تھا۔ سعدی دہشت گرد نہیں ہے۔ وہ تو میں اس کو پھنسانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ نہیں' نہیں میری بات سنو' یہ سب غازی نے کیا ہے۔ اس نے مجھے پھنسایا ہے۔"

"وارث غازی کے لیپ ٹاپ کی فائلز کی فائلز بھی مل گئی ہیں اور ایک میموری کارڈ اور بھی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا فرنٹ مین کرنل خاور ایک اعلا فوجی افسر اور اس کے خاندان کی ہلاکت میں ملوث تھا۔ جانتے ہو' یہ کتنے سنگین جرائم ہیں؟"

مگر ہاشم پیشانی پکڑے نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ "اس نے مجھے ٹریپ کیا ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ لائٹ بند کرو۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔" وہ آخر چلایا تھا۔ سارے جسم پہ پسینہ آرہا تھا اور دماغ درد سے پھٹنے کو تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بنگلہ چھوٹا سا' خوب صورت سا تھا اور اس کے لان میں ایک اونچا سا بائل پام کا درخت لگا تھا۔ فارس نے کار روکی' مسکراتے ہوئے میرون مفلر اتارا اور تہہ کرکے ڈیش بورڈ کے اندر رکھ دیا۔ یہ اس نے وارث کے اس سوئٹر سے کاٹ کر بنایا تھا جو جیل میں اٹل اور سارہ اس کے لیے لائی تھیں۔ اس کا اون اسے وارث کی یاد دلاتا تھا اور اتنے مہینوں سے ہاشم کے خلاف شطرنج کی ایک ایک چال چلتے ہوئے یہ پہن کر اسے لگتا تھا' وہ اس قرض کو اتار رہا ہے۔ جو وارث اس کے اوپر چھوڑ گیا تھا۔ آج سارے قرض اتر گئے تھے۔ سارے حساب پورے ہوگئے تھے۔

گھر کے اندر جابجا پیک شدہ کارٹن رکھے تھے۔ ندرت اور حنہ سارا دن کام کرواتی رہی تھیں اور اب کھانا کھایا جانا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل تک آیا تو زمر کھانا لگا چکی تھی اور سب نشستیں سنبھالے بیٹھے تھے۔

"اتنی دیر لگادی۔" زمر نے آنکھوں میں خفگی لیے گھورا۔

"نوکری کی تلاش میں نکلا تھا' دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔" وہ خوش گوار انداز میں کہتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ ندرت نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"اتنا مسکرا کیوں رہے ہو؟" (فارس نے فوراً منہ سیدھا کیا۔)

"نہیں تو..." اور سنجیدہ شکل بنائے پلیٹ میں کھانا نکالنے لگا۔ زمر نے ایک گہری نظر ڈالی' پھر میز کو دیکھتے

لگی۔ سب کھانا شروع کر چکے تھے۔ اسے خیال آیا کہ پانی نہیں رکھا۔

"میں پانی لاتی ہوں۔" وہ اٹھی اور پانی لا کر رکھا۔ پھر دیکھا ٹشو ندارد۔ دوبارہ گئی اور ٹشو کا ڈبا لا کر میز پہ سجایا۔ پھر کسی اور کام سے اٹھی۔

"بیٹھ جاؤ زمر!" ندرت نے ٹوکا تھا۔ "گھر کی مالکن کا کام کھانے کے دوران میز سے بار بار اٹھنا نہیں ہوتا۔ اس کا کام ہے کھانا بنانا اور کھانا لگانا۔ چاہے مہمان ہوں' گھر والے یا سسرال والے' اگر تم کھانے کے دوران بار بار اٹھ کر تازہ پھلکے لا کر دوگی یا ان کے نخرے اٹھاؤ گی تو تمہاری آہستہ آہستہ ڈائننگ ٹیبل سے جگہ ہی ختم ہو جائے گی۔ ان کو تمہارے بغیر کھانے کی اور تمہیں اٹھانے کی عادت پڑ جائے گی۔ عادتیں عورتیں خود بگاڑتی ہیں اور پھر جب سسرال والے سر پہ چڑھ کر ناچنے لگتے ہیں تو شکایت کرتی ہیں۔ نئے گھر' نئی زندگی میں سیٹل ہونے کے بعد لڑکیوں کو بہت اچھا بننے اور جی حضوری کر کے بڑھ چڑھ کر خدمت کرنے کے بجائے صرف اتنا کام کرنا چاہیے جتنا وہ اپنے گھر میں کرتی تھیں' کیونکہ وہ اتنی ہی ذمہ داری آگے بھی نبھا سکتی ہیں۔ ذمہ داری اتنی لو' جتنی نبھا سکتی ہو۔"

زمر آہستہ سے واپس بیٹھ گئی۔

"بس کر دیں امی! آپ پہ یہ مخلصانہ مشورے سوٹ نہیں کر رہے۔" حنین نے بے زاری سے لقمہ دیا اور ندرت نے صرف گھورا۔ (پرایا گھر دیکھ کر جوتے تک ہاتھ لے جانے سے خود کو روکے رکھا۔)

کھانا خوش گوار ماحول میں کھایا گیا۔ سارے دورانیے میں فارس کے لبوں پہ مسکراہٹ رینگتی رہی۔ ساری اداکاری ایک طرف' وہ اس مسکراہٹ کو نہیں چھپا پا رہا تھا۔

کھانے کے بعد سیم ٹی وی لاؤنج میں زمر فارس کا ٹی وی دیکھنے چلا گیا۔ بڑے دن سے گھر سے وہ شیطان کا ڈبا غائب تھا' تو یہاں ٹی وی دیکھنے میں مزا آ رہا تھا۔ ابا کو بھی ساتھ لے گیا۔ ندرت نماز پڑھنے کمرے میں چلی گئیں۔ اور وہ چاروں میز پہ بیٹھے رہ گئے۔ سوئٹ ڈش کھائی جا چکی تھی اور وہ یونہی بیٹھے تھے۔

"آج میں نوشیرواں سے ملا۔" سعدی نے خالی کپ میں چمچہ ہلاتے سر اٹھا کر کہا۔ ساتھ بیٹھی حنین نے جہاں چونک کے دیکھا' وہیں سامنے بیٹھے زمر اور فارس بھی حیران ہوئے۔

"فکر نہ کریں۔ وہ بس معافی مانگ رہا تھا۔ وہ امریکہ جا رہا تھا۔ جاب مل گئی ہے اسے اُدھر۔"

"تم نے کیا کہا۔"

"میں اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ سوری' مگر میں خود کو مجبور نہیں کر سکتا۔ اللہ قرآن میں کہتا ہے' وارثوں کو خون معاف کرنے کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تو پھر میرا اپنا خون تھا۔" اس نے سادگی سے شانے اچکائے' سب خاموش ہو گئے۔

"اگر عدالت اس کو سزا دے دیتی' تب تم معاف کر دیتے اسے؟" زمر نے نرمی سے پوچھا۔ سب غور سے سعدی کو دیکھ رہے تھے۔

"جی... میں تیار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ عدالت میرے حق میں فیصلہ دے گی۔ لیکن شاید ہمارا کیس کمزور تھا۔" پھر شکوہ کناں نظروں سے زمر کو دیکھا۔ "میں آپ کو کہتا رہا کہ کیس ہاشم کے خلاف ہونا چاہیے۔ مگر آپ لوگوں نے میری بات نہیں مانی۔"

"میں نے تو صرف مشورہ دیا تھا۔" فارس نے کان کھجاتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"اگر ہمارے پاس وہ فائلز ہوتیں' حنہ کا میموری کارڈ ہوتا' یا ہاشم کو میرا پاسپورٹ نہ ملتا تو ہمارا کیس کمزور نہ ہوتا۔" وہ افسوس کر رہا تھا۔ حنین اور فارس نے ایک دوسرے کو دیکھا اور زمر نے باری باری ان دونوں کو' پھر سعدی کو مخاطب کر کے بولی۔

"ویسے سعدی... غلطی تمہاری ہے۔ پاکستان آ رہے تھے تو کسی کو اپنی فلائٹ کا علم نہ ہونے دیتے۔ اس کو معلوم تھا' تمہاری فلائٹ کا' اسی لیے تو اس نے تمہارا پاسپورٹ چرا لیا۔"

"کسی کو بھی میری فلائٹ کا علم نہیں تھا زمر۔" وہ

تنگ کر بولا۔ "کسی کو نہیں معلوم تھا کہ میں آرہا ہوں' سوائے...." اور وہ بولتے بولتے رک گیا۔ چونک کے فارس کو دیکھا۔ "آپ کو معلوم تھا' صرف آپ کو...."

حنین نے گڑبڑا کے اور زمر نے بڑے مزے سے مسکرا کے اسے دیکھا۔ فارس شدید غیر آرام دہ ہوا' کرسی پہ پہلو بدلا۔

"ہاں تو....؟"

"اور سعدی.... شاید فارس نے ہی تم سے کہا تھا کہ تم افغانستان کے راستے آؤ' ہے نا؟" زمر محظوظ انداز میں مسکراہٹ دبائے بولی تھی۔ فارس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ (یہ جانتی تھی؟) مگر سعدی سُن بیٹھا تھا۔

"اور وہ فائلز.... اور میموری کارڈ.... وہ تو کسی چھوٹے' موٹے' سرخ مفلر والے آدمی نے چُرائے تھے' حنہ! وہ سب کیا تھا؟" وہ اس کی طرف گھوما۔

حنین تیزی سے کھڑی ہوئی۔ "میری نماز کا وقت ہو رہا ہے۔" سعدی نے ہاتھ سے کھینچ کر اسے واپس بٹھایا۔ وہ شرمندگی سے آنکھیں میچ کر بیٹھی۔ "میرے پاس آرٹیکل تیرہ کے تحت خاموش رہنے کا حق ہے۔"

"تم نہ بتاؤ' حنین! میں بتاتی ہوں۔" زمر یوسف ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھے' دلچسپی سے مسکراتے ہوئے بول رہی تھی۔ "جب گواہ جھوٹ بولتے ہیں' عدالت اور پولیس کے سامنے انہیں کسی شخص کو بچانا ہوتا ہے.... تو اس کا حلیہ الٹ بتاتے ہیں کہ جی موقع سے فرار ہونے والا ملزم چھوٹا' موٹا تھا' جبکہ وہ...." دائیں طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "کافی اسمارٹ اور قد آور سا تھا۔"

"بہت شکریہ۔" وہ جل کر بڑبڑایا۔ "چڑیل نہ ہو تو۔"

"آپ نے چرائے تھے وہ سب حنین کے کمرے سے؟" سعدی دنگ رہ گیا تھا۔

"کسی نے کچھ نہیں چرایا سعدی ڈیر۔ میرے شوہر اور تمہاری بہن نے ہم سے جھوٹ بولا۔ فارس نے گھر سے جاتے وقت حنین سے وہ چیزیں لیں اور اس کو کہا کہ کہے وہ کھو گئی ہیں۔ حنین اوپر گئی' کھڑکی کھولی اور چیخ ماری۔ ہم لوگ اوپر گئے تو اس نے ہمیں لمبی سی کہانی سنا دی جو مجھے اسی وقت سمجھ میں آگئی تھی' کیونکہ ایک ننھا سا میموری کارڈ اگر مبینہ چور نے پکڑ بھی رکھا ہو تو وہ اتنی دور سے حنہ کو کیسے نظر آسکتا ہے؟ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وارث غازی کی فائلز بھی حنین کھول چکی تھی' لیکن ہم سے اس نے کہا کہ اس میں فروزن کے سوا کچھ نہیں ہے اور اصل فائلز کہیں اور منتقل کردیں۔"

"میں نے سچ کہا تھا۔" وہ تیزی سے بولی۔ "ماموں نے مجھ سے پہلے وہ ادھر سے ڈیلیٹ کرکے اپنے پاس منتقل کرلی تھیں اور باقی ساری باتوں پہ آرٹیکل تیرہ کے تحت مجھے خاموش رہنے کا حق ہے۔"

"واؤ!" سعدی نے غصے سے فارس کو دیکھا جو گردن موڑ کے دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ بُرے بُرے منہ بھی بنا رہا تھا۔

"آپ میرا کیس کمزور کرتے رہے۔" فارس نے تنک کے اسے دیکھا۔

"ان سب کے باوجود بھی کیس ثابت نہ ہوپاتا سعدی۔ میں نے صرف ان چیزوں کا اچھا مصرف ڈھونڈا۔ ان ثبوتوں کو عدالت میں داغ دار کرنے کے بجائے کیس کو نوشیرواں تک محدود رکھا' تاکہ ہاشم خاموشی کا حق استعمال نہ کرے اور بولتا رہے۔ وہ جیتنا چاہتا تھا' ہر قیمت پہ.... میں نے اسے جیتنے دیا۔"

"آپ نے اسے کہا کہ وہ مجھے دہشت گرد ثابت کرے!" اس نے میز پہ زور سے ہاتھ مارا۔

"حالانکہ اصل دہشت گرد کوئی اور ہے۔" (خفگی سے زمر کو گھورا' جس نے مسکرا کے شانے اچکا دیے۔) پھر بات جاری رکھی۔ "تم کچھ بھی ثابت نہ کرپاتے' مگر وہ جینوئن انفارمیشن استعمال کرکے خود کو پھنسا لیتا۔ میں نے صرف ایک ______ ڈیل کی کہ وہ آکر خود دیکھ لیں ہاشم کیا کہتا ہے اور...."

"وہ چشمے والا آدمی.... وہ آپ نے بلایا' مگر آپ تو اس کو جانتے تک نہیں تھے۔" سعدی نے طنزیہ کہا

تھا۔ فارس نے بے بسی سے ایک انگلی سے ٹھوڑی کھجائی۔

"مجھے کیا معلوم تھا' وہ کس کو بھیجتے ہیں۔ شروع میں تو میں نہیں پہچانتا تھا اسے' مگر اس کے فنگر پرنٹ سے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کون ہے۔"

"مگر ہمارے سامنے آپ اداکاری کرتے رہے کہ آپ اس کو نہیں جانتے۔"

"نوازش!"

"اور جب احمر کو شک ہوا کہ کوئی قریب کا بندہ انوالوڈ ہے تو آپ نے میرا شک حسینہ پہ ڈلوانا چاہا۔"

"بے چاری حسینہ!" زمر نے چیخ کی آواز نکالی۔

"تو کیا اپنے اوپر ڈلواتا؟ پھر تم لوگ' قانون کی سر بلندی کی چلتی پھرتی مثالیں مجھے کہاں کچھ کرنے دیتے؟" وہ خفا خفا لگ رہا تھا۔

"اور کون کون انوالوڈ تھا آپ کے ساتھ؟" سعدی زیادہ خفا تھا۔ فارس اب کوئی فرار نہیں اختیار کر سکتا تھا۔

"ہاشم کی ملازمہ فینونا... وہ چھوٹے موٹے کام کر دیتی تھی۔ میرا جیل کا دوست جلال الدین۔ اس کی مدد سے میں ہاشم کو کچھ کوڈز بھیجتا تھا جن کو وہ نئے کاروباری مواقع کے لالچ میں ٹوئٹ کر دیتا تھا۔"

"تھا؟" سعدی نے ابرو اٹھائی۔ پہلی دفعہ فارس کھل کر مسکرایا۔

"ہاں... تھا... کیونکہ آج اسے کچھ لوگ اٹھا کر لے گئے ہیں اور وہ اب دوبارہ سورج کی روشنی نہیں دیکھ سکے گا۔"

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔" زمر محظوظ ہوئی تھی۔ "تم اتنے مسکرا جو رہے تھے۔ نوکری ڈھونڈنے کے بہانے۔"

"محترمہ! میری نوکری بہت پہلے بحال ہو چکی ہے۔ کیس کے دوران ہی جب ہاشم کا اصل کردار سامنے آیا تب۔" زمر کے چہرے پہ خوش گوار مسکراہٹ اٹڈ آئی۔

"مطلب اب تم بے روزگار نہیں رہے۔"

"جی ہاں! اب میں بے روزگار نہیں رہا۔" وہ طنزیہ مسکرا کے بولا۔

سعدی نے اسی خفگی سے میز بجائی۔ "اپنے مسئلے بعد میں سلجھایئے گا۔ پہلے میرے سوالوں کے جواب دیں۔"

"سب کچھ تو بتا چکا ہوں۔ اور کیا رہ گیا ہے؟" وہ اکتا گیا۔

"ماموں! آپ نے ہمیں ایک بات کبھی نہیں بتائی۔" حنین فوراً" چہکی۔ سعدی نے خفگی سے اس کے سر پہ چپت لگائی۔ اس نے ناراضی سے بھائی کو دیکھا۔

"کیا بھائی! اگر آپ دونوں پہ ماموں نے اعتبار نہیں کیا اور مجھ پہ کیا تو پلیز جیلس نہ ہوں' اچھا۔" اور سنجیدگی سے فارس کی طرف گھومی۔

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ سعدی بھائی کو نوشیرواں نے گولی ماری ہے اور یہ کہ وہ ہاشم کی قید میں ہے۔"

اب وہ تینوں اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ ڈائننگ ہال پہ سناٹا طاری ہو گیا اور وہ شدید غیر آرام دہ محسوس کرنے لگا تھا۔

"میں ہر بات بتانے کا پابند نہیں ہوں۔" وہ تینوں خاموشی سے اسے گھورتے رہے۔ فارس نے تھک کر گہری سانس لی۔

"وہ نیکلس!" اس نے باری باری تینوں کو دیکھا۔ "جب سعدی غائب ہوا تھا میں نے اس کے کمرے کی تلاشی لی۔ پولیس' زمر' سب اس لیے تلاشی لے رہے تھے کہ کوئی کام کی چیز مل جائے۔ میں اس لیے تلاشی لے رہا تھا کہ اور کیا کیا نہیں موجود۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ نیکلس غائب ہے۔ جو اس روز ہاشم نے سعدی کی جیب میں پلانٹ کروایا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ صبح وہ ہاشم کے آفس ہی گیا ہو گا۔ نیکلس واپس کرنے۔ زمر اور حنین کسی حلیمہ کا نام لے رہے تھے۔ میں نے پتا کیا اور معلوم ہوا کہ ہاشم کی سیکرٹری کا نام حلیمہ ہے۔ کچھ عرصے بعد میں نے فینونا کو چند پیسے اوپر دے کر خرید

لیا۔ اب سارا معاملہ واضح تھا کہ یہ کاروارز کا کام ہے۔"
پھر رک کر خفگی سے زمر کو دیکھا۔ "اور آپ کب سے میری سرگرمیوں سے واقف تھیں؟"
"آخری اطلاعات تک میں آپ کی بیوی ہوں اور جس مفلر کو آپ کار کے ڈیش بورڈ میں چھپا کر رکھتے ہیں' وہ کار میں کئی دفعہ ڈرائیو کرنے کا شرف حاصل کر چکی ہوں۔"
"استغفر اللہ.... کسی شریف انسان کی ذاتی چیزوں کی تلاشی لینا انتہائی غیر اخلاقی حرکت ہے۔"
"نہیں' میں نے سوچا' شاید آپ کی کسی پرانی کلاس فیلو کی کوئی باقیات مل جائیں ادھر سے....."
"یار! آپ دونوں لڑ بعد میں لینا' پہلے مجھے حساب دیں۔ مجھے اتنے مہینے اندھیرے میں کیوں رکھا آپ نے۔"
سعدی جھنجلا کر کہہ رہا تھا' مگر میز کی دوسری طرف بیٹھے زمر اور فارس' ایک دوسرے کی طرف رخ موڑے' شروع ہو چکے تھے۔ اس نے بے بسی سے حنین کو دیکھا۔ جو فوراً" گڑبڑا کے کھڑی ہوئی' دونوں ہاتھ اٹھائے۔ "آرٹیکل تیرہ!" کہا اور اندر بھاگ گئی۔
کمرے میں آکر اس نے ندرت کو مخاطب کر کے پوچھا۔ "ویسے امی! یہ حسینہ نے اتنا قیمتی موبائل لیا کیسے؟"
امی نے نماز سے ابھی ابھی سلام پھیرا تھا۔ اس کو دیکھ کر کہنے لگیں۔
"اس نے یا تو اپنا زیور بیچا ہے یا اپنے ماں' باپ سے پیسے لے کر لیا ہے۔ اس لیے اس سوال پہ پھیکی پڑ جاتی ہے۔"
"تو اس کی کیا ضرورت تھی۔"
"کیونکہ تم لوگ اپنے موبائل' ٹیبلٹ اور لیپ ٹاپ جب اس کے سامنے استعمال کر رہے ہوتے ہو تو کیا اس کا دل نہیں چاہتا ہو گا؟ ہم لوگوں کو احساس ہی نہیں ہوتا حنین کہ ہم قیمتی شاپنگ اور بھرے فریج سے اپنے ملازموں کو کتنے احساس کمتری میں مبتلا

کر دیتے ہیں۔" اور وہ سر جھٹک کر نوافل کی نیت باندھنے لگیں۔ حنین گہری سانس لے کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

اٹھے گا انا الحق کا نعرہ

آئس کریم پارلر میں بجتی موسیقی کسٹمرز کے شور میں دب سی گئی تھی۔ ہر میز پہ رش لگا تھا۔ ایسے میں بمشکل حنین نے دو افراد کی ایک میز قابو کی' اپنا بیگ ادھر رکھا اور پھر ساتھ کھڑی زمر کو مسکرا کے دیکھا۔
"میں ہماری جگہ رکھتی ہوں جب تک کہ آپ آئس کریم لے آئیں۔" پھر ذرا جتا کر بولی۔ "ظاہر ہے' اتنے عرصے بعد جو آپ نے میرے لیے وقت نکالا ہے تو آرڈر بھی لائیں گی۔"
وہ مسکرا کے اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ وہ بالوں کو فرنچ چوٹی میں باندھے ہوئے تھی اور ماتھے پہ گرتے بال تازہ کٹے لگ رہے تھے۔
"شیور....." زمر جو سامنے' سینے پہ بازو لپیٹے اور بالوں پہ سن گلاسز لگائے کھڑی تھی' مسکرا کے کندھے اچکا کر بولی۔ "تمہارے لیے کون سا فلیور لاؤں؟" آج واقعی عرصے بعد وہ دونوں سارے جھمیلوں سے آزاد ہو کر فرصت سے مل بیٹھی تھیں۔
"جو اپنے لیے لیں' اس کے بالکل الٹ۔" وہ ہتھیلیوں پہ ٹھوڑی گرائے بیٹھی' مزے سے بولی تھی۔ زمر سر ہلا کے آگے بڑھ گئی۔ پھر جب واپس آئی تو ہاتھ میں دو کپس تھے۔
"دیکھ لو۔ اندر سے دونوں آئس کریمز ایک جیسی ہیں' مگر اوپر سے ایک دوسرے کے بالکل الٹ ہیں۔" حنہ ہنس دی اور کندھے اچکا کر اپنا کپ کھسکا لیا۔ وہ بھی اب سامنے بیٹھ چکی تھی۔ ارد گرد شور اور رش ویسا ہی موجود تھا' مگر وہ دونوں چونکہ فراغت سے ایک دوسرے کی طرف متوجہ تھیں تو دھیرے دھیرے اطراف سے دھیان ہٹتا گیا' یہاں تک کہ ان کو لگا وہ تنہا بیٹھی ہیں۔
"تو زمر یوسف..... کیسا جا رہا ہے آپ کا نیا گھر؟"

حنین چمچے سے پھل کے ٹکڑوں کو آئس کریم میں مکس کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"مجھے لگتا تھا سعدی کا کیس ختم ہو گا تو مجھے بہت وقت مل جائے گا' میں فارغ ہوں گی' مگر ورکنگ ویمن کے لیے فراغت ایک خیالی پلاؤ ہے یا شاید مصروفیت کی عادت پڑ جاتی ہے' تم سناؤ۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ ارے ہاں' میں ہوم ڈیکور اور ہوم امپروومنٹ پہ ایک کتاب لکھ رہی ہوں۔ کیا میں نے آپ کو بتایا؟"

"غالباً" تم مجھے پچھلے دو ہفتوں میں دو سو دفعہ بتا ہی چکی ہو۔"

حنہ نے برا منہ بنا کر اسے دیکھا۔ "روز تو ملتے ہیں ہم' اب سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ "اور سناؤ" کا جواب کیا دے انسان۔"

"تمہیں یاد ہے حنین... میں اور تم... انیکسی کے تہہ خانے میں زمین پہ بیٹھ کر... رات کے اندھیرے میں... ایک دوسرے سے سچ بولا کرتے تھے؟" زمر آئس کریم کھاتے ہوئے مسکرا کے یاد کر رہی تھی۔

حنہ کی آنکھیں چمکیں۔

"چلیں' آج پھر ایک دوسرے سے سچ بولتے ہیں۔ پہلے آپ کی باری۔"

"ہوں!" وہ منہ میں کریم سے بھرا چمچہ رکھ کر نگاہیں اوپر کیے سوچنے لگی۔ پھر حنہ کو دیکھا اور مسکرائی۔ "جب تم چھوٹی تھیں تو میں اکثر تمہارے گھر میں چابیاں بھول جاتی تھی' جان کر۔"

"اور مجھے کئی سال بعد مگر سمجھ میں آگیا تھا کہ آپ وہ جان کر بھولتی ہیں اور میں کھڑکی سے آپ کو دیکھا کرتی تھی۔" حنہ خفیف سا ہنس دی۔ "مجھے یقین تھا کہ آپ پلٹ آنے والوں میں سے ہیں۔"

"اور تم بھی!" چند لمحے کے لیے دونوں کے درمیان آزردہ سی خاموشی چھا گئی۔

پھر حنہ نے اداسی دور کرنے کے لیے مسکرا کے سر جھٹکا۔ "اب سب ٹھیک ہے۔ اب ہم نے اداس نہیں ہونا' چلیں' اب پھر سے آپ کی باری۔"

"مجھے تو اور کچھ یاد نہیں آرہا۔" زمر نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔

"اچھا ایک بات بتائیں۔" وہ درمیان میں چمچہ کو منہ میں اندر رکھنے کو رکی' اسے منہ میں گھولا' پھر بولی۔ "آبدار کے بعد... کیا آپ پرسکون ہیں؟ میرا مطلب ہے' آپ کو فارس ماموں کی طرف سے' بھلے آپ کو چڑانے اور جلانے کے لیے ہی سہی' دوسری عورت والا دھڑکا تو نہیں لگا رہتا۔"

"ہرگز نہیں..." زمر نے فخر سے گردن کڑائی۔ "مجھے یقین ہے کہ آئندہ وہ مجھے تنگ کرنے کے لیے بھی کسی دوسری عورت کا نام نہیں لے گا۔"

چند ثانیے دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر حنہ نے زبان کھولی۔ "یہ سچ نہیں تھا۔"

"بالکل... یہ سچ نہیں تھا۔" زمر نے گہری سانس لی اور وہ دونوں ہنس پڑیں۔

"ویسے تم خوش ہو؟ میرے اور فارس کے جانے سے؟"

"اوں..." حنہ نے ابرو اچکا کے بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھا۔ "میں اب کافی میچور ہو گئی ہوں۔ آپ سعدی بھائی کو زیادہ توجہ دیں یا فارس ماموں کو' میں اب بالکل بھی جیلس نہیں ہوتی۔"

"اوکے" مگر یہ جھوٹ تھا۔"

"آف کورس۔ یہ جھوٹ تھا۔" حنہ جھرجھری سی لے کر اپنے کپ پہ جھک گئی اور جلدی جلدی کھانے لگ گئی۔

"سنو حنہ... ہمیں یہ سب..." آئس کریم کے کپس کی طرف اشارہ کیا۔ زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیے۔" تاکہ ہم ایک دوسرے سے سچ بولنا سیکھ لیں۔"

"کیا یہ سچ ہے؟" حنہ نے اس کو دیکھ کر پلکیں جھپکائیں تو وہ ہنس پڑی اور اپنے کپ میں چمچہ گھمانے لگی۔ موسیقی اب بھی انسانوں کے شور اور قہقہوں کے اندر دبی ہوئی تھی اور آئس کریم پارلر میں رش

بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

٭ ٭ ٭

جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

فوڈلی ایور آفٹر میں اس دوپہر نوجوانوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ چند میزوں پہ ایک طرف انہوں نے قبضہ کر رکھا تھا اور وہ پُرجوش انداز میں ایک دوسرے سے باتوں میں مگن تھے۔ بار بار گھڑی بھی دیکھتے، موبائل بھی چیک کرتے۔ جیسے انتظار میں تھے۔

بالائی منزل کے ہال میں سارا سامان سمیٹا جا چکا تھا، بس ایک میز پہ کچھ باکس رکھے تھے جن میں سے فارس کھڑا جھک کر کچھ کاغذات الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ اس نے سیاہ پینٹ پہ سفید ڈریس شرٹ اور سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا، بال بھی پہلے کی طرح چھوٹے تھے، مگر چہرے سے ساری کلفت، بے زاری اور اکتاہٹ دور ہو چکی تھی۔ اس پہ ہمہ وقت ٹھنڈے اور خوش گوار تاثرات رہا کرتے تھے۔

دروازہ دھاڑ سے کھلا اور سعدی اندر داخل ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اپنا کام کرتا رہا۔ سعدی اس کے سر پہ آ کھڑا ہوا اور برہمی سے اسے گھورا۔ "ان لوگوں کو کس نے بلایا ہے؟"

"ہر غلط کام میں میرا ہاتھ نہیں ہوتا سعدی یوسف۔" وہ مصروف انداز میں چند کاغذ ایک فائل میں لگا رہا تھا۔

"یہ مختلف شہروں سے آئے "سیو سعدی یوسف" پیج کے ایکٹو ممبرز ہیں ماموں۔ میں ان سے نہیں ملنا چاہتا تھا۔ میں شرمندہ تھا۔"

"میں نے نہیں بلایا ان کو۔ تمہاری امی کا ہاتھ ہو گا اس میں۔ میں اپنے کام سے آیا ہوں ادھر۔" وہ سادگی سے اسے دیکھ کر بولا تو سعدی نے خفگی سے سر جھٹکا۔

"اب میں ان سے جا کر کیا بات کروں؟ کیسے ان کو تسلی دوں کہ اس ملک میں قاتل بچ جاتے ہیں، مگر پھر بھی اس کا مستقبل روشن ہے؟"

"یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ مجھے الزام نہ دینا۔"

"ٹھیک ہے، میں مانتا ہوں کہ ہم وہ ثبوت استعمال کر لیتے، تب بھی نوشیرواں نہ پکڑا جاتا۔ لیکن، ہاشم ... ہم اس کو سزا دلوا سکتے تھے۔ عدالت کے ذریعے... تاکہ ایک مثال قائم ہوتی۔ یوں بیک ڈور سے...."

"واٹ ایور...." وہ اپنے بیگ میں چند فائلز ڈال کے سیدھا ہوا، بیگ اٹھایا اور اسی سادگی سے اسے دیکھا۔ "اب وہ تمہارے مہمان ہیں۔ تم ان کے پاس جا کر ایک اچھی سی تقریر کرو۔ مجھے کام ہے۔ میں جا رہا ہوں۔" اس کے کندھے کو دبایا اور آگے بڑھ گیا۔

سعدی یوسف جس وقت ریسٹورنٹ کے لاؤنج میں داخل ہوا، سب اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سیاہ شرٹ، نیلی جینز کے اوپر پہنے ہوئے تھا اور سنجیدہ مگر متذبذب نظر آ رہا تھا۔ کسی نے سیلفی بنائی، کسی نے کلک کلک کر کے تصاویر اتاریں۔ وہ جبراً" مسکرا کے سب کو ہاتھ ہلاتا ایک مرکزی میز تک آیا اور کرسی کھینچی۔ سب اس کے ساتھ ہی بیٹھے۔ خاموشی سی چھا گئی تھی۔ سعدی کی نظریں نیپکین اور گلاس پہ جمی تھیں۔ وہ اس سے تسلی لینے آئے تھے، اس سے جواب مانگنے آئے تھے، انہیں کن الفاظ میں اچھی امید تھمائے؟

"آپ لوگوں کا شکریہ کہ آپ یہاں آئے۔" کھنکھار کے اس نے کہنا شروع کیا۔ نظریں اب بھی جھکی تھیں۔ وہ کتنا اچھا مقرر تھا، بہترین بولتا تھا، مگر آج سارے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ وہ کیسے لوگوں کو بتائے کہ حق کے لیے اتنے مہینے لڑنے کا کوئی فائدہ تھا؟ وہ خود اس سوال کا جواب نہیں جانتا تھا۔ وہ کیسے ـــــ اپنی اتنے مہینوں کی خواری کو جسٹی فائی کرے گا۔

"میں.... دراصل میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ سے کیا کہوں۔" اس نے بدقت نظریں اٹھائیں۔ میزیں باہم جوڑ کر وہ لوگ ان کے گرد بیٹھے، اس پہ نظریں جمائے ہوئے تھے۔ سعدی یوسف کو گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

"ہم نے کئی مہینے کورٹ میں لڑائی لڑی' مگر آخر میں۔۔۔"

"میں ایک اسکول ٹیچر ہوں سر!" دائیں قطار میں بیٹھی اسکارف والی لڑکی ایک دم بولنے لگی۔ وہ رک کے اسے دیکھنے لگا۔ سب بھی اس کو دیکھنے لگے۔ وہ سانولی سی تھی' اور اس کی آنکھیں بہت سنجیدہ تھیں۔ "اور میں بنا کسی شرمندگی کے آپ لوگوں کو یہ بتا سکتی ہوں کہ میرے اسکول کا ایک کلرک پچھلے پانچ سال سے مجھ سمیت کئی ٹیچرز کو اپنی پرائیویٹ پراپرٹی سمجھتا تھا۔ اس کا جب دل چاہتا وہ کسی کو بھی ہراساں کر سکتا تھا' مگر اسے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔" شدت جذبات سے بولتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ پڑنے لگا۔ "لیکن جس دن میں نے آپ کو دیکھا۔۔۔ وہ انٹرویو دیتے ہوئے۔۔۔ وہ قانونی جنگ لڑتے ہوئے۔۔۔ روز عدالت میں سر بہادری سے اٹھا کر چل کے جاتے ہوئے۔۔۔ تب میں نے جانا تھا کہ اپنے حق کے لیے اور ظلم کے خلاف کیسے لڑا جاتا ہے۔ اس دن سر' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے ٹیچرز کو اکٹھا کیا اور ہم نے اس کلرک کو دن کی روشنی میں سب کے سامنے بے عزت کیا' اس کی شکایت کی' اس کو۔۔۔"

"یو نو۔۔۔ مجھے یونیورسٹی میں دو لڑکے Bully (دھونس جمانا) کرتے تھے۔" اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ایک دوسرا لڑکا بول اٹھا۔ "اور میں اتنے مہینے سے ان کا Errards Boys (چھوٹو) بنا ہوا تھا۔ میں ان کے کام کرتا' ذاتی بھی اور نصابی بھی۔۔۔ میں ان سے ڈرتا تھا۔۔۔ میں ان سے ہراساں ہوتا تھا مگر جب نوشیرواں کا روار کے خلاف کھڑے ہوئے تھے ناسعدی بھائی' تب میں نے بھی اپنے خوف کا بت توڑا' میں نے انگلی اٹھا کر ان کو بھرے مجمعے میں کہا کہ آج کے بعد وہ مجھ پہ حکم چلا کر تو دیکھیں' میں انہیں کورٹ میں گھسیٹوں گا' میں ان کو۔۔۔" مگر ساتھ ہی ایک دوسرے نوجوان نے تیز تیز بولنا شروع کر دیا تھا۔

"میرے دوست کی بہن کو اس کا کالج ٹیچر بلیک میل کر رہا تھا' اور یقین کریں سعدی' اگر آپ کو میں نے وہ انٹرویو دیتے نہ دیکھا ہوتا۔۔۔ اگر آپ کی بہن کی گواہی نہ سنی ہوتی' تو میں کبھی اپنے دوست کو نہ سمجھا سکتا کہ اسے بلیک میلر کا کیسے بہادری سے مقابلہ کرنا ہے' اسے کیسے اپنی عزت کی حفاظت۔۔۔"

"میرے والد انکم ٹیکس میں کام کرتے ہیں' ان کا باس ان کو ہر وقت۔۔۔"

"میں جب اسپتال میں تھی تو جانتے ہیں میری وارڈن نے کیا کیا؟"

"میں نے جب آپ کو ان امیر بدمعاشوں کے سامنے کھڑے ہوتے دیکھا تھا ناسعدی بھائی' تب میرے اندر ہمت آئی اور۔۔۔"

وہ دم بخود بیٹھا تھا۔۔۔ کبھی ٹکر ٹکر ایک ایک کی شکل دیکھتا' کبھی دوسرے کی طرف رخ پھیرتا۔۔۔ وہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ وہ ان کو ٹوک بھی نہیں پا رہا تھا۔ وہ اس سے تسلی سننے نہیں آئے تھے۔ وہ اس کو سنانے آئے تھے۔۔۔ داستانیں۔۔۔ کہانیاں۔۔۔ ہمت اور بہادری سے لڑی جانے والی جنگیں۔۔۔ اور وہ یک ٹک سن رہا تھا۔۔۔ پلک جھپکے بغیر۔۔۔ وہ ایک ایک کا چہرہ تک رہا تھا۔ وہ صرف ان کی بہادری کی' جدوجہد کی کہانی سن پاتا' مگر پھر دوسرا بول اٹھتا اور وہ جان ہی نہ پاتا کہ اس کلرک کو کیا سزا ملی' ہراساں کرنے والے دوستوں کا کیا بنا' بلیک میلر کالج ٹیچر کو نکالا گیا یا نہیں' انکم ٹیکس والے اور ہاسٹل کی وارڈن کی نوکری گئی یا نہیں۔۔۔ اور اس سے فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔۔۔ نہ انہیں اس بات سے فرق پڑتا تھا کہ نوشیرواں بچ گیا اور بھاگ گیا۔ وہاں سب کے لیے صرف جدوجہد اہم تھی۔ اپنے خوف کے بت توڑ دینا۔۔۔ آزاد ہو جانا۔۔۔ وہاں صرف مقتل میں اترنے کی دھج کا ذکر تھا' اس شان کا ذکر تھا۔ وہ شان جو ایک کی ہوتی ہے مگر کئی ہزاروں کو ہمت دے جاتی ہے۔ سب کو کچھ سکھا جاتی ہے۔

وہ اس سے تسلی لینے نہیں آئے تھے۔۔۔ وہ اس کو تسلی دینے بھی نہیں آئے تھے۔ وہ تو اپنی داستانیں سنانے آئے تھے۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا پھنس رہا تھا۔ وہ اسی طرح رونا چاہتا تھا جیسے فیصلے کے

دن رویا تھا۔۔۔ مگر آج وجہ وہ نہیں تھی۔ آج وجہ یہ تھی کہ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ فیصلے کی گھڑیاں شاید تب بیتی نہیں تھیں۔۔۔ فیصلہ تو اب ہوا تھا وہ ہارا نہیں تھا وہ جیت گیا تھا۔ اور جو جیتا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ تھا جو اس نے ہارا تھا۔ اس نے ڈبڈباتی آنکھوں سے ریستوران کی شیشے کی دیوار کو دیکھا۔ جہاں پارکنگ میں فارس اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔ اور اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ سعدی کو دیکھتے پا کر وہ مسکرایا' ایک آنکھ دبائی اور پھر اندر بیٹھ گیا۔

بہت سے آنسو اندر ہی اتار کے سعدی یوسف بڑبڑایا تھا۔

"دو نمبر آدمی!"

☆ ☆ ☆

چھ ماہ بعد

دسمبر 2016

پورا چاند آسمان پہ یوں جگمگا رہا تھا جیسے چاندی کا تھال ہو۔ وہ آج اتنا بڑا' اتنا قریب نظر آرہا تھا کہ لگتا' ابھی پگھلی ہوئی چاندی زمین پہ انڈیلنے لگے گا۔ اس کے گرد سرمئی بادل جمع ہو رہے تھے۔ ہلکے' ہر بوجھ سے آزاد بادل۔

نیچے دیکھو تو ہوٹل کے سبزہ زار میں نیلے سوئمنگ پول کے پانی میں چاند کا عکس تیر رہا تھا۔ ہچکولے کھا رہا تھا۔ پول کے ایک طرف دو آرام کرسیاں بچھی تھیں اور وہ دونوں ساتھ ساتھ ان پہ بیٹھے تھے۔ سردی اپنے جوبن پہ تھی اور اسی مناسبت سے فارس نے بھوری جیکٹ پہن رکھی تھی اور گردن اٹھائے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ ساتھ بیٹھی زمر سفید جیکٹ پہنے ہوئے تھی اور اس کا چہرہ بھی اوپر کی طرف اٹھا تھا۔

"تمہیں پورے چاند کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے' فارس غازی؟" وہ اس مسحور کن لمحے کے زیر اثر چاندی کے تھال کو تکتے بولی تھی۔ وہ اس کے منہ سے کوئی میٹھی سی بات سننا چاہتی تھی۔

"یہی کہ اگر نیل آرم اسٹرانگ نہ مرتا تو کم از کم ہمیں یہ تو بتا دیتا کہ انسان چاند پہ گیا بھی تھا یا وہ بھی صرف ایک امریکی ڈراما تھا؟"

سارا فسوں ٹوٹ گیا۔ زمر کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"تمہیں پتا ہے' تم نے کتنے عرصے سے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میں تمہیں کتنی اچھی لگتی ہوں اور۔۔۔"

"کس نے کہا تم مجھے اچھی لگتی ہو؟" (اونچی بڑبڑاہٹ)

"اور نہ ہی میری تعریف کی ہے۔"

"کس چیز کی تعریف کروں؟ ان بالوں کی جن کو تم ڈائی کرتی ہو' یا اس چہرے کی جس پہ ہر وقت غصہ دھرا رہتا ہے؟"

"ارے واہ۔ ایک زمانے میں تو سات سال تک قید میں ڈالنے کی باتیں کرتے تھے اور اب دیکھو۔۔۔ کتنے عرصے بعد تمہیں ڈنر کروانے کا وقت ملا ہے۔" وہ خفگی سے بولی تھی۔

"وہ بھی اس لیے تمہیں لایا ہوں کیونکہ تم نے کہا تھا کہ بل تم دو گی۔" وہ پتا نے والے انداز میں مسکرایا تھا۔ (وہ باہر اس لیے بیٹھے تھے کیونکہ ابھی ڈائننگ ایریا میں کوئی میز خالی نہ تھی۔)

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ ویسے بھی میرے سارے پیسے تم نے رکھ لیے تھے۔"

"بی بی۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔" وہ حیران سا سیدھا ہوا۔ "میں آپ کو ساری رقم واپس کر چکا ہوں چھ ماہ پہلے ہی۔"

"کوئی ثبوت؟" اس نے سنجیدگی سے ابرو اٹھائی۔

فارس نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"تم جج بننے کے لیے امتحان کیوں نہیں دے دیتیں۔ بہت اچھی جج بنو گی تم۔" اور وہ بے اختیار ہنس دی۔ پھر دوبارہ سے گردن اٹھا کے چاند کو دیکھنے لگی۔

"میں خوش ہوں' فارس!"

"میں بھی خوش ہوں۔"

"تم کیوں خوش ہو؟"

"کیونکہ میرے آفس میں دو بہت خوب صورت لڑکیاں کام کرتی ہیں اور۔۔۔"

"فارس غازی!" اس نے زور سے پیر زمین پہ پٹخا تو وہ مصالحتی انداز میں ہاتھ اٹھا کر جلدی سے بولا۔

"میں..... میں اس لیے خوش ہوں کیونکہ میری زندگی اب Stable (مستحکم) ہو گئی ہے۔ میرے پاس ایک بہت اچھی..... دل کی اچھی بیوی ہے۔ میرا خاندان مجھ سے خوش ہے۔ عزیزوں رشتے داروں میں مجھے اب کوئی قاتل یا مجرم نہیں سمجھتا۔ ہاشم اور اس کا خاندان ہماری زندگیوں سے جا چکا ہے..... میرے بھانجے اپنی زندگیوں میں صحت مند شہری بن کے سیٹل ہو چکے ہیں۔ میرے پاس ایک اچھی گاڑی ہے' جاب ہے' گھر ہے اور میرے آفس میں دو بہت خوب صورت لڑکیاں کام کرتی ہیں۔"

اور اس دفعہ آخر میں وہ دونوں ہنسے تھے۔

"آئی ریئلی ہیٹ یو فارس!"

"تو یو ٹو!" وہ مسکرا کے بولا تھا۔ وہ واقعی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کی ناک کی لونگ دمک رہی تھی۔ سفید جیکٹ سے ڈھکے کندھوں پہ گرتے گھونگھریالے بھورے بال اور بھوری آنکھوں کی مسکراتی چمک..... وہ واقعی خوش تھی..... اور وہ بھی تھا۔

دھماکے کی آواز آئی تو وہ چونکا۔ وہ بھی چونکی۔ لمحے بھر کو دل گھبرایا' مگر پھر دیکھا۔ ساتھ سے گزرتی ایک لڑکی سیل فون پہ کوئی فلم دیکھ رہی تھی یا کسی فلم کا ٹریلر۔ زمر نے اس کا پہلے لمحے بھر کو ششدر رہ جانے والا چہرہ دیکھا' اور پھر اسے مطمئن ہوتے دیکھا تو نرمی سے بولی۔

"فارس! اب سب ٹھیک ہے۔ کوئی سازشیں..... کوئی قتل و غارت اب ہماری زندگیوں میں نہیں ہو گی۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ گہری سانس لے کر مسکرایا۔ پھر جھرجھری سی لی۔ "بس کبھی کبھی..... ایک خیال سا ذہن سے گزرتا ہے..... جیسے دور کہیں..... کوئی کارہا ہے جو میری گھات میں بیٹھا ہے۔"

"یہ صرف تمہارا وہم ہے۔ میں جانتی ہوں ہم سے بھی غلط کام ہوئے ہیں مگر ہم سروائیول کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ہم اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اصول یہ ہے کہ اگر بدلہ لو تو اتنا لو جتنے ظلم کیے گئے تھے اور اگر اس کے بعد کوئی تمہارے ساتھ زیادتی کرے تو پھر اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ سو تم....." ہاتھ بڑھا کے اس کے گھٹنے پہ رکھا۔ "ریلکس ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسا رکھو۔ اللہ تمہیں ضائع نہیں کرے گا۔"

"میں اب ایتھیئسٹ (دہریہ) نہیں رہا۔ میرا ایمان اور یقین اب واپس آ چکا ہے۔" وہ مسکرایا۔ "اب میں پرسکون رہنے کی کوشش کروں گا۔"

"اور جب تک زندہ ہو' یہ یاد رکھنا کہ ہم سب ہمیشہ تمہارے ساتھ کھڑے ہیں اور میں جب تک زندہ ہوں یہ یاد رکھوں گی کہ تم میرے سب سے اچھے دوست ہو۔"

وہ ہلکا سا ہنسا۔ "آج بہت عرصے بعد تم چڑیل نہیں لگیں۔"

"او کے! اب ذرا ہم ڈنر ہال کی طرف جاتے ہیں..... اور راستے میں تم مجھے یہ بتاؤ گے کہ میرا یہ نام کس نے رکھا تھا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"احمر نے۔" وہ بھی ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"اور تم نے اسے ایک دفعہ بھی نہیں ٹوکا؟"

"بالکل نہیں۔ میں نے تو اسے شاباشی دی تھی۔"

"اور تھوڑی سی بھی شرم آئی تمہیں دیتے ہوئے؟"

"دیکھو' میں ایک شریف آدمی ہوں....." وہ دونوں ماہ کامل کی اس سرد رات میں قدم اٹھاتے چلتے جا رہے تھے..... دور ہوتے جا رہے تھے..... اور ان کی آوازیں مدھم ہو رہی تھیں..... دور سے یہی دکھائی دیتا تھا کہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا غازی' اس کی طرف جھک کر مسلسل کچھ کہہ بھی رہا تھا اور وہ نفی میں افسوس سے سر ہلائے جا رہی تھی۔ مسلسل لڑ رہی تھی۔ چاندی کے تھال سے چاندی اب بہہ بہہ کر ساری دنیا پہ گرنے لگی تھی..... سب کچھ چمکنے لگا تھا.....

٭ ٭ ٭

اور راج کرے گی خلق خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اور چند میل کے فاصلے پہ بنی عمارت کے وسیع آڈیٹوریم میں کرسیاں اوپر سے نیچے تک بھری تھیں۔ پہلی قطار سے ایک طرف کیمروں اور فل لائٹس کی چکا چوند روسٹرم پہ کھڑے سعدی کی آنکھیں چندھیائے دے رہی تھی مگر وہ اب ان کا عادی تھا۔ سیاہ تھری پیس سوٹ' ٹائی' کف لنکس پہنے' بالوں کو جیل لگا کر پیچھے کیے' وہ ڈائس پہ ہاتھ رکھے کھڑا مائیک پہ چہرہ جھکائے' آنکھیں لوگوں پہ مرکوز کیے کہہ رہا تھا۔

"میرا نام سعدی یوسف خان ہے۔ لوگ مجھے پیار سے سعدی کہہ کر بلاتے ہیں۔ اور غصے سے بھی یہی کہتے ہیں۔"

ہال میں کھلکھلاہٹ سی گونجی تھی۔ وہ مسکراہٹ بھرے پُرسکون چہرے کے ساتھ کہنے لگا۔

"چھ ماہ پہلے جب میں کیس ہارا تھا تو مجھے لگا تھا میں ہار گیا ہوں۔ ختم ہو گیا ہوں۔ مجھے لگا تھا اب اس ملک کا کچھ نہیں ہو سکے گا۔ جب اتنا بڑا مجرم جس کے خلاف عینی شاہد ہوں' جب جج اس کو بری کر دیں یا پولیس دباؤ ڈال کر مقتول کے وارثوں سے ملزم کو معافی دلوا دے تو انسان سوچتا ہے' اس ملک کا کیا بنے گا۔ جب ججوں کی بحالی اور عدلیہ کی آزادی کی تحریک چلانے والے ججوں کو متکبر اور وکلا کو تشدد دیتے دیکھیں تو سوچتے ہیں کہ ہماری ریاضت رائیگاں گئی مگر — کچھ عرصہ لگا یہ سمجھنے میں کہ ایسا نہیں ہوا....."

اس کی آواز سارے ہال میں گونج رہی تھی... اور لگتا تھا ماہ کامل کی اس برفیلی رات میں وہ آواز دنیا کے ایک ایک کونے تک جا رہی تھی....

"میں' سعدی یوسف' آپ سب لوگوں کے سامنے ببانگ دہل یہ بات کہتا ہوں کہ جب کوئی پاکستانی شہری کسی قاتل امیر آدمی یا کسی کرپٹ سیاستدان کے خلاف عدالت میں کیس لے کر جاتا ہے... تو اگر مصلحت کے مارے ججز فیصلہ دیتے وقت مجرم کو فائدے دے بھی جائیں... ہاں تب بھی مدعی نہیں ہارتا... انصاف کے لیے لڑنے والا نہیں ہارتا... وہ تو اسی دن جیت گیا تھا جب اس نے ہمت اور بہادری دکھاتے ہوئے امیر قاتلوں اور ڈاکوؤں کو عدالت میں گھسیٹا تھا... جب ایسے مصلحت میں لپٹے فیصلے آتے ہیں تو جج ہارتے ہیں... قانون ہارتا ہے... ملک کے انصاف کے ادارے ہارتے ہیں... مدعی نہیں ہارتا۔ ایسے فیصلے ہونے سے انصاف کے مدعی کا کچھ نہیں جاتا... وہ تو جیتا ہوا تھا... ایکسپوز تو ججز ہوتے ہیں... یاد رکھیے گا... انصاف کے لیے لڑنے والا کبھی نہیں ہارتا....

٭ ٭ ٭

اس تنگ و تاریک کوٹھڑی کے دروازے میں ایک چھوٹا سا چوکھٹا بنا تھا۔ جس میں شیشہ لگا تھا۔ ہاشم اس دروازے کے ساتھ کمر لگائے بیٹھا تھا۔ قیدیوں کا لباس پہنے' اس کی شیو بڑھی تھی اور وہ گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ دروازے پہ آہٹ ہوئی تو وہ کرنٹ کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازہ کھلا اور ایک سیاہ وردی والا سپاہی نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔

"میری بات سنو۔" ہاشم بے بسی اور غصے بھری دبی آواز میں بولا تھا۔ "تم میری بات پہ غور کر کے تو دیکھو۔ میرے پاس اب بھی بہت سے خفیہ بینک اکاؤنٹس ہیں جن کا نہ میرے گھر والوں کو علم ہے' نہ ان — لوگوں کو۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں تمہیں بہت امیر کر سکتا ہوں۔"

گارڈ نے ٹرے اندر پٹخی اور غصیلی خاموش نظر اس پہ ڈالتا باہر نکل گیا۔ دروازے کے آہنی تالے چڑھنے کی آواز آئی تو ہاشم نے زور سے دیوار پہ مکا دے مارا۔

"میرے اعصاب بہت مضبوط ہیں' یہ جیل میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں نکلوں گا اس سے ایک دن۔ پھر میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔" اور تابڑ توڑ کے

دروازے پہ مارنے لگا یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں سے خون بہنے لگا۔

"مجھے نہیں معلوم اس وقت میں کس ملک میں ہوں، لیکن تم لوگ پچھتاؤ گے مجھے میری بیٹی کو نہیں ڈھونڈنے دیا تم نے..... تم سب پچھتاؤ گے۔"

☼ ☼ ☼

"اور چونکہ مجھے آج اس سیمی نار میں آپ سے بات کرنے کا موقع ملا ہے تو میں آپ کو سورۃ النمل کی چند آیات سنانا چاہوں گا۔ قرآن کی آیات کے معانی ہر دفعہ نئے سرے سے ہم پہ کھلتے ہیں۔ سورۃ النمل کی آخری آیات بھی مجھے یوں لگتا ہے آج مجھے پہلی دفعہ سمجھ میں آئی ہیں۔"

قصر کاردار رات کے اس پہر اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ اب اس کی بتیاں رات گئے تک جلا نہیں کرتی تھیں۔ بس بجھی رہتی تھیں۔ تاریک بالکونی، میز پہ چمکس بکس، آفس ڈاکومنٹس اور عینک رکھی تھی اور ریلنگ کے ساتھ ایک ہیولہ سا کھڑا نظر آتا تھا..... سلور رنگ کا چغہ پہنے، بڈ سر پہ گرائے، وہ جلے ہوئے ہاتھ ریلنگ پہ جمائے دور کہیں پہاڑوں کو دیکھ رہی تھی..... اور ایکسی اس کو دیکھ کر زخمی سا مسکرا رہی تھی۔

"میں پناہ چاہتا ہوں اللہ کی دھتکارے ہوئے شیطان سے۔ شروع اللہ کے نام کے ساتھ جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ اور جب ان پر وعدہ پورا ہو گا تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے باتیں کرے گا کہ یہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں لاتے تھے۔"

وہ سانس لینے کو رکا اور ایک نظر خاموش ہال کو دیکھا۔ "النمل کی آخری آیات میں ایک زمین کے جانور کا ذکر ہے جو قرب قیامت زمین سے نکلے گا، اور لوگوں سے باتیں کرے گا۔ ویسے تو یہ ایک قیامت کی نشانی ہے مگر یہ اس سورۃ کے اختتام میں آئی ہے جو چیونٹیوں کی سورۃ ہے..... جس کے ہر واقعے میں ایک ایک چیونٹی اکیلی سارے عالم سے ٹکراتی ہے، ان کو اصلاح کی طرف پکارتی ہے، ان کا ہاتھ ظلم سے روکتی نظر آتی ہے..... مگر ہر کوئی اسے نہیں سنتا.....

ہم چیونٹیوں جیسے لوگوں کی جب متکبر لوگ بات نہیں سنتے تو آخر میں زمین پھٹتی ہے اور بڑے بڑے جانور نکل کر..... ان ہی جیسے خوفناک جانور نکل کے انہیں عبرت کا نشان بنا دیتے ہیں..... جب چیونٹیوں کو قدموں تلے پیسا جاتا ہے تو وہ کاٹیں یا نہ کاٹیں، زمین کے اندر چھپے جانوروں کو باہر نکال لاتی ہیں وہ....."

☼ ☼ ☼

کانفرنس روم میں متعدد غیر ملکی مہمان بیٹھے تھے، اور ان کے میزبان بھی مسکراتے ہوئے سامنے موجود نظر آرہے تھے۔ دھڑا دھڑ مختلف یادداشتوں پہ دستخط ہو رہے تھے اور ڈاکٹر سارہ مسکرا کے اس ساری کارروائی کو دیکھ رہی تھیں۔ قریب بیٹھی لڑکی نے جھک کر سرگوشی کی۔ "تھرکول ایک حقیقت بننے جا رہا ہے۔ کیا سعدی اب بھی واپس نہیں آئے گا؟"

سارہ نے اس کے کان کے قریب آہستہ سے کہا۔ "وہ پرائیویٹ سیکٹر میں چلا گیا ہے۔ اب جب راستہ کھل گیا ہے تو وہ آنے پہ راضی نہیں۔ کہتا ہے وہ سرکاری عہدہ لے کر مصلحتوں کا شکار ہو کر نہیں کام کر سکتا۔ وہ زیادہ daring (جرات مندانہ) کام کرنا چاہتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"اور آگے اللہ فرماتا ہے..... "اور جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گروہ ان لوگوں کا جمع کریں گے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے پھر ان کی جماعت بندی ہوگی یہاں تک کہ جب سب حاضر ہوں گے۔ کہے گا کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا تھا حالانکہ تم انہیں سمجھے بھی نہ تھے یا کیا کرتے رہے ہو۔ اور ان کے ظلم سے ان پر الزام قائم ہو جائے گا پھر وہ بول بھی نہ سکیں گے۔"

یہ آیات ہر مظلوم کے دل کو ٹھنڈک دیتی ہیں۔ ان کو پڑھ کے، ان کو سمجھ کے میں نے یہ جانا ہے کہ آج

عدالتوں میں ٹی وی پہ چوراہوں اور چوک میں یہ ظالم بارسوخ کرپٹ لوگ کتنا مرضی جھوٹ بول لیں ابھی قیامت نہیں آئی۔ اور جب آئے گی تو وہ بول بھی نہیں سکیں گے۔ اس دن ان کی کوئی صفائی کوئی توجیہہ نہیں سنی جائے گی۔ ہاں کبھی تو ان ظالموں کی بھی زبان بندی ہوگی۔ اس لیے ان کی زبانوں سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے۔"

☼ ☼ ☼

سفید دیواروں والے کمرے میں خوب صورت پینٹنگز آویزاں تھیں۔ گھومنے والی کرسی پہ سفید کوٹ پہنے بیٹھی ڈاکٹر پیڈ پہ قلم سے چند الفاظ گھسیٹ رہی تھی۔ اور سامنے بیٹھا آنکھوں تلے حلقے لیے نوشیرواں پژمردگی اور اداسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا اب میں یہ دوا چھوڑ نہیں سکتا؟ کیا ان دواؤں کے بغیر مجھے کہیں سکون نہیں ملے گا؟"

"آئی ایم سوری لیکن آپ کی ذہنی حالت کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔" وہ صفحہ پھاڑ کے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی تھی... شیرو نے اذیت سے آنکھیں موند لیں۔ دوائیاں... نیند کی... ڈپریشن کی... سکون کی... قابیل کی مہر ماتھے پہ دہکنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا نہیں دیکھتے کہ ہم نے رات بنائی تاکہ اس میں چین حاصل کریں اور دیکھنے کو دن بنایا البتہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمان میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے سب ہی گھبرائیں گے مگر جسے اللہ چاہے اور سب اس کے پاس عاجز ہو کر چلے آئیں گے۔"

یہ آیات سن کر میرے دوستو... کیا ہم صرف اپنے دشمنوں کی عاقبت کا سوچتے ہیں یا اپنا بھی سوچتے ہیں؟ کیا ہم اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ رہنے والے کام کرتے ہیں؟"

☼ ☼ ☼

ہارون عبید ایک ٹاک شو کے سیٹ پہ بیٹھے مسکرا مسکرا کے مقابل موجود دو مہمانوں سے بحث کر رہے تھے... ان کے انداز میں بے نیازی تھی... آگے بڑھنے کی لگن... عنقریب پالینے والی فتح کی چاہ اور وہ کہہ رہے تھے۔

"ہم نے اس ملک میں جمہوریت کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ ہماری منزل قریب ہے... آپ دیکھیے گا کہ ہم کیسے..."

"اور تو جو پہاڑوں کو جمے ہوئے دیکھ رہا ہے تو بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے اس اللہ کی کاریگری سے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنا رکھا ہے اسے خبر ہے جو تم کرتے ہو۔"

درست فرمایا اللہ نے۔ چاہے وہ ظالم لوگ ہوں یا ظالم حالات یوں لگتا ہے وہ پہاڑ جیسے ہیں۔ جمے ہوئے۔ کبھی ہماری زندگیوں سے ہمارے سروں سے نہیں ہٹیں گے... مگر ایسا نہیں ہے۔ میں نے ان ظالم لوگوں اور ظالم حالات کو روئی کے گالوں کی طرح دھنکے جاتے دیکھا ہے... باقی رہ جانے والا صرف اللہ ہے... باقی سب کو زوال آتا ہے... خود ہمیں بھی...

صاحبزادی صاحبہ اپنے لاکر کو کھولے کھڑی تھیں۔ اس میں ایک بڑا ڈبا کھلا ہوا تھا... اور اس کی سیاہ مخمل پہ جگمگاتے ہیرے پڑے نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے زیورات... ان کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھیں... وہ جب سے زندگی میں آئے تھے وہ بے رحم فیصلے کرنے لگی تھیں... وہ زیورات... ان کی چمک...

☼ ☼ ☼

"جو نیکی لائے گا سو اسے اس سے بہتر بدلہ ملے گا اور وہ اس دن کی گھبراہٹ سے بھی امن میں ہوں گے۔"

اللہ تعالیٰ ہمیں اس آیت میں یہ بتا رہا ہے کہ ہمیں سکون انعام جنت یہ چیزیں اپنی نیکیوں کے

"بدلے" کے طور پہ نہیں ملیں گی، بلکہ جو بھی نیکی کرے گا اس کو اس کی نیکی سے "بڑھ کے" بدلے میں یہ سب ملے گا۔ پھر جب فیصلے کی گھڑی آئے گی تو یہ ہماری چھوٹی چھوٹی نیکیاں ہوں گی جو ہمارے دل کو دنیا اور آخرت میں گھبراہٹ سے بچائیں گی۔ اگر آپ کا دل بات بہ بات گھبرا جاتا ہے تو آپ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نیکیاں کیا کیجیے ۔ کسی کا دل رکھ لینا' کسی کو پانی پلا دینا' زبان پہ طنز آجانے کے باوجود کسی کو ہرٹ نہ کرنے کے لیے اس کو لبوں سے نہ نکالنا' خاموش رہنا.... اور ایسے ان گنت کام آپ کے دل کو بہادر بنائیں گے.... یاد رکھیں.... ہر نیکی دوسری نیکی کا راستہ کھولتی ہے۔"

کتابوں کی دکان کے اس اونچے ریک پہ کتابیں ترتیب سے سجی تھیں۔ اور حنین ان کے سامنے کھڑی مسکرا کے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ساتھ کھڑے اسامہ نے تفاخر سے کہا تھا۔

"تمہاری بک یہاں دیکھ کر میں یہ فخر سے کہہ سکتا ہوں حنہ کہ تم صرف اپنی ہیرو نہیں ہو' بلکہ تم میری ہیرو بھی ہو۔"

اور اس نے ہنس کر سیم کے سر پر چپت لگائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اور جو برائی لائے گا سو ان کے منہ آگ میں اوندھے ڈالے جائیں گے تمہیں وہی بدلہ مل رہا ہے جو تم کرتے تھے۔"

یعنی اللہ انسان پہ ظلم نہیں کرے گا۔ اس دنیا میں تو ہمیں ہمارے اعمال سے کم یا زیادہ مل جاتا ہے مگر اس بڑے دن ہمیں اس کا بدلہ ملے گا جو ہم کرتے تھے۔ ہم کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ وہ وعدہ کرتا ہے تو اسے سچ کر کے دکھاتا ہے۔

جب وہ کہتا ہے کہ دعا مانگو' میں قبول کروں گا' تو ہم اس وعدے کو سچ جانتے ہوئے دعا میں شدت کیوں

اختیار نہیں کرتے؟ ہاں ہمارے اردگرد کا معاشرہ بدل رہا ہے' لوگ بدل رہے ہیں' زمانہ بدل رہا ہے' مگر اللہ نہیں بدلے گا۔ اللہ کا وعدہ نہیں بدلے گا۔ اللہ اپنے سارے وعدے پورے کرے گا۔ کیا ہم کریں گے؟"

☼ ☼ ☼

کال کوٹھڑیوں کے دروازے کھلے تھے اور تمام قیدی باہر نکل رہے تھے۔ وہاں ایک تاریک سا بڑا کمرہ تھا جس میں وہ دن بھر جمع رہتے تھے۔ ایسے میں ایک گارڈ ہاشم کے قریب آیا اور جھاڑو اسے تھمائی۔

"کیا تمہیں روز بھول جاتا ہے؟ اس جگہ کی صفائی تم نے کرنی ہے۔"

ہاشم نے درشتی سے اس سے جھاڑو لی اور پھر اس کے قریب آیا۔ "تمہیں جتنے پیسے چاہئیں' میں دوں گا' بس مجھے اتنا پتا کروا دو کہ میری بیٹی کہاں ہے؟ میری بیوی' ماں یا بھائی' کسی کو ملی وہ یا نہیں؟ صرف اتنا بتا دو مجھے۔"

"وہ اپنی دادی کے پاس ہے۔" وہ اسے گھورتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

ہاشم نے ایک نظر میلے فرش کو دیکھا..... پھر اپنے آپ کو..... بدرنگ جمپنگ سوٹ (قیدیوں کا لباس) پہنے..... میلے کچیلے حلیے میں..... وہ اب اس غلیظ فرش کو صاف کرے گا؟ اس نے سارے خیال ذہن سے جھٹک دیے اور ضبط کرتے ہوئے جھاڑو کو فرش پہ رگڑنے لگا..... آنکھوں میں بار بار درد سا بھرتا تھا..... مگر نہیں..... وہ آخری دم تک ان لوگوں سے لڑے گا۔ کبھی تو وہ آزاد ہو گا..... کبھی تو..... اس کی آنکھیں گیلی ہونے لگیں مگر اس نے سختی سے خود کو جھڑکا۔

"مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ سب نے میرے ساتھ زیادتی کی۔ سب سے زیادہ ظلم میرے ساتھ ہوا۔ وہ سب ایک ساتھ تھے۔ ایک میں اکیلا رہ گیا تھا..... میں اکیلا لڑتا رہا..... میں کب تک لڑ سکتا تھا....."

بھیانک اندھیرے آس پاس اس کی گھات میں کھڑے تھے.....

★ ★ ★

"مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس شہر کے مالک کی بندگی کروں جس نے اسے عزت دی ہے اور ہر ایک چیز اسی کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرماں برداروں میں رہوں۔ اور یہ بھی کہ قرآن سنا دوں پھر جو کوئی راہ پر آگیا تو وہ اپنے بھلے کو راہ پر آتا ہے اور جو گمراہ ہوا تو کہہ دو' میں تو صرف ڈرانے والوں سے ہوں۔ اور کہہ دو' سب تعریف اللہ کے لیے ہے تمہیں عنقریب اپنی نشانیاں دکھا دے گا پھر انہیں پہچان لو گے اور تیرا رب اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔"

☼ ☼ ☼

ریسٹورنٹ کی میز پہ خوب صورت گلاب کے پھول رکھے تھے' دو موم بتیاں تھیں۔ زمر اور فارس آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اشتہا انگیز خوشبو لیے کھانا ان کے سامنے سجا تھا۔ اور وہ مسکرا کے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تو آج ایک پُرامن اور پُرسکون ڈنر کا قرض تم نے اتار ہی دیا!"

"بالکل۔ تو پھر کیا خیال ہے؟ اب میں تمہیں اپنے آفس کی خوب صورت لڑکیوں کے بارے میں بتا سکتا ہوں؟"

اور وہ دونوں ایک ساتھ ہنس دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

"اور ان آیات کو سنانے کے بعد..... میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں۔" وہ ڈائس پہ ہاتھ رکھے کھڑا مجھے کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "کہ میں نے یہ جان لیا ہے کہ میرا کام تھا صرف پہنچا دینا۔ ہمارا کام پیغام پہنچا دینا ہوتا ہے۔ اسلام کو زبردستی لوگوں کے اوپر نافذ کرنا نہیں ہوتا۔ آپ دین کو جبر اور سختی سے کسی کے عمل میں شامل نہیں کر سکتے۔ آپ ججز سے زبردستی انصاف بھی نہیں کروا سکتے۔ ہم نے صرف سچ

کے لیے آواز بلند کرنی ہے' اس کے لیے لڑنا ہے' کوشش کرنی ہے۔ ہمارے ہاتھ میں صرف کوشش ہے۔ کامیابی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔
ضروری نہیں ہے کہ ہم ہر دفعہ کامیاب بھی ہوں'

ہم ہر دفعہ جیتیں بھی۔ ہمیں صرف اپنا ہنڈرڈ پرسینٹ دینا ہے۔ کیونکہ ہمارا یہی کام تھا۔ خود عمل کرنا اور صرف دوسروں کو پہنچا دینا۔ آگے کوئی مانے یہ نہ مانے' میں تو ہوں صرف پہنچا دینے والوں میں سے!"
وہ بات ختم کر کے خاموش ہوا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا... لوگ اپنی جگہوں سے اٹھ اٹھ کر اس کے لیے ہاتھ بلند کیے تالیاں بجا رہے تھے اور وہ مسکرا کے ان کو دیکھ رہا تھا۔
وہ فیصلے کی گھڑی آنے سے پہلے ہی جیت گیا تھا اس کو بس علم دیر سے ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

سولہ سال بعد۔
وہ اوپر سے دیکھنے پر کسی امریکی ریاست کا کوئی مصروف شہر لگتا تھا۔ خوب صورت اونچی عمارتیں' صاف ستھری سڑکیں..... مصروف سے' تیز تیز چلتے لوگ..... ایسے میں وہ مخالف سمت سے چلتی ہوئی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ تیز ہوا کے باعث سیاہ بال اڑاڑ کے چہرے پہ آ رہے تھے اور وہ بار بار ان کو کان کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ خوب صورت چہرہ' سیاہ شفاف آنکھیں اور ایک بے نیاز مسکراہٹ..... وہ مگن سی چلتی آ رہی تھی' جب قریب سے گزرتے ایک آدمی سے ٹکرا گئی۔
"سوری..... سوری۔" مسکرا کے معذرت کی تو وہ آدمی "نو پرابلم" کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اب کے وہ واپس مڑی اور قدم بڑھاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا مردانہ والٹ کھولا۔ اس آدمی کا آئی ڈی کارڈ..... چند ویزا کارڈ..... کڑکڑاتے ہوئے ڈالرز کے نوٹ..... ہوں گڈ۔

اس نے اسی سرد مسکراہٹ کے ساتھ کارڈز جیب میں رکھے' والٹ قریبی کچرے دان میں اچھالا' اور نوٹ مٹھی میں دبائے آگے بڑھ گئی۔
ایک بیکری کے قریب وہ رکی اور اندر چلی گئی۔ جب واپس آئی تو ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈبا تھا۔ کیک کا ڈبا۔

اب اس کی مسکراہٹ سوگوار ہو چکی تھی۔
وہ ڈبا لیے سڑک کنارے چلتی گئی..... چلتی گئی..... یہاں تک کہ زیر زمین ٹرین اسٹیشن کو جاتی سیڑھیاں نظر آنے لگیں..... وہ نیچے اترتی آئی۔
وہاں کونے میں ایک بوڑھا سیاہ فام آدمی بیٹھا تھا۔ شکل سے وہ ڈاؤن سنڈروم کا شکار لگتا تھا..... دنیا مافیہا سے بے خبر..... وہ اس کے پاس آ بیٹھی..... وہیں زمین پہ..... اور ڈبا کھول کے درمیان میں رکھا۔ اندر ایک چھوٹا سا کیک تھا۔ اس پہ ننھی سی موم بتی رکھی تھی۔ اس نے لائٹر نکال کر جلایا' موم بتی روشن کی' اور سیاہ فام کو دیکھا۔ وہ غائب دماغی سے اسے گھور رہا تھا۔
لڑکی نے اپنے ٹخنے سے جینز اوپر کی' وہاں بندھا چاقو

نکالا' اور کیک کے قریب لائی۔ پھر پھونک ماری۔ شعلہ بجھ گیا۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو می...... ہیپی برتھ ڈے ٹو سونیا......" وہ اب کیک کو دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں گنگنا رہی تھی۔ ساتھ میں چاقو سے کاٹ بھی رہی تھی۔

"جب میں چھوٹی تھی تو میرے بابا میری سالگرہ ایسے مناتے تھے کہ ساری دنیا دیکھا کرتی تھی۔ شہر کی سب سے زیادہ شاندار سالگرہ...... شاید میری ہوتی تھی۔ اور اب......" اس نے گہری سانس اندر کھینچی۔

"اور اب میں ان کے ساتھ سالگرہ نہیں منا سکتی۔ میں نے کتنے سال ان کے ساتھ سالگرہ نہیں منائی۔ اوہ تم کیا جانو...... میرا باپ کتنا عظیم انسان تھا۔"

پھر آنکھیں اٹھا کر بوڑھے بھکاری کو دیکھا اور مسکرائی۔

"اتنا عرصہ کھوئے رہنے...... بک جانے' ظلم سہنے کے بعد بھی...... میری دادی نے مجھے ڈھونڈ ہی لیا...... مگر میری قسمت میرے بابا سے الگ ہے البرٹو...... میری دادی نے مجھے اپنے بیٹوں کی طرح بڑا نہیں کیا...... انہوں نے مجھے ایک ہتھیار کی طرح ڈھالا ہے......" اس کی آواز سرد ہو گئی۔ "میں نے اتنے دھکے کھائے ہیں کہ اب میں ہر قسم کے لوگوں سے لڑنا' اور ان کو ہر طرح سے مارنا سیکھ چکی ہوں۔ اور میں یہ تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کیونکہ آج صبح معلوم ہوا ہے کہ میرے بابا زندہ ہیں...... اور اب البرٹو مجھے اپنے ملک واپس جانا ہے۔ اپنے بابا کو ڈھونڈنے' ان کو واپس لانے اور اپنے خاندان کو جوڑنے کے لیے......"

کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا جذبہ جاگا...... چمک...... پُرتپش برف جیسی چمک...... سلگتی ہوئی لکڑی کی سی حدت......

"اور آج شاید میں آخری دفعہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر کچھ کھا رہی ہوں۔ اب شاید میں واپس نہ آؤں۔ میرا سفر بہت طویل ہے' اور مجھے صرف اپنے خاندان کو اکٹھا نہیں کرنا' بلکہ مجھے......" آنکھیں سلگنے لگیں۔

ٹرین قریب آرہی تھی...... اور اس کی آواز میں سونیا کی آواز دب سی گئی...... مدھم سرگوشی میں بدل گئی۔

"مجھے اس ایک شخص اور اس کے خاندان سے بھی اپنا انتقام لینا ہے۔ میں اس کا نام کبھی نہیں بھولی...... میں اس کی آنکھیں نہیں بھولی...... وہ آخری دفعہ مجھے اسپتال کے کوریڈور میں نظر آیا تھا...... فارس غازی...... میں نے اس دن کا برسوں انتظار کیا ہے البرٹو...... جب میں پوری طرح تیار ہوں گی...... اور میں اس کے خاندان کے ایک ایک فرد کو ہر اس ظلم کی سزا دوں گی جو انہوں نے میرے خاندان پہ ڈھایا تھا...... میں ایک ایک زخم کا بدلہ لوں گی...... اس آدمی نے میری ساری دنیا تاریک کر دی...... وہی وجہ ہے ہر چیز کی...... چودہ سال...... چودہ سال اس نے اور اس کے خاندان نے سکون سے گزارے ہیں...... مگر اب اور نہیں......" اس نے کیک کا ڈبا البرٹو کی طرف بڑھایا اور خود بیگ کندھے پہ ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ آنکھیں پر تپش تھیں اور چہرہ برف کی طرح سفید۔

"اب وہ اپنے ایک ایک جرم کا حساب دے گا۔ میرے محبت کرنے والے عظیم باپ کے ساتھ اس نے جو کیا...... وہ اس کا حساب دے گا۔ میں اپنے باپ کو ڈھونڈ نہ بھی سکی تو فارس غازی سے ضرور ملوں گی' اور وہ اس ملاقات کو یاد رکھے گا۔ ویسے مجھے ابھی بھی امید ہے کہ وہ مجھے کبھی بھولا نہیں ہو گا۔ اسے بھی میری آنکھیں یاد ہوں گی۔"

اب وہ سامنے نہیں تھی۔ ایسے جیسے بھیڑ میں غائب ہو گئی ہو۔ کسی جن کی طرح۔

کسی پری کی طرح۔

اور اگر کبھی تمہیں کوئی کہے

کہ انتقام کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا۔

تو یقین کر لینا۔

کیونکہ۔

ہر انتقام کے آخر میں۔

نئے سرے سے بدلہ لینے کے لیے۔

اور اس چکر کو دوبارہ شروع کرنے کے لیے

ایک سروائیور۔

ضرور باقی بچ جاتا ہے۔

عائشہ اختر بٹ

کمروں کی تمام چیزیں ان کے اصلی مقام پر رکھ کر وہ جھاڑو دے چکی تو جلدی جلدی پونچھا دھو کر لے آئی۔ چند ہی منٹوں میں اس نے کمروں کے فرش چمکا کر رکھ دیے۔ آج اس کو ہر کام جلدی جلدی نپٹانا تھا۔ سو اب وہ جھاڑن پکڑے ماہرانہ انداز میں گھر کی ہر ایک چیز صاف کر رہی تھی، بے بے کے کمرے میں بچھے بستر کو صاف کر کے وہ امی کے کمرے کی طرف بڑھی، ہر چیز نفاست اور سلیقے سے صاف کر کے رکھی اور پھر مانو، بلو اور اپنے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھی، پہلا قدم

کمرے میں رکھتے ہی دل زور' زور سے دھڑکنے لگا۔

"اف! کیسے نظریں چراؤں۔" اس نے کن اکھیوں سے اپنے بستر کی طرف دیکھا' مگر دوسرے ہی لمحے جھاڑن لیے بستر کی طرف بڑھی' اسے جھاڑا' پھر کمرے کی ہر چیز سے گرد لمحوں میں غائب ہوئی۔ وہ ایسی ہی تھی' ہر کام میں طاق' جس کام کا بیڑا اٹھاتی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیتی' ہاں۔۔۔ مگر ایک چیز تھی جو اسے لگتا سب کاموں پہ بھاری ہے' پہلے وہ کرنے کی خواہش ہوتی' پھر کوئی دوسرا کام' مگر اس کی اصول پسند طبیعت آڑے آجاتی اور وہ پہلے "اس" کے بجائے امی کے حکم پر عمل کرنا ضروری سمجھتی۔ اب بھی وہ اپنا بستر صاف کر کے اس کمرے میں موجود "اس" شے سے نظریں چراتی باہر کو لپکی۔ اب اسے برآمدہ اور صحن چمکانا تھا۔ چونکہ آج اتوار کا دن تھا' سو جھاڑو پونچھا اسی کی ذمہ داری تھا۔

امی' بے بے کے ساتھ اس کی پھرتیوں کا قصہ چھیڑے بیٹھی تھیں۔ دونوں ساس' بہو ہر مہینے اس کی اس قسم کی پھرتیاں دیکھتی رہتیں' پھر مسکرا دیتیں۔ وہ اس کے پسندیدہ مشغلے سے آگاہ تھیں اور انہیں "اس" پہ کوئی اعتراض بھی نہ تھا' بس ایک ابا تھے جن کے سامنے وہ اس مشغلے کا ذکر تک نہ کرسکتی تھی' کیونکہ وہ اس چیز کے سخت خلاف تھے۔ ان کے علم کے مطابق وہ دماغ خراب کرنے کی چیز تھا۔ لہٰذا فجر کریم کبھی بھی ابا کے سامنے "اس" سے نظریں نہ ملا پاتی' کجا کہ ابا کے سامنے۔۔۔ کھلی بے حیائی (ان کے مطابق)

وہ اب سارے گھر کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی اور کچھ لمحوں بعد وہ ساری دنیا سے بے نیاز اپنے "پسندیدہ" ڈائجسٹ میں گم ہو چکی تھی۔ امی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مگن تھیں' جبکہ بے بے قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہو چکی تھیں' مئی کا سورج اپنی سنہری کرنوں سمیت ہر سو چھایا ہوا تھا' وہ گرمی سے بے نیاز رسالہ پڑھنے میں مگن تھی' بجلی چلی گئی' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

✡ ✡ ✡

کریم بخش واجبی سی تعلیم رکھنے والے ایک دیہاتی مرد تھے۔ وہ اور ان کی بہن رحیمہ' والدین کا کل سرمایہ تھے۔ رحیمہ ان سے تھوڑا دور ایک قصبے میں بیاہی گئی تھیں اور ان کی چار بیٹیاں تھیں' پھر کریم بخش تھے جن کی پہلوٹی کی اولاد فجر کریم تھی۔ بے بے' امی اور پھپھو کی لاڈلی۔ ابا دل سے بیٹی کو چاہتے' مگر ایک وقار جوان کی شخصیت کا خاصا تھا۔ ہمیشہ فجر کو نازبرداریوں کے راستے میں کانٹے کی طرح چبھتا۔ وہ ابا کی بارعب شخصیت سے بے حد مرعوب تھی۔ دادا کو گزرے زمانہ ہوا تھا۔ لہٰذا وہ گھر میں موجود صرف دو مردوں سے واقف تھی۔ ایک ابا اور دوسرا اس کا لاڈلا بھائی بلال عرف بلو۔ جو کچھ اس ترتیب سے پیدا ہوا۔ ابا کی شادی کے دو سال بعد فجر پھر سات سال بعد ماہ نور اور بلال کی شکل میں دو جڑواں' بہن بھائی پیدا ہوئے' مگر پہلے ماہ نور دنیا میں تشریف لائی' جبکہ اس کے بعد بلال عرف بلو دنیا میں وارد ہوئے۔ یوں یہ فیملی مکمل ہوگئی' مگر وہ چونکہ دونوں' بہن بھائی سے ہی سات سال بڑی تھی۔ لہٰذا ہر وقت ان کی اماں جان بنی پھرتی۔ بہرحال بلو اس کے نزدیک ایک نہایت معصوم بچہ تھا۔ (ہمسائیوں سے رسالے جو مانگ کر لاتا تھا۔) جبکہ ابا نہایت سنجیدہ اور بااصول قسم کے شخص تھے جو اپنے اصولوں اور روایات سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹتے تھے۔

دفعتاً "گیٹ کے زور' زور سے دھڑ دھڑائے جانے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور تکیے کے نیچے رسالہ چھپا کر باہر کو لپکی' ایسی ہڑبونگ مچی تھی کہ پوچھے بنا ہی گیٹ کھول دیا' سامنے ہی پھپھو کھڑی تھیں۔ بمعہ چار عدد بیٹیوں کے' اس نے پہلے انہیں اندر آنے کا رستہ دیا' پھر پھپھو سے لپٹ گئی۔ وہ ربیعہ' سنبعہ' حرا اور افزا کو ساتھ لانے پہ پھپھو کی شکر گزار ہو رہی تھی۔ انہوں نے مسکرا کر بھتیجی کو دیکھا اور پوچھا۔

"امی کہاں ہیں تمہاری؟" اس نے جا کر کچن میں

جھانکا' بریانی کی خوشبو سارے کچن میں پھیلی ہوئی تھی اور امی غالباً" نہانے کے لیے باتھ روم میں تھیں۔

"وہ نہا رہی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ پھر انہیں دادی کے پاس بٹھا کر خود مشروب تیار کرنے لگی۔ حرا اور سنیعہ بھی چلی آئیں۔

"لاؤ کچھ مدد کردیں ہم بھی۔" حرا نے بریانی کے دیگچے سے ڈھکن اتار کر خوشبو اندر اتاری اور گلاس اٹھا کر دھونے لگی۔ "وہ آگئے؟" سنیعہ اور حرا نے بیک وقت پوچھا تو وہ مسکرا دی۔ وہ چاروں بھی رسالے پڑھنے کی اتنی ہی شوقین تھیں اور آج آنے کا خاص مقصد بھی یہ ہی تھا کہ مل کر رسالے پڑھے جائیں۔ تب ہی امی غسل خانے سے باہر آئیں' گھر میں لگی رونق دیکھ کر مسکراتے ہوئے عزیز از جان نند کی طرف آئیں اور بچیوں سے ملنے لگیں۔ ان کا اپنی نند سے ہمیشہ سے ایسا ہی پیار تھا۔ دونوں خالہ زاد بھی تھیں اور پکی سہیلیاں بھی' اسی لیے خوب بنتی تھی۔

اس نے برآمدے میں ہی چٹائی بچھا کر کھانا لگا دیا اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھی "رسالہ پڑھنے والی" ٹیم کو بلانے کے لیے' کچھ ہی دیر بعد وہ سب کھانے میں مصروف تھے۔ اچانک ابا کی آمد ہوئی' مع بلو اور مانو کے وہ خاموشی سے اٹھی اور ابا وغیرہ کے لیے بھی پلیٹوں کا انتظام کرنے لگی' ابا' بھانجیوں کے سر پر دست شفقت رکھ کر بہن سے ملے' پھر خاموشی سے کھانے میں شریک ہوگئے کہ ان کے ہاں کھانا کھاتے وقت بولنا بری عادت سمجھا جاتا تھا۔ کھانے کے بعد اماں کے ہاتھوں کا بنا حلوہ سب کو دے کر وہ حرا کے ساتھ چائے بنانے چل دی۔ یہ سب باتیں اس نے ان ہی رسالوں سے سیکھی تھیں جو ابا کے نزدیک بے حیائی کا سامان تھے۔ امی نے مان سے اس کی طرف دیکھا۔

ظہر کی اذان کے شروع ہوتے ہی ابا مسجد کی طرف چلے گئے۔ خواتین گھر پر ہی نماز ادا کرنے کا اہتمام کرنے لگیں۔ پھپھو یقیناً" باقی باتیں ابا کے مسجد سے واپسی پر آنے پہ کرتیں۔ لہٰذا خاموشی سے نماز ادا کرنے لگیں' وہ جب بھی آتیں' ہر قسم کے مسئلے پر بھائی سے مشورہ ضرور کرتیں۔ شام کو انہیں واپس بھی جانا تھا۔ لڑکیاں نماز ادا کر کے گوشہ نشین ہو چکی تھیں۔ رات کا کھانا امی کے ساتھ تیار کرواتے ہوئے وہ ان دونوں کا ہوم ورک بالکل بھول چکی تھی' جسے کرنے کی اس نے ہامی بھری تھی۔

☼ ☼ ☼

نماز کی پابند تھی' فجر کی آنکھ پہلی اذان پہ ہی کھل گئی۔ امی اور بے بے لوگ بھی نماز کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ بے بے تو خیر تہجد گزار تھیں۔ معمول کے مطابق سب مصروف تھے۔ ابا نے بلال کو نماز کے لیے آواز دی تو وہ اٹھ کر ان کے ساتھ چلا گیا۔ فجر نے مانو کو جگایا' نماز ادا کرنے کے بعد جوں ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا تو بے اختیار مسکرا دی۔

"آپا...." ماہ نور صدمے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جو بے حد اطمینان کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

"آپا! آپ نے ہمارا ہوم ورک نہیں کیا؟" وہ منہ بسور کر دبی آواز میں چلائی۔ مبادا امی' ابا ہی نہ سن لیں۔

"نہیں...." فجر نے اطمینان سے ---- ڈائجسٹ اٹھایا اور ورق گردانی کرنے لگی۔

"مگر کیوں آپا؟" وہ صدمے سے چور آواز میں بولتی کاپیاں کھول کھول کر دیکھ رہی تھی۔

"کیا یہ میرے ذمے تھا؟ تم لوگوں کا کام تمہارا فرض ہے' چلو شاباش جلدی سے بیٹھ کر مکمل کرو۔" اس نے رسان سے کہتے ہوئے مفت مشورہ بھی دیا' تو مانو جل کر بولی۔

"مگر آپا! آپ نے تو ہم سے کہا تھا کہ آپ ہمارا ہوم ورک کریں گی۔" مانو بھی جیسے اس کو یاد کروانے پر تل ہی گئی تھی۔

"ہاں میں نے کہا تھا' بالکل کہا تھا کہ میں "ہوم

ورک" کروں گی۔" اس نے ہوم ورک پر زور دے کر کہا تو مانو منہ بنا کر بولی۔

"پھر کیا کیوں نہیں؟" وہ سچ مچ آپا کے جملوں کو سمجھ نہ سکی تھی' جو پہیلیاں بھجوائے جا رہی تھیں۔

"ارے مانو! ایسا نہیں تو کیا فارغ بیٹھی رہی' کل گھر کا اپنا سارا کام کس نے کیا؟" وہ ماہ نور کو بے وقوف بنا رہی تھی۔

"آپا میں گھر کے کام کی نہیں اسکول کے کام کی بات کر رہی ہوں۔" وہ جیسے زچ ہو کر بولی۔

"آ... اچھا تو تم دونوں کل مجھے اس ہوم ورک کی بابت کہہ رہے تھے۔" وہ رسالہ رکھ کر اس کی طرف مڑی اور ایک کاپی کو اٹھا کر دیکھا۔

"وچ چچ... میں سمجھی "ہوم ورک" مطلب گھر کا کام... میں بھی کہوں ان دونوں کو کیا ہوا ہے' میں تو ہر روز ہی گھر کا کوئی نہ کوئی کام کرتی ہوں۔ تو تم یہ والا ہوم ورک کہہ رہے تھے۔" وہ افسوس سے منہ بنا کر بولی۔

"مگر اب کیا ہو سکتا ہے' ایسا کرو جلدی سے دونوں بیٹھ کر کام مکمل کر لو' میں بلال کو بھی مسجد سے آنے پر کمرے میں ہی بھیج دوں گی۔" وہ مانو کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے باہر نکل گئی۔ اگر آج ان کا ہوم ورک کر دیتی تو وہ روز ہی بہانہ بنا کر اسے کہتے۔

پہلے پہل وہ رسالے ہمسائیوں سے لے کر پڑھتی تھی۔ مگر جب سے ابا نے اسے کالج میں ایڈمیشن دلایا تھا۔ وہ جیب خرچ جمع کرتی اور مہینے کے شروع میں خواتین' شعاع' کرن' گھر لے آتی' مگر ابا سے چھپا کر۔ گاؤں کا تانگہ والا بابا بک اسٹال سے کتابیں خریدتی بچی کو دیکھ کر سراہتا' جو ہر مہینے تھیلے بھر کر کتابیں لاتی' اس کے خیال میں یہ بچی نہایت محنتی تھی۔ شکر کے اس نے آج تک کتابوں کے ٹائٹل نہ دیکھے تھے۔ ورنہ کیا پتا وہ بھی ان کتابوں کو ابا کی طرح ہی سمجھتا اور آئندہ اس کے کتابیں لینے کے لیے گاڑی بک اسٹال پر نہ روکتا۔ لہٰذا وہ کالے شاپر میں احتیاط سے لاتی تھی۔

اس نے دو تین دن لگا کر سب رسالے پڑھ لیے تھے۔ کیونکہ وہ سب حرا' فزا لے کر جاتی تھیں' پھپھو کے اتنے اچھے حالات نہ تھے کہ وہ ان شاہ خرچیوں کی متحمل ہو سکتیں۔ لہٰذا چاروں بچیوں کو میٹرک تک تعلیم دلوا کر قریبی مدرسے تفسیر پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ ان سب کو پڑھ کر دے دیا کرتی تو پہلے سے زیادہ گہرا رشتہ محسوس ہوتا۔ تفریح کی تفریح' علم کا ذریعہ الگ سے۔ اب بھی وہ صرف خواتین رکھ کر تمام رسالے (اپنی نظر میں) ہدیہ کر چکی تھی۔ باقی رسالے وہ پچھلا ایک ہفتہ لگا کر پڑھ چکی تھی۔ صرف خواتین بچا تھا۔ یہ رسالہ بھی پڑھ کر اسے حرا وغیرہ کو ہی دینا تھا اور جب وہ لوگ بھی پڑھ لیتیں تو وہ واپس اس کے پاس آ جاتے۔ پھپھو رازداری سے یہ کام کر دیتی تھیں اور پھر یہ ہی رسالے سارے گاؤں کی لڑکیاں لے کر پڑھتیں' اس کی کئی کلاس فیلوز جو میٹرک کے بعد گھر بیٹھ چکی تھیں۔ وہ بھی اس کے رسالوں سے فیض یاب ہوتیں۔

وہ بہت خوش تھی' شہر کی تعلیم کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ وہ واپسی پہ رسالے لے آیا کرتی تھی۔ دن یوں ہی افراتفری میں گزر جاتے۔ مگر وہ ان رسالوں سے دن بہ دن بہت کچھ سیکھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ ایسی باتیں بھی جو ایک ماں' بیٹی کو سمجھاتی ہے' وہ پر اعتماد ہوتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اف... ف ف ف..." وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ بلو ناشتا کیے بغیر ہی اسکول جا چکا تھا۔ جب وہ مسجد سے لوٹا تو مانو نے منہ بنا کر ساری داستان اس کے گوش گزار کی' اس نے بھی منہ بنا لیا' پہلے تو آپا کو دوبارہ سے یاد دہانی کروائی' مگر آپا کے نہ ماننے پر جبراً" جلدی جلدی ہوم ورک مکمل کیا اور اب ناراضی کے اظہار کے طور پہ وہ ناشتا کیے بنا ہی اسکول جا چکا تھا۔ وہ اس کو منانے کا پروگرام ترتیب دینے لگی۔ پھر معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئی کیونکہ جانتی تھی آگے جون' جولائی کی چھٹیاں ہونے والی تھیں اور چھٹیوں میں باجی سارہ

(ٹیوشن والی) سے رسالے اسی نے لاکر دیئے تھے۔ وہ اپنے ابو سے سارے رسالے منگوایا کرتیں اور جب پڑھ لیتیں تو اپنی ہمسائیوں اور ٹیوشن آنے والی بچیوں کو پڑھنے کے لیے دے دیا کرتی تھیں۔ میٹرک تک اس نے بھی ان سے ٹیوشن لی تھی۔ لہٰذا وہ بھی اس معمول کا حصہ تھی۔ اب بھلے ہی وہ سیال بھر سے کالج سے واپسی پر رسالے لے آیا کرتی تھی، مگر چھٹیوں میں تو ایسا کچھ بھی ممکن نہ تھا۔ سوا سے بلال عرف بلو (یعنی باگڑ بلے) کو منانا بھی تھا۔ ترکیب ذہن میں آتے کے ساتھ ہی وہ مسکرا اٹھی، آج کالج سے چھٹی کی تھی۔ لہٰذا پرانے رسالے کھنگالنے لگی۔ اسے بلو کو منانے کے لیے مزاحیہ کہانی ڈھونڈنی تھی۔ وہ اپنے کام میں مشغول ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

جون کی آٹھ تاریخ تھی۔ چلچلاتی دھوپ، گرمی اپنے جوبن پر تھی۔ پھپھو آئیں تو مٹی کے رسالے تھیلے میں سے نکال کر اسے تھمائے۔

"لو بیٹا! بہت شکریہ تمہارا۔" پھپھو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے پھپھو! ایسا تو نہ کہیں۔" وہ خفت زدہ انداز سے مسکرائی۔

"ارے کیوں نہ کہوں بیٹا! پتا ہے حرا نے مجھے اتنی ساری احادیث پڑھ کر سنائیں، میرا تو دل خوش ہو گیا۔" وہ محبت سے بولیں۔

"اللہ بھلا کرے ان رسالے والوں کا، کیسی اچھی اچھی کام کی باتیں چھاپتے ہیں وہ، ایمان تازہ ہو گیا قسم سے۔" وہ اب امی سے کہہ رہی تھیں۔ فجر نے رسالے اٹھائے اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اور

انہیں بیڈ پر ہی رکھ کر وہ باہر چلی آئی۔ سوچا پہلے پھپھو کے پاس بیٹھے گی، پھر رسالے سنبھال کر رکھ دے گی۔ کبھی کبھی انسان کی معمولی سی لاپروائی ہی اس کے لیے کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن جایا کرتی ہے۔ اس

طوفان سے بے نیاز وہ یوں ہی ہنستی مسکراتی پھر رہی تھی، اگر جو اسے اس طوفان کی خبر ہوتی تو کیا وہ یوں لاپروائی سے رسالے بیڈ پر پھینک کر سکون سے بیٹھتی؟ ہاں! مگر طوفان کون سا اپنے آنے کی خبر دے کر آیا کرتے ہیں۔ ان کی بلا سے فجر کریم روئے یا ہنسے انہیں کیا پروا۔ وہ کون سا دلوں کے حال سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ دل جوان رسالوں میں شائع ہونے والی تحریروں کے ہر ہر کردار کے ساتھ روتا یا ہنستا تھا۔ یہ دنیا اگر خیالوں کی دنیا تھی تو ایک ایسی دنیا بھی تھی جو اس کی زندگی کے ہر ہر قدم پر اس کو جینا سکھا رہی تھی۔ وہ ایک بیٹی تھی۔ بیٹیاں تو ویسے بھی ہر اچھی چیز کو جلدی قبول کر لیتی ہیں اور وہ بھی ہر اچھی چیز، ہر اچھی عادت، ہر اچھا خیال کب کسی کردار سے نکال کر خود میں سمو لیتی اسے خود بھی خبر نہ تھی، اگر وہ یہ رسالے نہ پڑھا کرتی تو ایک عام بیٹی ضرور ہوتی، مگر ایک سگھڑ بیٹی بھی نہ ہوتی۔

یہ اس کا ذاتی خیال تھا۔ وہ جس تحریر میں بھی کسی کام پر بیٹی کو شاباش ملتے دیکھتی، لاشعوری طور پر کوشش کرتی کہ وہ خود بھی ایک ایسا ہی کردار بن جائے جس سے سب محبت کرتے ہوں۔

آج پھپھو ذرا دیر سے جانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ ربیعہ کا رشتہ آیا ہوا تھا اور وہ بھائی سے مشورہ کرنا چاہتی تھیں اور بھائی سے ہر ہر معاملے میں مشاورت کرنا تو ان کا پرانا اصول تھا۔ لہٰذا وہ بھی مشاورت کے لیے بھائی کے انتظار میں تھیں۔ ساتھ ساتھ بے بے اور بھابھی سے محو گفتگو بھی۔ ابا بہن کی آمد کا مقصد جانتے تھے۔ تب ہی وہ تین بجے فیکٹری سے لوٹ آئے تھے۔ وہ آکر بہن سے ملے اور پھر "دو منٹ" انتظار کرنے کا کہہ کر ماں، بلو اور فجر کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھے۔ وہ ذرا بلو کی طبیعت صاف کرنے جارہے تھے، کیونکہ راستے میں ہی مولوی صاحب نے ان سے کہا تھا کہ بلو چھٹیاں بہت کرنے لگا ہے اور قرآن مجید بھی دل لگا کر نہیں پڑھ رہا۔ بلو محو خرام تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئے۔ نظریں بستر پر پڑے رسالوں پر جا ٹھہریں۔ ان رسالوں کے بارے میں ناپسندیدگی کے باوجود وہ ان ہی کے گھر میں تھے اور وہ بھی فجر کے پلنگ پہ... وہ دھاڑے۔

"فجر...!" سکھ، چین کے ٹھنڈے درخت تلے بیٹھی چڑیاں کنالی سے پانی پیتے یوں اڑیں جیسے حیرت زدہ ہوں۔ اس گھر میں تو ہمیشہ نرمی سے بات کی جاتی تھی، پھر اب کیا ہوا؟

"فجر! یہاں آؤ۔" وہ دوبارہ غصے سے چلا کر بولے۔ آواز میں غصے کی زیادتی نمایاں تھی۔ اماں، پھپھو، بے بے کانپتی ہوئی اٹھیں۔

"الٰہی خیر..." تینوں بے اختیار بولیں، ایسا بھی کیا تھا کمرے میں؟ مگر جو تھا وہ ان کے گمان میں بھی نہ تھا۔ فجر سہمی چڑیا کی مانند حاضر تھی۔ بلو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"یہ... یہ یہاں کیسے آئے؟" انہوں نے رسالوں کی طرف حقارت سے اشارہ کیا جہاں بنی سنوری لڑکیاں جیسے ان پر ہنس رہی تھیں۔

"وہ... وہ ابا یہ، وہ میں..." وہ ہچکچا کر بولی۔ آنسو ابل ابل کر آنکھوں سے باہر آرہے تھے۔ ابا زندگی میں پہلی بار یوں مخاطب ہوئے تھے۔ وہ ڈھنگ سے جواب بھی نہ دے پائی۔ سوچ سکی تو بس یہ کہ ہاں وہ جو رسالوں میں لکھا ہوا ملتا ہے کہ...

"وہ... جو ہم سے بے تحاشا محبت کرتے ہوں، ان کا تلخی سے بولا گیا، ایک بول بھی برداشت سے باہر ہوتا ہے۔" بالکل سچ ہے، اس نے کہاں سنی تھی، ابا کی ایسی دہلانے دینے والی آواز۔ اس کا تو جیسے رواں رواں کانپ اٹھا تھا۔ کیا رسالہ پڑھنا اتنی بری بات ہے جو ابا یوں دھاڑ رہے تھے۔ وہ پشیمان سی سوچوں میں غرق آنسو بہائے چلے جارہی تھی، ابا گرج رہے تھے اور پھپھو اللہ جانے ان کو کیا سمجھا رہی تھیں۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا، وہ چونکی تب جب ابا اس کے تمام رسالے اٹھا کر اس کے سامنے سے نکل کر کچن کی طرف بڑھے تھے، وہ ٹرانس کی سی کیفیت میں ان کے پیچھے چل دی، شاید ردعمل جاننا چاہ رہی تھی۔ ابا رسالے پھاڑ پھاڑ کر آگ میں پھینک رہے تھے، وہ سکتے سے باہر نکلی، پہلی سوچ جو اس کے دماغ سے ٹکرائی۔

"او میرے خدا! اس میں تو... نہیں۔" وہ احادیث کا سوچتے ہی باورچی خانے کی طرف بڑھی، آنسو، ابا کا غصہ اور اپنا دھڑکتا دل سب بہت پیچھے رہ گئے تھے جو چیز دل و دماغ میں الارم بجارہی تھی۔ خبردار کررہی تھی، وہ یہ ہی تھی۔

"ابا کو روکو۔" اور بس اس نے جاکر شعلے پکڑتے رسالے ہاتھ سے، دوپٹے سے بجھانا شروع کردیے، اماں اور پھپھو کو وہ بالکل پاگل لگی۔ ابا نے غصے سے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔

"پاگل ہوگئی ہو؟" وہ ایک بار پھر دھاڑے، مگر اس دفعہ آواز میں نرمی کی جھلک دکھائی دی۔

"ابا... قرآنی آیات اور احادیث ہیں اس میں، اللہ کے واسطے ایسا مت کریں۔" وہ ان کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہونے کو کسمسائی۔ پھر دفعتاً ابا کی نظر ایک جلتے پھڑپھڑاتے ہوئے صفحے پر پڑی تھی۔ کسی راست باز (مومن) کے لیے مناسب نہیں کہ وہ لعن طعن کرنے والا ہو۔

"اف..." انہوں نے فجر کو چھوڑ کر جلدی سے چولہا بند کیا۔

"کیا رسالوں کے اندر آیات اور احادیث؟" وہ سخت پریشانی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے صفحات کو بجھانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ایک بار کسی دوست کے پاس کچھ اسی قسم کے رسالے دیکھے تھے۔ ایک دو صفحات ہی پڑھے تھے کہ کان کی لوئیں تک سرخ ہو گئیں۔ وہ سراسر فحش لٹریچر تھا۔ مگر کیا ہر لٹریچر ہی فحش ہو یہ ضروری ہے؟ بس وہ رسالہ بیرونی وضع قطع سے اسی رسالے سے مشابہہ تھا۔

"آہ!" آگ بجھا کر دونوں باپ، بیٹی شدت غم سے آنکھیں میچے بیٹھے تھے۔ ہاتھ جلنے کا دکھ تھا یا اپنی اپنی الگ کیفیات تھیں دونوں کی۔ حقیقتاً" کچھ ایسا ہی تھا۔ ابا اپنی جلد بازی یا پھر بے وقوفی (ان کی اپنی نظر میں) پر پچھتا رہے تھے اور فجر۔۔۔ فجر کس دکھ میں تھی؟ دکھ کا لفظ شاید بہت چھوٹا تھا۔ وہ حالت دکھ سے زیادہ حالت بے یقینی میں تھی۔ ابا سے رسالے چھپا کر پڑھنا، مان لیا کہ واقعی غلط تھا۔ مگر کیا اس قدر غلط تھا کہ ایسی بھیانک سزا ملتی وہ احادیث اور آیات مبارکہ کی بے حرمتی (اپنی وجہ سے) ہوتے دیکھ کر سن تھی۔

"کاش میں نے کبھی رسالے نہ پڑھے ہوتے۔ کبھی گھر نہ لائی ہوتی، تو آج ایسا نہ ہوتا۔" سوچ دامن گیر ہوئی تو آنسوؤں نے شدت پکڑ لی، مگر یہ کیا؟ ابا تمام رسالوں کو شیلف پر رکھنے کے بعد زمین پر بیٹھی فجر کے قریب ہی بیٹھ گئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ (وہ تو سمجھ رہے تھے کہ یہ بھی فحش قسم کا لٹریچر ہی تھا، مگر یہ کیوں بھول گئے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اور چلو ایسا بھی نہ سہی کیا فجر ان کی اپنی بیٹی ایسی ہو سکتی تھی؟ کہ فحش لٹریچر پڑھنے لگتی۔) فجر نے ابا کے گلے لگ کر دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ ساکت و جامد تین نفوس جو برآمدے میں کھڑے تھے۔ ان میں حرکت ہوئی۔ وہ بھی جامد کیفیت سے نکل کر زمین پر بیٹھے بیٹی اور باپ کی طرف بڑھے۔ پھپھو نے سکون کی سانس لی۔ باپ، بیٹی کو گلے لگا دیکھ کر اماں، بے بے کو چارپائی پر بٹھا کر باورچی خانے سے برنال نکال لائیں۔

وہ خواہ مخواہ تماشا کرنے والی عورت نہ تھیں، نم آنکھوں سے شوہر اور بیٹی کے ہاتھوں پر برنال لگائی۔ پھپھو نے آج کے دن بھائی سے مشاورت کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ آج کے دن کم از کم کوئی اور موضوع نہیں چھیڑنا چاہتی تھیں۔ جان سے پیاری بھتیجی کے آگے اپنی بیٹی کی بات تو کچھ بھی نہ تھی۔ "کاش وہ آج رسالے نہ لاتیں۔" انہوں نے شرمندگی سے سوچا۔

☼ ☼ ☼

"ٹھک ٹھک ٹھک!" دروازے پر کھٹکا ہوا۔

"کون۔۔۔" فجر نے پوچھا۔

"ڈاکیہ ہوں، بیٹی یہ کتابیں وصول کر لو۔" ڈاکیہ گاؤں کا ہی تھا۔ آج دوسری بار وہ گھر رسالے دینے آیا تھا۔

فجر نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولا اور رسالے وصول کیے۔ دفعتاً" ابا بھی گلی میں نمودار ہوئے، مگر فجر کے چہرے پر گھبراہٹ کی بجائے مان بھری ہلکی مسکراہٹ اور اعتماد تھا، کیونکہ اس دن کے بعد ابا نے خود فجر سے پوچھ کر رسالے سالانہ لگوا دیے تھے۔ کبھی کبھار انسان کو بڑوں کے آگے بول بھی لینا چاہیے کیونکہ وہ "بولنا" سب کی بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔ ابا نے اگر رسالے جلا دیے ہوتے اور وہ بولتی بھی ناں (کہ ان میں ہوتا کیا ہے؟) تو سب کچھ خاموشیوں کی نذر ہو جاتا۔ فجر نے بول کر اپنے لیے راہ ہموار کر لی تھی اور حق، سچ کی خاطر بولنا اس نے ان ہی رسالوں سے سیکھا تھا۔

ابا نے بعد ازاں ان ہی جلے رسالوں میں سے ایک میں (غالباً" شعاع میں) فرح بخاری کی تحریر "ضرورت" پڑھی تھی، پڑھنے کے بعد مسکرائے "اگر ایسی ہی کہانیاں ہیں اس میں تو یہ تو سیکھنے کی چیز ہے، بھئی اور پھر ساتھ احادیث اور حمد و نعت وغیرہ بھی تو ہوتی ہیں اس میں کچھ خاص مضائقہ بھی نہیں ہے" وہ مسکرا دیے۔ طوفان کی گرد چھٹ چکی تھی۔

✿

مجھے نہیں معلوم

یہ کس کے عشق کا قصہ ہے
مجھے نہیں معلوم
بس اتنا یاد ہے ظریف احسن
پھولوں میں بسا کرتے تھے
خوابوں کو بُنا کرتے تھے
کتابوں کو پڑھا کرتے تھے
حجابوں میں رہا کرتے تھے
راتوں کو جگا کرتے تھے
زلفوں میں رہا کرتے تھے
یہ کس کے عشق کا قصہ ہے
مجھے نہیں معلوم
بس اتنا یاد ہے ظریف احسن
اک دوجے کے نام کو
مہندی سے لکھا کرتے تھے
خوب سجا کرتے تھے
اپنا کہا کرتے تھے
یہ کس کے عشق کا قصہ ہے
مجھے نہیں معلوم

ظریف احسن

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے و لے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

اک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل
ہل من مزید کہتی ہے رحمت دُعا کے بعد

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

مولانا محمد علی جوہر

شگفتہ جاہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب تین آدمی ہوں تو تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں۔"

(بخاری و مسلم)

خیال میرا خوشبو کی طرح،

- ہم نے سمندروں میں مچھلی کی طرح تیرنا اور فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑنا سیکھ لیا مگر آج تک ہمیں زمین پر انسانوں کی طرح رہنا نہیں آیا۔
- ضمیر کی عدالت میں ضرور جائیے کیونکہ وہاں غلط فیصلے نہیں ہوتے اور نہ ہی وکیلوں کی فیس بھرنی پڑے گی۔
- جو لوگ کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ کر دکھاتے ہیں اور جو کچھ نہیں کر سکتے، وہ نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔
- جب ہم اللہ سے مانگتے ہیں تو بے حساب مانگتے ہیں لیکن جب عبادت کا وقت آئے تو نوافل بھی گن کر ادا کرتے ہیں۔
- ظلم بغاوت کو جنم دیتا ہے یا پھر احتجاجی موت کو۔
- جڑیں سلامت ہوں تو ٹنڈ منڈ درختوں پر بھی موسم بدلتے ہی پھول آجاتے ہیں۔
- ایک خوبصورت دل ہزار خوبصورت چہروں سے بہتر ہوتا ہے لہٰذا بہتر لوگ منتخب کریں جن کے پاس خوبصورت دل ہیں نہ کہ خوبصورت چہرے۔
- اگر آپ اپنی زبان سے یہ وعدہ لے لیں کہ وہ صرف ایک معقول بات کرے گی تو آپ دیکھیں گے کہ

رفتہ رفتہ آپ خاموش ہوتے جا رہے ہیں۔
سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

احساس،

شکر ہے
کہ سکھ کی ساری
دعائیں

قبول نہیں ہو جاتیں
ورنہ تو کبھی ہم
اپنے آپ کو دیکھ سکیں
اور نہ کبھی چھو سکیں

(فرحت عباس شاہ)
گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

خمیازہ،

پروفیسر صاحب کے ایک شاگرد نے قدرے شرماتے ہوئے ان سے کہا۔
"سر! آپ کی صاحبزادی مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گئی ہیں۔"
پروفیسر صاحب جو اس وقت ایک کتاب دیکھ رہے تھے، بے دھیانی میں بولے۔
"تو بھی اب مجھ سے شکایت کیوں کر رہے ہو؟ روزانہ تم میرے گھر کے چکر لگا رہے تھے، آخر اس کا نتیجہ تو یہی نکلنا تھا۔"

حمزہ، اقرا۔ کراچی

فیض احمد فیض،

فیض احمد فیض اور ان کی اہلیہ بھارت گئے ہوئے

تھے۔ مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعلا نے فیض صاحب کو فون کیا اور کہا۔

"آپ کو سری نگر آنے کی دعوت دیتا ہوں، جہاں آپ شادی کی سالگرہ منائیں اور گھومیں پھریں۔"

فیض صاحب یہ بات سن کر مسکرائے اور وزیر اعلا کو جواب دیا۔

"بھئی، یہ تو ٹھیک ہے مگر ہم وہاں کیسے آ سکتے ہیں ہم تو کشمیر میں آپ کی حکومت کو مانتے ہی نہیں ہیں۔"

سمجھ دار

ایک عورت اپنی کسی دلی مراد کے حصول کے لیے ایک پیر صاحب کے آستانے پر حاضر ہوئی۔ پیر صاحب نے مسئلہ سننے کے بعد فرمایا۔

"محترمہ! یہ بہت مشکل کام ہے۔ مجھے اس کے لیے بڑی سخت اور کٹھن چلہ کشی کرنا ہوگی اور اس کے ساتھ مجھے تھوڑی رقم بھی درکار ہوگی۔"

عورت: "پیر صاحب! کتنی رقم درکار ہوگی؟"

پیر صاحب: "زیادہ رقم نہیں چاہیے بس یہی کہ دنیا میں کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے ہیں لہٰذا ہر نبی کے نام پر ایک روپیہ دینا ہوگا۔"

عورت بھی پیر صاحب کی طرح بہت پہنچی ہوئی تھی۔ جھٹ سے بولی۔

"پیر صاحب! ایسا ہے کہ آپ ایک ایک کر کے بصد ادب ہر نبی کا نام لیتے جائیں اور میں ہر نام کے بدلے ایک روپیہ پیش کرتی جاؤں گی۔"

پیر صاحب ابھی تک بے ہوش پڑے ہیں۔

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

پریشانی

ایک صاحب ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے بولے۔

"میں جب بھی ٹیکسی میں بیٹھتا ہوں تو مجھے سب سے زیادہ فکر ٹیکسی کے بریکس کی ہوتی ہے۔"

ڈرائیور نے ان صاحب کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"اس ٹیکسی میں بیٹھ کر آپ کو بریکس کے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ اس ٹیکسی میں بریکس ہی نہیں ہیں۔"

آمنہ محمد نوید۔ پیچوکی ملیاں

ایک چھوٹا سا لمحہ

دل درد کا ٹکڑا ہے
پتھر کی ڈلی سی ہے
اک اندھا کنواں ہے یا
ایک بند گلی سی ہے
ایک چھوٹا سا لمحہ ہے
جو ختم نہیں ہوتا
میں لاکھ جلاتا ہوں
یہ بھسم نہیں ہوتا

گلزار

ابو النصر فارابی

سلطان سیف الدولہ کے دربار میں کنیزیں گا رہی تھیں۔ ایک ترک درویش نے کنیزوں کے گانے پر اعتراض کیا اور کئی خامیاں نکالیں۔

سلطان نے پوچھا "آپ اس فن سے واقف ہیں؟"

درویش نے جواب دیے بغیر اپنی کمر سے ایک تھیلی کھولی اور چند لکڑیوں کے ٹکڑے نکال کر انہیں جوڑا اور پھر بجانے لگے۔ بے اختیار تمام حاضرین ہنسنے لگے پھر لکڑیاں ایک دوسرے انداز میں جوڑیں اور بجائیں حاضرین محفل رونے لگے۔

اس کے بعد درویش نے تیسری دفعہ لکڑیوں کو جوڑا اور پھر دھن بجائی۔ اب سب لوگ سو گئے۔ دربان، بادشاہ، کنیزیں سب گہری نیند میں چلے گئے۔ یہ درویش مشہور سائنس دان ابو النصر محمد بن الفارابی تھے۔

ندا، فضہ۔ کراچی

مسائل کتنے،

ہم کو درپیش ہیں اب اتنے مسائل انور
ان کو گننے بھی جو بیٹھیں تو زمانے لگ جائیں
کوئی تدبیر ہو اس ایک پریشانی کی
بکھرے ہوئے شاید ہیں ٹھکانے لگ جائیں

ملائکہ کوثر۔ بسم اللہ پور

سراغ رساں،

شرلاک ہومز کے دوست اور دست راست ڈاکٹر واٹسن ایک روز صبح ہی صبح ہومز کے ہاں پہنچے تو اس نے کہا۔
"گڈ مارننگ واٹسن! آج خاصی گرمی ہے لیکن تم نے اتنے موٹے اور سرخ کپڑے کا انڈرویر پہنا ہوا ہے۔"
"کمال ہے۔" واٹسن حیرت سے بولا۔" ہومز! تم نے کس طرح سراغ لگایا کہ میں نے موٹے سرخ کپڑے کا انڈرویر پہنا ہوا ہے۔"
"تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں چھوٹے سے چھوٹے سراغ کو بھی نظرانداز نہیں کرتا جیسے ہی تم کمرے میں داخل ہوئے میں نے دیکھ لیا کہ انڈرویر کے اوپر تم پتلون پہننا بھول گئے ہو۔"

نادیہ، نجمہ۔ گلستان جوہر

یثرب،

نام تو طیبہ تھا لیکن اہل عرب اسے یثرب کہتے تھے۔ عربی میں یثرب تکلیف اور بیماری کے مقام کو کہا جاتا ہے۔ یہ بات تھی بھی درست۔ پورے عرب میں سب سے زیادہ بارشیں اسی علاقے میں ہوتی تھیں لہٰذا وادی میں زہریلے مادے پیدا ہو گئے تھے جو بھی طیبہ میں قدم رکھتا، بیمار ہو جاتا لیکن پھر وہاں میرے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو یثرب مدینہ بن گیا اور طیبہ منورہ اور پھر یہ شہر دنیا میں سکون، ایمان، شفا اور قبولیت کا مرکز بن گیا۔

(جاوید چودھری۔ زیرو پوائنٹ)

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

مشورہ،

اگر آپ دکھ درد کی کہانیاں بند کر دیں، کسی نہ

کسی طور پر نگڑے ہو جائیں اور یہ تہیہ کر لیں کہ اللہ نے اگر ایک دروازہ بند کیا تو وہ اور کھولے گا تو یقیناً اور دروازے کھلتے جائیں گے۔

(اشفاق احمد)

نوال افضل گھمن۔ کراچی

رد بلا،

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ سفر کرنا تھا اور ان کو ماں نے نصیحت کی تھی جب تم سفر میں نکلا کرو تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ نہ کچھ ضرور خرچ کیا کرو۔ ایک روز سفر کے دوران وہ بزرگ کھانا کھانے بیٹھے تو ایک سائل آپ کے پاس آیا۔ انہوں نے اپنی روٹی سائل کو دے دی اور اپنا سفر جاری رکھا۔ راستے میں انہوں نے ایک سانپ کو دیکھا جس کے اوپر ان کا پاؤں پڑا۔ وہ بڑے پریشان ہوئے کہ کہیں وہ ڈس نہ لے۔ جب پیچھے ہٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس سانپ کے منہ میں کوئی چیز ہے جس نے اس کے منہ کو بند کیا ہوا ہے۔ وہ بڑے حیران ہوتے کہ اس سانپ کے منہ میں کیا چیز پھنسی ہوئی ہے؟ جب اس کو مار تو دیکھا کہ وہ روٹی کا ٹکڑا تھا جو اس کے منہ میں پھنسا ہوا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اللہ کے راستے میں جو خرچ کرتا ہے اس کی بلائیں اور مصیبتیں اس کے بدلے میں دور ہوتی ہیں۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

رشتہ،

ایک سردار جی رشتے کی بات چیت کرنے کے لیے لڑکی والوں کے گھر گئے۔ لڑکی کے والدین نے کہا۔
"معذرت جی ابھی ہماری لڑکی پڑھ رہی ہے۔"
سردار نے جواب دیا۔"کوئی بات نہیں جی۔ میں ایک دو گھنٹے کے بعد دوبارہ چکر لگا لوں گا۔"

مدیحہ نورین مہک۔ برنالی

خالدہ جیلانی

حنا کنول فرحان ________ حویلی لکھا

دیا بجھا ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے

شفق راجپوت ________ گوجرہ

ہمیشہ غیر کی عزت تیری محفل میں ہوتی ہے
تیرے کوچے میں جا کے ہم ذلیل و خوار ہوتے ہیں

عظمیٰ شفیق ________ جڑانوالہ

اپنے بالوں کی سفیدی سے ڈر لگتا ہے
زندگی اب تیری رفتار سے ڈر لگتا ہے

آسیہ فرید ________ ملتان

یوں تو لا حاصل بہت کچھ رہا
پر سر فہرست رہی کمی تیری

حرا ملک ________ وہاڑی

کتابوں سے دلیلیں دوں یا خود کو سامنے رکھوں
وہ مجھ سے پوچھ بیٹھے ہیں محبت کس کو کہتے ہیں

رضوانہ شکیل راؤ ________ لودھراں

بہکا تو بہت بہکا سنبھلا تو ولی ٹھہرا
اس خاک کے پتلے کا ہر رنگ نرالا ہے

ودشا عنبر خان ________ ملتان

اداس وقت اداس زندگی اداس موسم اداس رات
کتنی چیزوں پر الزام لگ گیا ان کے جانے کے بعد

رخ جی ________ جڑانوالہ

مجھ کو تو گردش حالات پہ رونا آیا
رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا

کبریٰ عباسی ________ گاؤں کابز

بہت ملنے ملانے میں لگا ہوں
میں اب خود کو بھلانے میں لگا ہوں
ہے کار عشق بھی کار اذیت!
خود اپنا دل دکھانے میں لگا ہوں

خالدہ ________ گاؤں اوکھ

اے مرا حال پوچھنے والے
تجھ کو اب تک مری خبر نہ ہوئی
ہجر کی رات کاٹنے والے
کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

زرفشاں انصاری ________ کراچی

ہمارے درمیاں ہے دشت و دریا سا کوئی رشتہ
سمندر تو سمندر کی طرف چل کر نہیں آتا

فریال ________ کراچی

جس گھڑی سامنا ہوا تیرا
وہ گھڑی جیسے عمر بھر ٹھہری

نوریہ حنیف ________ کاندن سرگودھا

تو ہو، تیرا خیال ہو یا خواب
کوئی بھی رات بھر نہیں رہتا

فری گل ________ بنوں

دل دھڑکتا تھا تو میلہ سا لگا رہتا تھا
اب دھڑکتا ہے تو دھڑکا سا لگا رہتا ہے

شائستہ اکبر ________ گڈو کالونی

گم ہو چلے ہو تم تو بہت خود میں اے منیر
دنیا کو کچھ تو اپنا پتا دینا چاہیے

مدیحہ نورین مہک ________ برنالی

تقدیر کے قاضی سے میں کیا پوچھوں قسمت اپنی
وہ شخص خود ہی کہتا ہے میں تیرا نہیں ہوں

کوثر خالد ________ جڑانوالہ

وہ الم کشوں کا ملنا وہ نشاط غم کے سائے
کبھی رو پڑا تبسم کبھی زخم مسکرائے

تسنیم شریف کی ڈائری سے

موسم بدلتا جاتا ہے، دنیا بدلتی جاتی ہے مگر انسان کی سرشت اس کی محبت، نفرت، فطرت کچھ نہیں بدلتی۔ اعتبار، محبت، وفا، یقین، دھوکا صدیاں گزرنے کے بعد بھی اسی رنگ میں نظر آتا ہے۔ جو صدیوں پہلے تھا۔ اسی حقیقت کو اجاگر کرتی محسن نقوی کی یہ غزل آپ کے ذوقِ طبع کے لیے۔

وہی قصے ہیں، وہی بات پرانی اپنی
کون سنتا ہے بھلا رام کہانی اپنی

روز ملتے ہیں دریچے میں نئے پھول مجھے
چھوڑ جاتا ہے کوئی روز نشانی اپنی

دشمنوں سے ہی غمِ دل کا مداوا مانگیں
دوستوں نے تو کوئی بات نہ مانی اپنی

آج پھر چاند افق پر نہیں ابھرا محسنؔ
آج پھر رات نہ گزرے گی سہانی اپنی

شہنیلا اسلام کی ڈائری سے

پُرخلوص انسانوں کا المیہ ہے کہ جیسے ان میں کھوٹ اور منافقت نہیں ویسے ہی انہیں اہلِ سفر ملیں لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر انسان منافقت سے پاک ہو۔ اہلِ خلوص جب اپنی سی خوبیاں دوسروں میں ڈھونڈتے ہیں تو ان کے خیالات بھی بعد میں کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ منیر نیازی کی یہ غزل آپ کی نذر۔

ہم زباں میرے تھے ان کے دل مگر اچھے نہ تھے
منزلیں اچھی تھیں، میرے ہم سفر اچھے نہ تھے

جو خبر پہنچی یہاں تک اصل صورت میں نہ تھی
تھی خبر اچھی مگر اہلِ خبر اچھے نہ تھے

بستیوں کی زندگی میں بے زری کا ظلم تھا
لوگ اچھے تھے وہاں کے اہلِ زر اچھے نہ تھے

ہم کو خوباں میں نظر آتی تھیں کتنی خوبیاں
جس قدر اچھے لگے، اس قدر اچھے نہ تھے

اس لیے آئی نہیں گھر میں محبت کی ہوا
اس محبت کی ہوا کے منتظر اچھے نہ تھے

اک خیالِ خام ہی مرشد تھا ان کا منیرؔ
یعنی اپنے شہر میں اہلِ نظر اچھے نہ تھے

نمرہ، اقراء کی ڈائری سے

خمار بارہ بنکوی کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ آپ سب بہنوں کی نذر۔

آج ہم ناگہاں کسی سے ملے
مدتوں بعد زندگی سے ملے

شمع کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سلسلے سب کے تیرگی سے ملے

ان اندھیروں سے کوئی کیسے بچے
وہ اندھیرے۔ جو روشنی سے ملے

زندگی کے سلوک کیا کہیے
جس کو مرنا ہو زندگی سے ملے

ہم پہ گزرا ہے وہ وقت خمارؔ
جب شناسا بھی اجنبی سے ملے

تمہیں خوب صورت نہیں بناسکتی۔

ج۔ ایمان! چلیں اب آپ کو پتا چل گیا نا کہ بددعائیں کتنی جلدی اثر کرتی ہیں۔ آئندہ احتیاط کیجیے گا اور ہم سے شکایت کرنا واقعی بے کار ہے۔ ہم تو پورا دن اور اکثر رات کا بیشتر حصہ بھی پرچے کی تیاری میں صرف کردیتے ہیں۔ اس کے باوجود پرچہ ٹائم پر نہیں ملتا تو یہ ہمارا قصور نہیں۔ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں' اس لیے جانے دیں۔

محمودہ اکبر۔۔۔ کراچی

خواتین ڈائجسٹ میں "نمل" اور "آب حیات" بہترین سلسلے ہیں۔ میں حیران ہوں۔ نمرہ احمد اور عمیرہ احمد اتنا اچھا کیسے لکھ لیتی ہیں۔ دشت جنوں بھی اچھا ہے۔ میرا حمید کا "ابن القلم" بھی بہت اچھا ہے۔ خواتین ڈائجسٹ میری والدہ پڑھتی تھیں پھر میں نے بھی پڑھنا شروع کیا۔ یہ ڈائجسٹ نہ صرف گھریلو خواتین پڑھتی ہیں بلکہ ڈاکٹرز اور انجینئرز بھی پڑھتی ہیں' میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ جو باہر کے ملکوں کی بہترین یونیورسٹیوں سے پڑھی ہوئی ہیں' وہ بھی پڑھتی ہیں اور گھریلو خواتین سے مراد وہ خواتین ہیں جو کہ دنیا کے بہترین اور مشہور کلاسک کو بھی پڑھ چکی ہیں۔ وہ بھی خواتین ڈائجسٹ کو شوق سے پڑھتی ہیں۔ میں ڈائجسٹ میں لکھے ہوئے اشعار تو نہیں پڑھتی ہوں' مگر جب بھی پڑھتی ہوں تو بہت اچھا محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً "نومبر کے شمارے میں ایک شعر بہت اچھا لگا۔

ترے ہوتے ہوئے میرے خالق
مجھ پر ہر شخص نے خدائی کی

اس کے علاوہ "بیوٹی بکس کے مشورے" بہت کار آمد ہوتے ہیں۔ "کرن کرن روشنی" پڑھ کر بھی بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔

ج۔ محمودہ بہن! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ہماری بیشتر قارئین ہمیں لکھتی ہیں کہ ان کی والدہ اور نانی بھی خواتین پڑھتی ہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ خواتین کی قارئین میں ہر عمر ہر طبقہ کی خواتین شامل ہیں' بلکہ بیشتر مرد حضرات بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ بصرہ بہت اچھا ہے' خواتین ڈائجسٹ کو جس انداز سے آپ نے سراہا اس سے بہت خوشی ہوئی' لیکن تھوڑا ادھورا سا لگا۔ آئندہ

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

ایمان جلبانی۔۔۔ گاؤں دریا خان جلبانی

سب سے پہلے عمیرہ احمد آپ کو اتنا شاندار ناول لکھنے پر مبارک باد۔ آغاز سے لے کر اختتام تک اس ناول کے ہر ایک لفظ' ہر ایک کردار نے مجھے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ آپ کے ان لفظوں نے "پتا نہیں، ہم کتنے مومن ہیں کتنے کافر' لیکن جو بھی ہیں اللہ ہمارے دلوں سے بے خبر نہیں" آپ یقین نہیں کرسکتیں' ان جادوئی لفظوں نے مجھے کیسی سرشاری اور اطمینان والی کیفیت عطا کی۔ آخری پتا مجھے سمجھ نہیں آیا پر دوبارہ پڑھ کے سمجھنے کی کوشش کروں گی۔ پرچا اس ماہ بھی لیٹ ملا۔

اور ہاں آپی معاف کرنا خوامخواہ تمہیں اتنا کوسا۔ بددعائیں دیں۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ ہماری آہیں اتنا جلدی اثر کریں گی ہاشو غریب پہ بھی افسوس ہو رہا ہے۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا اور جواہرات! اب دنیا کی کوئی سرجری بھی

پورے شمارے کی تحریروں پر تبصرے کے منتظر ہیں۔

شکیلہ رانا.... کراچی

خواتین ڈائجسٹ سے رشتہ تو تب سے ہے جب انشا جی محمود ریاض صاحب حیات تھے اور ہم بھی نارتھ ناظم آباد میں رہا کرتے تھے۔ "آتش جواں تھا" مگر خواتین ہاتھ میں آتے ہی وہی ذوق و شوق طاری ہو جاتا ہے اب بھی (61 سال)۔ "ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا" میرا حوالہ (ٹریجڈی) صحافت کے حوالے سے منظر امکانی مرحوم (شوہر) 18 جون 1997ء بلاک N 1 C / ر نارتھ ناظم آباد کراچی۔ مصیبتوں کا سفر، چار معصوم زیر تعلیم بچے۔ اللہ نے کٹوا دیا یہ سفر بھی۔ آب حیات زبردست، عمیرہ احمد زندہ باد۔ نمل کیا ہی بات ہے، تسلسل لاجواب وحشت جنوں۔ دلچسپ آمنہ ریاض سے ایک گزارش بلکہ دیگر مصنفات سے بھی کہ ناموں کے ساتھ ان کا مطلب، ماخذ اور زبان تعارف میں بتا دیا کریں۔ آئے کت، منفرا، وسامہ، حمین تو پڑھنے والوں کو یہ نام اپنانے میں ذرا سہولت ہو۔

ج۔ شکیلہ بہن! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ منظر امکانی کی وفات تو ہمیں آج تک یاد ہے، کس طرح "نامعلوم" قاتلوں نے انہیں گولی مار کر شہید کیا تھا۔ آج تک قاتل پکڑے نہیں گئے۔ آپ نے حیات کا یہ سفر کیسے طے کیا ہوگا، چار بچوں کی پرورش اکیلے کرنا آسان نہیں تھا ہم آپ کی محنت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

نور دیا نور.... ڈی آئی خان

آج کل میں ڈائجسٹ میں دیکھ رہی ہوں کہ قاریات سنجیدہ تحریروں سے گھبرانے لگی ہیں۔ رد کر رہی ہیں کہ حقیقت میں تلخیاں برداشت کریں تو افسانوں میں کیونکر.... پہلی بات۔ حقیقی ہیروز کا افسانوی ہیروز سے تقابل کرنے کی بات ہی مت کرو۔ حقیقی انسان.... بہت سی تلخیاں.... دکھ.... ساتھ لے کر.... حوصلے سے زندہ رہتے ہیں.... ہم انسان ہیں بھئی.... اللہ کی بہترین مخلوق.... ہمیں ایسے ہی جینا چاہیے۔ ایک قلم کار کو شاید اللہ حساس دل اس لیے دیتا ہے کہ وہ دوسروں کا درد دل میں جذب کر سکے اور بالآخر اسے وہ صفحات پر انڈیل کر یہ قرض اتارے۔ اپنے گرد میں کئی برائیاں بھی دیکھتی ہوں۔ ایسے خاموش کردار جو خود اپنے لیے آواز نہیں اٹھا پاتے۔ میں ان کے دکھ رقم کر کے آپ کے سامنے لانا چاہتی ہوں۔ میرے خیال میں یہ ان کا حق ہے کہ میں ان پر لکھوں اور آپ پڑھیں۔ ان کا دکھ محسوس کریں اور ان کے لیے وہ کریں جو آپ کر سکتے ہیں، مگر آپ نے سنجیدہ تحریروں کو ہی ریجیکٹ کرنا شروع کر دیا۔

ج۔ پیاری دیا! آپ کے خیالات بے شک اچھے ہیں، مگر یاد رہے کہ ہماری قارئین سنجیدہ تحریروں سے گھبراتی نہیں ہیں بلکہ وہ ان کی زیادتی سے پریشان ہیں اور زیادتی تو کسی بھی چیز کی اچھی نہیں ہوتی اور ہمیں اس کا بخوبی احساس ہے اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ تفریح کے نام پر بھی انہیں وہی کچھ پڑھنے کو نہ ملے جو وہ روز اپنے اردگرد ہوتا دیکھ رہی ہیں بلکہ انہیں زندگی کی خوب صورتیوں سے بھی روشناس کرایا جائے۔ رہا آپ کی تحریر کا معاملہ تو آپ کی ایک کہانی قابل اشاعت ہے۔ جلد شائع ہو جائے گی، دوسری تحریر کے بارے میں آپ کو فون پر بتا چکے ہیں۔

سنبل ملک.... اعوان، شاہدرہ لاہور

میرے خط کو شائع کرنے کے بجائے ردی کی ٹوکری کا پیٹ بھر دیا جاتا ہے۔ بھائی تو پہلے ہی میرا کوئی کام نہیں کرتے۔ ماما ترس کھا کر کہتی ہیں۔ سنبل! لاؤ دے۔ اپنے خط مجھے دے دے، میں پوسٹ کر آتی ہوں۔ حالانکہ دو رکشے بدل کر پوسٹ آفس جانا پڑتا ہے، مگر ماں ہیں نا میرا آف موڈ دیکھ نہیں سکتیں فوراً "جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔

اب وہ بھی یہ کہتی ہیں۔ سنبل مٹی ڈال اپنے شوق پر۔ اللہ تیرے کسی کام میں راضی نہیں۔ تو غلطی سے دنیا میں آ گئی جب اللہ تیرا رشتہ کرنا بھول گیا تو سمجھ کیوں نہیں جاتی کہ اللہ تجھے بھول گیا۔

"آب حیات" واہ جی مولا۔ ہماری دل پسند رائٹر عمیرہ احمد! اللہ پاک نے خوب صورتی کے ساتھ ساتھ خوب صورت دماغ بھی دیا ہے۔ کردار، کہانی، الفاظ کا چناؤ، ماضی سے حال تک کا سفر، جملوں کی ادائیگی، کمال حاصل ہے عمیرہ احمد کو۔

پھر ہم "نمل" کو پڑھنے بھاگے۔ نمرہ احمد جی.... ہم کیا بولیں آپ کے ناول کے بارے میں.... ماما مونگ پھلی اور اخروٹ کی گری نکال نکال کر مجھے دیتی جاتی ہیں۔ میں کھاتی

رہتی ہوں اور ناول پڑھتی رہتی ہوں۔

ج۔ پیاری سنبل! آپ لوگوں نے ہماری ردی کی ٹوکری کو خواہ مخواہ بدنام کر رکھا ہے۔ حد ہوگئی 'اتنی بدنام تو منی بھی نہیں ہوئی ہوگی۔ ہمیں یہ آپ کا پہلا خط ملا ہے جسے شائع کر رہے ہیں۔

مونگ پھلی اور اخروٹ کے مزے تو وہ اڑائیں جن کے ہاں سردی آئی ہے۔ ہم تو پنکھے چلا کر اور شربت پی کر گرمی کے مزے لے رہے ہیں۔

اپنی والدہ کو ہمارا سلام کہیں۔۔۔ اور ان کی بات ہمیں اچھی نہیں لگی۔ شادی نہ ہوئی تو دنیا میں آنا بے مقصد ہی ہو گیا؟ یہ بھلا کیا بات ہوئی۔ زندگی کا مقصد صرف شادی ہی تو نہیں۔۔۔ ان سے کہیں اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے اگر شادی میں تاخیر ہو رہی ہے تو اس میں یقیناً" اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے۔ اندھیر نہیں اور وہ اپنے بندوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ سنبل کے لیے اس نے یقیناً" بہت اچھا رکھا ہوگا۔

آسیہ فرید۔۔۔ ملتان

ہر ماہ شرکت کرنے کو دل چاہتا ہے 'مگر خواتین بہت دیر سے ملتا ہے 15 تاریخ تک۔ ابھی بس نمل ہی پڑھ سکی ہوں۔ آپ سے شیئر کرنا تھا کہ آئی ایم نیو ایئر گفٹ۔ ہاں جی یکم جنوری کو میری سالگرہ ہوتی ہے۔

ج۔ پیاری آسیہ! ہمیں احساس ہے کہ ہماری بہت سی قارئین تک خواتین بہت لیٹ پہنچتا ہے جس کی وجہ سے وہ خط نہیں لکھ پاتی ہیں۔ آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ آپ کے انس اور محمد امریز کو پیار۔

رحمہ بنت حسین۔۔۔ کراچی

عمیرہ احمد کا "آب حیات" ختم ہوا اور یہ سوچنے پر مجبور کر گیا کہ اس ناول کا مقصد کیا تھا؟ اگر یہ سود کے خلاف کوئی مزاحمت تھی تو کافی سے زیادہ فینٹسی تھی۔ حقیقت سے دور۔ کسی ٹھوس جدوجہد 'تھیوری یا نتیجہ کے بغیر جیسے بچوں کی کہانیوں میں انجام کار ہیرو کامیاب رہتا ہے اور سب اچھا ہو جاتا ہے بغیر کسی دلیل یا وجہ کے۔

اگر یہ سالار کی فیملی کا کریکٹر اسکیچ تھا تو ایک طرف تو بے انتہا مبالغہ آمیز اور دوسری طرف ادھورا سا۔ عنایہ کا کردار بالکل بھرتی کا تھا۔ حمین کو اٹھانے کی تو بہت کوشش کی گئی لیکن اس کے کردار سے بھی انصاف نہیں ہوا۔

جبریل اور عائشہ عابدین کی زبردستی کی ڈالی ہوئی ایک روایتی سی کہانی تھی۔ ایرک عبداللہ اور احسن سعد کے کردار نہ بھی ہوتے تو کچھ نہ ہوتا بلکہ کرداروں کی اس قدر بھرمار کی وجہ سے ہی کہانی کہیں پیچھے رہ گئی۔

قسط کے شروع میں عمیرہ نے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ یہ "کامل انسانوں" کی کہانی ہے۔ ویسے تو انہوں نے ایک طرف سالار فیملی اور دوسری طرف احسن سعد کو دکھا کر پوری کوشش کی کہ "کامل" شخصیات کو پیش کریں مگر کیا انسان کبھی کامل ہوا ہے؟ لہٰذا کامل ذات صرف اللہ کی ہے۔ ہاں انسانوں میں انبیاء سب سے بلند مرتبہ ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی کتنا ہی نیک 'پرہیزگار' ولی 'قطب' ابدال ہو' وہ کامل نہیں ہو سکتا۔ یہاں عمیرہ نے ایک نہ دو 'کاملین' کا پورا خاندان اکٹھا کر دیا۔ ان کے ناول 'پیر کامل کے نام سے میں نے یہ اخذ کیا تھا کہ نبی کی ذات کامل ہے اور وہی 'پیر' (عرف عام میں) کہلانے کے مستحق ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترکیب انہوں نے علی ہجویری کے لیے کہے شعر سے مستعار ہے۔

ناقصاں را پیر کامل' کاملاں را راہنما

اسی لیے انہوں نے کاملوں کا خاندان لا کھڑا کیا

پیاری رحمہ! آب حیات کو کچھ قارئین نے پیر کامل کے تناظر میں دیکھا۔ پیر کامل میں کہانی دو کرداروں پر مرکوز تھی' جبکہ آب حیات میں ایسا نہیں تھا۔ اس لیے کمی محسوس ہوئی۔ سود کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ آج تک اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں نکل سکا' ہے نہ ہی اس کے متبادل کوئی نظام پیش کیا گیا ہے۔ دنیا بھر میں معیشت دان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کی جڑ سود ہے۔ عمیرہ نے اس ناول میں اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کم از کم انہوں نے یہ تو بتا دیا ہے کہ بنکاری کا نظام جائز نہیں ہے۔ سود حرام ہے۔

عنایہ کا کردار زبردستی کا نہیں تھا۔ عبداللہ نے سالار کی فیملی کے اخلاق سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ سالار نے عبداللہ کو داماد کے طور پر قبول کر کے ثابت کر دیا کہ اسلام میں رنگ' نسل' زبان اور ذات برادری کی کوئی اہمیت نہیں۔ نیکی' تقویٰ اور ایمان اہم ہے۔

یہ بات درست ہے کہ کوئی بھی انسان کامل نہیں ہو سکتا

لیکن کامل بننے کی کوشش تو کر سکتا ہے۔ سالار نے اس راہ پر قدم رکھا اور پھر اپنے بچوں کو اس طور تربیت کی کہ وہ اچھے انسان' اچھے مسلمان بن سکیں۔

جبریل اور عائشہ عابدین کا کردار بھی زبردستی کا نہیں تھا۔ ایک مبلغ اسلام' شریعت پر کاربند صوم و صلوٰۃ کا پابند عورت کی عزت نہیں کرتا۔ اپنی بیوی کے ساتھ برا سلوک کرتا ہے' سعد جیسے لوگ مذہب کو بدنام کرتے ہیں۔ جبکہ اسلام نے عورتوں سے اچھے سلوک کی سخت تاکید کی ہے خواہ وہ ماں کے روپ میں ہو یا بیوی اور بیٹی ہو۔

یاسمین ساجد' روزینہ نعیم..... کھیالی گوجرانوالہ

نمل پڑھ کر انگلیاں منہ میں ہی رہ گئیں' ابھی تو بس خواہش کی تھی کہ آبدار قتل ہو جائے اور وہ ہو گئی قتل ہاشم کے ہاتھوں' شکر فارس تو بچ گیا اور زیادہ خوشی زمر کے بچ جانے کی ہوئی۔ ورنہ تو سب کے دل بے حال ہو جاتے افسوس یہ کہ ہاشم نے اپنے ہاتھوں سے آپی کو قتل کیا' وہ تو پیار کرتا تھا اس نے اتنا بے حس' وہ اتنا ظالم۔ جواہرات کے ساتھ تو بہت اچھا ہوا۔ اس کے بعد آب حیات پڑھا یہ کیا آخری قسط۔ مجھے تو کچھ منٹ یقین ہی نہیں آیا کہ یہ ختم ہو گئی۔ پر یہ کیا حمین کو کیوں گولی لگی۔ معلومات تو سالار کے متعلق اکٹھی ہو رہی تھیں نا۔ جبرئیل مجھے تو عائشہ کے ساتھ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اتنا اچھا ہمارا جبرئیل تو۔ پر یہ کیا سالار اور امامہ کا مشہور زمانہ رومینس تو آپ نے تھوڑا سا بھی نہیں دکھایا شکوہ رہے گا ہمیشہ اور یہ ترپ کا پتا کچھ تو اوپر سے ہی گزر گیا۔ یہ لکھنا لازمی تھا کیا۔ ہنرمند کو تو پڑھ کر بہت سے آس پاس رہنے والے لوگ یاد آئے جن پر یہ کردار بہت فٹ آتے۔ عندلیب زہرا اچھی کاوش تھی' ٹاپک برا نہ لگا۔ فاطمہ عسکری کچھ خاص مزہ نہیں آیا۔ اگر بات کی جائے محبت' خواب' جزیرہ کی تو یہ اچھے وقت پر اپنے انجام پر پہنچ گئی۔ ہلکی پھلکی کہانی اچھی تھی۔

پیاری یاسمین اور روزینہ! آپ کا شادی کا احوال جو دو دفعہ موصول ہوا۔ کرن والوں کو دے دیا ہے۔ یہ سلسلہ اب کرن میں شائع ہوتا ہے۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا باری آنے پر شائع ہو جائے گا۔

ان لوگوں نے مارنا تو سالار کو ہی تھا لیکن جسے اللہ رکھے والی بات ہے۔ گولی حمین کو چھوتی ہوئی گزر گئی' جبریل واقعی بہت اچھا تھا لیکن ہمیں تو عائشہ بھی بہت اچھی لگتی ہے۔ آپ کو اس میں کیا خرابی نظر آئی اور امامہ اور سالار کے رومانس والی بات عمیرہ تک پہنچا رہے ہیں۔ ویسے ہمارا خیال ہے عمیرہ رومانس لکھتے ہوئے ذرا محتاط رہتی ہیں۔

ماہم حمید..... میرپور خاص

سب سے پہلے "آب حیات" کیا لکھوں اس کے بارے میں' کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ میں پہلی قسط سے آخری قسط تک یہ ناول پڑھتی رہی ہوں' میرے پاس الفاظ نہیں اس ناول کی تعریف کے لیے بحیثیت ایک مسلمان ہمیں۔ کن اصولوں کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے یہ سب کچھ اس ناول کے ذریعے اور اس کے کرداروں کے ذریعے رائٹر نے بہت اچھے سے ہم سب تک پہنچایا۔ ایک فرمائش میری اور میری امی کی طرف سے ہے کہ آپ پلیز عمیرہ جی کا آب حیات کے لیے انٹرویو ضرور لیں۔ اب آتے ہیں نمل کی طرف آپ کو کیا ضرورت ہے اتنی جلدی نمل ختم کرنے کی؟ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے اس ناول میں' پلیز اتنی جلدی اینڈ مت کریں۔ جواہرات کے ساتھ تو بہت ہی اچھا ہوا' اس کی سزا یہی ہونی چاہیے تھی۔ اب ہاشم کا بھی کچھ ایسا ہی اینڈ ہونا چاہیے۔ اس کا آخری ٹھکانا تو پاگل خانہ ہی ہونا چاہیے۔

ماہم! ہمیں اس سے پہلے آپ کے خط موصول نہیں ہوئے۔ کافی عرصہ بعد آپ کا یہ خط ملا ہے تو شائع کر رہے ہیں۔ عمیرہ احمد انٹرویو دیں گی تو ہم ضرور شائع کریں گے۔ چاہتے تو ہم بھی یہی تھے کہ ابھی نمل ختم نہ ہو لیکن نمرہ احمد کا کہنا ہے کہ کہانی کو اتنا طویل نہیں ہونا چاہیے کہ قارئین اکتا جائیں اور اس لیے بھی وہ اسے جلد ختم کرنا چاہتی ہیں کہ انہیں اگلا ناول شروع کرنا ہے۔ اور ہاشم کا انجام تو نمرہ نے اس سے بھی زیادہ برا کیا ہے۔

کلثوم حمید..... میرپور خاص

میرا رسالوں سے تعلق بہت ہی پرانا ہے میری عمر 45 سال ہے لیکن میں نے دس بارہ سال کی عمر سے ہی رسالے پڑھنا شروع کر دیے تھے۔ وہ بھی خرید کر نہیں بلکہ میرے ابو ایک کباڑیے کا کام کرتے تھے۔ ان کی وجہ سے مجھے کبھی رسالوں کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ہر طرح

اور ہر قسم کا رسالہ ردی میں آجاتا تھا۔ میرے ابو ان پڑھ تھے۔ لیکن ان کو کہانیاں سننا بہت اچھا لگتا تھا۔ لہٰذا میں ابو کو مختلف کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتی تھیں۔ خیر جب میں میٹرک میں آئی تو مجھے ایم سلطانہ فخر کی قسط وار کہانی۔ اتنی پسند آئی کہ میں نے ہر روز ایک روپیہ اپنی پاکٹ منی سے جمع کرنا شروع کر دیا۔ ابھی مجھے قلم اٹھانے پر مجبور "نمل" نے کیا ہے۔ "آب حیات" بھی بہت اچھا ہے۔ آب حیات جھیل جیسا سا لگا اور نمل سمندر جیسا جوشیلا ہوتا ہے۔ میں نے پہلے آب حیات کو ترجیح دی تھی لیکن میری بیٹی نے مجھے "نمل" کی طرف متوجہ کیا۔ اور وہ مجھے انتہائی پسند آیا۔

پیاری کلثوم! آپ خواتین اتنے طویل عرصہ سے پڑھ رہی ہیں' یہ جان کر خوشی ہوئی اور آپ خواتین سے اتنا لگاؤ رکھتی تھیں کہ اپنے جیب خرچ سے پیسے بچا کر جمع کرتی تھیں تاکہ خواتین خرید سکیں۔ آپ کی یہ محبت ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ محبت ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے اور ہم خواتین کا معیار قائم رکھ سکیں۔ اور کیا یہ بھئی.... اتنی طویل رفاقت میں صرف ایک خط اور وہ بھی ادھورا یعنی صرف دو ناولوں پر تبصرہ....؟ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔

شبانہ عندلیب..... گوجرانوالہ

فہرست پر نظر دوڑانے کے بعد آب حیات کی آخری قسط پڑھی۔ حسب توقع انجام ٹھیک ہوا۔ ترپ کا پتا ٹھیک ہی تھا۔ دو سالوں میں جہاں تک سالار اور امامہ کی کہانی تھی' وہاں تک تو بہت مزا آیا۔ معذرت کے ساتھ ان کے

بچوں کی کہانی نے وہ لطف نہیں دیا جو سالار اور امامہ کی کہانی میں آیا تھا۔ نمرہ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں مایوس نہیں کیا۔ البتہ آبدار کے اس طرح مرنے پر دل بہت دکھی ہوا' مانا کہ وہ کبھی کبھی بہت ہی زہر لگتی تھی۔

پیاری شبانہ! یہ آپ تمام قارئین کی بددعائیں اور کوسنے ہی تھے جو آب دار کو یوں لیے ڈوبے۔ اب سب کو افسوس ہو رہا ہے مگر کیا فائدہ۔ یہ کوئی انڈین ڈرامہ تو ہے نہیں کہ مردہ چار قسطوں کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر دماغ کھاتا رہے۔

پیاری آپی ایک دفعہ مرگئی تو بس مرگئی۔ اور ہاں اگر خط شائع نہ ہو تو دل چھوٹا نہ کریں۔ ہم نے آپ کا خط پوری توجہ اور محبت سے پڑھا ہے۔

ملائکہ کوثر

"کرن کرن روشنی" پیارے آقا کی خوب صورت باتیں تو ہیں ہی لاجواب۔ "دشت جنوں" ناول بڑا اچھا سنسنی خیز ہوتا جا رہا ہے۔

نومبر کی "نمل" نے تو گویا میری آدھی جان نکال لی تھی۔ مجھے بھی آگ' پانی گھٹن' جس والی موت سے خوف آتا ہے۔ بند سی لفٹ تو بالکل پسند نہیں۔ نمرہ (بیٹی) خود لحاف میں غڑپ ہاتھ باہر' رسالہ پکڑے ہوئے۔ "بھئی! یہ ہاتھ کتاب پڑھ رہے ہیں۔" "یس ماما! یہ پڑھ رہے ہیں کہ آبدار نے فارس سے شادی کر لی ہے' زمر خدانخواستہ مرگئی ہے۔"

"اللہ نہ کرے میرا جملہ۔"

شکر ہے زمر بچ گئی پر آبدار کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوا۔ ایک بہن نے خط میں لکھا تھا اگر وہ فارس اور زمر کے بیچ آئی تو اسے پانی میں ڈبو ڈبو کر آپی بنا دیتا ہے۔ بہن آپ نے تو نہیں البتہ ہاشم کمینے نے ضرور اسے آپی بنا دیا ہے۔ کیسی محبت تھی یہ ہاشم کی۔ نمرہ ٹھیک کہتی تھی۔ ہاشم اپنے عزیز رشتوں سے مار کھائے گا۔

پیاری ملائکہ کوثر! محبت تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ جان دے بھی دیتی ہے اور جان لے بھی لیتی ہے اور صرف ہاشم کی محبت نظر آئی آپ کو۔ آب دار کی نہیں۔ اس نے بھی تو محبت کے لیے جان دے دی۔ سچ یہ ہے کہ محبت صرف اللہ ہی سے کرنا چاہیے۔ بندوں کی محبت تو صرف خوار ہی کرتی ہے۔
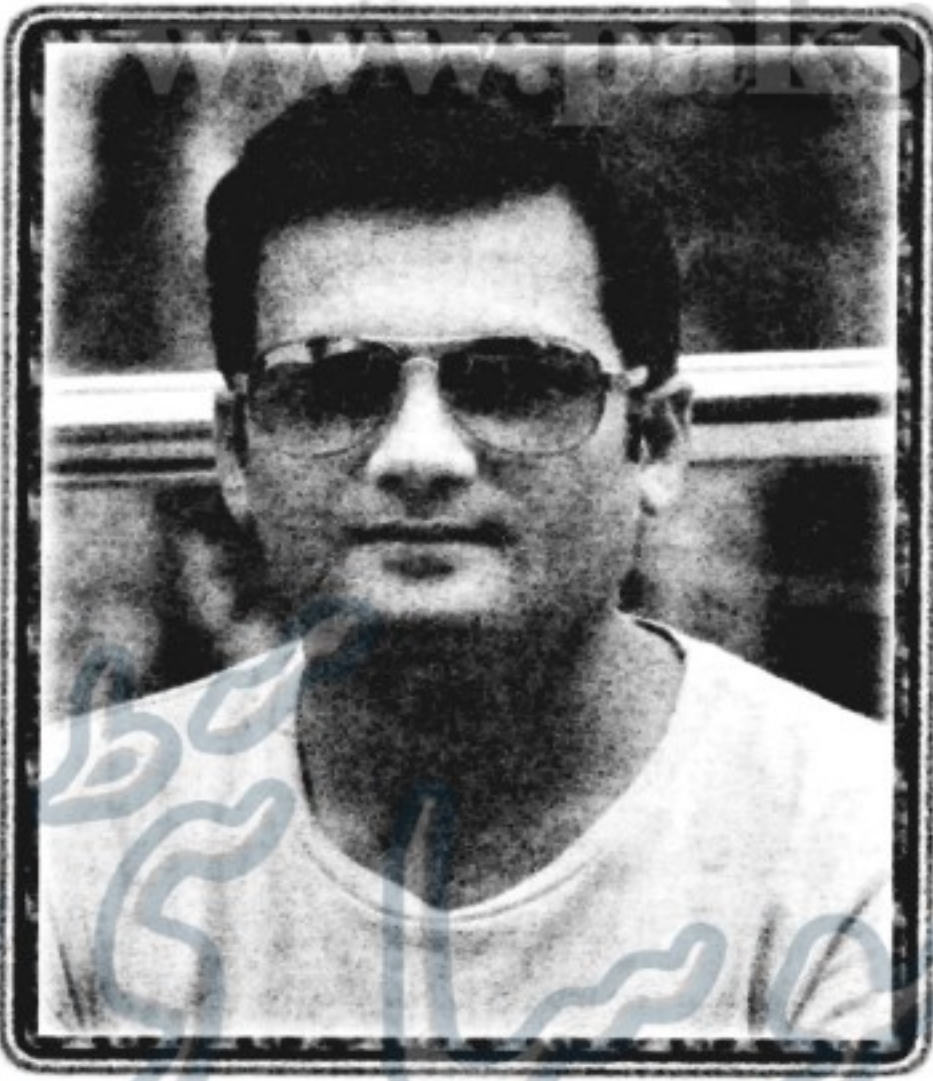
عدیل رزاق کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ٹی وی ڈرامے دیکھنے والی قارئین یقیناً "عدیل رزاق کے نام سے آشنا ہوں گی۔ ان کے لکھے گئے ڈراما سیریل "جیا جائے نہ مقدس" اور حال ہی میں ختم ہونے والا سیریل "دیوانہ" یقیناً لوگوں کی یادداشت میں ہوں گے۔ ہم اس مرتبہ عدیل رزاق سے آپ کی ملاقات کروا رہے ہیں۔

☆ "آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

"ڈراماز لکھ رہا ہوں۔ چار ڈراما سیریلز ہیں جو ابھی لکھنے کے مرحلے میں ہیں۔ ایک ایک کرکے سب کو مکمل کرنا ہے۔"

☆ "اگلا سیریل کب آرہا ہے؟"

"اگلا سیریل ناٹک ہے۔ تین دسمبر سے ہر ہفتے کی

عدیل رزاق سے باتیں

شاہین رشید

رات آٹھ بجے "ہم" ٹی وی سے آن ایئر ہوگا۔"

☆ "پہلے "مقدس" پھر "دیوانہ" شاید تین تین مہینے کا گیپ ہے تو آپ بھی خواتین رائٹرز کی طرح اپنی پرانی تحریروں کو تو کیش نہیں کرا رہے؟"

"ہاہا.... نہیں بالکل نہیں۔ "مقدس" 25 مئی 2015ء میں اسکرین پر آیا تھا "دیوانہ" 11 مئی 2016ء کو۔ تو یوں سال بھر بعد میرا اگلا ڈراما اسکرین پر آیا۔ "مقدس" تو لکھا بھی دو سال میں گیا تھا اور "مقدس" سے دو سال قبل "جیا نہ جائے" چلا تھا۔ جس کی تاریخ مجھے اب یاد نہیں آرہی، خواتین لکھاری تو بہت تیز لکھتی ہیں ان کی شاید پریکٹس ہی ایسی ہے۔ میں تیز لکھ بھی لوں تو مجھے لگتا ہے کہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں تیز لکھنے سے زیادہ اس بات کو ترجیح دوں گا کہ لوگ کہیں میں پوری دل جمعی سے لکھتا ہوں اور خود کو دہراتا نہیں ہوں۔ تیز لکھنے میں دہرائے جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ناٹک لکھنے میں بھی ایک سال سے زیادہ کا وقت لگا ہے۔ پرانی تحریروں میں میرے پاس چند افسانے ہیں اور محض ایک دو کہانیاں۔ ورنہ میں نے تھیٹر لکھا ہے زیادہ اور ریڈیو پر بہت لکھا ہے، مگر وہ ٹی وی پر چل نہیں سکتا۔ ورنہ شاید ان تحریروں کے ذریعے میں بھی چار سال میں آٹھ سیریل تو لکھ چکا ہوتا۔ ابھی چار سال میں میرے چار ہی سیریلز ہیں۔ چوتھا چل رہا ہے۔ "ناٹک"۔"

☆ "اقرا کے ساتھ اَیگری منٹ ہے یا ذاتی طور پر پسند ہیں؟"

"ہاہاہا.... نہیں بھئی۔ رائٹر کا کسی ایکٹر سے اَیگری منٹ ہو، ایسا کوئی سین نہیں ہے اس فیلڈ میں۔ ہاں اقرا اداکارہ بہت اچھی ہے۔ "مقدس" کے ذریعے ہی وہ پہچانی گئی اور مصروف ہوگئی۔ مجھے بہت پسند بھی ہے۔ لیکن میرے تین سیریلز میں یکے بعد دیگر اس کا

ہونا محض اتفاق ہے۔ میں نے ایسا بالکل نہیں چاہا تھا۔"

☆ "دیوانہ" "پی کے" فلم سے متاثر تھا۔ حقیقت سے دور تھا۔ کیا کہیں گے اس بارے میں؟"

"نہیں۔ "دیوانہ" میں "پی کے" فلم سے متاثر ہو کر کچھ نہیں لکھا گیا۔ ہاں یہ ایک فینٹسی سیریل تھا۔ لیکن انسان اشرف المخلوقات ہے۔ صبر' جذبات' برداشت' غصہ' نفرت اور آزمائشوں کی بھٹی میں روز پکتا اور کندن بنتا رہتا ہے۔ اسی لیے یہ تمام مخلوقات میں عظیم تر ہے۔ جن و ملائک سے بھی افضل ہے۔ اللہ کی کوئی اور مخلوق انسان کے برابر نہ عظیم ہے اور نہ ہی عاجز۔ تو یہ بنیادی ٹھاٹ تھا۔ "دیوانہ" کا اور یہ "پی کے" سے بالکل بھی متاثر نہیں تھا۔"

☆ "جاسوسی ٹائپ ہوتی ہیں آپ کی کہانیاں..... کیوں؟"

"ہرگز نہیں۔ میری کہانیاں جاسوسی بالکل نہیں ہوتیں۔ ہاں میں کائنات کے اسرار کو اس میں چھپے رمزوں کو' پراسراریت کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہوں۔ انسان خود اپنے لیے ابھی تک ایک راز ہے۔ تو میں اپنی کہانیوں کے ذریعے ان رازوں کی کھوج میں دوڑتا ہوں اور میرے کردار بھی میرے ساتھ ساتھ دوڑتے ہیں۔ جاسوسی اور پراسرار ہونے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ خدا نے انسان کو کائنات کے اسرار کھولنے کے لیے ہی بھیجا ہے اور کیا مقصد ہے انسان کی زندگی کا۔ اگر سب بس بیوی' بچے پال رہے ہوتے تو کائنات کتنی آگے بڑھتی۔ اس کے پردے ہٹائے ہیں انسان نے تو ہی ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔ میں تو ان کہانیوں پر حیران ہوتا ہوں جن میں کوئی اسرار نہ ہو۔ رمز نہ ہو' رمز کا اختتام حیرت کا ظہور ہے اور جس فن پارے کی خصوصیات میں تحیر نہ ہو' اس کی انفرادیت کیا رہ جاتی ہے۔ مونالیزا کی مسکراہٹ آج بھی اسرار سے بھری ہوئی ہے' اسی لیے وہ اب تک ہمارے درمیان ہے۔ جاسوسی کا مطلب اس سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ جاسوسی میں ایک کیس کسی سراغ رساں کو دیا جاتا ہے اور وہ سے حل کر دیتا ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے۔ میرے تو کسی ڈرامے میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ تو وہ جاسوسی کیسے ہو سکتے ہیں۔ اصل میں ناظرین کو مختلف چیز کے لیے کچھ نہ کچھ ہموار کرنا پڑتا ہے۔ میں تو جاسوسی ڈراموں کے بھی خلاف نہیں ہوں۔ اس سے مردوں کی اوڈئینس واپس ڈرامے کی طرف لوٹ سکتی ہے اور ایک نہ ایک دن ایسا ہونا تو ہے۔ لیکن میں نے ابھی تک کوئی جاسوسی ٹائپ ڈراما نہیں لکھا ہے۔ بلکہ میں تو اس انوکھی اور مظہر العجائب دنیا سے کچھ انوکھا واقعہ لے کر اس کی نفسیات' اس کے رمز میں اترنے کی کوشش کر رہا۔ ہوں' تو آپ اسے انسان کو کھوجنے کی مسٹری کہہ لیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہی میرا خدا ہے اور یہ ہی میرے خدا کی کھوج۔ اور خدا پراسرار تو ہے اور اس کی کھوج لگانا ہی انسان کی اصل منزل ہے۔

س۔ مظلوم لڑکی کا روتا دھوتا ڈراما زیادہ اچھا لگ رہا ہوتا ہے۔ ریٹنگ کا آپ کتنا خیال رکھتے ہیں؟

روتا دھوتا ڈراما دیکھنے والی خواتین ہی ہیں۔ جس دن وہ اس روتے دھوتے ڈرامے سے اکتا جائیں گی ڈراما بدل جائے گا۔ اور یہ بدلاؤ آرہا ہے۔ ایشو بیس موٹی ویشنل ــــ کہانیاں اور کردار سراہے جارہے ہیں۔ اڈاری اس کی حالیہ مثال ہے۔ دل لگی بھی ہے۔ یہ دیکھنے والی اور لکھنے والی بھی خواتین ہی تھیں۔ رہی ریٹنگ کی بات تو میں شعوری طور پر تو ایسا نہیں کرتا البتہ لکھتے وقت آپ کو خود بخود احساس ہونے لگتا ہے کہ آپ کس طرح کے لوگوں کے لیے لکھ رہے ہیں۔ اب اسے لوگوں کا خیال رکھنا کہیں یا ریٹنگ کا..... شاید ایک ہی بات ہو۔ کمرشل فلم ہو' ڈراما ہو یا کہانیوں کا کوئی ڈائجسٹ ہو' اسے ناظرین اور قارئین کی پسند ناپسند کا خیال ہر حال میں رکھنا ہی پڑتا ہے۔ میں اس نظام کی صداقت پر بڑے سیریس تحفظات رکھتا ہوں۔ لیکن ڈراما عوام کے لیے ہونا چاہیے' عوام کی پسند کا ہونا

چاہیے اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے۔ لیکن ڈراما سبق آموز بھی ہو اس سے میں سے بالکل ایگری نہیں کرتا۔

س۔ لکھنے کا انداز کیا ہے۔ پلان کر کے لکھتے ہیں یا بس لکھنے بیٹھ گئے؟ اور کبھی کسی نے فرمائش کر کے لکھوایا ہے؟

نہیں پلان کر کے کبھی نہیں لکھ پایا۔ میرا خیال ہے کہانی اپنے آپ کو خود لکھواتی ہے۔ کردار اپنی گہرائیوں کا پتا تب دیتے ہیں جب رائٹر ان کے ساتھ رہنا شروع کر دیتا ہے۔ ہاں ڈرامے میں منزل پتا ہو نہ ہو' راستہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔ کرداروں کی اور کہانی کی منزل کیا ہو گی۔ یہ میں کبھی پہلے طے نہیں کرپاتا۔ کردار اور کہانی اپنے فطری بہاؤ میں چلتے چلے جاتے ہیں اور ڈراما بنتا چلا جاتا ہے۔ اور آپ کے سوال کا آخری حصہ فرمائش کر کے لکھوایا تو ڈراما کی دنیا میں اسے ڈکشن کہا جاتا ہے۔ کہانیاں ڈسکس ہوتی ہیں۔ لائن ڈسکس ہوتی ہے سبجیکٹ ڈسکس ہوتا ہے۔ ڈراما اب انفرادی عمل رہا بھی نہیں ہے۔ شاید کبھی ہوتا تھا لیکن اب نہیں ہے۔ تو ڈکشن اس فیلڈ کا بہت پروفیشنل تقاضا بن چکا ہے اب۔

س۔ آپ کی سوچ اور تحریر کتنے فیصد اسکرین کا حصہ بنتی ہے۔ آپ کی کتنی مرضی چلتی ہے؟

ٹی وی کا ڈراما اصل میں صرف رائٹر کی مرضی نہیں ہوتا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ ڈراما تکنیک اور تخلیق کے پیروں پر چل کر اسکرین تک آتا ہے۔ کوئی ایک ٹانگ بھی چھوٹی یا لمبی ہو جائے تو ڈراما لنگڑا کر شمار کیا جانے لگتا ہے۔ میرے خیال میں تخلیق روح ہے اور تکنیک جسم۔ روحیں زندہ رہتی ہیں اور جسم بدل بدل کر سفر کرتی ہیں۔ میری مرضی میرے کرداروں کے مکالموں میں ہوتی ہے۔ اور شکر ہے کہ میری اتنی مرضی چلتی بھی ہے اور سراہی بھی جاتی ہے۔

س۔ تحریر کبھی ریجیکٹ بھی ہوئی جسے آپ سمجھتے ہوں کہ وہ بہترین تحریر تھی؟

ریجیکشن والی صورت حال کا سامنا مجھے نہیں ہو سکا۔ اس کا سبب ہے۔ جب میں نے ڈراما لکھنے کا فیصلہ کیا تو چھ مہینے اس ریسرچ میں رہا کہ ہماری مارکیٹ اور چینلز کو کیا چاہیے اور کیسا کام چاہیے۔ پھر مجھے لفظ لفظ کو دیکھنے والے استاد بھی میسر تھے۔ ابتدا میں جو سنگل پلے لکھے وہ لکھ کر سید ھا حنیف سحر صاحب کے پاس جاتا تھا۔ کئی ایک پر وہ شاباشیاں دیتے تھے اور کئی اسکرپٹ کچرے کے ڈبے میں ڈال دیتے تھے۔ تو وہ ہر موقع ہر "گام" ہر لمحہ میری راہنمائی کر رہے تھے۔ یوں کہہ لیں کہ ٹی وی کا ڈراما میں نے ان ہی سے لکھنا سیکھا ہے۔ اس لیے ریجیکشن کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہاں استاد نے سینکڑوں بار میری تحریروں کو ڈنڈے مار مار کر ریجیکٹ کیا ہے۔ تب میں سوچتا تھا بھاگ جاؤں نہ آؤں اس فیلڈ میں۔ لیکن وہ پھر گردن سے پکڑ کر بٹھاتے تھے کہ بیٹھو لکھو تم لکھ سکتے ہو۔ بھاگو مت۔ اسی طفیل میرا پہلا ہی ڈراما اے آر وائی سے پہلی ہی دفعہ میں اپروو ہوا اور فٹافٹ پیسے بھی مل گئے تھے۔

س۔ ہر ڈراما رائٹر فلم بھی لکھنا چاہتا ہے تو آپ بھی فلم لکھ رہے ہیں؟

جی بالکل۔ ایم ڈی پروڈکشنز کے ساتھ بچوں کے لیے ایک اینی میٹڈ فلم تو تقریباً" مکمل ہو چکی ہے۔ اور بھی بہت سی فلمیں کاغذ پر کسی نا کسی حد تک منتقل کر چکا ہوں۔ کئی چیزیں ڈسکشن کے مراحل میں ہیں۔ اب دیکھیں ناظرین کو کب کیا اور کن حالات میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

س۔ کیا کیا لکھ چکے ہیں اور اپنا لکھا ہوا سب سے زیادہ کیا پسند ہے؟

" جیا جائے نہ۔ مقدس۔ دیوانہ۔ ناٹک۔ فلم جو ابھی بننا ہے اور دس کے قریب سنگل پلیز ہیں۔ سب سے زیادہ پسند ابھی کچھ نہیں ہے وہ ابھی لکھنا باقی ہے۔ کیونکہ آج تک جو لکھا اس میں کمی لگتی ہے۔ پرفیکٹ کچھ نہیں لگتا۔

س۔ پہلی تحریر کیا تھی۔ پذیرائی ملی نہیں ملی۔ کب لکھا؟ متاثر کس سے ہیں؟

میری پہلی تحریر تو خیر بہت ہی پرانی ہے۔ ریڈیو پاکستان ایم اے جناح روڈ کے پاس ہماری رہائش ہوا کرتی تھی۔ میری امی ریڈیو بہت شوق سے سنتی تھیں تو ریڈیو پاکستان کے گانے اور پروگرامز میری بچپن کی یادداشتوں کا حصہ ہیں۔ لکھنے کی ابتدا بھی ریڈیو سے ہوئی۔ کلاس 6 یا 7 میں تھا تو بچوں کی دنیا کے لیے ایک خاکہ لکھا تھا۔ "لڑائی کی سزا" اس کا عنوان تھا۔ بدھ کے روز سب بچے ریڈیو پر اپنی تحریریں پروڈیوسر کو دکھانے اور ریہرسل کرنے جمع ہوتے تھے۔ اور اتوار کو پروگرام لائیو ہوا کرتا تھا۔ لائیو پروگرام کا یہ سلسلہ آج بھی ریڈیو پاکستان سے اسی طرح جاری ہے۔ تو ایک سنڈے میں پروگرام میں خاموش بچے کے طور پر شریک ہوا۔ اگلے بدھ کو خاکہ لکھ کر لے گیا اور اتوار والے دن میری تحریر کو صداکار بچے لائیو بول رہے تھے۔ میں بھی بول رہا تھا۔ تو بس یوں ابتدا ہو گئی۔ پھر بزم طلبا' آرٹس کونسل' تھیٹر' اور شہر میں جہاں بھی ثقافتی سرگرمی ہوتی ہم بچے اپنا تان تو بڑا لے کر پہنچ جاتے۔ بچے ہونے کا خوب فائدہ اٹھاتے۔ پڑھا شاید بہت نہیں ہے۔ لیکن قرۃ العین حیدر' عصمت چغتائی' بانو قدسیہ' ٹیگور' شیکسپیئر اور موپساں نے بہت متاثر کیا ہے۔ اور بھی بہت سے نیشنل انٹرنیشنل ادیب ہیں جنہیں پڑھتا ہوں تو لگتا ہے سب کچھ تو لکھ گئے یہ لوگ۔ شکر ادا کرتا ہوں اس بات پر کہ ادب سے جلدی ہی آشنائی ہو گئی تھی۔ نہیں' گھر میں اور خاندان میں اس وقت قسم کا شوق کبھی نہیں رہا۔ البتہ میری چھوٹی بہن نوشین پرائیویٹ سیکٹر میں ریڈیو پروڈیوسر رہی اور اس نے ریڈیو اور تھیٹر کے لیے تھوڑا بہت ضرور لکھا ہے۔

س۔ ٹی وی تک رسائی کیسے ہوئی؟ نظر انداز ہوئے؟ جدوجہد کرنا پڑی؟

میں کوشش کرنے پر یقین رکھتا ہوں۔ جب ٹی وی ڈراما لکھنے کا شوق چڑھا تو حنیف صاحب کی شاگردی میں کچی پکی صحافت کر رہا تھا۔ ٹی وی ڈراما لکھنا بھی ان ہی سے سیکھ رہا تھا کیونکہ ان کے تب تک کئی سنگل پلیز پی ٹی وی اور جیو وغیرہ سے چل کر ایوارڈز جیت چکے تھے۔ تو ان سے سیکھ کر ایک ڈراما ایک نجی چینل کو بھیجا اور چند سنگل ڈرامے لے کر پروڈکشن ہاؤس گیا' وہ ڈرامے ٹی وی سیریز "کتنی گرہیں باقی ہیں" کے لیے بنے اور چلے۔ پہلا ڈراما سیریل جیا نہ جائے ابھی لکھ ہی رہا تھا کہ وہ شوٹ پر چلا گیا۔ تو کچھ یقین آنے لگا کہ مجھے ڈراما لکھنا آتا ہے۔ یا آتا جا رہا ہے۔

س۔ لکھنے کے ماحول کے محتاج ہیں یا ہجوم میں بھی لکھ لیتے ہیں؟

میں شوکت صدیقی کی طرح شاید چنڈو خانے میں بیٹھ کر بھی لکھ سکتا ہوں۔ بہت تکلفات کا محتاج نہیں ہوں۔ لیکن موڈ کا ہوں۔ مہینوں گزر جاتے ہیں اور کچھ نہیں لکھا جاتا۔ اور جب یلغار ہو تو پوری پوری رات بیٹھ کر بھی لکھتا ہوں۔ لکھنے کے معاملے میں بالکل بھی منہج نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔ ہونا چاہتا ہوں کہ کمرشل

رائٹنگ کا یہ ہی تقاضا ہے۔ دیکھیں کب سیکھتا ہوں ٹائم مینجمنٹ اور دیگر..... انتظام و انصرام.....

س۔ اس کام میں پیسا ہے؟ کیونکہ ایک رائٹر نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنا گھر بھی بنالیا ہے اور گاڑی بھی لے لی ہے۔

کون ہے وہ رائٹر' نام تو بتائیں۔ انہیں مبارک باد دوں گا۔ ہاں پیسا ہے۔ لیکن میں نے ابھی گھر نہیں بنایا۔ اور مجھے نہیں لگتا کہ یہ کوئی جلد رونما ہونے والا واقعہ ہے۔

س۔ فیملی؟ شادی؟ بہن بھائیوں میں کون سے نمبر پر ہیں؟

ہم چار بہن بھائی ہیں۔ میرا نمبر تیسرا ہے۔ امی امور خانہ داری میں ماہر ہیں اور ابا کا اپنا کام ہے۔ شرافت اور محنت کرنا جیسے میری وراثت ہیں اس لیے ان کی حفاظت بھی کرتا ہوں اور ان سے محبت بھی۔ کرنے والے کاموں میں ایک کام شادی بھی ہے۔ ہر چند کہ شادی کا انسٹی ٹیوشن بہت ڈرانے والا بھی ہے لیکن کرنا تو پڑتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں صرف لڑکیوں سے ہی شادی کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے لڑکوں سے بھی سو سو سوال ہوتے ہیں جس میں سے ایک آپ نے بھی کیا ہے۔ ایک اور وجہ سے بھی کرنا پڑے گی شادی۔ ایک بی بی ہیں جو بہت ثابت قدمی سے سالوں سے مجھ پر مر رہی ہیں۔ سو فیصلہ کرلیا ہے کہ اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں سے کوئی مرجائے' باقی کی زندگی ایک ساتھ جی لی جائے۔

س۔ کن رائٹرز کا کام آپ کو اچھا لگتا ہے؟

کام تو بہت ہو رہا ہے لیکن اچھا کم ہو رہا ہے۔ میرے خیال سے ابھی میں اس قابل خود کو نہیں سمجھتا کہ کسی کے کام کو جج کرسکوں..... لیکن جب بھی کوئی اچھا کام کرتا ہے وہ نظر آ ہی جاتا ہے۔ معیاری کام دیکھ کر حوصلہ ملتا ہے کہ مختلف کام بھی کم سہی لیکن موجود ہے' ایگزسٹ کر رہا ہے اسی ڈراما انڈسٹری میں۔

س۔ کچھ کہنا چاہیں گے؟

برداشت ختم ہو چکی ہے سوسائٹی سے۔ خوب صورت باغوں کو مالی اور کٹائی چھٹائی کا بڑا قینچہ چاہیے ہوتا ہے۔ ہم نے قینچہ اور قینچی والے ہاتھوں کو توڑنے کی قسم کھالی ہے۔ ادب' فن' مذہب' سماج' سیاست' ریاست سب کچھ کائی زدہ جوہڑ بنتا جارہا ہے۔ ہم اپنے اپنے کنویں سے آسمان دیکھ رہے ہیں اور اسی کو پورا آسمان مان کر کنویں میں ہی رہنا چاہتے ہیں۔ دیکھیے باہر کوئی رسی ڈالے کھڑا ہے تو اس کی رسی کو پکڑ لیے کنویں کی سیلن زدہ' سالخوردہ دیواروں پر جما جما کر پیر رکھیں اور باہر نکل کر پورا آسمان دیکھیں تو سہی۔ کچھ نہیں ہوگا۔ نہ آپ مذہب سے بچھڑیں گے نہ فن و ادب کے لوگ بھوکے مریں گے۔ ناقد کو زہر پلانے کی روایت کو بدلیں تاکہ بعد از عہد آپ زندوں میں شمار تو کیے جاسکیں اور کچھ نہیں تو کم سے کم گنے تو جاسکیں کہ ہاں جی آپ بھی تھے جو اس دھرتی سے ہو کر گئے ہیں۔ کچھ دے کر گئے ہیں بعد والوں کو۔ ورنہ زندہ تو وہی رہا جس نے زہر پیا تھا۔ پلانے والے تاریخ کے پنوں کی گرد تک میں نہ رہ سکے۔ تو کیا ہماری دنیا آج بھی سقراط کو زہر پلانے کے منظر سے آگے نہیں بڑھی۔ دنیا سے مطلب ہماری دنیا ہے۔ ورنہ باقی دنیاؤں میں تو بہت سی آزادیوں کا دور دورہ ہے۔

س۔ کن کن ایوارڈ کے لیے نامزد ہو چکے ہیں اور کون کون سا جیتا؟

لکس اسٹائل ایوارڈ میں نامینشن ہوئی تھی ڈراما سیریل مقدس کے لیے۔ جیتا کوئی نہیں ہے ابھی تک۔ لیکن خواہش یہ ہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا دل جیت سکوں۔ دل جیت لیے تو ایوارڈ تو چٹکیوں میں مل جاتا ہے۔

س۔ کھانے میں کیا پسند ہے؟

دیسی مرغی کی کڑھائی۔ مونگ کی دال کی کھچڑی۔ پائے اور سب طرح کے دیسی کھانے خصوصاً" اچھی بنی ہوئی سبزی۔

س۔ فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟

وقت بڑا نامہربان ہے۔ اور رائٹر کے پاس تو ہوتا ہی نہیں فارغ وقت۔ ہو بھی تو ذہن کسی نا کسی کہانی' کسی نا کسی کردار کے ساتھ ڈائیلاگ کرتا رہتا ہے۔ پھر بھی میسر آجائے تو اپنی اسٹڈی میں بیٹھ کر کچھ پڑھتا ہوں یا فلمیں دیکھتا ہوں۔

س۔ سیاست سے کتنا لگاؤ ہے؟

افسوس کہ ہمیں بڑی بدبودار اور غلیظ سیاست دیکھنے کو ملی ہے۔ زیادہ لگاؤ ہونے نہیں دیتا کہ میری روزی روٹی انٹرٹینمنٹ کی دنیا سے جڑی ہے۔ اس طرف لگ گیا تو میں تو زندہ رہوں گا' ضمیر شاید زندہ نہیں رہے گا۔

س۔ کھیلوں سے کتنا لگاؤ ہے؟

فزیکل کھیلوں میں صرف سوئمنگ کرتا ہوں۔ باقی ذہانت سے جڑا ہر کھیل کھیلنا اور دیکھنا پسند ہے۔

س۔ چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟

رائٹر کے پاس چھٹی کا کوئی دن نہیں ہوتا۔ دعا کریں مل جائے تو چھ مہینے کے لیے سونا چاہتا ہوں۔ پھر چاہے مر بھی جاؤں پروا نہیں۔

س۔ کس کے ہاتھ کا کھانا پسند ہے؟

ابھی تو اماں کے ہاتھ کا پسند ہے۔ لیکن سب کچھ نہیں۔ بس وہ کچھ کچھ ہی اچھا بناتی ہیں۔ باہر کے کھانے پہلے زیادہ نہیں کھاتا تھا لیکن اب بہت شوق اور اہتمام سے کھانے لگا ہوں۔

س۔ کیا کرنا چاہتے ہیں زندگی میں؟

پہلے زیادہ سنجیدہ تھا تو ہر وقت یہ سوچتا تھا کہ ایسا کیا کروں کہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہ سکوں۔ اب لگتا ہے جو جی رہا ہوں اسے تو اچھے سے جی لوں' مرنے کے بعد والی مرنے کے بعد دیکھی جائے گی۔ گھڑ سواری' پیرا گلائیڈنگ' اسکوبا ڈرائیونگ' سارنگی اور طبلہ سیکھنا چاہتا ہوں۔ اور دنیا کے سب سے خاموش' سب سے گمنام سب سے ویران حصوں پر بالکل اکیلے کیمپنگ کرنا چاہتا ہوں۔ شہرت کے بجائے گمنامی کی موت کا خواہاں ہوں۔

☆

بقیہ سروے

بیوی کی کسی خوبی پر فخر کریں، تعریف کریں، جب کوئی میرے شوہر کی تعریف کرے، جب کسی رسالے کے مدیر یا مدیرہ کی جانب سے پذیرائی کا سندیسہ ملے۔ دل بے اختیار خوش ہوتا ہے اور دل سے اللہ کا شکر نکلتا ہے گو غم بھی ساتھ لگے ہوں۔

5۔ دو سالوں سے تو سب سے اچھی کتاب (ناول) نمل لگ رہی ہے اس سال نئی کتابوں میں اک کتاب زیر مطالعہ رہی "ایک ہزار پُر تاثیر واقعات" یہ دل کی دنیا بدلنے والی ایسے پر اثر واقعات پر مبنی کتاب ہے جو انسان کی زندگی میں اصلاحی انقلاب برپا کر دے اس کی جمع و ترتیب قاری محمد اسحاق ملتانی نے کی ہے۔

پسندیدہ شعر!

اے جوشِ جنوں بے کار نہ رہ کچھ خاک اڑا ویرانے کی
دیوانہ تو بننا مشکل ہے صورت ہی بنا دیوانے کی!

بی سحر ملک..... لاہور

1۔ نیا سال چاہے ہجری کیلنڈر کا ہو یا چاہے عیسوی کیلنڈر کا..... یا پھر میری سالگرہ کے دن سے زندگی کا نیا سال شروع ہو..... میرے احساسات ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ سوچتی ہوں اللہ رب العزت کی ذات نے توبہ اور نیک اعمال کے لیے مزید مہلت دے دی ہے۔ نیو ایئر ریزولوشن کی مصنفہ کی طرح بہت سے عہد باندھتی ہوں کہ اب خود میں سے یہ عادت ختم ہونی چاہیے۔ اب مجھ میں یہ تبدیلی آنی

کی طرح بہت سے عہد باندھتی ہوں کہ اب خود میں سے یہ عادت ختم ہونی چاہیے۔ اب مجھ میں یہ تبدیلی آنی

چاہیے۔

2۔ قابل ذکر تو کچھ نہیں کیا نہ اپنے لیے نہ کسی کے لیے۔ لیکن ایک کام ہے۔ جس نے دل کو سکون سے بھر دیا۔ وہ یہ کہ شامت اعمال نے قرآن سے دور کر دیا تھا۔ چونکہ حافظ ہوں۔ سو زیادہ دوری کے نتائج بہت ہی زیادہ تکلیف دہ ہو سکتے تھے۔ اس سال زیادہ سے زیادہ وقت قرآن پاک کو دیا۔ ترجمہ اور تفسیر ابھی پڑھنی شروع کی ہے اور ساتھ ہی صحیح مسلم کو بھی روٹین میں شامل کیا ہے۔ میرے لیے اس سے بڑی کوئی روحانی خوشی ہو ہی نہیں سکتی۔

3۔ 2016ء نے اک ایسی خوشی دی ہے جو تادم آخر یاد رہے گی۔ اور میرے لیے بہت بڑی کامیابی بھی ہے۔ 27 رمضان المبارک کو امی کی طرف افطاری تھی۔ شادی شدہ بہن بھائی اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ موجود تھے۔ چھوٹے بھائی اور بھانجے، بھتیجے، بھتیجی سب موجود تھے۔ ماشاء اللہ خوب رونق تھی۔ (اللہ یہ رونق ہمیشہ قائم رکھے) بہن کو دبئی سے اس کے دیور نے موبائل بھیجا تھا۔ میں اور بڑا بھائی انٹرنیٹ پر بات کر رہے تھے۔ اسی دوران میں نے نورین سے اس کا موبائل پکڑا اور فیس بک پر اس کی پروفائل بنا دی۔ مجھے کہنے لگی، فرینڈز میں خود کو ایڈ کر دو۔ جناب سرچ آپشن پر جا کر "بی سحر ملک" ٹائپ کیا اور رزلٹس میں میرے پروفائل کے بجائے کچھ اور نکل آیا۔ ڈائجسٹ کا صفحہ نمایاں ہو رہا تھا۔ کھولا تو اک افسانہ تھا جس کی مصنفہ بی سحر ملک تھی۔ دیکھ کر بے حد دکھ ہوا کہ میرا اتنا ڈفرنٹ نام ہے۔ سوچا تھا اس نام سے اور کوئی نہیں ہو گا۔ خیر دکھ کو فی الحال سائیڈ پر رکھا اور سب کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتے ہوئے افسانہ پڑھنا شروع کیا۔ ابھی پہلا صفحہ ہی پڑھ رہی تھی کہ تحریر جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ مزید پڑھا۔ اگلے صفحے پر منہ سے چیخ ہی نکل گئی۔

"امی..... امی میرا افسانہ شعاع میں شائع ہو گیا۔" اک لمحے سے پہلے بیڈ سے چھلانگ لگا کر دوسرے کمرے میں امی کے پاس بھاگی۔ بھائی اور بہن، بچے۔ سب ادھر جمع ہو گئے۔ سب کو اپنا نام "خصوصاً" دکھایا۔ وہ شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مبارک سلامت، شوخیاں، شرارتیں۔

اصل میں شعاع اور خواتین امی جانے کب سے پڑھتی رہی ہیں۔ ہوش سنبھالا تو انہیں دیکھ کر مجھے بھی پڑھنے کا شوق ہوا۔ پچھلے دنوں نیٹ سے عنیزہ سید کا شب گزیدہ نکالا تو حیران رہ گئی۔ جس وقت یہ ناول شائع ہو رہا تھا میں بہت چھوٹی تھی۔ اتنی چھوٹی کہ اس عمر میں بچے ٹھیک سے نصاب کی کتابیں نہیں پڑھ پاتے اور میں رسائل پڑھا کرتی تھی۔ عائشہ نیازی فرام کنیئرڈ کالج کے الفاظ ذہن میں شور مچاتے تھے سو اک گروپ میں پوسٹ ڈال دی۔ وہیں سے نام اور لنک ملا تھا۔ اتنی پرانی قاری ہوں اور بچپن سے ہی ذہن میں کہانیاں بننے لگا تھا۔ شرمیلی (صرف کہانیوں کی حد

تک) ہونے کی وجہ سے کچھ بھی پوسٹ نہیں کرتی تھی۔

کچھ میں نے سن رکھا تھا کہ شعاع اور خواتین میں نو آموز رائٹرز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی یا یہ کہ پیسے دینے پڑتے ہیں' سفارش وغیرہ چلتی ہے۔

پھر 2013ء میں ہمت کر کے شعاع میں تحریر بھیجی جو کہ 2014ء جولائی میں "پھر یوں ہوا" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس مہینے اللہ نے اک بہت بڑی خوشی میرے بیٹے کی صورت عطا کی تھی تو ڈائجسٹ نہ منگوا سکی نہ پڑھ سکی۔ تو یہ میرے لیے یہ ایک ایسی کامیابی ہے کہ جب بھی یاد آئے گی' دل کو یونہی خوشی سے بھرتی رہے گی۔ اور ناکامی الحمدللہ کوئی نہیں ملی۔

4۔ میں وہ لڑکی ہوں جس نے عمر رواں کے گزشتہ کئی سال' جذباتی تنہائی' اک بے جرم سزا کی طرح کاٹے ہیں اور ابھی تک کاٹ رہی ہوں۔ یا شاید میں نے غلط لکھ دیا بے جرم سزا نہیں.... میری حساسیت کی سزا ہے شاید۔ پھولوں' تتلیوں' بارش' جگنو' ہواؤں' کتابوں اور خوابوں کو چاہنے والی کوئی بھی لڑکی شاید عملی زندگی میں میری ہی طرح تنہائی کا شکار ہوتی ہو۔ ہزار سوچنے کے بعد بھی اس سوال کے جواب میں دمکتا اک لمحہ بھی ذہن میں نہیں آیا جب سچی خوشی نے دل کو منور کر دیا ہو۔ معذرت۔

5۔ کتابوں کے حوالے سے یہ سال بہت یادگار رہا۔ انگلش کے قابل قدر مصنفین کو پڑھنے کا موقع ملا۔ شیکسپیئر' جان آسٹن' ٹالسٹائی' جان ملٹن کی تصنیفات ابھی بھی زیر مطالعہ ہیں۔ اردو میں ناصر کاظمی کی شاعری اور شہاب نامہ پڑھا لیکن جس چیز نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا' وہ ہندوستان سے شائع ہونے والے اک رسالے کی کتابی شکل میں شائع ہونے والے نو مسلم بہن' بھائیوں کے واقعات زندگی میں سے اک واقعہ ہے۔

اک بہن کو اللہ کی طرف سے ہدایت ملی بغیر کسی انسانی وسیلے کے۔ انہوں نے اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اللہ عزوجل کا وعدہ ہے۔ اسلام ہر گھر' ہر گلی' ہر دل میں پہنچے گا۔ اللہ ہمارے وسیلے کا محتاج نہیں۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہونے کے ناتے' کیا ہمارا فرض نہیں کہ ہم لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔

اگر کوئی مشرک پیدا ہوا اور مشرک مر گیا تو اس کے شرک میں قصوروار ہم بھی ہیں کہ ہم نے اس کی اصلاح کی کوشش نہیں کی۔

کم و بیش یہی الفاظ تھے ان کے۔ یہ پڑھنے کے بعد سوشل میڈیا کی سائٹس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اب میں نے لوگوں کو اللہ کے دین کے مطالعے کی طرف بلانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ دعا کریں اللہ کسی ایک شخص کا بھی دل پھیر دے تو میں اس سکون کے ساتھ مر سکوں گی کہ فرض ادا نہ ہوا پر کوشش تو کی۔ کسی ایک شخص کو ابدی سزا سے بچا لیا۔

ثمینہ اکرم.... کراچی

1۔ نئے سال کے آغاز پر میرے احساسات ناقابل فہم ہوتے ہیں۔ میری شخصیت دھوپ چھاؤں جیسی ہے۔ بعض دفعہ بہت خوشی کے موقعوں پر میرا دل بہت اداس ہو جاتا ہے۔ میں اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پاتی۔ لہٰذا جب نئے سال کی آمد ہوتی ہے تو بہت زیادہ پرجوش نہیں ہوتی۔

2۔ کبھی کبھی کی گئی ایک چھوٹی سی نیکی بھی' ہمیں وہ سچی روحانی خوشی عطا کر جاتی ہے کہ لاکھوں روپے خرچ کر کے بھی ہم اس خوشی کو نہیں پا سکتے۔ اور وہ ایک لمحہ ساری عمر پر سبقت لے جاتا ہے۔ مجھے چھوٹے چھوٹے اچھے کام کر کے راحت قلب نصیب ہوتی ہے۔ کئی مرتبہ سول اسپتال میں پریشان حال مریضوں کی ہر ممکن مدد' مجھے دلی خوشی سے ہم کنار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ۔

ایک مرتبہ میں نے اپنی کمیٹی کا نمبر ایک دوسرے کمیٹی ممبر کو دے دیا کیونکہ ان کی بیٹی کی شادی تھی جبکہ مجھے خود بھی پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ مگر میں نے اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر ان کی ضرورت پوری کر دی۔

3۔ جب بھی میں کوئی اچھا کام کروں مجھے خوشی اور سکون قلب ملتا ہے۔ کسی بزرگ کو سڑک پار کروانا.... اکثر اپنی ضرورت کی چیز کسی اور ضرورت مند کو اٹھا کر دے دیتی ہوں۔ بس میں اپنی جگہ دوسروں کو دے دینا۔ اپنی کام والی کو مہینے سے پہلے ہی تنخواہ دے دینا۔ یہ سارے کام اور اس جیسے چھوٹے چھوٹے سینکڑوں کام کر کے مجھے بہت خوشی اور روحانی سکون ملتا ہے۔

4۔ یہ سوال پڑھ کر بے ساختہ مجھے اکرم یاد آ گئے اور میں

ان کو یاد کر کے ہنس پڑی (کیونکہ ابھی صاحب جاب سے واپس نہیں آئے ہیں) میں جب بھی ذرا سا تیار ہو جاؤں، نئے کپڑے پہنوں تو ان کی محبت بھری نظریں میرا طواف کرتی رہتی ہیں اور ان کے میٹھے جملے میری سماعتوں میں رس گھولتے ہیں۔ اور میرے لیے یہ بہت جان افزا اور خوش کن احساس ہے کہ مجھ عام سی بندی کو اتنا چاہنے والا شوہر ملا ہے۔ اور اکثر اکرم میرے لیے کہتے ہیں کہ تم بیماری کے باوجود بھی ہر وقت گھر کے کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی ہو۔ لوگ تو آرام کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں اور تم بیمار ہو پھر بھی آرام نہیں کرتی ہو۔ یقیناً" تم میری کسی نیکی کا انعام ہو۔" میرے صاحب کے یہ تحسین و تعریف آمیز جملے میری ساری تھکن کافور کر دیتے ہیں۔ اور میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتی ہوں اور پروردگار کی شکر گزار بھی ہوتی ہوں۔

5۔ "شعور حیات" اور "زاویہ" میری پسندیدہ کتابیں ہیں۔ کیونکہ ان کو پڑھ کر ہم اپنی زندگی کو بہترین بنا سکتے ہیں۔ اس میں زندگی کو پرسکون بنانے کا گر پنہاں ہے۔

زاویہ سے اقتباس

"لذتیں وقتی اور ہنگامی ہوتی ہیں۔ مسرتیں، شادمانیاں مستقل ہوتی ہیں۔ لذتوں کا جسم سے تعلق ہوتا ہے اور خوشیوں کا روح سے۔" (اشفاق احمد)

مسرت الطاف احمد..... کراچی

1۔ نئے سال کے آغاز پر یہ احساس بہت ہی شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ وقت بہت برق رفتاری سے گزر رہا ہے۔ نئے سال کی آمد پر دل میں خوشی اور اداسی کی ملی جلی کیفیت ہوتی ہے۔

2۔ گزشتہ برس اسکول میں، جہاں میں جاب کرتی ہوں اسٹوڈنٹس نے ایک پارٹی ارینج کی جس میں ہم نے بہت انجوائے کیا۔ ہماری ایک ٹیچر جن سے میں کم ہی علیک سلیک کرتی ہوں جب ان سے ٹیچرز کے حوالے سے کمنٹس لیا گیا تو بھری محفل میں انہوں نے میرے لیے کہا "مس مسرت کو بات کرنے کی تمیز ہی نہیں ہے ان میں اکڑ بہت ہے۔" ہال میں شدید گھٹن کا احساس ہوا۔ میرے لیے یہ بات سب سے زیادہ شاکنگ تھی، میں نے آنکھوں میں امڈ آنے والے اشکوں کو بمشکل ضبط کیا ان کے بیٹھتے ہی ایک دوسری ٹیچر نے سب کے سامنے میری تعریف کی اور میرے لیے کہا "مس مسرت فضول گوئی نہیں کرتیں۔ کم بولتی ہیں لیکن اچھا بولتی ہیں۔"

پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا جیسے دشت میں اچانک ساون برسے، جیسے اندھیری راتوں میں کوئی ہزاروں دیے روشن کر دے۔

3۔ گزشتہ سال ذاتی حوالے سے بہت ساری خوشیوں سے ہمکنار کر گیا اپنی جڑواں سسٹر صائمہ الطاف کی شادی کی تقریبات کے لیے اپنے، ندا اور ام رباب کے ڈریسز میں نے ڈیزائن کیے تھے جسے سب نے بہت پسند کیا بہت سے لوگوں نے یہ تک کہہ دیا کہ یہ ڈریس ریڈی میڈ ہیں جس سے دلی خوشی ہوئی۔ اسی سال میری کارکردگی کو دیکھتے ہوئے میری سیلری میں بھی اضافہ کیا گیا۔ میری لگن اور محنت کی وجہ سے راستے خود بخود کھلتے گئے اور منزلیں آسان ہوتی گئیں۔

4۔ بہت سے لوگوں نے میرے لیے تعریفی جملے کہے

کسی نے نین نقش کی تعریف کی تو کسی نے کردار کی۔ میری آنٹی نے جو مسقط میں رہتی ہیں انہوں نے میرے ہونٹوں اور آواز کی تعریف کی۔ پتا نہیں مجھ میں یہ اوصاف ہیں یا نہیں لیکن یہ تحسین آمیز جملے یاد کر کے آج بھی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔

5۔ اس سال مطالعے میں سرفہرست شعاع اور خواتین ہی رہا۔ کیوں کہ اس کی ہر تحریر متاثر کن اور سبق آموز ہوتی ہے پسندیدہ اقتباس نمرہ احمد کی تحریر "نمل" سے جس نے مجھے بہت زیادہ انسپائر کیا۔

"آزمائش اللہ اذیت دینے کے لیے نہیں، کچھ سکھانے کے لیے ڈالتا ہے، جتنی جلدی سیکھ لیں گے، اتنی جلدی وہ دور ہو گی۔"

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

آفر

بولی ووڈ میں تو لگ گئی پابندی (بھارت نے لگادی پاکستانی فن کاروں پر پابندی ورنہ؟) اب ہمارے فن کار کیا کریں تو اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ اب انہیں ہالی ووڈ سے آفرز آرہی ہیں۔ (ہیں.... کیا....؟ نہیں بھئی۔) اب اداکارہ ثناء نے کہا ہے کہ انہیں ہالی ووڈ سے آفر آئی ہے۔ (ایہہ کی گل کردی ثنا! تمہیں پاکستان میں تو کام مل نہیں رہا' ہالی ووڈ....؟) ثنا کا کہنا ہے کہ وہ پچھلے دنوں انگلینڈ میں ہونے والے ایک پاکستانی ایوارڈ شو میں پرفارم کررہی تھیں کہ اچانک ہالی ووڈ ڈائریکٹر جان پیٹرسن کی ''جوہر شناس'' نظریں ان پر ٹھہر گئیں اور انہوں نے اسی وقت انہیں اپنی ایک فلم میں کام کرنے کی آفر دے دی۔ (پورے ایوارڈ شو میں صرف ثنا کی پرفارمنس.... انہیں نظر آئی۔ باقی فن کار کیا سلیمانی ٹوپی پہنے ہوئے تھے؟) اور ثنا نے اسے قبول کرلیا ہے اور اگلے ماہ وہ اس آفر کو باقاعدہ قبول کرنے انگلینڈ جانے کا ارادہ بھی رکھتی ہیں۔ (ثنا! کہیں اس ڈائریکٹر کی یادداشت واپس نہ آجائے۔) ویسے ثنا کردار کیا تھا' یہ بھی پوچھا یا نہیں۔

اعزاز

ایک برطانوی جریدے نے نو آموز پاکستانی اداکارہ ارمینا خان کو ایشیا کی پچاس پُرکشش ترین (ہیں!! یہ ''ترین'' پر اتنا زور کیوں؟) خواتین (اف ارمینا! خواتین؟) میں شمار کرتے ہوئے' ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ انہوں نے حال ہی میں ریلیز ہونے والی فلم ''جاناں'' میں کوئی ایسا اچھوتا کردار ادا کیا جس نے پاکستانی معاشرے پر زبردست اثرات مرتب کیے۔ (ہم م م! ریحام خان کا کردار ادا کیا تھا ارمینا نے۔) جریدے نے ارمینا کو پاکستانی سینما کا ایک کامیاب ستارہ بھی قرار دیا ہے۔ (پاکستانی سینما کا آسمان کتنا بڑا ہے؟) اب ایک

برطانوی نژاد پاکستانی اداکارہ کو یہ اعزاز ملنا ہماری خالص پاکستانی فنکارائیں کہاں برداشت کر سکتی ہیں۔ (جب ہی تو بھارتی فلموں میں کام کرنے کے لیے بے قرار رہتی ہیں۔ ہیں نا؟) کچھ نے کہا کہ یہ تو ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ (ہیں..... یہ کون بولا؟) اور کچھ بولیں کہ کیوں کہ ارمینا برطانوی نژاد ہیں' اس لیے برطانوی میڈیا نے فیورٹ ازم کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں یہ اعزاز دیا ہے۔

چھاپ

احسن خان نے اپنی فنکارانہ زندگی کا آغاز فلم سے کیا' لیکن انہیں شہرت اور پسندیدگی کی سند ٹی وی ڈراموں کے ذریعے ملی' لیکن اب بدلتے ہوئے فلمی ماحول میں احسن خان دوبارہ فلم کر رہے ہیں۔ ان کی فلم "چھپن چھپائی" جو نیلم منیر کے ساتھ ہے۔ فروری 2017ء میں ریلیز کی جائے گی۔ اس کے بارے میں احسن خان کہتے ہیں کہ "چھپن چھپائی" کا اسکرپٹ پڑھ کر بھی انہوں نے اس لیے یہ فلم سائن کر دی تاکہ منفی کرداروں کی چھاپ ان پر نہ لگ جائے اور ورسٹائل اداکار والا تاثر برقرار رہے۔

یاد رہے پرائیوٹ چینل سے چلنے والے ایک ڈرامے سیریل میں احسن خان نے اپنے منفی کردار کو بہت خوبی سے نبھایا تھا اور اس پر اپنے کیریر کی بھرپور ترین داد بھی وصول کی تھی۔

نادر نسخہ

تقریباً" سو سال قبل 1935ء میں بریلی سے حج کے لیے جانے والے ایک زائر نجیب اللہ شیخ کو حجاز مقدس میں ایک عربی بزرگ نے مختصر ترین نسخہ قرآن دیا۔ اب یہ نسخہ ان کے پوتے شاہ کفیل احمد کی تحویل میں ہے۔ یہ نادر نسخہ اتنا مختصر ترین ہے کہ اسے صرف محدب عدسے کی مدد سے ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ شاہ کفیل احمد نے عمرے کے دوران یہ نسخہ مسجد نبوی میں دکھایا۔

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ دبئی کے مہنگے ترین علاقے جمیرہ کے ایک ریزورٹ میں سابق گورنر سندھ عشرت العباد خان کے صاحب زادے کا ولیمہ ہوا۔ ولیمے کی یہ تقریب کسی شہزادے اور ولی عہد کے ولیمے سے کیا کم ہوگی' کہتے ہیں ام دبئی اساطیر میں ہونے والی اس تقریب میں غریب قرض دار پاکستان کے ایک صوبے کے سابق گورنر نے اس شاہانہ تقریب میں چار کروڑ لٹائے۔ یہ وہی گورنر سندھ ہیں جو چودہ برس تک ٹھاٹھ باٹ سے گورنر رہنے کے بعد سابق ہوئے تو چودہ گھنٹے بھی یہاں رہنا گوارا نہ کیا۔

(دیکھتا چلا گیا..... سیلانی)

☆ بے نظیر بھٹو کے شوہر اور سابق صدر آصف زرداری نے بے نظیر بھٹو کے قتل کے مقدمے کی ایف آئی آر درج کرانے میں دلچسپی نہیں لی۔ جس مقدمے کا کوئی مدعی نہیں ہوتا۔ وہ مقدمے کبھی انجام تک نہیں پہنچتے۔

(محمد انور..... سنڈے میگزین)

آپ کا باورچی خانہ

آمنہ زاہد ...... میاں چنوں

میں سمجھتی ہوں مجھے اس سلسلے میں شرکت کرنا چاہیے کیونکہ پچھلے نو سالوں سے اس پرچے کی قاری ہونے کے ساتھ ساتھ کھانا پکانے کی پاگل پن کی حد تک شوقین ہوں اور یہ شوق نو سال سے ہے۔ آپ سوچیں گے نو سال کا کیا راز تو جناب مابدولت کی شادی کو نو سال ہوئے ہیں۔ کھانا بنانا بھی اسی وقت سے شروع کیا اور ڈائجسٹ بھی تسلسل سے پڑھنا تب ہی شروع کیا پہلے امی ابو روٹین سے پڑھنے نہ دیتے۔ کچھ پڑھائی کی مصروفیت آڑے آتی شادی بہت کم عمری میں ہوگئی تھی۔

س ۔ کھانا پکاتے وقت آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں۔ پسند ناپسند غذائیت یا گھر والوں کی صحت؟

ج آٹھ سال تک جوائنٹ فیملی سسٹم تھا تو روزانہ دو سے تین سالن بنتے' سب کی پسند اور صحت کو مد نظر رکھتے ہوئے' اب الگ ہیں تو میاں اور بچوں کی پسند کو مد نظر رکھ کر کھانا بناتی ہوں جو کہ بلاشبہ غذائیت سے بھرپور بھی ہوتا ہے۔

س ۔ کھانے کا وقت ہے۔ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری طور پر تیار کرکے تواضع کرسکیں۔

ج ۔ ماشاء اللہ سے کافی بڑی فیملی ہے۔ کوئی نہ کوئی مہمان آتا ہی رہتا ہے اور چاول سب کی پسندیدہ ڈش ہے تو میں جلدی سے چکن پلاؤ اور ساتھ میں دہی بڑے بنالیتی ہوں' چکن پلاؤ آدھے گھنٹے میں تیار ہوجاتا ہے' ترکیب یہ ہے۔

ضروری اجزا :

چکن	ایک کلو
چاول	ایک کلو
پیاز	دو عدد
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	تین چائے کے چمچے
ادرک' لہسن پیسٹ	دو چمچے
ٹماٹر	دو عدد
سبز مرچ	حسب ذائقہ
آئل	حسب ضرورت
زیرہ' املی	حسب ضرورت
سرکہ	ڈیڑھ کپ
بریانی مسالا	ایک پیکٹ

(ذائقہ بڑھانے کے لیے)

ترکیب :

باریک لچھے دار کٹی ہوئی پیاز کو بادامی ـــــ کرلیں پھر اس میں ادرک لہسن' پیسٹ ڈال دیں۔ ساتھ ہی ٹماٹر اور سبز مرچ شامل کردیں' تھوڑی دیر تک بھونیں اور پھر نمک' مرچ' املی اور زیرہ شامل کردیں۔ پانی کا چھینٹا لگائیں اور چکن شامل کردیں۔ دس منٹ تک چکن بھونتے رہیں اور ساتھ ہی بریانی مسالے کا پیکٹ ڈال دیں اور اب اس میں حسب ضرورت پانی ڈال دیں۔ پانی جوش کھانے لگے تو چاول اور سرکہ شامل کریں جب پانی خشک ہونے لگے تو حسب ضرورت دم پر لگادیں۔ مزے دار چکن پلاؤ تیار ہے۔ چاول بناتے بناتے دہی بڑے بھی بن جائیں گے۔

جھٹ پٹ سرو کریں اور داد وصول کریں۔

س ۔ کچن خاتون خانہ کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

ج ۔ جیسے میں کھانا بنانے کی شوقین ہوں تو ویسے ہی کچن کی صفائی میں بھی جنونی ہوں' زیادہ بکھیڑا پھیلنے نہیں دیتی' ساتھ ساتھ برتن دھل جاتے ہیں اور کاؤنٹر وغیرہ بھی صاف ہوتے رہتے ہیں۔ رات سونے سے

پہلے گرم پانی سے فرش ضرور دھوتی ہوں چاہے سردی ہو یا چاہے گرمی۔ تفصیلی صفائی بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے، کبھی ایک کیبنٹ کی کرلی اور کبھی دوسرے کی۔

س۔ صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں۔ ایسی خصوصی ڈش جو آپ بہت اچھی بناتی ہیں؟

ج۔ صبح کے ناشتے میں عموماً "پراٹھا" رات کا بچا سالن انڈے اور چائے شامل ہیں اس کے علاوہ کبھی چیز سینڈوچ بنالیتی ہوں جو سب بہت پسند کرتے ہیں ترکیب حاضر ہے۔

پنیر سینڈوچ

ضروری اجزا :

ڈبل روٹی	ایک پیکٹ
انڈے	چار عدد
پیاز	دو چھوٹے سائز کی
ٹماٹر	ایک عدد
ہری مرچیں	دو سے تین عدد
سرخ مرچ	حسب ضرورت
نمک	حسب ضرورت
چکن کی بون لیس بوٹیاں	چھ، سات عدد
آئل، چیز	حسب ضرورت

دو درمیانی سائز کے آلوؤں کے چپس

ترکیب :

تھوڑے سے دودھ میں نمک، مرچ اور انڈے شامل کر کے اچھی طرح پھینٹ لیں پھر تمام اجزا شامل کردیں اور سنہری پھولا ہوا آملیٹ بنالیں اب آملیٹ کے ٹکڑوں کو بریڈ پر رکھیں، اس کے اوپر کش کیا ہوا پنیر ڈالیں۔ اس کے اوپر دوسرا سلائس رکھیں اور آئل لگا کر سینڈوچ میکر میں سینڈوچ بنالیں۔ لذیذ سینڈوچ تیار ہے، چائے کے ساتھ پیش کریں۔

س۔ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھاتی ہیں؟

ج۔ ہمارے ہاں باہر کھانا کھانے کا بالکل رواج نہیں۔ البتہ برگر، شوارما، پیزا وغیرہ کھایا جاتا ہے، میں گھر پر بھی یہ سب بنالیتی ہوں۔ بچوں کو زنگر برگر بھی بنادیتی ہوں، اس لیے باہر سے کھانا کھانے کا تردد کم ہی کرتے ہیں۔

س۔ پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟ ج۔ جی بالکل۔ اگر بارش ہو تو پکوڑے تو لازمی ہوں گے۔ کبھی گول گپے بھی بنالیتے ہیں۔ سردیوں میں ساگ، گاجر کا حلوہ، فرائی مچھلی اور گرمیوں میں دال کے ساتھ سادہ چاول اور سفید چنے کا پلاؤ ساتھ میں ہلکا پھلکا سارائتہ اور سردیوں میں سبزیوں کا پلاؤ اور سبزیوں میں مٹر تو لازمی شامل ہونے چاہئیں۔

س۔ اچھا کھانا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

ج۔ اچھا کھانا بنانے کے لیے بلاشبہ محنت اہم جزو ہے، لیکن ایک اور چیز بھی ہے جس کے بغیر کھانا کبھی بھی اچھا نہیں بن سکتا، وہ ہے آپ کا پیار اور خلوص اگر آپ یہ چیزیں شامل کریں گی تو ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کھانا کسی کو پسند نہ آئے آزمودہ نسخہ ہے جب شادی ہوئی تو بہت کم عمر تھی۔ تجربہ صفر تھا۔ بس پیار، محبت، شوق و لگن سے بناتی اور کبھی کھانا رونہ ہوا۔

س۔ کچن کی کوئی ٹپ جو دینا چاہیں؟

ج۔ پانی ہمیشہ اسٹیل کے برتن میں بوائل کریں۔ وہ کالا نہیں ہوگا۔ چاول بوائل کرتے ہوئے نمک چاولوں کے بعد شامل کریں۔ برتن کالا نہیں ہوگا۔ پالک میں ایک چٹکی میٹھا سوڈا ڈال دیں۔ رنگت تبدیل نہ ہوگی۔ دال بناتے ہوئے چمچہ نہ چلائیں ایسے دال جلدی بن جائے گی۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چٹخارے دار مچھلی کا سالن

ضروری اجزا :

مچھلی	ڈیڑھ کلو
پیاز	ڈیڑھ کپ
دہی	دو کھانے کے چمچے
کٹا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر	چار عدد
لیموں کا رس	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچیں، لیموں	سجاوٹ کے لیے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

مچھلی کے موٹے قتلے بنوالیں، پھر اس کو دھو کر۔ — نمک اور سرکہ لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

ایک دیگچی میں تیل گرم کرکے اس میں پسی پیاز ڈال کر بھون لیں۔ کٹا دھنیا، لال مرچ پاؤڈر، ٹماٹر باریک کٹے، ہلدی پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر اور نمک ڈال کر پکائیں، ٹماٹر گل جائیں اور مسالا تیل چھوڑدے تو مچھلی اور دہی شامل کرکے پانچ منٹ دم پر رکھ دیں۔ اس کے بعد دیگچی کو کپڑے کی مدد سے پکڑ کر ہلائیں اور اچھی طرح بھون لیں۔ روغن اوپر آجائے تو آخر میں لیموں کا رس چھڑک کر ڈش میں نکال کر ہری مرچ اور لیموں کے سلائس سے سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

فش کباب

ضروری اجزا :

مچھلی	ڈیڑھ کلو
آلو	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
زیرہ پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
اوریگانو	ایک چائے کا چمچہ
انڈا	ایک عدد
تیل	تلنے کے لیے
ہرا دھنیا	حسب ضرورت

ترکیب :

آلو اچھی طرح میش کرکے اس میں بھاپ میں ابلی مچھلی کے ریشے کرکے نمک، لال مرچ پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر اوریگانو، پسی ہری مرچ اور ہرا دھنیا ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

آمیزہ کو کباب کی شکل دے کر انڈے میں ڈبو کر توے یا فرائی پین میں تیل گرم کرکے تل لیں۔ سنہرا رنگ آنے پر ڈش میں نکال کر کیچپ کے ساتھ گرم گرم فش کباب پیش کریں۔

سندھ کی مشہور توا فش

ضروری اجزا :

مچھلی سالم	ڈیڑھ کلو
لہسن ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
چاٹ مسالا	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
اجوائن	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ

بیسن	تین کھانے کے چمچے
گندم کا آٹا	دو کھانے کے چمچے
املی کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

مچھلی کو نمک اور پسا لہسن ادرک لگا کر دھولیں اور اس پر ترچھے کٹ لگائیں' ایک بڑے برتن میں مچھلی پر لیموں کا رس' پسا لہسن ادرک' لال مرچ پاؤڈر' چاٹ مسالا' اجوائن' زیرہ' بیسن' گندم کا آٹا' املی کا رس اور نمک لگا کر ایک سے دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ توے پر تیل ڈال کر درمیانی آنچ پر گرم کریں۔ اس میں مسالا لگی مچھلی پہلے ایک طرف سے تل لیں' اس کے بعد سنہرے ہونے پر دوسری طرف سے تلیں۔

مزے دار و چٹ پٹی تو افش تیار ہے۔ ڈش میں رکھ کر لیموں کا رس چھڑک دیں اور گرما گرم مچھلی رائتے اور املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

شلجم کا اچار

ضروری اجزا :

لال شلجم	ایک کلو
رائی	دو کھانے کے چمچے
کٹی ہوئی لال مرچ	آدھی چھٹانک
نمک	حسب ضرورت
پانی	دو کلو
گڑ یا چینی	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

شلجم کو گول گول ایک انچ کی چوڑائی میں کاٹ اور ایک بڑے برتن میں ڈال کر ابال لیں۔ شلجم گل جائیں تو نکال کر ٹرے میں ٹھنڈا کریں۔ کسی مرتبان یا برتن میں شلجم' پسی رائی' کٹی ہوئی مرچ' نمک' لہسن' گڑ یا چینی ڈال کر اس میں دو لیٹر پانی ابال کر ٹھنڈا کر لیں' پھر وہ پانی بھی ڈال دیں۔ ایک ہفتہ میں مزے دار اچار تیار ہو جائے گا۔

سوہن حلوہ

اجزا :

اراروٹ	ایک پاؤ
چینی	ایک پاؤ
دودھ	آدھا کلو
سبز الائچی	چھ عدد
بادام' اخروٹ' پستے	حسب پسند
گھی	ایک پاؤ

ترکیب :

ایک برتن میں دودھ ڈال کر اس میں اراروٹ شامل کر کے اچھی طرح حل کر لیں۔ اور پھر ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ مستقل چمچہ چلاتی رہیں۔ دودھ گاڑھا ہونے لگے تو اس میں چینی اور گھی شامل کر دیں۔ جب یہ اجزا خوب اچھی طرح پک جائیں اور آمیزہ کی شکل سوہن حلوے کی شکل اختیار کرنے لگے تو اس میں خشک میوہ کاٹ کر ڈال دیں۔ اور سبز الائچی کے دانے بھی ڈال دیں' چمچہ مستقل چلاتی رہیں۔ ایک ٹرے یا تھالی میں گھی یا تیل لگا کر حلوے کو اس میں ڈال کر پھیلا دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر ٹکڑے کاٹ لیں۔

☆

ش۔ر۔ کراچی

سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی سب کے ہی اتنے ہی امتحان لیتی ہے یا پھر اس خاص عنایت سے مستفید ہونے والی میں ہی ہوں' بھائی' ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ 3 بھائی اور دو بہنیں۔ بہن اور دو بھائیوں کی شادی ہو چکی ہے اور میری منگنی۔ بڑے بھائی کے دو بچے ہیں ایک بیٹی اور ایک بیٹا اور اس اگست میں میری جان سے عزیز بھابھی' میری بہن' میری دوست' میرا سب کچھ ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئیں۔ ہمارا عظیم سرمایہ ہم سے کھو گیا۔ اس دکھ اس غم نے ہمیں چکنا چور کر دیا۔ ہے سب کچھ کر کے دیکھ لیا مگر ان کے بغیر ایک ایک پل اذیت سے بھرپور ہی رہتا ہے۔ میری بھتیجی جو کہ چار سال کی ہے' وہ شروع سے ہی مجھ سے اٹیچڈ ہے۔ وہ کوئی کام میرے بغیر نہیں کرتی ابھی نہیں جب اس کی مما ہمارے ساتھ تھیں' جب بھی وہ ایسی ڈپینڈڈ تھی مگر اب بیٹا بھی میرے پاس ہی ہوتا ہے۔ بھائی بہت عجیب ہو گئے ہیں یا تو وہ روتے رہتے ہیں یا پھر ان کی ایک ہی بات کہ ان کی شادی جلد از جلد کر دی جائے۔

میرے لیے یہ سب بہت بہت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ میرا دل و دماغ اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ اتنی جلدی ان کی جگہ کسی اور کو دے دی جائے۔ مجھے بچوں کے معاملے میں کسی پر اعتبار نہیں ہے حتیٰ کہ اپنے بھائی یعنی بچوں کے باپ پر بھی نہیں حالانکہ میرے بھائی ایک کامیاب بزنس مین ہیں' روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے گھر میں....

میں نے خود کراچی یونیورسٹی سے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کیا ہے ریڈیو پر بہت کام کیا ہے۔ مختلف اخبارات سے وابستہ رہی ہوں مگر اب لگتا ہے کہ میں ایک ناکام انسان ہوں۔ میری جس شخص کے ساتھ منگنی ہوئی ہے وہ ایک بے حس انسان ہے میری اس سے کبھی بات نہیں ہوئی ہے۔ مگر پھر بھی میں اسے کافی زیادہ جانتی ہوں۔ اس کے گھر میں خواتین پر حد سے زیادہ پابندیاں عائد ہیں۔ 60 گز کے مکان میں' تین شادی شدہ بھائی پہلے سے رہتے ہیں اور مجھے بھی وہیں جا کر ایڈجسٹ ہونا ہے۔ اس کی اپنی سیلری انیس ہزار ہے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ مجھے جاب کرنے کی اجازت مل جائے.... میں شادی نہیں کرنا چاہتی' جہاں ہوں۔ جیسے ہوں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ گھر والوں سے بھی ہر طرح سے بات کر کے دیکھ لی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا اور بھابھی کے جانے کے بعد تو میرا دل بالکل بھی نہیں مانتا ہے۔ بچے مجھ سے بہت زیادہ اٹیچڈ ہیں میں بھی انہیں نہیں چھوڑنا چاہتی۔

ج : آپ نے دو مسئلے لکھے ہیں' پہلا مسئلہ آپ کے بھائی کا ہے۔ آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں تو آپ کے بھائی کا مطالبہ غلط نہیں ہے۔ بیوی کی جدائی سے وہ پریشان ہیں' تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ آپ کی بھابھی کا اب اس دنیا سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ بھائی دوسری شادی کر لیں یا ساری عمر ان کی یاد میں گزار دیں۔ بھابھی کو کیا فرق پڑے گا۔ آپ کے بھائی شادی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کوئی اچھی نیک دل لڑکی دیکھ کر ان کی شادی کر دیں' ایسی لڑکی جو بچوں کو ماں کا پیار نہ دے سکے تو کم از کم ان کے ساتھ بدسلوکی بھی نہ کرے۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں' وہ جلد نئی ماں سے مانوس ہو جائیں گے آپ بچوں کا بہت خیال رکھتی ہیں لیکن ان کے بارے میں بہت جذباتی ہو کر سوچ رہی ہیں حالانکہ آپ کی اپنی بھی زندگی ہے۔

دوسرا مسئلہ آپ کا ہے۔ آپ اپنے رشتہ سے ناخوش ہیں۔ مسئلہ اگر کم تنخواہ کا ہے تو اگر لڑکا پڑھا لکھا اور ذہین

ہے تو تنخواہ بڑھ بھی سکتی ہے۔ اور وہ بڑا گھر بھی لے سکتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس لڑکے سے ایک بار بات کریں۔ ممکن ہے آپ اسے بے حس اور بے کار سمجھ رہی ہوں اور وہ ایسا نہ ہو اور آپ کے خیالات اس کے بارے میں بدل جائیں۔ فون پر بات کی جاسکتی ہے۔ اگر پھر بھی آپ کا دل راضی نہ ہو اور آپ یہ سمجھتی ہوں کہ آپ وہاں گزارہ نہیں کر سکتیں اور ان لوگوں کے ساتھ رہنا مشکل ہے تو پھر اس رشتہ کو ختم کرنا بہتر ہے۔ ابھی کی تھوڑی پریشانی بعد کی بڑی الجھنوں سے بہتر ہے۔

اگر گھر والے رشتہ ختم کرنے پر رضامند نہ ہوں تو آپ اس لڑکے سے کہیں کہ اس رشتہ میں آپ کی مرضی شامل نہیں۔ وہ خود انکار کردے۔ اگر وہ لڑکا انکار کردے گا تو آپ کے گھر والے آپ کو مجبور نہیں کر سکیں گے۔

جہاں تک بھائی کے بچوں سے محبت کی بات ہے تو جب تک آپ کی شادی نہیں ہوتی آپ انہیں ساتھ رکھ سکتی ہیں لیکن اس لڑکے سے نہ سہی کہیں اور تو آپ کی شادی ہونا ہی ہے تو ایسی صورت میں آپ کے لیے انہیں اپنے پاس رکھنا مشکل ہوگا۔

بہن گ۔ ق ننکانہ صاحب

ج : عزیز بہن جس طرح آپ کی والدہ نے محنت مزدوری کرکے آپ کو پڑھایا اور اب آپ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھا رہی ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ باپ کے برے رویے کے باوجود آپ کے رشتے آئے ہیں۔ اگر لڑکے نیک، شریف اور برسر روزگار ہیں تو آپ کی والدہ ہمت کریں اور آپ کی شادی کر دیں۔ کیونکہ یہ توقع رکھنا کہ آپ کے والد اور بھائی سدھر جائیں گے عبث ہے۔ ان کی عادتیں پختہ ہو چکی ہیں۔

جو باپ بیٹی کو مار کر گھر سے باہر سڑک پر کھڑا کر سکتا ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اپنی والدہ سے کہیں کہ اچھے رشتے ہیں تو بلا تاخیر قبول کرلیں۔ ان حالات میں آپ کا رہنا ٹھیک نہیں ہے خصوصاً" ان کی مار پیٹ سے آپ لوگوں کو بڑا نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ والد کے مارنے سے آپ کے چھوٹے بھائی کو ناک اور منہ سے جو خون آنے لگا ہے۔ اس کے لیے آپ فوری طور پر ڈاکٹر سے مشورہ کریں اور آپ کو جو چکر آتے ہیں، وہ بھی ڈاکٹر کو بتائیں کیونکہ سر کی چوٹ خطرناک ہو سکتی ہے۔

انعم اعجاز.....لالہ موسی

ج : عزیز بہن! آپ نے محنت، مشقت کرکے بچوں کی پرورش کی، انہیں تعلیم دلائی۔ ایک پلاٹ جو آپ کی ساری عمر کی جمع پونجی تھی۔ انہوں نے وہ بھی نہ چھوڑا۔ اور اپنے حصے کا مطالبہ کردیا۔ آپ کو اس وقت ان کا مطالبہ ماننا ہی نہیں چاہیے تھا۔ پلاٹ آپ کے نام تھا۔ وہ آپ کو مجبور نہیں کر سکتے تھے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ آپ کا اسٹور بھی گھر کے اندر ہے۔ اگر گھر بک جاتا ہے تو آپ کا ذریعہ آمدنی ختم ہو جائے گا اور جب بہوئیں آپ کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تو آپ کہاں جائیں گی۔

گھر آپ کے شوہر کے نام پر ہے۔ قانوناً" وہ اس کے وارث ہیں وہ آپ کو گھر بیچنے پر مجبور کر سکتے ہیں اس صورت حال میں آپ کو صرف یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے بچوں پر۔ خاندان کے لوگوں کے ذریعے اخلاقی دباؤ ڈالیں۔ خاندان والے انہیں سمجھائیں کہ آپ کو جیتے جی گھر سے بے گھر نہ کریں۔ آپ خود بھی بچوں سے کہیں کہ مرنے کے بعد تو یہ گھر ان کا ہی ہے۔ تھوڑا انتظار کرلیں۔ شاید بچوں کی سمجھ میں آجائے اور وہ اپنے ارادوں سے باز آجائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

نگہت جمال..... شکارپور

س: سردی آتے ہی مجھے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چہرے پر سفید دھبے نمایاں ہوجاتے ہیں۔ ہاتھ پیر پھٹنے لگتے ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم جاتی ہیں۔ بال روکھے اور بے جان ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ مجھے ان تمام مسائل کا حل بتادیں تو میں بھی سردی کا موسم انجوائے کرسکوں گی۔

ج: آپ کو جن مسائل کا سامنا ہے۔ یہ موسم سرما کے عام مسائل ہیں۔ سرما کے موسم میں بہت سی بہنیں ان مسائل کا شکار ہوتی ہیں۔ خشک ہوا ہماری جلد پر اثر انداز ہوتی ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم موسم سرما میں پانی کم پیتے ہیں موسم سرما میں غذا کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ یاد رکھیے! جس موسم میں جو پھل آتے ہیں۔ ان میں اس موسم کے لحاظ سے افادیت ہوتی ہے۔ موسم سرما میں کینو' مالٹا اور موسمبی ضرور استعمال کریں۔ اس میں موجود "وٹامن سی" جلد کے لیے بے حد فائدہ مند ہے۔ آپ کے مسائل کا حل حاضر ہے۔

چہرے کے لیے

چہرے پر سفید دھبے نمایاں ہونے کی وجہ چہرے کی جلد کا خشک ہونا ہے اور اس بات کا اشارہ بھی ہے کہ آپ متوازن غذا نہیں استعمال کررہی ہیں۔

اگر ممکن ہو تو ڈاکٹر کے مشورے سے ملٹی وٹامنز ٹیبلٹ استعمال کریں۔

روزانہ رات کو سونے سے پہلے اچھی سی کولڈ کریم لگائیں۔ روزانہ یا ہفتے میں تین بار بالائی اور شہد کا پیسٹ بنا کر چہرے پر لگائیں۔ صابن کا استعمال کم کریں' دہی یا دودھ کے ساتھ بیسن کا پیسٹ بنا کر لگانے سے بھی جلد کی خشکی دور ہوجاتی ہے۔ ایک چمچہ دہی یا دودھ میں آدھا چمچہ بیسن ملا کر پیسٹ بنالیں اور اس کو چہرے پر لیپ کرلیں۔ دس منٹ بعد چہرہ پانی سے دھولیں۔ خشکی دور ہوجائے گی۔ چہرے پر موئسچرائزر ضرور لگائیں۔

ہونٹوں کے لیے

ہونٹوں پر خشکی کی وجہ سے پپڑی آتی ہے۔ آپ رات کو باقاعدگی سے گلیسرین لگائیں۔ گائے کا کچا دودھ ہونٹوں پر لگانا بہت مفید ہے۔ بالائی لگانے سے بھی ہونٹوں کی خشکی دور ہوجاتی ہے۔

ایڑیوں کا پھٹنا

چار چمچے گلیسرین میں ایک لیموں کا عرق ملالیں۔ دو چٹکی پسی ہوئی پھٹکری ملالیں۔ دن میں تین بار لگائیں۔ رات سونے سے پہلے چار کپ گرم پانی میں ایک چمچہ نمک اور ایک چمچہ سرسوں کا تیل ملالیں۔ دس منٹ تک دونوں پیر اس محلول میں رکھیں۔ پھر جھانویں سے رگڑ کر صاف کرلیں۔ اس کے بعد پاؤں خشک کرکے اچھا سا باڈی لوشن لگائیں۔ اگر باڈی لوشن نہ ہو تو گلیسرین اور عرق گلاب کا محلول بنا کر رکھ لیں۔ سونے سے پہلے پیروں پر لگائیں۔

بالوں کے لیے

دہی میں ایک چمچہ ناریل کا تیل ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ سر دھونے سے آدھا گھنٹہ پہلے اس کو اچھی طرح سر اور بالوں پر لگائیں' پھر سر دھولیں' بال چمک دار ہوجائیں گے۔ کچھ لوگوں کو دہی کے استعمال سے خشکی بڑھ جاتی ہے۔ ان کے لیے مشورہ ہے کہ ناریل کے تیل میں لیموں کا رس ملا کر اس سے سر کی خوب مالش کریں۔ ایک گھنٹے بعد سر دھولیں۔

☼